دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

سالگرہ نمبر

http://pakfunplace.blogspot.com

http://pakfunplace.blogspot.com

Scan Dot

INTRODUCING

MEDICAM

FOR MEN

SHAVING CREAM

Awesome Colour & Fragrance

Perfect Luxurious Shaving

Enjoy Smooth, Moisturised and Fresh Skin

ہر شیو زبردست شیو

پُراعتماد شیو ہر دن

میڈی کیم شیونگ کریم

Optimum Formula For Smart Shave

http://pakfunplace.blogspot.com

http://pakfunplaces.blogspot.com

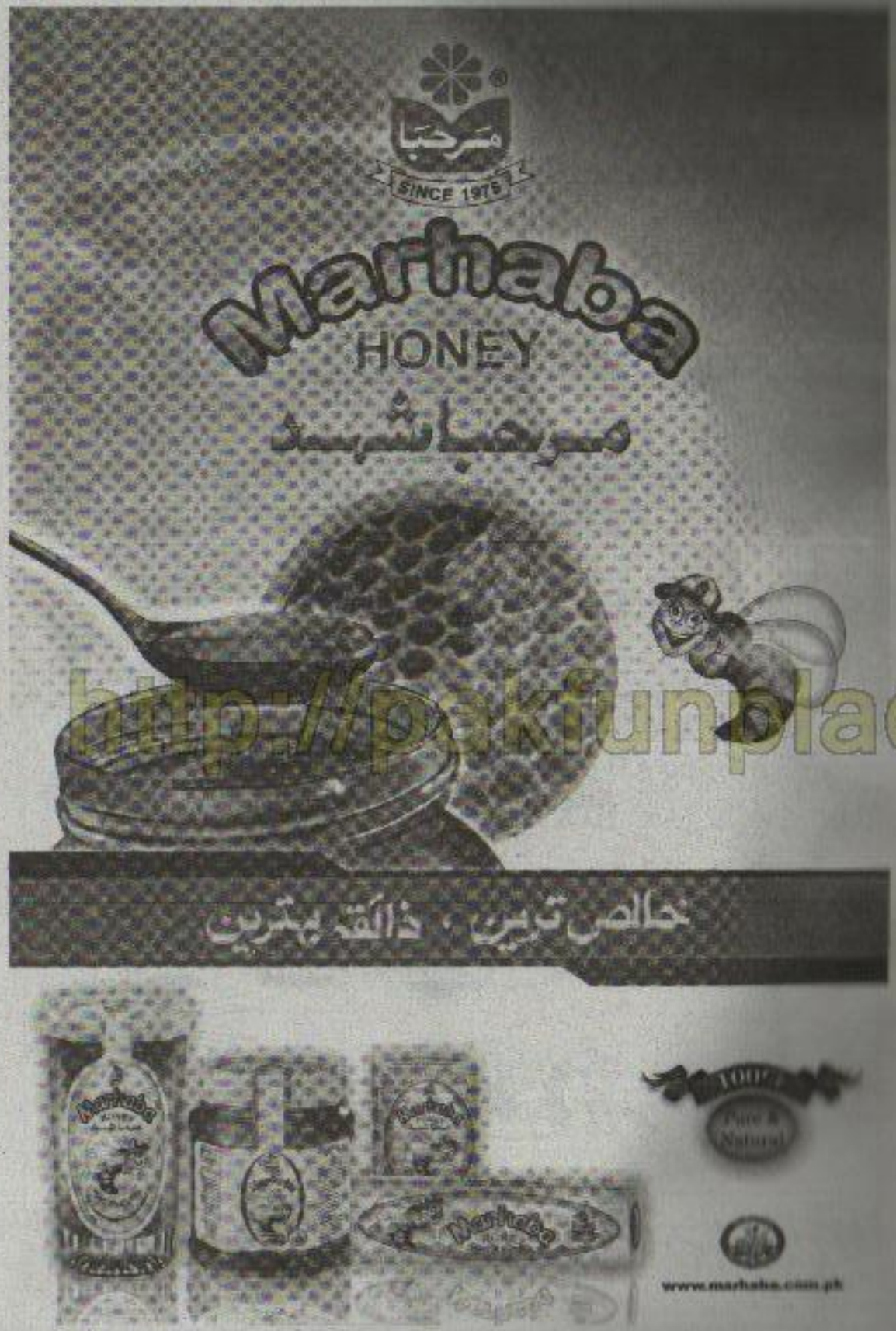

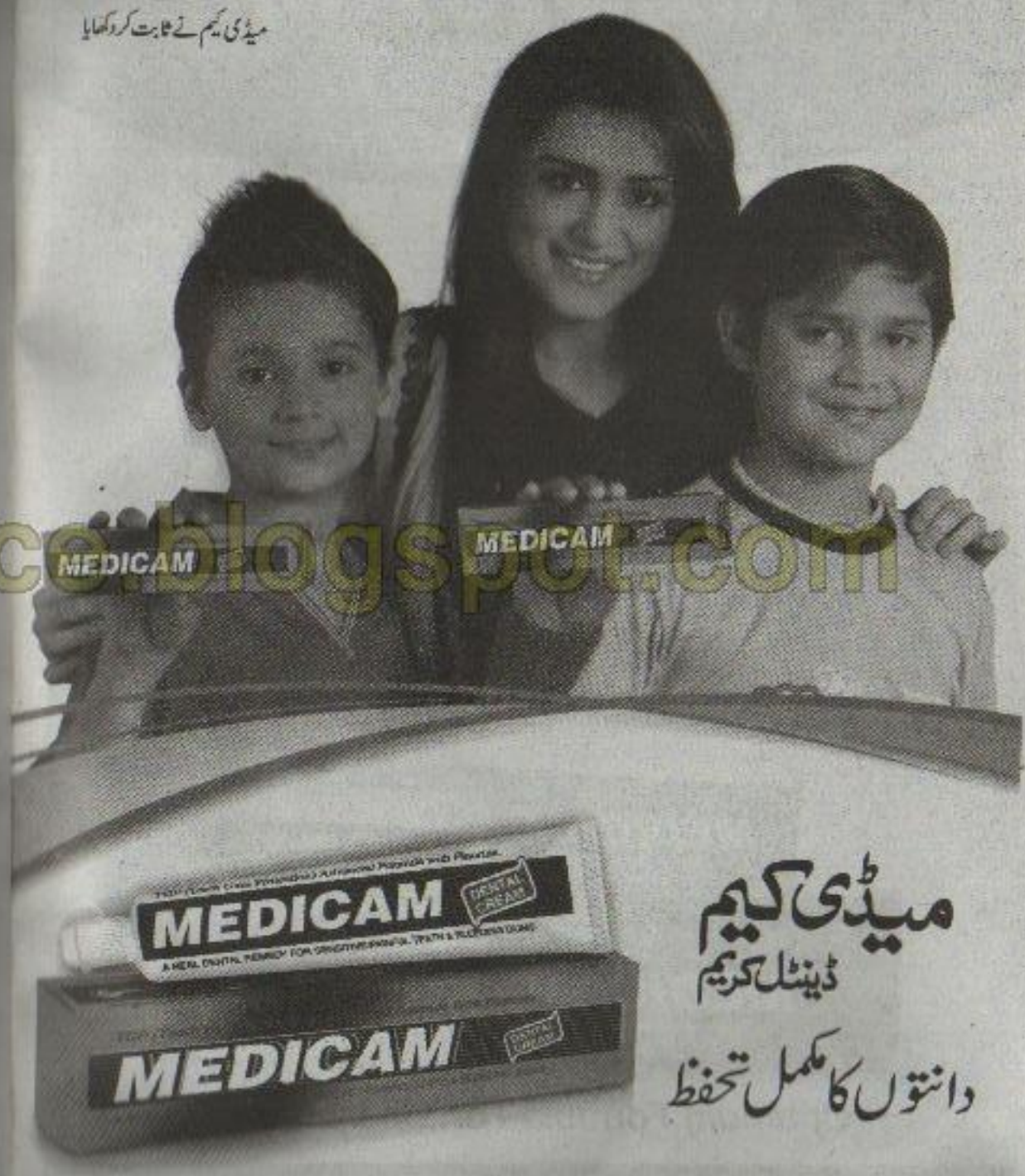

احتیاط علاج سے بہتر ہے

میڈی کیم نے ثابت کر دکھایا

چینی نکتہ چینی — 11 — [illegible]
قارئین کی آرا، فرمائشیں، کج ادائیاں، نامہ پیام، الجھنیں، مناجتیں اور شکایتیں

خوابِ زر — 18 — [illegible]
سنہرے خوابوں کا تاج محل جو تعبیر سے ہمکنار ہونا چاہتا تھا

گونگے کی گواہی — 51 — محمد سلمان زرار
ایک بے زبان لڑکا قصے کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے وہاں کی سرتوڑ کوشش

نادان دوست — 61 — آصف ملک
ایک نادان دوست کی دوستی نما دشمنی کا شاخسانہ

گرداب — 68 — اسد قادری
تقدیر کی ستم ظریفی، قسمت کی نیا بار بار کے مقدر کا کھیل، شطرنج کے مہرے بنے انسانوں کی کہانی

حسن کارکردگی — 101 — بابر نعیم
قلم اور عمل کے درمیان فرق کو نظر انداز کر دینے والے شخص کا عبرت انگیز ماجرا

معاہدہ — 109 — رضوانہ منظر
حرص و ہوس کے تانے بانے میں الجھی ایک کاروباری روداد

شبِ صد ہزار — 115 — مختار آزاد
ایک عجب تماشے کی کہانی اور ناقابلِ فراموش شاہکار پارہ

جلد 40 • شمارہ 01 • جنوری 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

للکار — 134 — طاہر جاوید مغل
[illegible]

لاحاصل — 179 — تنویر ریاض
[illegible] کی بساط پر بچھے مہروں کی ایک چال نے اچانک ہی بازی پلٹ دی

مردہ چور — 189 — [illegible]
[illegible]

رازوں کا صندوق — 203 — سلیم انور
ان میاں بیوی کا تذکرہ جو اپنی اپنی بات پر سختی سے کاربند تھے

فتنہ پرداز — 205 — منظر امام
بے ایمانی اور بدگمانی کی شاہراہ پر گامزن راہزنوں کا انوکھا کھیل

سودوزیاں — 215 — انور صدیقی
سود و زیاں کی قید سے رہائی پانے والے انسانوں کی عبرت ساماں تصویریں

سفینۂ حیات — 250 — کاشف زبیر
[illegible] کی دلچسپ داستان

تراش خراش — 000 — ادارہ و قارئین
[illegible]

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز][ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

http://pakfunplace.blogspot.com

چینی نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اوائل 2011ء کا خاص شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ تمام قارئین کو سالِ نو کی بہت بہت مبارک باد... گردشِ وقت نے کتابِ حیات کا ایک اور ورق پلٹ دیا۔ کتاب وہی پرانی ہے، اس کے صفحے پر نئی کہانی رقم ہوتی ہے۔ نئے سال کے اس صفحے پر طلوع ہونے والا سورج تو وہی پرانا ہے... لیکن جذبہ نیا سا ہوتا ہے، دل یا بعد کہ سال گزشتہ میں کیا کھویا کیا پایا اب تو کچھ بھی یاد نہیں۔ پانے اور لٹ جانے کی جمع تفریق کا کام حساب کتاب والوں کے نام، دل والوں کو اس سے کیا نسبت... سو نئے سال کی آمد پر حسبِ گزشتہ باندھی جاتی ہیں نئی امیدیں، تراشی جاتی ہیں نئی آرزوئیں... بُنے جاتے ہیں بہت سے خیالات... دیکھے جاتے ہیں نئے خواب... کہ نیا سال تو عبارت ہے اس طرح کی دل کی شعبدہ گری کا تو پھر سوچ ہاتھ سے کیوں جائے... باندھتے رہیے امیدیں... تراشتے رہیں نئی آرزوئیں... بُنتے جائیں بہت سے خیالات اور دیکھتے رہیے نئے نئے خواب کہ... نئے سال کا نیا سورج ابھی ابھی تو اُبھرا ہے۔ ابھی تو سال گزشتہ کے آخری دنوں کی سرد طویل شبوں میں ٹھٹھرتے جسموں کی بستی میں بسنے والے دلوں کو نئے سورج کی لو پر تو کرنوں سے ذرا حرارت تو پالینے دو... سرد راتوں میں ٹھٹھرتے جسموں میں حرارت دوڑے گی تو دیکھیں گے کہ تخیل تمنا کیسے اور کیا گل کھلاتی؟... ہو گی تو واہ واہ ورنہ سود و زیاں کا حساب کون کرے گا۔ نیا سال پھر آئے گا... دیکھیں گے۔ کیونکہ وقت کو بہت ہی گزر جانے سے ہے۔

شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب ہے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو

تو قارئین... نئے سال کے نئے سورج کو مشرق سے اُبھرتا ہوا دیکھ کر سوچیں کہ... اس نئے برس میں ہواؤں کو کس رُخ سے دیکھیں گے... ہم بہاراں میں کھلتے گلاب کا نظارہ کس کس زاویے سے کریں گے... حیات کے رنگوں کو دنیا کی بخشی کہانی زندگی کو کس طرح مزید روشن بنائیں گے، وغیرہ وغیرہ...

آپ سوچیے اور ہم چلتے ہیں پاکستان کے ہر شہر... قصبے... کوچے میں... کیونکہ ہمارا تعلق آپ سے ہے... ان جگہوں سے جہاں سے خط موصول ہوتے ہیں... آئیے دیکھتے ہیں کہ آپ کی محفل میں کیا کچھ ہے۔

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا کی مبارک باد چکوال سے "سب سے پہلے ہم آپ کو آگاہ کردیں کہ اتفاق سے ڈینگی بخار ہم دونوں کو ہوا... ڈاکٹروں اور گھر والوں کی محبت نے ہمیں رحم کے ... ہسپتال میں بھی رہنا پڑا۔ (رب ... کا احسان ہے) ... ناول گرل کو دیکھا تو محترمہ دلکش شکل نظروں سے اچھا جانے والوں کو دیکھ ... ہمارے بھائی ... شامل تھے۔ ناول ... ہمارے ... پیر قابلِ توجہ تھی وہ اس کا ہیرو اسماعیل ... کہانی کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی پھولوں کلیوں والی محفل میں پہنچے... اداریے کی طرف سے تبدیلی پسند آئی لیکن ہمارا انتظار وہی ایک ... برقرار ہے۔ بابر عباس آپ کو ذرا بعد میں مبارک باد دیتے ہیں، پہلے ہم ان کو کہیں جن کی جنوری میں سالگرہ ہوتی ہے۔ ہمارے دو محبوب جاسوسی اور سسپنس کو ... آپ کو بھی سالگرہ مبارک۔ ان کو بھی جن کی ہمیں پتا نہیں۔ جی کب کھلا رہے ہیں؟ بابر اپنے شہر کی خالص دیسی گھی کی بنی ہوئی مٹھائی۔ ایس ایس ناز! کیا آپ کا یہ ذاتی تجربہ ہے۔ خیر، ہم خراب ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔ آپ خان کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے کیا فائدہ۔ مدیر اعلیٰ کا حکم نہ مانا تو ہم آپ کو گستاخ سمجھیں گے۔ مسٹر اعجاز! اس سے آپ کا مطلب؟ اور سنیے... اپنی تنگ سوچ کو بدلیں۔ چنیوٹی بھائی ہمارا دل کوئی گائے بکری نہیں کہ بے قابو ہو جائے۔ تصویر العین! اتفاق سے آپ کو ایک پانچ ماہ پرانے رسالے میں دیکھا، تھی بڑی بات ہے اپنوں سے چھپا کر غیروں کو پہلے ہی اپنی خوب صورت مصوری کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ ذکر ہو جائے اب کہانیوں کا۔ حسبِ معمول ابتدا پہلی کہانی سے کی۔ روحی کا کردار اپنے معاشرے کا نہیں لگ رہا تھا یا شاید ہماری زندگی ایک خاص حد تک ہے۔ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی گندگی کا نہیں معلوم۔ للکار میں جنگی کی نیا پارنگ گئی۔ تابی کی کب باری آئے گی؟ بازی گر خاص متاثر نہیں کرسکی۔ طاہر پرتو پہلی ہی ڈاک تھا۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ لیلیٰ کی محبت میں اشعر کو راستے سے ہٹا رہا ہے، یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے آج کل دولت سے محبت کی جارہی ہے۔ مریم کے خان دو ماہ کی غیر حاضری کا کوٹا پوری امانت داری سے عمل کرتی ہوئی نظر آئیں۔ بہت ہی پیچیدہ موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ہمارے کشمیری بھائی ہم ... ہیں۔ کم از کم ان کو پتا ہے ان کی لڑائی کس سے ہے جبکہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے اصل دشمن کون ہیں اور آپس میں پھر بھی لڑ رہے ہیں۔ ... مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔ پہلے کس کو چن کر پڑھیں؟ حسرت! تمام ایڈی سوزن، جلد بازی اور کمزور منصوبہ بندی کی وجہ سے شکنجے میں آگیا۔ ... دونوں کی ... لاجواب تھیں۔ دل کا معاملہ، کلیو جون کا مصنوعی دل آج کل کی بے ہودہ سبزیوں کی طرح تھا۔ سائنس دانوں کو چاہیے کہ ایک ایسا دل تیار کریں جس کا تعلق دماغ سے ہو۔ ہمارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ دماغ کی انگلی پکڑ کر چلے۔ گواہی میرے سر سے گزر گئی، وجہ ... پڑھی ہی نہیں۔ آخر میں سب کو نیا سال مبارک۔"

ایم اے خان کی وضاحت پشاور سے "اس مرتبہ ہم کچھ بھی کہنے کے لیے نہیں آئے ہیں کیونکہ نہ ہی چند مہینوں سے میں نے ناول دیکھا اور نہ ہی میں نے ڈائجسٹ پڑھا ہے مگر بزم میں شمولیت کو ہم نے ضروری جانا... آج کل کچھ ایسا دور چل رہا ہے کہ

لطف مرنے میں باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں

یہاں بھی آکر ... ہیں... کوئی منظر بازک وجاہت کی مخالفت میں ہے تو کوئی تعریفوں کے لیے چوڑے قصوں میں الجھا ہوا ہے۔ بس لفظوں

Benchmark

کی جنگ ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو الفاظ کے نشتر سے زخمی کرنا چاہتا ہے۔ (آپ کو ایسا کیوں لگا... دوستوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا مقصد زخمی کرنا نہیں ہوتا۔) خدا ہمیں ان زہریلے نشتروں سے امان میں رکھے... ہم کسی کے منہ نہیں لگنا چاہتے اس لیے عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ چپکے سے کھسک جائیں۔"

فضل محمد آف پشاور کی پشاوری باتیں "ٹائٹل اس دفعہ بھی پہلے کی طرح خوب صورت تھا۔ حسینہ کی تصویر دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ یہ لڑکی کہیں دیکھی بھالی ہے۔ (بھول گئے... پچھلی گلی میں تو رہتی ہے۔) مجھے بالوں کا اسٹائل بہت پسند آیا۔ دائیں اور بائیں طرف دو مشٹنڈوں کی تصویروں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا چل رہا ہے۔ (کوئی وجہ فساد ہی انجان بنے بیٹھے ہیں) اور اسی لڑائی میں ایک نے دوسرے کی گاڑی جلا دی۔ سردی سے بچنے کے لیے ڈبل کراس کر کے ہم یاران محفل میں جا پہنچے۔ دیکھا تو صدارت کی کرسی پر بابر عباس صاحب بیٹھے یوں مسکرا رہے تھے کہ آخری تیر کا نشانہ صحیح آ کر لگا ہو... ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ احمد علی کیف جو کہ نئے ساتھی انٹر ہوئے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں اور سلام قبول کرتے ہیں۔ ایس ایس ناز صاحبہ! صنف کرخت کا نمبر ایک پر آنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہو۔ شاید آپ ابھی اس فیلڈ میں انٹر نہیں ہوئی ہیں۔ اس لیے آپ کے منہ سے بچگانہ باتیں نکل رہی ہیں۔ لہٰذا اقبال مرزا اور صبا مرزا سے کچھ سیکھ لیں۔ آسیہ خان! یہ کیا بات ہوئی کہ یہ آپ کا آخری خط ہے۔ خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں یا پھر دولہا بھائی نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ تصویر العین صاحبہ! آپ کے ابو کے لیے اسپیشل دعا کی۔ باقی تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ ہر ایک نے اپنی ذہانت کے مطابق تبصرہ کیا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ (جزاک اللہ...) انشور بادی نے ہمیں قانونی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ مغربی طرز کی مشرقی کہانی بڑی سبق آموز تھی۔ روحی کے کردار نے یہ باور کرایا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ایڈی مورٹن کی قسمت خراب تھی کہ سیکیورٹی سسٹم نے اچانک کام شروع کر دیا ورنہ ایڈی تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مسز نوکس کی دلیل پر سچی بے مثال تھی لیکن بابر نعیم کی گواہی تاثر دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ حالانکہ شین مائیکل نے فلورا کی مدد بھی کی اور اس کی دولت اسے دینے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی بچالی۔ عورت، ناگن اور اوت سے دشمنی اچھی نہیں ورنہ لوگ اس کی مثال ہی نہ دیتے اور زن گزیدہ میں انجام جو بتی چھپانہ ہوتا۔ دل کے معاملات میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آصف ملک نے دل کے معاملے میں تھوڑی سی غلطی کی ہے۔ یہ دل بظاہر حرکت پذیر تھا لیکن احساس سے خالی تھا۔ اس لیے جون نے اپنی زندگی ہاری اور ولیم جیسے لاکھوں افراد بھی تباہ ہو گئے۔ خودکشی کے کیس میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دینا بھی اچھی بات نہیں اور اس کہانی میں مونک کی اداکاری اور کارکردگی حیران کن تھی۔ ایلس ایک سادہ کردار کی حامل عورت تھی لیکن اس نے اپنی بہادری سے اس کیس کی کایا ہی پلٹ دی۔ سرورق کے رنگوں میں بازی گر اچھی لگی۔ بیل کا کردار ہمارے اردگرد کے ماحول سے میچ کرتا تھا لیکن اس معاشرے میں طاہر اور اشعر جیسے کردار بھی ہوتے ہیں اور انجام وہی جو کہ دستور زمانہ ہے۔ شہر آشوب کو مریم صاحبہ نے لفظوں کے موتیوں کو پھولوں کی طرح پرو کے لکھا اور ہم نے دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ للکار اور گرداب کے بارے میں لکھنا گویا چراغ کو سورج کے سامنے رکھنے کے برابر ہے۔"

اعجاز احمد کا تبصرہ ساہیوال سے "سال کا آخری شمارہ زیر نظر ہے۔ دسمبر کی اداس کر کوکھاتی کرتی ٹھٹھرتی راتیں ہیں۔ دل کی عجب سی کیفیت ہے۔ یہ فراق و وصل کے لمحے ہیں۔ موجودہ سال سے الوداع اور سال نو کو گلے لگنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ماہ و سال یونہی بدلتے رہیں گے، کاروانِ زیست یونہی چلتا رہے گا۔ (یقیناً) ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود کو بدلیں۔ بہر حال جاسوسی کے سنگ ایک اور سال اختتام پذیر ہوا۔ امید ہے سال نو ہمارے لیے خوشیاں لائے گا۔ سرورق پر شوخ و چنچل حسینہ کے عقب میں سگریٹ کے کش لگاتا سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی بھلا محسوس ہوا جبکہ سامنے والے کی خیر تھی۔ حسینہ کی مست نشیلی آنکھوں میں کھوئے کھوئے شاہراہ دوستاں پر پہنچے۔ جیت پرانے دوست بابر عباس کی ہوئی، سو مبارکاں۔ تبصروں میں سلیم شبلی بلوچ، ایم اے محمد عمر نعمان کے تبصرے پسند آئے۔ آسیہ خان! مجھے آپ کا الوداعی پروگرام اچھا نہیں لگا۔ بندے میں کچھ حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ محسن آفریدی صاحب! کچھ دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دل ہی میں رکھنا مناسب ہوتا ہے۔ آمنہ پٹھانی! یہاں تو کوئی کسی کے آنسو بھی نہیں پونچھتا۔ بہر حال، آپ کا کسی کو بے ایمان آدمی کہنا اچھا لگا۔ تصویر العین صاحبہ! ہم آپ کے والد محترم کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ مغل صاحب اب تابش کو چپ والے چکر سے نکال دیں تاکہ وہ کھل کر ایکشن میں آ سکے۔ جیکی اور شگفتہ کا وصل سرور کن ثابت ہو رہا ہے۔ بہر حال موجودہ قسط ایکشن و تھرل سے بھر پور تھی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ بالا اپنے انجام کے نزدیک تر ہے۔ ماہ بانو کی وجہ سے بہادر بھی منظر پر آ گیا ہے۔ شہریار کے ساتھ مشارم خان کی کمی محسوس ہوئی۔ پہلا رنگ بازی گر پڑھا۔ دولت و ہوس کی خاطر اکثر لوگ ایک دوسرے کو دھوکا دینے سے نہیں چوکتے۔ بہر حال، طاہر کی بازی الٹی ہو گئی۔ آزادی کشمیر کے موضوع پر لکھا گیا دوسرا رنگ شہر آشوب پسند آیا۔ قانونی دھوکا ماڈرن سوسائٹی کا منہ بولتا ثبوت تھا جن کے نزدیک ہر ناجائز کام بھی جائز ہے۔ قربان بیگ کا کردار پسند آیا۔ حسرت ناتمام پڑھی، ظاہر ہے زندگی میں کچھ ایسی خواہشیں ہوتی ہیں جو دل کی حسرت بن جاتی ہیں اور کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ زن گزیدہ میں یہ بات واضح ہوئی کہ میاں بیوی کا نازک رشتہ ہوتا ہے جو کہ ایک دوسرے پر اعتماد ہونے تک قائم رہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز دست قدرت میں ہے، کوئی اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی دل کا معاملہ تھا، دونوں سائنس دانوں کو ان کا لالچ لے ڈوبا۔ کایا پلٹ میں ایلس نے حق دوستی خوب ادا کیا۔"

ضلع راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی باتیں "پچھلی مرتبہ کی ساری کسر نکالتے ہوئے اس مرتبہ جاسوسی نے ریکارڈ چکر لگوائے لیکن جیسے ہی شمارہ ہاتھ آیا ساری بیزاری غائب ہو گئی۔ سرورق حسینہ کے ادھ کھلے ہونٹ، ستواں ناک، گلابیاں لیے شفاف رنگت، اس پر ستم خوب صورت آنکھوں سے دیکھنے کا انداز۔ خدا خیر کرے۔ سارے تبصرہ نگار برادران کی۔ (اس وقت تو آپ کی حالت خراب لگ رہی ہے) حسینہ کی ایک سائڈ پر رقص کرتے شعلے تو دوسری طرف ... سے ملتے نیلگوں آسمان۔ چیچی، ملکہ چیچی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ جاسوسی ٹیم کو ایڈوانس اور دیگر قارئین کو تھوڑا لیٹ ویری ویری ہیپی نیو ایئر۔ حالانکہ اپنا تو بقول شاعر یہ عالم ہے

وہی بے یقینی ہے کُو بہ کُو، وہی نا امیدی ہے چار سُو
جو بھی سراپا سوال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

خیر، ناامیدی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ نیا سال خوشیوں کا اور امن کا پیامبر ثابت ہو، آمین۔ (ہماری طرف سے بھی نیک تمنائیں) بابر عباس! مبارک باد۔ حضور بخش! پسندیدگی کا شکریہ۔ سویٹ آسیہ سس! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ہمیں اس محاذ پر اکیلا چھوڑ جائیں... نو، نیور۔ اعجاز احمد! ابھی تو

آپ شہد کی مکھیوں کی طرح میرے تبصرے کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ مبارک احمد! آپ کچھ الفاظ کی بات کر رہے ہیں جبکہ میرے تبصرے میں سے ہر دفعہ دو پیراگراف کٹ ہوتے ہیں لیکن مجھے تسلی ہے کہ اول جو کرتے ہیں، ٹھیک کرتے ہیں۔ نوبی اے اگر آپ کی ذہانت عالمی سطح پر مانی جا چکی ہے۔ ذیشان اینڈ ماما تو جو نہیں ... ماما کر کے محفل جواں ہے، حسین ہے۔ محفل کے کونے میں تاریک کوٹھری سے آہ و زاری کی آوازیں آ گئیں۔ تجسس کے مارے اندر جھانکا تو ... اپنے پیارے راج بھیا اور سویٹ عذرا آپی ہیں۔ سویٹ! اس پانی اور رزکاں والوں کی ... کے ساتھ للکار کی یہ قسط اچھی رہی۔ گرداب ... رہی۔ چودھری کی حالت اس حکمران کی سی ہو رہی ہے جس کے سب کچھ بس میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہو۔ دوسرا رنگ شہر آشوب پڑھ کے تو ... ہوش و حواس گم رہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شہیدوں کا خون رائگاں نہ جائے اور کشمیریوں کو ان کی قربانی کا صلہ ایک آزاد خطۂ زمین کی صورت میں ملے، آمین۔ ثمر عباس کی تیسرا آدمی اچھی رہی۔ اس انجام کا تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ محمد عثمان آزادی کی پروانہ پڑھ کر مزہ آیا۔ کایا پلٹ کی ایلس نے آخر قاتلوں کو ... اور ساتھ ساتھ حق داروں کو حق دلا دیا گیا۔ رضوانہ منظری زن گزیدہ میں سر پر سے گزر گئی۔ تراش خراش تمام ہی اچھی رہیں۔ شاہد انکل کے اسکیچز تو سارے ہی اچھے تھے لیکن قسط وار کے علاوہ زن گزیدہ کا اسکیچ زیادہ پسند آیا۔" (چلیں جی کسی نے تو شاہد انکل کے فن پاروں کی... تسی گریٹ ہو۔)

تصویر العین کا باتصویر تبصرہ قارئین کی نذر "اس دفعہ جاسوسی کا ٹائٹل مجھے تو بہت پسند آیا۔ سب سے پیاری چیز ٹائٹل گرل تھی۔ اوپر بنا ہوا آدمی خوب صورت تھا مگر اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا کہ اس کی خوب صورتی کو گہن لگا دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ پیچھے جلتی ہوئی گاڑی میں کچھ ہاتھ اس کی سگریٹ کا بھی ہو گا۔ (کیا شعلہ مسکراہٹ ہے جو آگ لگا دیتی ہے۔) پیچھے موجود شخص نہ جانے کسے اتنے غور سے دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنی ناک سے بہنے والے خون تک کا احساس نہیں تھا۔ چیچی، ملکہ چیچی میں صدارت کی کرسی پر بابر عباس بیٹھے نظر آئے۔ تقریباً آدھا تبصرہ صرف ٹائٹل پر ہی تھا۔ بابر صاحب! آپ، مبارک احمد ... مٹھائی کی فرمائش کر رہے ہیں بلکہ اب تو مٹھائی آپ کو کھلانی چاہیے کیونکہ آپ کا خط پہلے نمبر پر آ گیا ہے۔ ضروری نہیں جس کے ساتھ آفریدی لگا ہو، وہ شاہد آفریدی کا کچھ لگتا ہے۔ آفریدی ... ذات یا قبیلے کا نام ہے پٹھانوں میں۔ (بجا فرمایا) احمد علی کیف! بڑی مہربانی کہ آپ اپنی مصروف زندگی سے کچھ وقت نکال کر جاسوسی پڑھتے ہیں اور ہم لوگوں پر احسان عظیم کرتے ہیں۔ ایس ایس ناز! اباجان سعید کو بہت ملتان کی دعوت دی جا رہی ہے، خیریت تو ہے؟ کیا سلیم شبلی (بھوت) کا سایہ آپ پر بھی ہو گیا تھا جو دل نشین کو منع کر رہی ہیں۔ میری کمی محسوس ہوئی، بڑی مہربانی کہ آپ نے یاد کیا۔ اقبال اینڈ صبا مرزا اپنے تبصرے میں سب کی ٹانگ کھینچتی نظر آ گئیں۔ آسیہ خان! یہ کیا بات ہوئی؟ جب آپ جیسے دوست ساتھ چھوڑ دیں گے تو جاسوسی کی محفل کا کیا مزہ آئے گا۔ پلیز یہ الوداع لفظ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیں اور جاسوسی میں دوبارہ شرکت کریں۔ اس دفعہ چیچی کی محفل بہت اچھی تھی۔ تراش خراش میں ... ولید بلال بہت پسند آئی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ طاہر جاوید مغل کی للکار میں اس دفعہ کچھ تیزی آئی۔ جیکی کی محبوبہ شگفتہ کی اچانک انٹری ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جب تک تابش لڑائی بھڑائی میں اچھی طرح ماہر نہیں ہو جاتا، طاہر انکل عمران کو اسٹوری میں واپس نہیں لائیں گے۔ ورنہ اگر عمران کی کہانی میں انٹری ہو گئی تو پھر یہ دکھایا جائے گا کہ تابش پھر سے عمران پر انحصار کر رہا ہے (یہ میرا ذاتی خیال ہے۔) اسما قادری کی گرداب بہت زبردست تھی۔ راحیل اور طارق کا معاملہ بھی گڑبڑ لگ رہا ہے۔ قانونی دھوکا میں انشور بادی نے روحی کو بہت چالاک دکھایا۔ اس نے طارق اور ڈگلس کے ساتھ بہت برا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ خود برا ہوا۔ سچ ہی ہے کہ ... جتنی بھی چالاک کیوں نہ ہو، وہ کچھ نہ کچھ غلطی ضرور کرتا ہے۔ بازی گر ... اس کہانی میں مجھے شروع سے ہی طاہر پر ہی شک تھا کہ یہ ضرور گڑبڑ کرے گا۔ بیچ میں تھوڑی دیر کے لیے ذہن اشعر کی طرف گیا لیکن انجام وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دوسرا رنگ شہر آشوب ابھی آدھا پڑھا ہے، اچھی کہانی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ جاسوسی اس بار بھی اچھا تھا۔" (خطوط کو جوں کا توں نہ شائع کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمیں کہانیوں کے لیے بھی صفحات درکار ہوتے ہیں... آئی سمجھ میں تصویر شناس۔)

سدرہ جبین کی مصروفیت گوجرانوالہ سے "گریجویشن کے امتحانات سے پہلے عارضی رخصت لی تھی آپ سے۔ سوچا تھا کہ امتحانات سے فارغ ہو کر آؤں گی مگر گزرے وجوہ کی بنا پر یہ رخصت قدرے لمبی ہو گئی جس کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔ (چلیے قبول کی) اگست میں میرا رزلٹ آیا، الحمدللہ فرسٹ ڈویژن آئی ہے اور اب انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔ (بہت اچھے) مگر اس بار ہمت کر کے خط لکھنے کی جسارت کر ہی لی۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ لڑکی کا ہیئر اسٹائل کمال تھا، البتہ سگریٹ پیتا مرد بہت برا لگا اور نیچے جلتی ہوئی ... مجموعی طور پر ٹائٹل کی خوب صورتی کا کریڈٹ لڑکی کو ہی دیا جانا چاہیے۔ فہرست میں نظر دوڑائی، للکار کا صفحہ نمبر دیکھا اور کہانی پڑھنی شروع کر دی۔ تابی کی اتنی بہادری پر عمران کو سلیوٹ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ بہت بہادری سے اس نے لڑائی لڑی اور جیت بھی گیا۔ سلطانہ ... کی از حد نفسیاتی اذیت کا شکار ہے۔ بہت دل دکھا اس کی حالت پڑھ کر... خوشی کی خبر ... جیکی اور شگفتہ مل گئے۔ دوسری تحریر انشور بادی کی قانونی دھوکا پڑھی۔ اس قدر بولڈ موضوع... اتنی عجیب و غریب تحریر... بس دانتوں پسینہ آ گیا۔ روحی جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں؟ ناقابل یقین۔ طارق کا اس کے ہاتھوں کھلونا بننا بہت برا لگا مگر سچ کی جیت ہو کر رہی۔ اب بات کروں گی گرداب کی۔ کشور کے لیے مشکلات کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور بلند اصاحب چودھری افتخار کو یقیناً ٹف ٹائم دینے والی ہیں۔ دوسری طرف شہریار کے خفیہ ٹھکانے ... کیے جاتے ہیں۔ ماہ بانو کسی مصیبت کا شکار نظر آئی۔ اس کے بعد دل کا معاملہ پڑھی۔ بہت بہت اچھی تحریر تھی۔ یقیناً بہت ریسرچ کر کے لکھی گئی ہے۔ فی الوقت کہانیوں پر تبصرہ اتنا ہی... انشاءاللہ باقی آئندہ ماہ حاضر ہو کر پوری کروں گی۔ اور دوستو! بے فکر ہو جاؤ، سب کی ٹانگ کھینچنے کا پروگرام بھی آئندہ ماہ پر ملتوی کر رہی ہوں۔" (یقیناً سب نے شکر ادا کیا ہوگا)

حضور بخش کنول طاہر پیر سے لکھتے ہیں "دسمبر کا جاسوسی ڈائجسٹ حسب عادت دیر سے ملا۔ ٹائٹل گرل کے حسنِ بے مثال نے پس منظر میں آگ لگا دی مگر مجھے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ (اتنے خوفناک ہیں) آسیہ خان! آپ کی باتوں سے میرا دل ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ زندگی دکھوں غموں کا مجموعہ ہے۔ یہاں تو ہر کوئی ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستا ہے، رونے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ مجھے آپ کی تحریر نے دکھی کر دیا۔ خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ امید ہے آئندہ ... مسکراتے ہوئے محفل میں شرکت کریں گی۔ قانونی دھوکا ان والدین کی آنکھیں کھولنے والی تحریر ہے جو اپنی اولاد سے بے فکر ہو کر اپنی ہی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ انہیں بھلا اس وقت لگتا ہے جب اولاد برائی کی دلدل میں پھنس جاتی ہے اور باہر نکلنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ گواہی میں ... جانسن خود کو چالاک اور سمجھدار سمجھتا رہا مگر اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں خود پھنس گیا۔ بلنڈا اسویٹ کو اس کی وجہ سے شہرت مل گئی اور دیکھتے ہی

http://pakfunplace.blogspot.com

دیکھتے اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ زن گزیدہ بظاہر تو مختصر سی تحریر ہے۔ اس میں ان مردوں کو سبق سکھایا گیا ہے جو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی بے قرار و بے کل رہتے ہیں۔ بازی گر میں لیلیٰ کی ذہانت اور معاملہ فہمی قابل ستائش ہے مگر اس نے طاہر کو سمجھنے میں غلطی کی جو اس کا اور اشعر کا جانی دشمن بن گیا اور اپنی ناقص حکمت عملی کی وجہ سے پکڑا گیا۔ شہر آشوب کا شمار میری من پسند کہانیوں میں ہوتا ہے۔ میں مصنف کی سوچ کی داد دیتا ہوں۔ واقعی کچھ دلوں، جگہوں اور شہروں پر ہمیشہ خوف کا موسم چھایا رہتا ہے۔ تمام قلم کاروں کو اچھی تحریریں لکھنے پر مبارک باد۔" (بہت شکریہ)

گاؤں سرور ڈی ضلع سکھو سے تابش کا اظہار جرأت "جاسوسی ڈائجسٹ تو بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کر رہا ہوں۔ (دیر آید درست آید) اس دفعہ ڈائجسٹ نے 4 تاریخ کو اپنا دیدار کرایا تو ایسے گلے لگایا جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کو گلے لگاتا ہے۔ سرورق پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دوشیزہ بے نیاز حسینہ آنکھوں میں خون لیے بھرپور نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ (سامنے سے ہٹ جائیں، کہیں خون آپ پر نہ چھلک جائے) ہیئر اسٹائل اچھا لگا۔ لڑکی کے سائڈ میں ایک چھوٹی سی جیپ شعلوں میں گھری نظر آئی۔ کس ظالم نے اس کو آگ لگائی؟ ہمیں تو یہ کارنامہ چودھری افتخار کا لگا۔ اس کے اوپر ایک آدمی تھا جو سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ہاتھ میں پستول کے بجائے سگریٹ پکڑے ہوئے تھا۔ نیچے بھی ایک آدمی رونی سی صورت بنائے ہوئے مظلوم نظر آنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مجموعی طور پر سرورق اچھا رہا۔ اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے تیکھی نکتہ چینی کی محفل میں پاؤں پسار کے بیٹھ گئے (بھئی تمیز سے، جگہ کم ہے) تو بابر عباس کو صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے بھنگ لیتے ہوئے پایا۔ مبارک ہو بھیا! احمد کیف نے دوسری جگہ حضور بخش کنول نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ دونوں کو بھی مبارک ہو۔ آسیہ خان! آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ واپس نہ آنے کی باتیں کر رہی ہو۔ زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان سب سے کٹ کر رہ جائے۔ آسیہ پلیز! ابھی الوداع نہ کہنا اور واپس آ جاؤ۔ محمد سلیم، اعجاز احمد، صبا اینڈ اقبال مرزا، مبارک احمد اور محسن آفریدی کے تبصرے زبردست رہے۔ محمد سرفراز صاحب! گلگت کا موسم کیسا ہے؟ یہاں تو سردی اپنے جوبن پر ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی جس میں تابش شاید آزاد ہونے والا ہے۔ تابش کو چاہیے کہ اپنی بیوی کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ طاہر انکل پلیز، عمران کو واپس لائیں۔ اسما قادری کی کہانی گرداب پڑھی۔ کہانی زبردست جا رہی ہے۔ آفتاب اور کشور محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ شاید مہرین (ماہ بانو) بھی اب محفوظ ہے مگر ڈاکٹر طارق نے جو تصویریں بنائی ہیں، شاید ان کی وجہ سے ماہ بانو مصیبت میں گھر جائے اور دشمن اس تک پہنچ جائے۔ شہریار بھی شبیا کے قاتلوں تک پہنچنے والا ہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ پڑھا۔ دولت نے طاہر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور وہ اشعر کے خلاف ہو گیا۔ خیر اب تو وہ جیل میں سڑ رہا ہوگا۔ سرورق کا دوسرا رنگ نہیں پڑھا مگر مریم کے خان نے کہانی لکھی ہے تو ضرور اچھی ہوگی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔"

ہمایوں سعید راج کی باتیں بنوں سے "بابر صاحب! ایک طرف آپ شوگر کا رونا رو رہے ہیں تو دوسری طرف مبارک بھائی کو مبارک باد دے کر مٹھائی کی فرمائش کر رہے ہیں۔ سنبھل جائیں ورنہ بیگم صاحبہ از خود نوٹس لے لیں گی اس بے احتیاطی کا۔ کیف صاحب! آپ کے نام پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے کرنٹ سا لگا۔ میں سمجھا کترینہ کیف آ گئی ہے۔ آمنہ پٹھانی کیا فلسطین یا کشمیر جا رہی ہے؟ جو آپ اسے اتنے تحفے دے رہی ہیں۔ آسیہ خان نے اس بار قلم استاد شبنم کے خصوصی جذباتی انداز میں بات کر کے انکل سمیت پوری محفل کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ سب سے پہلے شہر آشوب پڑھی جو توقع سے زیادہ پسند آئی۔ مریم جی نے کشمیری عوام، بھارتی ہتھکنڈوں اور بین الاقوامی میڈیا کا کردار بڑے جامع اور پراثر انداز میں تحریر کیے ہیں۔ بازی گر کے نام نے جتنا متاثر کیا تھا، کہانی نے اتنا نہیں کیا۔ بے حد عام انداز میں شروع کی گئی کہانی کو آخر میں زبردستی جاسوسانہ انداز دے دیا گیا۔ بے چارے طاہر کے مخلص کردار کو خواہ مخواہ احمق بنا دیا گیا۔ اگر وہ چاہتا تو... کسی جھنجٹ میں پڑے بغیر لیلیٰ کو حاصل کر سکتا تھا۔ (اب یہ مشورہ دینے کے لیے آپ کہیں موجود نہیں تھے) اس کے بعد ابتدائی صفحات پر خوب صورت کہانی قانونی دھوکا پڑھی۔ جاسوسی کے معیار کے عین مطابق لگی۔ طارق اور نرگس کی پیاری جوڑی بے حد پیاری لگی۔ مختصر کہانیوں میں دل کا معاملہ اور پروانہ ذرا بے حد پسند آئی کیونکہ مجھے میڈیکل اور کمپیوٹر سائنس سے متعلق کہانیاں بے پناہ اچھی لگتی ہیں۔ دل کا معاملہ میں رائٹر نے اتنی اچانک بازی پلٹی کہ ہم بھی چکرا کے رہ گئے۔ کیو جون اچانک ہی عرش سے فرش پر پہنچ گیا، ویلڈن آصف ملک۔ تیسرا آدمی کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ چھوٹی سی بات میں مؤلف نے میرے اور ڈیلن کے صبر کا پیمانہ لبریز کرنے کے بعد کیس حل کیا۔ للکار حسب معمول سنسنی خیز رہی۔ سلطانہ نے کمال بہادری سے تابی کو باڑے کے شکنجے سے نکالا اور خود سراپا قہر بن کے ان حیوانوں پر نازل ہونے نکل پڑی ہے۔ گرداب میں بھی ہنگامہ خیزیاں عروج پر تھیں۔ راحیلہ اور ماہ بانو کی دوستی بھی دل میں ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ زبردست رہا۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

سید محی الدین اشتیاق کی شمولیت فتح پور سے "سب سے پہلے تیکھی نکتہ چینی پر کچھ تبصرہ۔ (بھئی آرام سے، آپ تو ڈرا رہے ہیں) بابر عباس صاحب! کرسی صدارت پر مبارک باد۔ ٹائٹل گرل کے ہیئر اسٹائل کو دیکھ کر صنف نازک کو اسٹائل بنانے میں کافی آسانی ہوئی ہوگی اس کے لیے انہیں ڈاکٹر انکل کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اعجاز احمد صاحب! آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں ادا ہوں؟ آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ مبارک احمد محمود صاحب میں واقعی ایشوریا کا پرستار ہوں، نوی اے صاحب! آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! آپ پریشان نہ ہوں، میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ آپ چالیس سال کی عمر میں بچپن کی نظر آتی ہیں۔ بہرحال، آپ کا تبصرہ پسند آتا ہے۔ محسن آفریدی صاحب، آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر۔ اولین صفحات پر قانونی دھوکا تحریر اشرف بادی جو کہ آج کل کے معاشرے کے مکروہ چہروں کو آشکار کر رہی تھی، بہت پسند آئی۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ تابش توقع کے عین مطابق رستم سیال بنتا جا رہا ہے۔ تابش کو چاہیے کہ وہ اپنی حسینہ بیوی سلطانہ کو تلاش کرے اور اس سے اچھا سلوک کرے۔ جنگی کا کردار آگے بھی چلنا چاہیے۔ کہانی زبردست تھی۔ شگفتگی کے ملنے سے کہانی میں تھرل پیدا ہو گیا ہے۔ پہلا رنگ بازی گر تحریر تنویر ریاض، طاہر آج کل کے معاشرے کے ان لوگوں جیسا تھا جو دولت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کا منصوبہ ناکام رہا اور اشعر اور لیلیٰ محفوظ رہے۔ اس مرتبہ جو کہانی جاسوسی کی جان رہی وہ تھی مریم کے خان کی شہر آشوب۔ مصنف نے بڑے اچھے انداز میں مسئلہ کشمیر کو اجاگر کیا ہے۔ میرے خیال میں ہر شمارے میں ایک کہانی مسئلہ کشمیر اور فلسطین پر ہونی چاہیے۔ نواز گل کا کردار بہت اچھا لگا۔"

مبارک احمد محمود چھچھوٹ سے "خلاف توقع دسمبر کا جاسوسی 2 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر موجود حسینہ قابل ذکر نہیں تھی جبکہ ان سے بہتر ساتھ میں موجود صنف کرخت تھے جو بڑے حسد اور پیارے انداز سے سگریٹ نوشی فرما رہے تھے جبکہ نیچے موجود آدمی کی پریشانی کا سبب حسینہ کا ان کی طرف نہ دیکھنا تھا۔ اشتہارات کو دیکھتے ہوئے اپنی محفل میں پہنچے۔ مدیر اعلیٰ کی طرف سے امام حسینؓ کے لیے لکھے گئے الفاظ پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ وکٹری اسٹینڈ پر بابر عباس

نے جابرانہ قبضہ کیا ہوا تھا۔ آپ کے تبصرے میں کچھ خاص تو نہیں تھا، بہرحال مبارک باد قبول کیجیے۔ جناب سلسلہ وار تحریریں ہی تو جاسوسی کی پہچان ہیں۔ ایس ایس ناز صاحبہ! گستاخی معاف، آپ تو کسی ایجنسی کی سیکرٹ ایجنٹ معلوم ہوتی ہیں۔ نام کے ساتھ ساتھ تبصرہ بھی اس کی دلیل تھا۔ اقبال اینڈ صبا، کہیں آپ میں سے تو کسی کو دشمنی نہیں ہو گیا؟ آپ کا مزاح سے بھرپور تبصرہ اچھا لگتا ہے۔ آسیہ جی اللہ پر بھروسا کیجیے۔ ایسی بھی کیا مشکل جو جاسوسی سے بھی قطع تعلق؟ ہم اگلے ماہ آپ کی شرکت کے منتظر رہیں گے۔ سیم شبلی! اس طرح ڈوبنا بھی اچھا نہیں۔ ماہ تاب گل! آپ کا نام کچھ زیادہ مینڈک نہیں ہے؟ تصویر اچھی! ہماری طرف سے آپ کے ابو کے لیے نیک تمنائیں۔ اللہ انکل کو صحت عطا فرمائے، آمین۔ حسب سابق آغاز للکار سے کیا۔ جنگی اور شگفتگی کو جدا مت کیجیے گا۔ تابی اور سلطانہ کا آپس میں کوئی خاص جوڑ نہیں ہے۔ گرداب اس ماہ اچھی رہی۔ اسما جی اب شہریار اور ماہ بانو کو بھی اظہار محبت کا موقع دیں۔ قانونی دھوکا ایک متاثر کن تحریر تھی۔ ہماری مادہ پرست سوسائٹی کا ایک بہت ہی بُرا پہلو۔ ان سلگتے پہلوؤں پر اور بھی لکھنے کی ضرورت ہے۔ رنگوں میں شہر آشوب ایک سبق آموز تحریر تھی۔ مختصر کہانیوں میں وطن پرست میں نوکس کی حب الوطنی بہت اچھی لگی۔ پروانہ ذرا میں شمیں نے مہارت سے بازی جیت لی۔ دل کا معاملہ ایک دلچسپ اور سنسنی خیز تحریر تھی۔ تراش خراش میں دانش اظہار کی پسندیدگیاں ہمیں بھی پسند آئیں۔"

ایم عزیز اسعد کی آمد چکوال سے "جاسوسی پر نظر پڑتے ہی خوشی کی گرما گرم لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ تیکھی دھرنے والوں میں سب سے آگے بابر عباس زخمی ہونے کے باوجود فائٹنگ کر رہے تھے۔ پہلے آنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ محمد سلیم شبلی شکر کیجیے کہ اتنی سردی میں کسی جھیل میں ڈبکی لینے سے بچ گئے۔ آسیہ خان کو بیٹی کی طرح سمجھتے ہوئے انکل جی نے جس محبت سے حکم دیا ہے، اس کے پیش نظر آسیہ خان کو شرکت کرنا چاہیے۔ (بالکل صحیح کہا آپ نے) انکل جی کے مارکس نے تبصروں کا مزہ دوبالا کر دیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی للکار پڑھی۔ جنگی اور شگفتگی کا ملاپ بہت اچھا لگا۔ ثروت اور عمران کا ذکر پوشیدہ کیا ہوا ہے۔ کہانی ایک توازن کے ساتھ جاری ہے۔ شہر آشوب وادی کشمیر پر لکھی گئی پُراثر تحریر تھی۔ کبھی تو ان کی قربانیاں رنگ لائیں گی۔ کبھی تو خون میں لت پت وادی میں امن کے پھول کھلیں گے۔ قانونی دھوکا ایک منفرد کہانی تھی۔ روبی نے جن گندے لفظوں میں محبت کو بیان کیا ہے، اس سے تو میرا دل ہی چھلنی ہو گیا۔ میرے خیال میں اس کا کوئی عبرت ناک انجام ہونا چاہیے تھا۔ بھنور میں پھنسی ہوئی داستان گرداب اسما قادری کی تحریر اس ماہ بھی زبردست تھی۔ کاشف زبیر کی کمی واضح طور پر محسوس ہوئی۔"

ضلع جونیر سے ایم احمد ہاشمی کی ناراضی... شکوے شکایتیں "دسمبر 2010ء کا سرورق حسینہ کے ہیئر اسٹائل کی وجہ سے کافی خوشنما نظر آ رہا تھا۔ شمارہ مجموعی طور پر زبردست رہا۔ آمنہ بی بی! لڑکیوں کی عمر کا نہ بڑھنا میری سمجھ میں آتا ہے۔ فاقوں کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ مجھے مزید رسالے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے بس۔ کیا کسی کے پاس فالتو پیسے ہیں یا نام زیادہ ہوتا ہے جو اتنی مشکل سے وقت نکال کر آپ کے خوشنما، دیدہ زیب، دلفریب، خوش انجام، خوش ذوق، خوش آراستہ... لیکن پھر بھی میں کیوں آپ کے رسالے کے لیے اتنے اچھے الفاظ اور اپنا قیمتی وقت نکال کر خط لکھوں؟ (ہمارے لیے تمام قارئین قابل احترام ہیں) ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟ آخر دور دراز کے گاؤں اور دیہات و قصبات والوں سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟ (دوستی ہے... مجھے یاد نہیں کہ آپ کے خط نظر انداز ہوئے ہوں) ہم بھی تو اپنے سارے کام آگے پیچھے کر کے قیمتی محبت اور خلوص سے ہر ماہ اپنا قیمتی وقت نکال کر خط لکھتے ہیں اور پھر تین تین دن انتظار میں رہتے ہیں پھر جاسوسی کے صفحات پر اپنا خط دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔ مگر وہ خط کیا وہ تو آدھا آپ کی لاڈلی قینچی حذف کر چکی ہے۔ خط کے الفاظ بھی آگے پیچھے ہو جاتے ہیں۔ (کانٹ چھانٹ ضروری ہوتی ہے... لیکن ایسا نہیں کہ آپ کا خط ہو اور الفاظ کسی اور کے...) پھر دیکھنے والے کا دل بھی نہیں کرتا پڑھنے کو کہ فلاں قاری نے یہ کیا لکھا ہے۔ مبارک احمد صاحب کا جواب میں نے پڑھا ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ کچھ نہیں ہم بہت سے الفاظ حذف کر دیتے ہیں تاکہ زیادہ قارئین کے خطوط شائع ہو سکیں۔ بے شک زیادہ سے زیادہ قارئین کے خطوط شائع ہونے چاہئیں مگر اشتہارات ذرا کم کر کے تیکھی نکتہ چینی کے صفحات میں اضافہ کیجیے۔ بھئی آپ خود سوچیں کہ اگر شہر والے آپ کا پرچہ 50 روپے میں خریدتے ہیں تو ہم بھی اتنے کا ہی خریدتے ہیں۔ جو محبت شہر والوں کے دلوں میں ہوتی ہے اتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہمارے دل میں بھی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ بدستور اس پر قائم رہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں گاؤں اور دیہاتیوں کے لیے کوئی عزت و وقار نہیں اور ہم خط لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ آگے آپ کی مرضی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ انداز گفتار میرا خط ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا اور اس کا مجھے افسوس ضرور ہوگا۔" (آپ کا خط بغیر کسی کتر بیونت کے شائع کر دیا ہے... اب گاؤں والے یقیناً خوش ہوں گے لیکن اشتہارات بھی اہم کا ذریعہ ہیں... رسالہ چلانے کے لیے یہ باتیں اس خط میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ضروری ہیں۔ کسی کہانی پر تبصرہ تنقید تعریف تھی؟)

محمد سرفراز کی رائے گلگشت ملتان سے "حسب توقع جاسوسی کا شمارہ 4 دسمبر کو ملا۔ سرورق میں ایک آدمی کو سگریٹ ہاتھ میں، بائے کسی گہری سوچ میں غرق پایا۔ ظالم حسینہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر کچھ شرما سے گئے اور محفل دوستاں میں جا پہنچے۔ بابر عباس کو کرسی صدارت پر پا کر خوشی ہوئی۔ مبارک ہو جناب! بابر عباس صاحب جس باریک بینی سے آپ نے سرورق کا مشاہدہ کیا ہے، ظاہر ہوتا ہے دو دن سرورق ہی دیکھتے رہے۔ آسیہ خان صاحبہ! آپ کہاں چل دیں؟ محفل سے کنارہ کشی، غلط بات۔ اعجاز احمد صاحب اتنی تنہائی صحت کے لیے مفید نہیں۔ تصویر احسن صاحب! اب آپ کے ابو کی صحت کیسی ہے؟ اللہ ان کو جلد صحت عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی محبوب کہانی للکار پڑھی۔ سلطانہ کی ہمت اور خاوند کی فرماں برداری پر داد۔ کہانی کا اختتام بارود جنگی اور شگفتگی کے نامکمل ملن پر ہوا۔ اگلی قسط کا بڑی شدت سے انتظار رہے گا۔ مریم کے خان کی شہر آشوب کافی اچھی کہانی تھی۔ نواز کا ریچہ سے کیا گیا وعدہ کشمیر کی آزادی کے لیے کام، کافی متاثر کن تھا۔ شوبز کی دنیا سے تعلق رکھنے والی کہانی بازی گر حسب معمول کافی بور گزری۔ کہانی کا اختتام طاہر کے دھوکے پر ہوا۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

محمد نعمان پیارے کی ملہہ سے پیاری باتیں "4 دسمبر کو جاسوسی کا رخ مہتاب نظر آ گیا۔ سرورق پر حسینہ سنہری زلفوں اور آنکھوں میں انگارے دہکائے، تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ حسینہ نمبر ون بننے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ٹائٹل گرل کے اوپر ایک عدد شخص گاڑی جل جانے کے غم کو غلط کرنے کے لیے سگریٹ پی رہا تھا۔ جناب! اگر آپ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی گاڑی پر نہ پھینکتے تو یہ حال نہ ہوتا۔ حسینہ کے نیچے والا آدمی ہماری جانب اتنے غصے سے ایسے دیکھ رہا تھا کہ جیسے پاکستان کو آئی ایم ایف سے قرضہ لینے کا مشورہ ہم نے ہی دیا تھا۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں سے بھاگا اور بابر عباس کے

پاس پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔ بابر جی! ویلکم اینڈ مبارک باد۔ شاہد سلیم صاحب! آپ تیرہ سال سے جاسوسی کے قاری ہیں، لکھنے کا خیال اب آیا؟ لگتا ہے آپ بھی ہماری طرح سست واقع ہوئے ہیں۔ سلیم شبلی صاحب! آپ کو صنفِ نازک سے پنگا لینے کا مشورہ کس ہستی نے دیا تھا۔ اعجاز احمد! آپ کا تبصرہ پہلے نمبر پر ہونا چاہیے تھا۔ نومی اے! آپ کو کون سی مصروفیات آن پڑی ہیں؟ سرفراز صاحب! آپ نے اچھا ہی کیا جو قلم اٹھا لیا، ویسے بھی جاسوسی چیز ہی ایسی ہے جو اچھے اچھوں کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دے۔ آمنہ پٹھانی! آپ نے تو دل کھول کر بھڑاس نکالی ہے، توبہ اتنا غصہ۔ اگر گھر میں لڑائی کرنے کے بعد خط لکھیں گی تو ایسا ہی لکھا جائے گا۔ ویسے صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا، جوش میں ہوش نہیں کھونا چاہیے۔ تصویر! آمین! آپ کے ابو کی طبیعت اب کیسی ہے؟ کہانیوں میں سب سے پہلے عکس قاطر کی حسرت ناتمام پر نظر ڈالی گئی۔ حسرت ناتمام اوسط درجے کی کہانی تھی۔ اس کا اختتام پیچیدہ تھا۔ خیر ایڈی جیسے لالچی شخص کو کیسے کی سزا مل گئی۔ للکار میں رنجیت پانڈے تابی کے پیچھے ہاتھ منہ دھو کر پڑا ہوا ہے مگر تابش بھی اب مرداں مدد خدا کا راگ الاپ رہا ہے اور چٹان بن کر دشمنوں سے نمٹ رہا ہے۔ وطن پرست ایک الجھی ہوئی مگر اچھی اور جاندار تحریر تھی۔ وطن پرست مکمل طور پر نوکس کی ذات اور وطن پرستی کے گرد گھومتی ہوئی نظر آئی۔ شہر عباس کی تیسرا آدمی ایک بہترین کہانی تھی۔ آخر کار ایوان نے لورنا کا پیار پا ہی لیا۔ بابر تمیم کی گواہی بھی بہت پسند آئی۔"

نومی اے کی پسندیدگی مسلم ٹاؤن سے "3 دسمبر کی سرد اور اداس شام میں جاسوسی کی آمد سے حسبِ معمول اداسی چھٹ گئی۔ سرورق پر ٹائٹل گرل کے ہیئر اسٹائل کے سوا کچھ قابلِ غور طلب نہیں تھا۔ پہلا خط جانے کس بنا پر اول نمبر پر آیا۔ خیر، لگے ہاتھوں مبارک ہو بابر عباس۔ حضور بخش کوں پر کیا مردانہ و زنانہ نام ہے۔ اقبال اینڈ صبا مرزا دل کے تار ٹوٹے ہیں تو کیسے کوئی چھیڑ سکتا ہے؟ مزمل اسلم غور سے پڑھئے آمنہ پٹھانی نے وجہ بتائی تھی غیر حاضری کی۔ اعجاز احمد صبا مرزا نے تو بڑی بات کی تھی، آپ کو سمجھ نہیں آئے گی۔ تصویر! آمین آپ کے والد کے لیے دلی دعا اور آپ کے نام کی طرح مطلب بھی خوب صورت ہے۔ تمام خطوط پر تبصرہ لکھتے لکھتے تھک گئے۔ للکار میں تابی کا مردانہ وار نہ پانی سے مدد آتا، سلطانہ کا غائب ہونا، شفقت کا ملنا اور عشق کی لازوال داستان کو دہراتی تحریر پر ہی سنسنی خیز حالات نے آخر تک جکڑے رکھا۔ گرداب کے اختتام میں سسپنس کے سوا باقی کہانی میں کوئی تیزی نہیں تھی۔ دولت، ہوس اور مفاد پرستی پر مبنی تحریر قانونی دھوکا نے ابتدائی صفحات کا حق ادا نہیں کیا۔ شوبز پر لکھی گئی تحریر بازی گر کافی طویل اور بور تھی۔ حقیقتِ حال کو اجاگر کرتی شہر آشوب کافی دلچسپ اور متاثر کن تھی۔ سائنسی تحقیق پر لکھی گئی دل کا معاملہ اچھی اسٹوری تھی۔ میری ذاتی رائے، جذبات دماغ کے تابع ہوتے ہیں، دل کا کام جسم کی ضرورت پوری کرتا ہے، جذبات سے کام لینا نہیں۔ آخر میں تمام دوستوں اور ادارے کو نیا سال مبارک۔" (آپ کو بھی...)

قمر حق کھوکھر راولپنڈی سے لکھتے ہیں "ماہِ دسمبر کا جاسوسی 2 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ بالکل بھی متاثر نہ کر سکی۔ (کیوں؟) اور ایک خوبرو جوان کسی کا غم غلط کرنے کے لیے سگریٹ کا سہارا لے رہا تھا جبکہ پیچھے لنگور نما آدمی کو ناک سے بہتے خون کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ٹائٹل پر حسیناؤں کو دیکھ کر دل بھر گیا ہے اس لیے انکل سے گزارش ہے کہ اگلے سال ٹائٹل منفرد ہونا چاہیے۔ آخر کسی خوب صورت نوجوان کی تصویر بھی تو ہونی چاہیے۔ (آپ اپنی بھجوا دیں) فہرست میں پہنچے تو کاشف زبیر کو حاضر پایا۔ دل بہت اداس ہوا... محفل میں شامل ہوئے لیکن یہاں بھی ایک اور جھٹکا لگا۔ کرسی صدارت کا حقدار ... انکل نے ... بابر عباس صاحب کرسی صدارت پر فائز تھے ... جان دار تبصرہ لکھ کر ... جنہوں نے اپنا تبصرہ پڑھا ہے۔ ... نازو صاحب! غلط انداز سے مت لگائیے ابھی تو میں سترہ سال کا ہوں اور شادی تو دور کی بات، ابھی اس کا ذکر کر کے بھی مت تھکیے اور اگر میں بیوی سے ڈرتا بھی ہوتا تو کیا صنفِ نازک کے خلاف لکھتا۔ مرزا سسٹرز! آپ نے مجھے عجیب و غریب کیا کیوں؟ کیا میرے سر پر آپ دونوں کی طرح سینگ نکل آئے ہیں یا پھر آپ پچھلے شمارے میں اپنے بارے میں پڑھ کر آگ بگولہ ہو گئی ہیں۔ آسیہ خان صاحبہ! آپ اچانک کہاں چل دیں؟ ویسے آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ اگر آپ دوستوں سے شیئر کریں گی تو ہو سکتا ہے کہ ہم سب مل کر اس کا حل تلاش کر لیں۔ مانا کہ مجھے صنفِ نازک سے چڑ ہے لیکن اصل میں میرا دل بہت نرم ہے اور نوک جھونک تو خط کا حصہ ہوتی ہے اس لیے اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ محمد سلیم شبلی صاحب! آپ نے تو نظر لگا دی بھائی۔ شاید انکل نے بھی بات نوٹ کر لی تھی اور باقی رہی مٹھائی تو آ جاؤ راولپنڈی، آپ جتنی کہیں گے اتنی مٹھائی کھلا دیں گے لیکن بغیر چینی والی... کیسے؟ محسن آفریدی صاحب! آپ کو کیسے پتا کہ میرا ستارہ عروج پر ہے۔ شاید آپ پامسٹ ہیں اس لیے میرا پورا زائچہ بنا کر بھیج دیں۔ ماہ تاب صاحب! اگر اپنا دماغ خالی ہو تو بندہ کسی دوسرے سے مشورہ کر لیتا ہے۔ ویسے اگر تابی کو قتل طاہر صاحب نے کسی سے پٹوا دیا تو تم ... لیکن یہ طریقہ بھی نہ آزما لینا، گھر والے مشکل میں پڑ جائیں گے۔ تمام دوستوں کو نئے سال کی مبارک باد۔ ایم احمد ہاشمی صاحب! شاید آپ پنجابی فلمیں زیادہ دیکھتے ہیں، انہیں کم کیجیے اور 5 نمبر کا چشمہ لگا کر دیکھیں کہ اس شادی شدہ کو الٹا حسینہ کہا، کس کی ضعیف النظری ہے۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے قانونی دھوکا پڑھی۔ کہانی کا آغاز اور کلائمکس اچھا تھا لیکن انجام بہت جلدی کر دیا گیا۔ کہانی کو سمیٹنے کے لیے قربان بیگ کے کردار کو جلدی تبدیل کر دیا گیا۔ حسرت ناتمام بھی اچھی کہانی تھی۔ ایڈی نے بہت جلدی کی جس کی وجہ سے وہ ناکام ہو گیا۔ وطن پرست ایک زبردست کہانی تھی جس میں نوکس اگر چاہتا تو پہلے ہی اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا تھا لیکن اس کی موت نے بھی ایک بہت بڑا سبق دیا۔ گواہی میں مجرم نے خود ہی اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا۔ اس کے بعد پہنچے پسندیدہ کہانی للکار میں جہاں تابی جنگی کی مدد سے لڑ رہا ہے۔ وہیں اس چپ کا بھی خاتمہ ہوا لیکن یہ اندازہ ہے کب تک کہ کوئی بتانا مشکل ہے۔ پرواز زر اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ پڑھ کر خواہش ہوئی کہ شاید شین پاکستان میں آ جائے اور میں بھی اس سے سب کچھ سیکھ لوں۔ (اور پھر غلط کاموں میں پھنس جاؤں) تیسرا آدمی میں مجھے پہلے ہی میک بین پر شک تھا اور آخر میں وہی نکلا۔ گرداب میں اب صاحب گرد بھی شہریار کے شکنجے میں آ گیا ہے۔ مشارم خان کے حالات کو بھی بتایا جائے۔ دل کا معاملہ واقعی اگر انسان کا دل جذبات سے عاری ہو تو وہ انسان نہیں صرف نام کا انسان رہ جاتا ہے۔ چھوٹی سی بات ایک اچھی کہانی تھی۔ کایا پلٹ میں ایلس نے ہوشیاری کا ثبوت دیا اور چاروں مجرمان کو پکڑ لیا۔ بازی گر میں موضوع وہی پرانا تھا لیکن کہانی پڑھ کر مزہ آیا۔ طاہر کا دھوکا دینا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ شوبز کی دنیا جتنی دلکش اور حسین ہے وہیں لالچ، حرص اور خود غرضی بھی بہت ہے۔ سرورق کا دوسرا رنگ شہر آشوب بہترین کہانی تھی۔"

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار کی رائے "ٹائٹل گرل پسند آئی۔ چمکتی ہوئی گاڑی بھی جاسوسی کی شان کے عین مطابق تھی تاہم اس کے علاوہ ٹائٹل پر اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فہرست کا ڈیزائن بھی پسند آیا۔ بابر عباس، ویلکم بیک۔ احمد علی، معراج رسول کا شکریہ ادا کریں کہ اس مہنگائی کے دور میں اتنی سستی اور معیاری تفریح مہیا کر رہے ہیں۔ حضور بخش، وہ جو وزن سے کائنات میں جنگ بھی تو ہے۔ ایس ایس ناز! ڈرتا ہے ہی ہر شریف آدمی... بیوی سے ڈرتا ہے، اب آپ شادی شدہ مت کہیے گا۔ اقبال مرزا اور صبا مرزا دونوں کو اکثر لوگ صنفِ نازک خیال کرتے ہیں جبکہ ہمارے خیال میں تو دونوں بہن بھائی ہیں۔ آہستہ پلیز کنٹرول یور جذبات اور مدیر اعلیٰ کے حکم کی پیروی کریں۔ محسن آفریدی، دلنشین بلوچ خود کہتی ہیں کہ ان کے ہاتھ حسین ہیں۔ آپ نے انہیں بے وقوف کہہ دیا۔ بہت بری بات ہے۔ ان کی تو نظر کمزور ہے۔ مزمل اسلم، آمنہ پٹھانی نے غیر حاضری کی وجہ بھی بتا دی تھی۔ خود تبصرہ پڑھا ہوتا۔ انور ہادی نے انتہائی بے باک تحریر لکھی۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس تحریر میں موجود بے باکی پسند نہ آئی ہو تاہم ہمارے خیال میں رائٹرز کو معاشرے میں پھیلے ہوئے ہر قسم کے کردار کو احاطۂ تحریر میں لانا چاہیے۔ بہرحال، مجموعی طور پر تحریر اچھی لگی۔ گرداب میں کشور اور ماہ بانو ایک نئے گرداب میں پھنسنے والی ہیں۔ راحیلہ اور عارف ہمارے خیال میں لڑکیاں گھیرنے کا کام کرتے ہیں۔ للکار، انتہا یا بور کرنے لگا ہے پلیز کوئی ٹیمپو لائیں۔ سرورق کے دونوں رنگ درمیانے درجے کے رہے۔ پہلے رنگ کا پلاٹ بہت پرانا تھا۔ دوسرا رنگ بھی پرانے پلاٹ پر مبنی تھا۔ (سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے، ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں۔ اور ہاں مجھے شہزادہ صاحب) واقعات کو ایک نئے اور دلچسپ رنگ میں پیش کرنے کی وجہ سے ہم اس تحریر کو بھی پاسنگ مارکس دینے میں کامیاب ہو گئے۔ ہو سکتا ہے آپ کو ہماری اس بات سے اختلاف ہو مگر ہمارے خیال میں کشمیر کے موضوع پر اس انداز میں تحریریں نہیں شائع ہونی چاہئیں کیونکہ اس طرح کی تحریروں سے دلوں میں جو نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ پاکستان و بھارت دونوں کے لیے نقصان دہ ہے اور فائدہ انہی کو ہے جنہوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا۔ (کہانیوں میں واقعات کی حقیقی تصویر پیش کرنے کی کوشش اس لیے کی جاتی ہے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے آگاہی... اور کچھ نہیں) حسرت ناتمام بالکل پسند نہیں آئی۔ وطن پرست متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ گواہی بھی بورنگ لگی۔ پرواز زر البتہ سسپنس و چالاکیوں سے بھرپور ہونے کی وجہ سے دل کو چھو گئی۔ تیسرا آدمی میں کافی سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاہم اینڈ میں سب اندازے کے مطابق ہی ہوا۔ ذہن گزیدہ کی دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ سائنس فکشن پر مبنی تحریر وبالِ جان مختصر تحریروں میں پہلے نمبر پر رہی۔ ویسے تو اینڈ حسبِ توقع رہا البتہ ڈاکٹر کے بارے میں انکشافات حیران کر گئے۔ کہ تحریریں دلچسپ لگیں۔ مجموعی طور پر آپ کا بھیجا گیا تحفہ بہت پسند آیا۔"

سعید عباسی، بہاولپور سے اعتراف کرتے ہیں "میری آپ سے پہلی ملاقات 1993ء میں اس وقت ہوئی جب میں ٹرین میں لاہور جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں جو رسالہ وقت گزاری کے لیے خرید رہا ہوں، میرا اتنا گہرا دوست بن جائے گا کہ میں اس کا گرویدہ بن جاؤں گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ آپ کتنے عرصے سے جاسوسی پڑھ رہا ہے تو کبھی کوئی خط کیوں نہیں لکھا۔ میں نے کلاس 5 میں اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا اس لیے جاسوسی کی تحریروں کو بڑی مشکل سے پورا ماہ گزارتا تھا۔ کم تعلیم کی وجہ سے ایک کہانی کو پڑھنے میں ہمارا کم سے کم وقت 6 سے 7 دن ضرور لگ جاتا تھا اس لیے بھی ہمت ہی نہیں ہوئی... بہت خوشی ہوئی ہے لیکن اس بار دل نے کہا کہ کیوں بھائی آخر کب تک چھپے گا۔ اٹھو ... جاسوسی کے قاری ہو... ہمت کر کے پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس ماہ کے ٹائٹل کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے جناب سگریٹ پینے والے پر نظر ڈالی۔ صاحب ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی کی تاک میں ہوں۔ اس سے ذرا نیچے آئے تو پتا چلا کہ نہایت ہی خوب صورت اور میک اپ سے بھرپور لڑکی ہمیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہلے ہم کہیں مل چکے ہوں۔ اس سے ذرا نیچے آئے تو پتا چلا کہ جناب ہمیں ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے انہیں ہم نے مارا ہو۔ بھائی ہم نے تو آج تک مکھی نہیں ماری، آپ کو کیسے مار سکتے ہیں۔ اندر گئے تو سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس بار کی قسط محبت اور پیار سے بھرپور تھی۔ جنگی کو اس کی محبوبہ مل گئی اور دوسری کہانی وطن پرست جو عامر آزاد کے قلم سے لکھی ہوئی بہت اچھی رہی۔ باقی ابھی ہم پڑھ رہے ہیں۔"

محسن آفریدی کی تعریف بالاکوٹ سے "ماہِ دسمبر کا شمارہ خلافِ توقع اور خلافِ معمول 2 تاریخ کو ملا۔ بزمِ یاراں میں کرسی صدارت پر بابر عباس کو براجمان پایا، مبارک ہو جی مبارکاں۔ بابر صاحب میں سب ڈاکٹروں کے نہیں کچھ ڈاکٹروں کے خلاف ہوں جو اس مقدس پیشے کو بدنام کر رہے ہیں۔ حضور بخش کون، اللہ نوازی ہے آپ کی ورنہ بندہ کس قابل۔ ایس ایس ناز، دلنشین کے نام پر مت جائیں۔ اقبال مرزا اینڈ صبا مرزا!! آپ کو قمر حق کے نام میں کیا عجیب و غریب بات لگی؟ (آپ کو کیا تکلیف ہے انہیں بری لگی، لگی بس) آسیہ خان! آپ نے ساری محفل کو دکھی کر دیا۔ زندگی میں دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مجھی گناہ ہے سو کم بیک۔ ماہ تاب گل جی! اس میں ہمایوں سعید کا کوئی قصور نہیں۔ بعض خواتین دیکھنے میں حضرات نظر آتی ہیں۔ آمنہ پٹھانی ابھی عمر ینگ سے بہت دور ہے۔ اور ہاں، آپ سب کو بے ایمان کیوں کہتی ہو؟ (سب بتا دیں) کہانیوں میں سب سے پہلے قانونی دھوکا پڑھی۔ درمیانے درجے کی کہانی تھی۔ قربان بیگ کا کردار کچھ ہضم نہیں ہوا۔ حسرت ناتمام میں ایڈی کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اس کی آخری چال بھی الٹ گئی۔ وطن پرست میں نوکس کا کردار بہت پسند آیا۔ گواہی کچھ خاص نہیں لگی۔ آخر کار ہم پہنچے للکار پر۔ تابی آخر کار ہیرو بن ہی گیا لیکن عمران کے بغیر مزہ نہیں ہے۔ جنگی کو آخر اس کی محبت مل ہی گئی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ باقی کہانیوں میں گرداب پڑھی۔ لگتا ہے کہ ماہ بانو پھر گرداب میں پھنسنے والی ہے۔ آگے آپ دیکھتے ہیں کہ ہوتا ہے کیا۔ اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی مریم کے خان کی شہر آشوب تھی جس نے آخر تک ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ہم کردار کے ساتھ خود کو محسوس کرتے رہے۔"

ان قارئین کے نام جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

عادل، لاہور۔ ایلزا مسعود اینڈ راحیلہ دیا، آزاد کشمیر۔ احمد علی کیف، مجتبیٰ آباد۔ سون لائٹ صدیقی، پشاور۔ شاہین تبسم، کراچی۔ عمران احمد، حیدرآباد۔ کاشف نون، کوئٹہ۔ عمار نقوی، فیصل آباد۔ عثمان غازی، سکھر۔ ثنا شاہ علی، لاہور۔ اختر حسین، گوجرانوالہ۔ وسیم احمد، ملتان۔

★

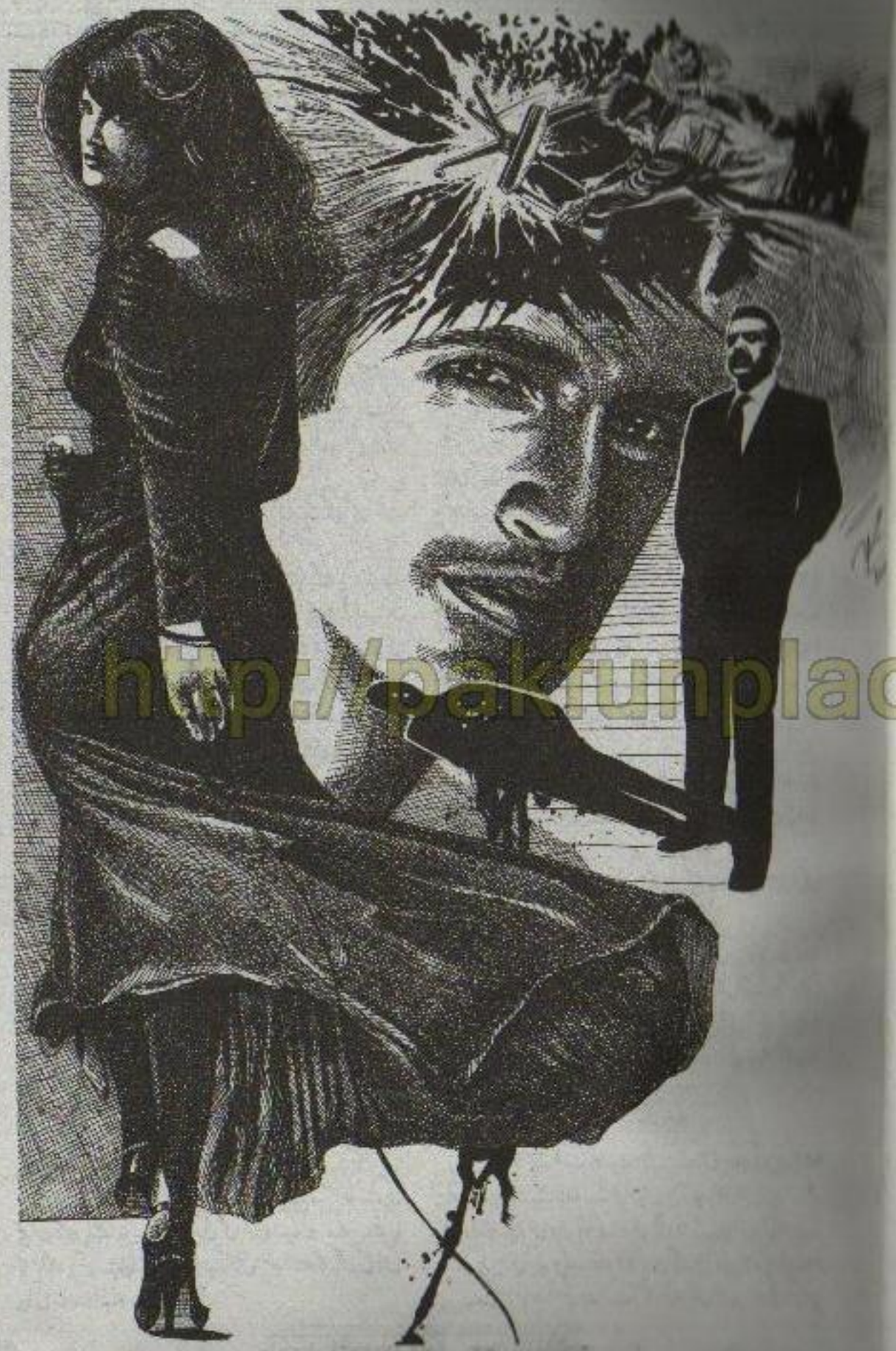

سراغرساں اور مجرموں کے مابین کھیلی جانے والی سنسنی خیز و دلچسپ آنکھ مچولی

خوابِ زر

عبدالرب بھٹی

خواہشات... تمنائیں... سمندر کے مانند وسیع تر ہوتی ہیں خواہشات کا لامتناہی سلسلۂ دراز... بغیر کسی سنگِ میل کے جاری و ساری رہتا ہے... جرم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے چند ایسے ہی کرداروں کا ملاپ... آتھن سو بے کی چوری کا منصوبہ ان کی زندگی کا مطمحِ خاص تھا... امریکہ اور انگلینڈ کے قرب و جوار میں سفر کرتے سنسنی خیز ناول کا تلخیص و ترجمہ...

سنہرے خوابوں کا تاج محل جو تعبیر سے ہمکنار ہونا چاہتا تھا

مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن شاید اس کا فیصلہ یہ خط ہی کر سکتا تھا جسے ایک بار پڑھنے کے بعد میں نے میز پر رکھ دیا تھا۔

یہ خط ایف بی آئی کے ڈائریکٹر نے میرے نام لکھا تھا جانے کیا سوچ کر میں دوبارہ وہ خط اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"اسپیشل ایجنٹ کاشون کو ہدایت کی جاتی ہے کہ فوراً سے پیشتر نیویارک پہنچے اور "جی" برانچ کے فیڈرل ایجنٹ ڈواکن سے ہدایات حاصل کرے۔"

میں نے ڈواکن کا نام تو سنا تھا لیکن کبھی اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تاہم خط میں اس کی شناخت کے بارے میں اتنا کچھ درج تھا جس سے میں اسے بہ آسانی پہچان لیتا۔ اس کا دایاں ہاتھ چھوٹی انگلی سے محروم تھا، چند ایک اور نشانیاں بھی اسے پہچاننے کے لیے کافی تھیں جبکہ ڈواکن کو اپنی شناخت کروانے کے لیے مجھے اپنی بائیں کلائی پر موجود زخم کا نشان نمایاں رکھنا تھا۔ نیویارک پہنچنے کے بعد مجھے خود کو ہیری رائس ظاہر کرنا تھا۔ خط کے ساتھ شناختی کاغذات بھی تھے جس کے مطابق ہیری رائس، لیتھی میں، میسن سٹی میں مقیم تھا اور سفری بونڈ فروخت کرتا تھا۔

بہرحال خط پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اہم نوعیت کا ہے۔ ڈواکن کا شمار باصلاحیت لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ کئی بڑے معرکے اور کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ اگرچہ اس سلسلے میں کم شہرت تو میں بھی نہیں رکھتا تھا لیکن ڈواکن کے کریڈٹ پر چند اہم ترین نوعیت کے کارنامے زیادہ تھے۔

ڈواکن کو ہیڈ آفس کی طرف سے کسی خاص مہم کے لیے شکاگو سے نیویارک بھیجا گیا تھا اور اب مجھے تاکید کی گئی تھی کہ میں اس سے جا کر ملوں۔

ایک ہی مہم کے لیے ہم دو افراد کا مقرر کیا جانا ظاہر کرتا تھا کہ معاملہ گمبھیر تھا، بالخصوص ڈواکن جیسے ذہین و فطین شخص کے ساتھ مجھے بھی نتھی کرنا، مہم کو سنگین ظاہر کرتا تھا۔

میں بذریعہ ٹرین نیویارک پہنچا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ ہوٹل کورٹ کے رجسٹر میں، میں نے ہیری رائس نام کے ساتھ اپنا پیشہ سفری بانڈ فروخت کرنا درج کروایا تھا۔ دورانِ گفتگو کلرک پر میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں نیویارک پہلی بار آیا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہاں کوئی بھی دور پرے میرا شناسا مجھ سے نہیں ٹکرائے گا۔

میں ڈواکن سے ملنے ہوٹل وائٹ فرانٹ پہنچا تو وہاں لوگوں کا خاصا ہجوم نظر آیا۔ ہال کمرے میں ایک جانب بار بنا ہوا تھا، میں

http://pakurduplace.blogspot.com

نے کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے بیئر طلب کی اور اس سے گفتگو شروع کردی۔ بیئر ختم ہونے تک میں نیویارک کے بارے میں بہت کچھ کہہ اور سن چکا تھا۔ ابھی میں بیئر کا مزید آرڈر دینے ہی والا تھا کہ اچانک ایک شخص ہال کمرے میں داخل ہوا۔ میری نگاہ اس پر جم کر رہ گئی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا، مجھے یقین تھا کہ وہی ہاتھ چھوٹی انگلی سے محروم ہوگا۔

"ھم۔۔۔! گویا یہی ڈواکن یعنی میلانڈر ہے۔" میں نے دل میں کہا اور پھر اپنی کلائی کاؤنٹر پر اس طرح رکھ دی کہ زخم کا نشان بہ آسانی نظر آسکے۔

میلانڈر فوراً ہی میری طرف بڑھا اور قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ یقیناً اس نے میری کلائی کا زخم دیکھ لیا تھا۔ پھر اس کی سرسراتی ہوئی سرگوشیانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "تم ہیری رائس ہو اور میسن سٹی میں رہائش پذیر ہو؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میری آواز بھی کچی تھی جس میں تھوڑا حیرانی کا تاثر بھی تھا۔

"تم شاید بھول رہے ہو۔" اس نے جواباً مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "کئی روز پہلے میسن سٹی کے قریب میری کار خراب ہو گئی تھی، خوش قسمتی سے تم وہاں پہنچ گئے اور تم نے نہ صرف میری مدد کی بلکہ ایک رات مجھے اپنے گھر میں بہ طور مہمان بھی رکھا۔"

مجھے اپنی یادداشت کھنگالنا پڑی اور سارا واقعہ یاد آگیا۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

ہم دونوں ایک خالی میز پر جا بیٹھے۔

موقع غنیمت جان کر میں نے اس سے مہم کے بارے میں دریافت کیا جس کی وجہ سے مجھے اس سے ملنے کے لیے یہاں آنا پڑا تھا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ معاملے کی اصل نوعیت سے وہ خود بھی آگاہ نہیں۔

"ہاں، البتہ محکمے کو ایک اڑتی اڑتی سی خبر ضرور ملی تھی کہ کوئی نامعلوم شخص یا گروہ اس جہاز کو لوٹنا چاہتا ہے جس میں اگلے ہفتے امریکا سے سونا لاد کر انگلینڈ بھیجا جا رہا ہے۔" اس نے سگار سلگاتے ہوئے تفصیل بتانا شروع کی۔

"سونے کی مالیت دو کروڑ پونڈ ہے اور اس کا وزن آٹھ ٹن ہے۔ سونا کس طرح جہاز سے غائب کیا جائے گا اس کا علم کسی کو بھی نہیں ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر مزید بولا۔ "معاملے کی چھان بین پہلے میرے سپرد ہوئی تھی لیکن اب میرے ذمے نیا کام لگا دیا گیا ہے لہٰذا یہ معاملہ اب تمہیں سنبھالنا ہوگا۔ کل صبح میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"نامعلوم شخص یا گروہ کو یہ کیسے پتا چلا کہ اگلے ہفتے امریکا سے سرکاری طور پر آٹھ ٹن سونا بھیجا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا سوال ہے۔" میلانڈر نے گردن ہلائی۔ "گزشتہ دنوں ایک زخمی شخص پولیس کو سڑک پر پڑا ملا۔ اسے اسپتال لایا گیا تو وہ بے ہوشی کے عالم میں سونے کی ترسیل، مقدار اور امریکا کے محکمۂ خزانہ کے وہ احکام جن کے تحت سونا انگلینڈ بھیجا جائے گا، کے بارے میں بڑبڑا رہا تھا۔ اتفاقاً ہمارا ایک نمائندہ کارسن اس وقت اسپتال میں موجود تھا۔ اس نے یہ ساری بڑبڑاہٹ شارٹ ہینڈ میں لکھ کر ہیڈ آفس بھیج دی۔ اس نے زخمی شخص سے سونا لوٹے جانے کے بارے میں مزید تفصیل معلوم کرنا چاہی لیکن مزید کچھ بتائے بغیر ہی جان سے ہار گیا۔"

ڈواکن نے دوسرا سگار سلگایا اور کہا۔ "کارسن کی رپورٹ ملتے ہی ہیڈ آفس نے یہ معاملہ میرے سپرد کر دیا۔ میں نے یہاں آتے ہی اپنے چند خاص افراد کو ان پانچ افراد کی نگرانی پر مامور کر دیا جو جرائم کی مقامی دنیا میں زبردست مانے جاتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ کوئی بات دریافت ہوتی، میرا ایک آدمی بروکلین میں مردہ پایا گیا۔ اسے کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ دوسرا شخص ایسٹ لیک کے قریب بے ہوش پڑا ملا، تیسرے شخص کو رات کی تاریکی میں چند آدمیوں نے اتنا مارا پیٹا کہ وہ ابھی تک اسپتال میں پڑا ہے۔"

میلانڈر نے تفصیل بتا کر پوچھا۔ "اس سے تم کیا اندازہ لگاتے ہو؟"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چند افراد ہال میں داخل ہوئے اور قریبی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ میلانڈر نے طویل سانس لی اور سرگوشی میں بولا۔

"آج شب ایک بجے میڈرڈ کلب پہنچ جانا، میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ معاملہ واقعی ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے انجام دیا جا سکتا۔ اچانک یہ سوچ کر مجھے ہنسی آگئی کہ میرا دوست بل کی ادائیگی کیے بغیر ہی چلا گیا ہے اور اب یہ رقم مجھے ادا کرنی تھی۔

☆☆☆

میڈرڈ نائٹ کلب، کورٹ ہوٹل سے دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ میں ساڑھے بارہ بجے ہی وہاں جا پہنچا۔ کاؤنٹر پر جا کر بیئر کا آرڈر دینے ہی والا تھا کہ میری نگاہ دائیں جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، یہ ہینگ تھا، شکاگو ایوننگ گزٹ کا رپورٹر۔ وہ میرے صحیح نام اور اصلیت سے آگاہ تھا، میں اس سے کئی مرتبہ

میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جبکہ جیکٹ والے شخص کا نام روڈی تھا۔ اس کا تعلق زیرِ زمین دنیا سے تھا۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ میلانڈر اب تک وہاں کیوں نہیں پہنچا۔۔۔ میں نے اسے کلب کے ہر حصے میں دیکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے ہینگ سے معذرت چاہی اور کاؤنٹر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے مگر ان میں میلانڈر نہیں تھا۔ میں ہال سے نکل کر کلب کے سبزہ زار میں آگیا لیکن وہ یہاں بھی موجود نہ تھا۔ میں دوبارہ ہال میں چلا گیا۔ بار روم کے ساتھ ہی ایک گیلری نما راستہ اندر کی طرف جا رہا تھا میں بغیر کسی مقصد کے اس گیلری میں داخل ہو گیا۔ گیلری زیادہ کشادہ نہیں تھی اور اس میں لکڑی کے تین باکس بنے ہوئے تھے اور تینوں میں ٹیلی فون لگے ہوئے تھے۔ فون دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ وائٹ فرنٹ ہوٹل کے منیجر کو فون کر کے میلانڈر کے بارے میں دریافت کروں، ممکن ہے وہ وہاں سے چلا ہی نہ ہو۔

میں آخری باکس کے قریب جا کر رک گیا لیکن باکس میں گھستے ہی جو منظر دیکھا وہ میرے لیے سراسر غیر متوقع تھا میلانڈر دیوار سے ٹیک لگائے ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا، مگر یوں کہ۔۔۔ اس کا سر نیچے کی جانب ڈھلکا ہوا اور کپڑے خون میں تر تھے۔ میلانڈر کی لاش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو میلانڈر کی اصل شخصیت سے واقف ہو گئے تھے اور انہوں نے فوری طور پر میلانڈر کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔۔۔ ظاہر ہے وہ مجھے بھی نہیں بخشتے۔

میلانڈر۔۔۔ کی اچانک موت پر میں خود کو اندھیرے میں بھٹکتا محسوس کر رہا تھا۔ میں فوراً وہاں سے کھسک لیا اور ہال میں آگیا۔ خلافِ توقع کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں تھا، میں ایک خالی نشست پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً میلانڈر کے قاتل تک پہنچنے کی ایک تجویز میرے ذہن میں آگئی۔

کاؤنٹر پر ایک نوجوان نیگرو لڑکی بھی صارف کی سہولت کے لیے موجود تھی۔ میں نے اس سے گتے کا ایک ٹکڑا اور چھوٹی سی ڈوری طلب کی اور دونوں چیزیں لے کر قریبی باتھ روم میں گھس گیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے گتے پر موٹے الفاظ میں "آؤٹ آف آرڈر" لکھا اور ڈوری گتے سے باندھ دی پھر میں باتھ روم سے نکلا اور جس باکس میں میلانڈر کی لاش موجود تھی اس کے دروازے پر ہینڈل کے ساتھ گتے کو لٹکا دیا اور دوبارہ ہال میں آگیا۔

☆☆☆

http://pakistanipiace.blogspot.com

میلانڈر نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، وہ اتنا نہ تھا کہ میں اس کی روشنی میں کوئی بہتر لائحہ عمل مرتب کر سکتا۔ اب مجھے ہی اپنی آنکھیں کھلی رکھنی تھیں۔ اچانک میری نگاہ ہینگ پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے پاس آبیٹھا۔ میرے ذہن میں میلانڈر کی لاش گھوم رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر اس کا قتل بات ختم کرنے کے بعد ہوا تھا تو یقیناً اس نے میرے نام کورٹ ہوٹل میں کوئی پیغام ضرور دیا ہوگا۔ میں نے چونک کر ہینگ سے کہا۔

"یہاں فون تو ہوگا۔ ذرا میرے ہوٹل فون کر کے معلوم کرو کسی شخص نے فون پر مجھے دریافت تو نہیں کیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور گیلری میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ تیسرے کیبن میں ہی گھسا تھا چند ثانیے بعد ہی وہ لوٹ آیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کی سراسیمگی نمایاں نہیں تھی۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔

"تھوڑی دیر بعد ہی مجھے ایک شخص سے ملنا ہے لہٰذا اب اجازت دو اور ہاں... ضرورت پڑنے پر تم مجھے یاد کر سکتے ہو۔"

ہینگ کے جانے کے چند منٹ بعد ہی آرکسٹرا نے ساز چھیڑ دیے۔ تمام لوگ اسٹیج کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ہال کی روشنی گل کر دی گئی تھی۔ صرف اسٹیج پر مختلف زاویوں سے رنگین روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ یکایک کارلوٹا عقبی دروازے سے اسٹیج پر نمودار ہوئی اور آتے ہی گانا اور تھرکنا شروع کر دیا۔ اس کی دل کش آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی اور اس کا کندنی جسم سیمابی کیفیت میں اسٹیج پر فتنے جگا رہا تھا۔ آنکھیں اب تاریکی سے آشنا ہو گئی تھیں اور لوگ آسانی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ مجھے خود سے چند نشست آگے اسٹیج کے دائیں کونے پر چارلس بیٹھا نظر آیا۔ اس کی نظریں کارلوٹا کا طواف کر رہی تھیں۔ کبھی کارلوٹا بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ گانے کے اختتام پر کارلوٹا ضرور اس کے پاس آ کر بیٹھے گی۔ میں اس سے شناسائی کا موقع حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اپنی جگہ سے اٹھ کر چارلس سے ایک نشست پیچھے کرسی پر جا بیٹھا جو اتفاق سے خالی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ ہر بڑے جرم کی تہ میں کسی خوب صورت عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے اور اسی یقین کے تحت میں کارلوٹا سے تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا، اس وقت کارلوٹا نغمے کے آخری مصرعے ادا کر رہی تھی۔ لہٰذا روشنی کا رخ اسی کی طرف تھا اور جہاں چارلس بیٹھا تھا وہاں اس قدر تاریکی تھی کہ کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی، دفعتاً میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جو عموماً سائلینسر لگے ریوالور سے نکلتی ہے، اسی لمحے کارلوٹا نے اپنا گانا ختم کیا اور ہال تیز روشنی سے روشن ہو گیا۔ لوگ تالی بجا کر اسے داد دینا چاہتے تھے لیکن یکایک ہی جس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں ساکت ہو گئے، چارلس کا سر، میز پر رکھے گلدان سے لگا ہوا تھا اور اس کے سینے سے نکلتا خون سفید میز پوش کو رنگین کر گیا، کسی نے چارلس کو گولی ماردی تھی اور وہ مر چکا تھا۔

اچانک میری نگاہ کارلوٹا پر پڑی۔ وہ چند ثانیے چارلس کو گھورتی رہی پھر بغلی دروازے سے گزر کر اسٹیج کے عقبی حصے میں بنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ اس کے اسٹیج سے اترتے ہی کلب کا مالک رنگل ہال کے داخلی دروازے پر جا کھڑا ہوا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"خواتین و حضرات! تمام لوگ اپنی جگہ تشریف رکھیں اور کسی چیز کو چھونے کی کوشش نہ کریں۔ پولیس کو اطلاع کر دی گئی ہے۔ جب تک پولیس نہ آئے کسی شخص کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی ہال میں تیز سرگوشیاں گونج اٹھیں۔ ہر شخص خوف زدہ تھا۔ میں لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے کارلوٹا گئی تھی، یہ ایک پتلی سی گیلری تھی جس کے آخر میں چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ سارے کمرے مقفل تھے البتہ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ کمرے سے سرگوشیانہ آواز آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا، کارلوٹا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ کمرے کے ایک کونے میں کرسی پر روڈی بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" روڈی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کس کی تلاش ہے؟"

"میں اتفاقاً اس طرف آ نکلا۔" میں نے جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے، ہال میں قتل ہو گیا ہے اور تم یہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہو؟"

روڈی نے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا اور درشتی سے بولا۔ "کون ہو تم اور اس قسم کی گفتگو کا تمہیں کیا حق ہے؟"

"میرا نام ہیری رائس ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے ایک دوست نے مجھے اس خاتون سے متعارف کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اسے جلدی جانا تھا لہٰذا میں نے سوچا کیوں نا خود ہی اس خاتون سے شرفِ ملاقات حاصل کر لوں۔"

یہ کہہ کر میں نے کارلوٹا کی طرف دیکھا۔ وہ بہ غور میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر ہیری!" قدرے توقف کے

بعد وہ بولی۔ "مگر تمہارا بلا اجازت کمرے میں آنا خلافِ اصول ہے، تمہیں میرے ساتھی کے سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

پھر وہ روڈی کی سمت مڑتے ہوئے بولی۔ "روڈی! میں نے رقص کے دوران میں اس آدمی کو اپنی جگہ سے اٹھتے اور چارلس کے پاس بیٹھتے دیکھا تھا، غالباً یہی اس کا قاتل ہے۔"

"تم یہی بات پولیس کو بتا دینا۔" روڈی مجھے ناگواری سے گھورتے ہوئے بولا۔ "اس کے بعد وہ خود ہی مسٹر ہیری کا بندوبست کر دیں گے۔"

"میں قاتل نہیں ہوں۔" میں مسکرایا۔ "البتہ مجھے شک ہے کہیں تمہارے پاس ہی وہ ریوالور موجود نہ ہو جس سے چارلس کو قتل کیا گیا ہے۔"

"اس سے قبل کہ میں تم سے کوئی برا سلوک کروں۔" روڈی غصے سے بپھر کے اٹھا۔ "فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے بھی مجھے خوامخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کی عادت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا اور ہال میں آ گیا۔

اطلاع ملتے ہی پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔

ایک لیفٹیننٹ جس کا نام ریسلر تھا، چند سپاہیوں کے تعاون سے لوگوں کے بیانات لے رہا تھا۔ میں جیسے ہی ہال میں داخل ہوا، ایک شخص نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور زور سے چیخا۔

"یہی وہ شخص ہے جس نے قتل سے ذرا دیر قبل اپنی نشست تبدیل کی تھی اور مقتول کے قریب جا بیٹھا تھا۔"

لیفٹیننٹ نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے قاتل تصور کر رہا ہے، لیفٹیننٹ نے مجھ سے کہا کہ میں اسے وہ جگہ بتاؤں جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے اس کرسی کے پاس لے گیا جہاں میں جا کر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے وہ دروازہ بھی دکھایا جہاں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کسی نے چارلس کو قتل کر دیا تھا پھر اسی راہ سے روپوش ہو گیا، لیفٹیننٹ کے اس سوال پر کہ واردات کے بعد میں کہاں اور کیوں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کارلوٹا کے ڈریسنگ روم کا حال سنا دیا۔ عین اسی وقت کارلوٹا اور روڈی، اسٹیج کے عقبی دروازے سے نمودار ہوئے۔ لیفٹیننٹ نے انہیں بھی قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سوچنے لگا کہ خدا جانے کب کلب میں موجود دوسری لاش دریافت ہو گی لیکن اسی وقت پولیس وین آ گئی اور مشتبہ لوگوں کو جن میں میرے علاوہ کارلوٹا اور روڈی بھی شامل تھے، وین میں بٹھا کر پولیس ہیڈ کوارٹر بھیج دیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں میرا بیان وہی تھا جو اس سے قبل میں ہوٹل میں دے چکا تھا۔ کارلوٹا چونکہ اسٹیج پر محوِ رقص تھی لہٰذا اسے فوراً ہی غیر مشتبہ قرار دے دیا گیا۔ روڈی نے اپنا بیان یوں دیا کہ وہ پروگرام شروع ہونے سے قبل ہی کارلوٹا کے پاس بیٹھا تھا اور رقص ختم ہونے تک ڈریسنگ روم میں ہی اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ روڈی نے مزید بتایا کہ ڈریسنگ روم میں اس کی موجودگی کی شہادت وہ لڑکا دے سکتا ہے جو اسٹیج پر روشنی ڈالنے کا کام کرتا ہے۔ کیونکہ پروگرام کے دوران میں اہم دونوں کھلے دروازے سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ لڑکے کی شہادت پر روڈی کو بھی نجات مل گئی۔

تمام لوگوں کے بیانات تسلی بخش تھے۔ صرف میری ذات مشکوک تھی، میں پولیس کو اپنی اصلیت بتا کر جان چھڑا سکتا تھا لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اپنی اصل شخصیت ہر حال میں پولیس سے مخفی رکھوں گا۔ تاہم پولیس سے جان چھڑانا بھی ضروری تھا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ہینگ پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا اس نے کسی سے واردات کے بارے میں سن لیا تھا اور اخباری رپورٹر کی حیثیت سے واقعے کی صحیح صورتِ حال معلوم کرنے یہاں چلا آیا تھا۔ اس کی آمد کو میں نے امدادِ غیبی سمجھا۔ مجھے وہاں موجود دیکھ کر اسے معاملے کی نوعیت سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔ اس نے میرے بارے میں لیفٹیننٹ ریسلر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ کسی کو قتل کرنا تو درکنار، میں نے زندگی میں کبھی پستول بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ ہینگ کی سفارش پر ریسلر نے مجھے جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی وہ ہدایت کرنا نہ بھولا کہ بہ حیثیت شریف شہری، میں آئندہ ایسے واقعات سے ہمیشہ دور ہی رہوں۔

میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل کر چند قدم چلا تھا کہ روڈی سامنے کھڑا نظر آیا۔

"مجھے افسوس ہے، ہیری!" وہ سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔ "... کہ نیویارک میں پہلے دن ہی تمہیں ایک تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ تم گھر جا کر اس واقعے کا ذکر اپنے دوستوں سے ضرور کرو گے تاہم مجھے امید ہے کہ آئندہ خود کو ایسے معاملات سے دور ہی رکھو گے۔"

میں نے ہنس کر اس کی نصیحت کا شکریہ ادا کیا۔ روڈی نفیس کپڑے پہننے کا عادی تھا مگر اس وقت میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس نے سبز پتلون پر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی قریب سے گزرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ڈرائیور کو ہوٹل کورٹ چلنے کی ہدایت کی لیکن جب یقین ہو گیا کہ اب ٹیکسی روڈی کی نظروں سے اوجھل ہے تو ڈرائیور کو میڈرڈ

http://paksociety.com

کلب کی سمت ٹیکسی موڑ لینے کا حکم دیا۔ کلب سے تھوڑے فاصلے پر میں ٹیکسی سے اتر گیا اور تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلب کے عقبی حصے میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

عمارت کی کھڑکیاں سڑک کی سطح سے زیادہ بلند نہیں تھیں۔ جلد ہی مجھے وہ کھڑکی بھی نظر آگئی جو ڈریسنگ روم کو جانے والی گیلری میں واقع تھی۔ میرے لیے کھڑکی کھولنا، اپنی جگہ سے جست لگانا اور کھڑکی میں داخل ہونا صرف ایک ساعت کا کام تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے کھڑکی بند کردی۔ عمارت میں غضب کی تاریکی تھی۔ روشنی کا واحد ذریعہ وہ پنسل ٹارچ تھی جو میرے ہاتھ میں تھی۔ ذرا دیر بعد ہی میں نے خود کو اس گیلری میں کھڑے پایا جو ڈریسنگ روم کو جاتی تھی۔ میں اسے عبور کرکے اس جگہ پہنچا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ حادثے کی جگہ دیکھنے کے بعد میں فون بکس کی طرف گیا۔ میرا لٹکایا ہوا ''آؤٹ آف آرڈر'' کا بورڈ بدستور دروازے پر لٹک رہا تھا اور میلانڈر کی لاش اسی حالت میں موجود تھی گویا کسی شخص کو ادھر آنے اور لاش دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

میرے ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ دفعتاً میرے ذہن میں روڈی کا بے ترتیب لباس ابھر آیا لباس میں رنگوں کے اختلاف نے مجھے دور کی سجھائی۔ اگر روڈی ہی چارلس کا قاتل تھا تو یقیناً وہ آرکسٹرا پلیٹ فارم کے عقبی دروازے سے نکل کر ہال میں آیا ہوگا، تاریکی کے باعث کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ چارلس کے پاس جاکر اس نے جیکٹ کی جیب میں رکھے ریوالور سے گولی چلائی اور واپس جاکر جیکٹ بدل لی تاکہ جیب کا سوراخ جو گولی نے بنا دیا تھا کسی کو نظر نہ آسکے۔ یہ خیال آتے ہی میں چونک پڑا۔ اگر میرا قیاس درست تھا تو اس نے جیکٹ کو ضرور ڈریسنگ روم میں ہی اس جگہ چھپایا ہوگا۔

میں اسٹیج کے دروازے سے گزر کر کارلوٹا کے ڈریسنگ روم میں جا پہنچا۔ دروازہ مقفل تھا مگر میرے لیے اسے کھولنا دشوار نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد میں ڈریسنگ روم میں تھا۔ میزوں کی درازیں، ملبوساتی الماریاں اور دیگر مقامات کی تلاش کے دوران میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جلد ہی روڈی بھی جیکٹ لینے ضرور آئے گا، میں اس کی آمد سے پیشتر تلاشی کا عمل مکمل کرلینا چاہتا تھا کیونکہ دوسری صورت میں مجھے بھی میلانڈر اور چارلس کے پیچھے جانے پر مجبور ہونا پڑتا۔ وہ یقیناً مسلح ہوتا جبکہ میرا ریوالور ہوٹل میں ہی رہ گیا تھا۔ ڈریسنگ روم سے مایوس ہوکر میں باہر نکلا اور گیلری میں ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں جیکٹ کو آسانی سے چھپایا جاسکتا ہو۔

واش بیسن کے مقابل قدرے اونچائی پر مجھے ایک چھوٹا سا روشن دان دکھائی دیا۔ جس کے پٹ گرے ہوئے تھے۔ میں نے روشن دان کے پٹ ہٹا کر ہاتھ اندر ڈالا تو میری انگلیاں ایک کاغذی پیکٹ سے جاٹکرائیں۔ پیکٹ کھولتے ہی مجھے روڈی کی جیکٹ دکھائی دی۔ میں نے اس کی داہنی جیب میں گولی کا سوراخ بھی دیکھ لیا تھا۔ جیکٹ کی اندرونی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک جیب سے ایک خط برآمد ہوا جو مس کارلوٹا کے نام تھا۔ میں حیران تھا کہ کارلوٹا کا خط روڈی کی جیب میں کیسے آپہنچا۔ خط کی عبارت تھی۔

''ڈیئر کارلوٹا۔۔۔! آج کسی بھی طور مجھ سے ضرور مل لو۔ میں اپنی معلومات پر پریشان بھی ہوں اور ڈر بھی محسوس کررہا ہوں لیکن خود سے زیادہ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم خطرناک لوگوں میں گھر گئی ہو اور غیر قانونی سازشوں میں حصہ لے رہی ہو۔ افسوس! میں فون پر ان باتوں کا اظہار نہیں کرسکتا جو آج ہی مجھے معلوم ہوئی ہیں۔ امید ہے تم میرا انتظار کروگی۔

تمہارا چارلس''

خط پڑھ کر میں نے ایک طویل سانس لی۔ صورتِ حال یہ بنی تھی کہ چارلس کا خط کارلوٹا نے ہی روڈی کو پڑھنے کے لیے دیا ہوگا۔ روڈی کو معلوم تھا کہ چارلس کس معاملے میں کارلوٹا سے گفتگو کرنا چاہتا ہے، دونوں نے طے کیا کہ چارلس کے منہ سے کوئی بات نکلنے سے قبل ہی اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردینا بہتر ہوگا اور روڈی نے اس وقت جبکہ کارلوٹا اسٹیج پر موجود تھی اس کا کام تمام کردیا۔

میں نے خط جیکٹ کی جیب میں رکھا اور اسے کاغذ میں لپیٹ کر اسی جگہ رکھ دیا، جہاں وہ رکھی تھی تاکہ روڈی کو کوئی شک نہ ہو، میرا ذہن اس وقت بھرپور انداز میں کام کررہا تھا۔ جیکٹ روشن دان میں رکھ کر میں ایک فون باکس میں گیا اور ریسیور پر رومال ڈال کر پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے لیفٹیننٹ ریسلر فون پر تھا۔ اس نے میرا نام دریافت کیا لیکن میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کردیا اور کہا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ! امیڈرڈ کلب کے ایک فون باکس میں ایک لاش موجود ہے۔ مقتول کا نام میلانڈر ہے اور کسی نے یکے بعد دیگرے تین فائر اس کے دل پر کیے ہیں'' پھر قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور فوراً ہی عمارت سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ناشتے کے دوران میں میرا ذہن گزشتہ شب کی الجھنوں سے متعلق چند نتائج اخذ کرچکا تھا۔ اول یہ کہ چارلس سونے والے معاملے سے واقف تھا یا پھر اس گروہ کا رکن تھا جو سرکاری سونا اڑا لینے کے چکر میں تھا، دوم یہ کہ چونکہ میں سونا چوری مہم کی تفتیش پر مامور تھا۔ لہٰذا مجھے معلوم کرنا تھا کہ کہیں یہ دونوں قتل سونے والے معاملے سے متعلق تو نہیں، تیسرے یہ کہ اگر میں پولیس پر یہ ظاہر کردوں کہ میلانڈر اور چارلس کا قاتل کون تھا تو میرے لیے دشواری پیدا ہوسکتی تھی، مجھے اصل معاملے کی تفتیش کرنا مشکل ہوجاتا۔

میں نے بیرے سے اخبار لانے کو کہا۔ اخبار میں چارلس اور میلانڈر کے قتل کی خبر موجود تھی۔ میلانڈر کی لاش ریسلر نے میرا فون وصول کرنے کے آدھے گھنٹے بعد دریافت کرلی، خبر میں یہ بھی تحریر تھا کہ پولیس جلد ہی مشتبہ افراد کو گرفتار کرنے والی تھی، مشتبہ افراد میں میرا اور روڈی کا نام بھی شامل تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس لڑکے سے بھی مل لینا چاہیے جو میڈرڈ کلب کا لائٹ مین تھا۔ اس سے کوئی نئی بات بھی معلوم ہوسکتی تھی۔

میں تار گھر پہنچا اور خفیہ حروف میں ایک خط اپنے دفتر روانہ کیا۔ میں نے اس میں میلانڈر اور چارلس کے قتل کی اطلاع دینے کے علاوہ درخواست کی تھی کہ مقامی پولیس کو ہدایت کی جائے وہ تفتیش کا کام التوا میں ڈالے اور روڈی نامی شخص پر فی الحال شک کرنا چھوڑ دے۔ خط مکمل ہوچکا تھا مگر پھر میں نے اس میں ایک جملے کا اضافہ کردیا اور وہ جملہ یہ تھا کہ ... تفصیل بعد میں مہیا کی جائے گی۔

خط کی ترسیل کے بعد میں ہوٹل واپس آگیا۔ دس بجے ونگ مجھ سے ملنے آیا اس نے آتے ہی مجھ سے دریافت کیا کہ کیا مجھے میڈرڈ کلب میں ہونے والے دوسرے قتل کا علم تھا؟ وہ میلانڈر کے بارے میں دریافت کررہا تھا، میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا جس میں میلانڈر کے قتل کی خبر موجود تھی۔ ونگ یہ سوچ کر الجھ رہا تھا کہ میں گزشتہ شب میڈرڈ کلب میں کیا کرنے گیا تھا۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ ضرورت پڑنے پر میں اس سے کوئی بھی کام لے سکتا تھا، اس کی پیشکش مخلصانہ تھی۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر راز میں شریک کرلینا مناسب سمجھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میلانڈر کون تھا؟ اور میں اس سے ملنے میڈرڈ کلب گیا تھا۔ میں نے اسے میلانڈر سے ملنے والی اطلاعات سے آگاہ کردیا اور اپنا یہ خیال بھی ظاہر کردیا کہ وہ دونوں قتل سونے کی چوری ہی سے متعلق ہیں، ونگ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ان باتوں کو اپنے تک محدود رکھے گا اور جیسے ہی کوئی مفید اطلاع ملی، وہ اسے مجھ تک پہنچادے گا۔

ونگ جیسے ہی رخصت ہوا میں سیدھا میڈرڈ کلب جا پہنچا۔ کلب کا مالک ریگل اپنے دفتر میں موجود تھا۔ وہ مجھ سے ملاقات پر قطعاً خوش نہیں تھا اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا جس شخص کے کلب میں یکے بعد دیگرے دو قتل ہوجائیں وہ اپنا دماغی توازن کس طرح درست رکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات میں اتفاقاً اس کلب میں آیا تھا لیکن اس سانحے سے دوچار ہوگیا۔ میں نے اس پر اپنے اس یقین کا اظہار بھی کردیا کہ چارلس کا قاتل یقیناً آرکسٹرا پلیٹ فارم کے قریب بنے دروازے سے ہال میں داخل ہوا ہوگا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مزید بولنے سے روک دیا۔ اس کے نزدیک اگر کوئی شخص دروازے سے گزر کر چارلس پر گولی چلا سکتا تھا تو وہ صرف روڈی ہی تھا مگر لائٹ مین نے کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا لہٰذا بقول اس کے میرا اندازہ غلط ہی تھا۔ وہ ثبوت کے لیے مجھے واردات پر لے گیا اور وہ جگہ دکھائی جہاں لائٹ مین بیٹھ کر اپنا فرض انجام دیتا تھا۔ لائٹ مین اس وقت بھی وہاں موجود تھا، اس کا نام اسکینڈل تھا۔ اسکینڈل نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص بھی اس کی نگاہ سے اوجھل رہ کر چارلس کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔۔۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھتے ہی جان لیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن موقع کی نزاکت کے پیش نظر خاموش رہا۔

میں نے ریگل سے کارلوٹا کی خوب صورتی اور گانے کی تعریف کی تو اس نے بتایا کہ دراصل کارلوٹا کو روڈی ہی ملازمت کے لیے اس کے پاس لایا تھا اور ہر وقت باڈی گارڈ کی طرح اس کے گرد منڈلاتا رہتا تھا جبکہ خود اسے یہ بات قطعی ناپسند تھی۔

میں کلب سے باہر آیا تو کارلوٹا سے ملنے کا تہیہ کرچکا تھا، میں اس سے مل کر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ ان واقعات سے کس حد تک متاثر تھی۔ میں قریبی میڈیکل اسٹور میں گیا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس کا رہائشی پتا دیکھنے لگا۔ چند منٹ کی کاوش کے بعد ہی مجھے اس کا پتا مل گیا۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور ٹیکسی کے ذریعے اس کے فلیٹ جا پہنچا۔

دروازے پر کارلوٹا کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ کال بیل بجاتے ہی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے آکر دروازہ کھولا اور بتایا کہ مس کارلوٹا باہر گئی ہوئی ہیں اور اس وقت میری ان سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

وہ دروازہ بند کرنے کے لیے جیسے ہی پیچھے ہٹی، میں نے اپنا پیر دروازے میں اڑا دیا۔ وہ سراسیمہ ہوگئی، میں نے اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھایا اور کارلوٹا کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ ریشمی گاؤن پہنے صوفے پر نیم دراز تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے نگاہ اوپر اٹھائی اور اس انداز سے مجھے گھورا جیسے میں

http://paktunplace.blogspot.com

مرتع کا باشندہ ہوں اور اچانک ہی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔

"کیا تمہیں ملازمہ نے یہ نہیں بتایا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں؟" اس نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہو گا فوراً ہی یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ گارڈ کو بلوا کر عمارت سے باہر پھنکوا دوں گی۔"

"میرے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے اس کی برہمی کی پروا کیے بغیر پورے سکون سے کہا۔ "۔۔۔گزشتہ شب میڈرڈ کلب میں تمہیں دیکھ کر مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا تھا اب جبکہ میں جلد ہی نیویارک چھوڑنے والا ہوں، مجھے اچھا نہیں لگا کہ تم سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے سے برہمی کے آثار کم ہو گئے... میں نے اسے مزید بتایا کہ پولیس چارلس کے قتل میں مجھے مشکوک سمجھ رہی تھی، گو عارضی طور پر پولیس نے مجھے چھوڑ دیا تھا مگر ہر لمحہ یہی خوف غالب تھا کہ نہ جانے کس وقت دھر لیا جاؤں۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے بلاوجہ تمہیں چارلس کا قاتل سمجھ لیا تھا۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ چارلس کا قاتل اسٹیج کے بغلی دروازے سے ہی آیا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"۔۔۔واردات کے وقت اسٹیج کی داہنی سمت دیوار پر لگا بلب روشن نہیں تھا۔ کیا اسے جلایا نہیں جاتا؟" وہ جواباً پُرسوچ لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے کل اس میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔"

کارلوٹا کے جواب سے مجھے یقین ہو گیا کہ اسکینڈل بھی اس واردات میں شامل تھا۔ اس نے دانستہ بلب کو روشن نہیں کیا تا کہ اندھیرے میں بہ آسانی چارلس کو گولی کا نشانہ بنایا جا سکے۔ اب اسکینڈل سے ملنا اور بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

"کیا تم بھی روڈی کو چارلس کا قاتل سمجھتے ہو؟" کارلوٹا نے دریافت کرنا چاہا۔

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی تو کارلوٹا نے میری توجہ پھر اسکینڈل کی طرف مبذول کرائی۔ اس نے روڈی کو کسی بھی وقت ڈریسنگ روم سے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا، دوسری بات جو اس نے روڈی کی مدافعت میں کہی، وہ یہ تھی کہ ابتدائی تلاش کے دوران میں روڈی کے پاس سے کوئی اسلحہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس کی یہ بات درست ہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ جیکٹ کی طرح ریوالور بھی چھپانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا، خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ اسکینڈل کا تعاون بھی اسے حاصل تھا۔ تاہم میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کارلوٹا پر نہیں کیا اور یہی کہا کہ ایسی صورت میں روڈی، چارلس کا قاتل قرار نہیں دیا جا سکتا اور دراصل کارلوٹا مجھ سے یہی اگلوانا چاہتی تھی۔

گفتگو اپنے اختتامی موڑ پر آ گئی تھی۔ کارلوٹا اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"عموماً میں لوگوں سے گھر پر نہیں ملتی لیکن تم پہلے شخص ہو جس کی خاطر میں نے اپنا یہ اصول توڑا ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ میں لفٹ کی جانب بڑھنے کے بجائے گیلری کے سرے پر پہنچا اور ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا، دس منٹ ہی گزرے تھے کہ عمارت کے عین سامنے روڈی کی کار آ کر رکی۔ وہ سیدھا ہی کارلوٹا کے دروازے پر میں پہنچا اور دستک دیے بغیر اندر چلا گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کارلوٹا نے فون کر کے اسے بلایا تھا، اور اب وہ روڈی کو مجھ سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کرے گی، میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور عمارت سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

رات بھر جاگتے رہنے کے باعث اب نیند سے برا حال تھا۔ میں اپنے ہوٹل پہنچا تو ہوٹل کے داخلی دروازے کے عین مقابل ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس کی نگاہ میرے کمرے کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا" وہ روڈی کے حکم پر ہی میری نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے اس شخص کو اپنی نگرانی کرتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، گویا وہ وقت قریب آ گیا تھا جب ریوالور ہر وقت اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شام کے سات بجے تھے۔ میں نے اپنا سامان بیگ میں بھر کر کلرک کو فون پر بتایا کہ بل بنا کر بھیج دے۔ میں فوری طور پر رہائش بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا تا کہ روڈی کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا لیکن اپنے قائم کردہ نظریوں کی تصدیق سے قبل میں روڈی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہوٹل تبدیل کرنا بھی میرے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

بہرطور... میں ہوٹل سے نکلنے ہی والا تھا کہ ہینگ کا فون آ گیا اس نے روڈی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ روڈی نے بہت سی غیر قانونی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا مگر کبھی پولیس کی گرفت میں نہ آ سکا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نصف شب کے قریب میڈرڈ کلب جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اسکینڈل کا پتا معلوم کرنے کی ہدایت کی۔ ہینگ سے فون پر گفتگو کے بعد میں

کلرک کے پاس گیا اور رقم کی ادائیگی کی۔ چلتے وقت میں نے اس سے کہا۔

"میں کل کسی وقت یہاں آؤں گا۔ اس دوران میرے نام کوئی پیغام آئے تو رکھ چھوڑنا میں آ کر لے لوں گا۔"

میں ہوٹل کی عمارت سے باہر نکلا اور نگرانی پر مامور شخص کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک سمت چل دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے بھی ایک خالی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ میرے تعاقب میں تھا۔ ایک جگہ جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی میں نے گاڑی رکوائی اور نیچے اتر آیا مجھے رکتا دیکھ کر عقب میں آنے والی گاڑی بھی کچھ فاصلے پر رک گئی۔ میں اس گاڑی کے نزدیک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھے شخص سے کہا۔

"میرے تعاقب سے باز آ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

جواب میں اس کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ اس نے میرا پورا حسب نسب بگاڑ دیا۔ پھر جیسے ہی اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا، میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اپنی جانب کھینچا اور ساتھ ہی ایک عدد گھونسا بھی اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ فوراً بے جان ہو کر اپنی نشست پر ڈھلک گیا۔ میں اسے چھوڑ کر اپنی ٹیکسی کی طرف متوجہ ہوا۔

"خیریت چاہتے ہو تو گاڑی لے کر میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

ڈرائیور پہلے ہی خاصا سہما ہوا تھا۔ میرے سخت لہجے نے اس کی وحشت میں اور اضافہ کر دیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر گاڑی کا رخ جس سمت سے آیا تھا اسی طرف موڑ دیا۔ چند ثانیے بعد ہی گاڑی میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی، میں فوراً دوسری گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ دور چل کر میری نگاہ ایک ہوٹل کے چمکتے نیون سائن پر پڑی جس پر "ہوٹل ڈیلامیر" کے حروف جگمگا رہے تھے، میں نے فوری طور پر ایک کمرا اپنے نام محفوظ کرایا اور کلب کی سمت چل پڑا۔

بار روم کے دروازے پر مجھے ریگل کھڑا نظر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دیا۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ پولیس دوبارہ میلانڈر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئی تھی۔ مقامی پولیس کا خیال تھا کہ میلانڈر کو قتل کر کے قاتل کلب سے چلا گیا تھا۔ مگر اپنا ایک ساتھی وہیں چھوڑ گیا۔ جس نے موقع دیکھ کر چارلس کو ہلاک کیا اور داخلی دروازے بند کیے جانے سے قبل ہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں سمجھ گیا۔ پولیس نے وہ کہانی صدر دفتر سے میرے خط میں دی گئی ہدایت پر گھڑی تھی۔ اسی دوران... میں ہینگ بھی آ گیا۔ ریگل اٹھا اور عمارت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

ہینگ نے مجھے بتایا کہ وہ اسکینڈل کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے اسکینڈل کا پتا نوٹ کرایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ڈائری جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ روڈی کلب میں داخل ہوا۔ اس نے نیا ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں بٹنوں کی جگہ قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ فوراً ہی میرے قریب آ بیٹھا اور بولا۔

"کارلوٹا اپنا گانا ختم کرے تو میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا، پھر ہم تینوں ایک دوسرے کی صحت کا جام نوش کریں گے۔"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہال کی روشنیاں گل ہو گئیں اور اسٹیج رنگ برنگی روشنیوں سے چمک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے کارلوٹا اسٹیج پر نمودار ہوئی، اس نے وہی گانا شروع کیا جو کل رات گایا تھا، جیسے ہی وہ گانا ختم ہوا، کارلوٹا عقبی دروازے سے روپوش ہو گئی اور ہال کی روشنیاں ایک مرتبہ پھر جگمگا اٹھیں۔

روڈی نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا اور مجھے لے کر اس جگہ جا بیٹھا جہاں کل چارلس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اسکینڈل اپنے کام میں مشغول تھا اور دیوار گیر بلب جو کل بجھا ہوا تھا آج جل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کارلوٹا ہنستی ہوئی آئی اور ہمارے ساتھ بیٹھ گئی، سب سے پہلے اس نے میری مزاج پرسی کی۔

اچانک... اس وقت آرکسٹرا نے رقص کی دھن شروع کر دی۔ روڈی آرکسٹرا بجانے والوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کارلوٹا نے جلدی سے اپنے پرس سے ایک پنسل نکالی اور میز پوش پر جھک کر کچھ لکھنے لگی۔ پھر اس نے میری جانب دیکھا اور یہ اطمینان کر لینے پر کہ میں نے اسے لکھتے دیکھ لیا ہے، اس حصے کو پلیٹ سے ڈھک دیا۔ وہ مجھے کوئی پیغام دینا چاہ رہی تھی۔ چند منٹ بعد روڈی نے اجازت چاہی اور دونوں اٹھ کر رقص میں شریک ہو گئے۔

میں نے پلیٹ ہٹا کر دیکھا، لکھا تھا۔ "فلیٹ میں تین بجے۔"

گویا اس نے مجھے تین بجے اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ پورا ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ میں نے سوچا کیوں نا اسکینڈل سے ملاقات کر لی جائے۔ وہ کلب سے اپنے گھر جا چکا تھا۔ ہینگ نے مجھے بتایا تھا کہ اسکینڈل اسپروس اسٹریٹ کی ایک ایسی عمارت میں رہتا ہے جس کے نچلے حصے میں موٹر گیرج واقع تھا۔

کسی خاص پریشانی کا سامنا کیے بغیر میں جلد ہی اس گیرج کو پا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی جس کے

http://pakfunplace.blogspot.com

نچلے حصے میں تین کمرے بنے ہوئے تھے جبکہ گیرج کے بائیں سرے پر ایک زینہ اوپر جانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ گیرج والے حصے میں ایک شخص کار کا انجن کھولے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی وہ کسی کام سے اندرونی حصے میں گیا، میں برق رفتاری سے حرکت میں آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں زینے پر تھا۔

اوپر پہنچا تو زینے کے اختتام پر ایک کمرا تھا جس کی جھریوں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ میں نے داہنے ہاتھ میں ریوالور پکڑا اور زور سے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی اسکینڈل اسٹول پر بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ آواز سن کر اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ ریوالور دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن اس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔

"خاموش بیٹھے رہو اور جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔" میں نے ریوالور اس کے حلق پر رکھ دیا۔ "۔۔۔جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

وہ اسٹول پر بیٹھا خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کا سکون دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی کہ ریوالور دکھائے جانے کا یہ اس کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ چارلس کے قتل میں روڈی کا معاون تھا تو اسے قتل کیے جانے کی وجہ بھی ضرور معلوم ہو گی۔ میں اس سے یہی بات اگلوانا چاہتا تھا لیکن اس سے قبل کہ میں کوئی سوال کرتا، وہ درشتی سے بولا۔

"مسٹر ہیری! یہ کیا مذاق ہے؟ ریوالور ہٹاؤ، آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"چارلس میرا دوست تھا، روڈی نے تمہارے تعاون سے اسے افشائے راز کے ڈر سے ہمیشہ کے لیے چپ کرا دیا۔" میں نے اسے بتایا۔ "اب تم مجھے وہ بات بتا دو جس کی وجہ سے اسے قتل کیا گیا ہے۔ ورنہ وہ سبق دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"پاگل مت بنو، ریوالور دکھا کر تم مجھے خوف زدہ کر سکتے ہو نہ میری زبان کھلوا سکتے ہو۔" یہ کہتے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا اور اس کے جبڑے پر ایک زوردار پنچ رسید کر دیا۔ اسکینڈل لہرایا اور زمین پر دوزانو بیٹھ گیا مگر پھر فوراً ہی اٹھ کر مجھ پر جھپٹا اور آکٹوپس کے مانند مجھ سے چمٹ گیا۔ جسمانی لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور نہ تھا۔ میں نے جب بھی اسے رگیدنے کی کوشش چاہی، اس نے میری گرفت کمزور کر دی، میں یکایک ہی اس کی گردن پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے انگلیوں کا شکنجہ اس کی گردن پر سخت کیا تو اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور بدن ڈھیلا ہو کر جھولنے لگا۔

"اگر اب بھی تم نے صحیح جواب نہ دیا تو یاد رکھو، چند منٹ کی دیر ہے، پھر تمہاری آواز دوسرے جہان سے بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گی۔" میں نے سنگین لہجے میں کہا اور اپنی گرفت سخت کر دی۔ دباؤ پڑتے ہی اس کی گردن کی رگیں تن گئیں اور چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اشارے سے گردن چھوڑ دینے کے لیے کہا، میں نے جیسے ہی اس کی گردن سے ہاتھ ہٹایا، اس نے ایک طویل سانس لی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن سہلانے لگا۔

"بتاؤ! روڈی نے چارلس کا قتل کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے گردن سہلاتا ہوا اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے غیر محسوس انداز میں بدن کو دائیں بائیں گھمایا اور تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا، اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع نہ تھی، لہٰذا میں نے راستے ہی میں اسے جا لیا اور اس کے پیٹ پر زوردار لات ماری وہ بری طرح ڈکرایا اور اوندھے منہ زمین پر گرنے لگا میں نے شانے سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا اور دوسرا گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا، ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ پھر زمین پر گر پڑا، میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی اور چہرہ کئی جگہ سے سوج گیا تھا۔

"امید ہے، اب تمہارا دماغ درست ہو گیا ہو گا؟"

میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "یا ابھی کچھ اور خاطر کی جائے؟"

اس کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی کرسی سے لڑھک کر اس طرح زمین پر گر گیا جیسے اس کی جان نکل گئی ہو۔ میں اسے سنبھالنے کے لیے بڑھا۔ اس کی آنکھیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں چمک دیکھی تو یک دم دروازے کی طرف گھوم گیا۔ دروازے پر وہی شخص کھڑا تھا جسے میں نے گیرج میں کام کرتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک موٹی سلاخ تھی، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سلاخ سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں فوراً ہی ایک طرف ہٹ گیا پھر بھی سلاخ کا سرا میرے شانے پر پڑا لیکن ضرب کے بجائے اس نے میرے کوٹ کی آستین پھاڑنے پر ہی قناعت کی، قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا اور دوبارہ مجھے پر حملہ آور ہوتا، میں چھلانگ لگا کر اس پر جا گرا۔ میرا حریف زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ چند ہی ثانیے میں، میں نے اسے زیر کر لیا اور اسے بھی کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیا، پھر میں نے اپنا ریوالور زمین سے اٹھا لیا اور دروازہ

اندر سے مقفل کر دیا۔

اسکینڈل زمین پر پڑا میری کارروائی کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لگائے زخموں کے باعث دیوار چین کا نقشہ پیش کر رہا تھا، میں نے اپنی جیب سے اپنا شناختی نشان نکالا اور دونوں کے سامنے کر دیا۔

"میرا نام کاشون ہے اور میں ایف بی آئی کا اسپیشل ایجنٹ ہوں، اب بتاؤ تم کچھ بتانے کے لیے تیار ہو یا پھر تمہیں چارلس اور میلانڈر کے قتل کے الزام میں پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا جائے، میں جانتا ہوں تم نے انہیں قتل نہیں کیا مگر میری شہادت پر تم پھانسی کے تختہ دار سے نہیں بچ سکو گے۔"

اسکینڈل نے پلکیں جھپکائیں اور لرزتی آواز میں بولا۔

"میلانڈر کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں کہ کب اور کیسے وہ ٹیلی فون باکس میں پہنچا اور کس نے اسے ہلاک کیا، البتہ اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ حرکت روڈی کی نہیں تھی، میں شروع سے آخر تک اپنی جگہ موجود تھا۔"

"کارلونا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اسے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"وہ ایک خطرناک عورت ہے، میڈرڈ کلب میں آنے سے پہلے کسی معمولی کلب میں ڈانسر تھی لیکن میڈرڈ میں آتے ہی اس کا نام چمک اٹھا۔ روڈی کے علاوہ کئی سرپھرے اس کے لیے دیوانے ہیں لیکن وہ صرف روڈی کی محبت کا دم بھرتی ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ روڈی کو احمق بنا رہی ہے۔" اسکینڈل نے بتایا۔

"چارلس کا قتل کس نے کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً یہ حرکت روڈی ہی کی تھی۔" اسکینڈل نے انکشاف کیا۔ "جب کارلونا اسٹیج پر رقص کر رہی تھی تو میں نے اسے ڈریسنگ روم سے نکل کر اسٹیج کی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا اور ہاتھ کی گرفت کسی شے پر تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کسی کی جان لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے مجھے بغلی روشنی بجھانے کو کہا اور ہال میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ لوٹ آیا اور مجھ سے بولا۔

"مت بھولنا کہ میں تمام عرصہ کارلونا کے کمرے میں رہا اور تم نے کسی وقت بھی مجھے کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ آپ ہی بتائیے! میں اس کی بات کیسے ٹال سکتا تھا؟" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"چارلس کے مارے جانے کی وجہ؟"

"وہ مجھے نہیں معلوم۔" اسکینڈل نے جواب دیا۔ "روڈی جیسا شخص کسی کو قتل کرنا چاہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں کو اس کی وجہ بھی بتا دے۔" وہ ذرا سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ "شاید آپ کو علم نہیں کہ روڈی نے میرے بھائی کو بھی ہلاک کیا تھا۔ محض اس لیے کہ اس نے روڈی کے کسی راز کو افشا دینے کی کوشش کی تھی، وہ روڈی کا خاص آدمی تھا اور اکثر اسے اپنے راز بھی بتا دیا کرتا تھا۔ روڈی نے اس کے سر کو بوتل کی ضرب سے چکنا چور کر دیا تھا۔ بھائی کے مرنے کے بعد روڈی نے مجھے میڈرڈ کلب میں کام دلایا۔ وہ تنخواہ کے علاوہ مجھے دو سو ڈالر فی ہفتہ دیتا ہے اور اس کے بدلے، میں اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہوں۔"

مجھے یاد آیا۔ میلانڈر نے بھی کسی ایسے شخص کا تذکرہ کیا تھا جس کا سر بری طرح چکنا چور ہو گیا تھا۔ اس نے بے ہوشی کے عالم میں جہاز سے سرکاری سونا اڑا لیے جانے کی اسکیم کا انکشاف کیا تھا۔ پھر بے ہوشی کے عالم میں ہی مر گیا اور اس افواہ کو سن کر اعلیٰ حکام نے پہلے میلانڈر پھر مجھے اس معاملے کی تفتیش پر مامور کر دیا۔ میں نے مزید تصدیق کی خاطر اس سے پوچھا۔

"تمہاری مراد اس شخص سے ہے نا جو بیلا ویسٹا اسپتال میں بے ہوشی کے عالم میں مر گیا تھا؟" اسکینڈل نے اثبات میں سر ہلایا اور بتایا کہ وہ اس کا بھائی تھا۔

میں نے دوسرے شخص کی طرف رخ کیا۔ "اب تم بھی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟" وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا، پھر بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ گیرج روڈی کی ملکیت ہے اور میرا کام بس اتنا ہے کہ خراب کاروں کی مرمت کر کے انہیں قابلِ استعمال بنا دوں، تمام آمدنی روڈی کو جاتی ہے اور وہ میری محنت کا مناسب معاوضہ مجھے دیتا ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اسکینڈل نے بتایا۔ "اسے روڈی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔"

"اب میرے آخری سوال کا جواب دو۔۔۔روڈی کہاں رہتا ہے؟"

اسکینڈل ذرا سا ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "وہ ایسٹ اسٹریٹ پر ففتھ ایونیو میں رہتا ہے۔" اس نے مجھے روڈی کے فلیٹ کا نمبر بتایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کے سوا کوئی اور جگہ ہو تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا، وہ درست کہہ رہا تھا۔ اب میرے سامنے صرف ایک سوال تھا اور وہ یہ کہ ان دونوں کے ساتھ کیا کیا جائے تاکہ وہ اس گفتگو کا کسی سے تذکرہ نہ کر سکیں۔ میں اس شہر میں اپنی شخصیت کے چہرے سے نقاب اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ جلد ہی میرے ذہن نے اس مشکل کا حل بھی پیش کر دیا۔ انہیں

http://pakurdupoetry.blogspot.com

کچھ دنوں کے لیے روپوش رکھنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے دونوں کو رسی کے ذریعے کرسیوں پر مضبوطی سے باندھ دیا۔ اب وہ کسی طرح بھی خود کو آزاد نہیں کرا سکتے تھے۔

"اچھا دوستو! اجازت، جلد ہی کچھ لوگ آ کر تمہیں اس گرفت سے آزاد کریں گے اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

میں نے کمرے کی روشنی بجھاتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔ مجھے فوری طور پر کسی پبلک کال آفس کی تلاش تھی۔ میں سڑک عبور کر کے گلی میں آیا ہی تھا کہ عین اس وقت مجھے اپنے عقب میں کار کی روشنی نظر آئی، میں نے احتیاطاً ہیٹ کو چہرے پر ترچھا کر لیا۔ کار بے حد نزدیک آ چکی تھی اور میں اس کی روشنی میں نہا گیا، میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا سگنل دیا، میں اوندھے منہ گرا اور زمین پر لیٹ گیا۔ عین اسی وقت کسی نے کار کے عقبی حصے سے مجھ پر ٹامی گن کا دہانہ کھول دیا۔ بیک وقت کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئیں۔ اگر مجھے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میرا جسم چھلنی ہو گیا ہوتا، گولیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہی کار کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خاصے فاصلے پر اس کی عقبی بتی جلتی دکھائی دی۔ پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اٹھا اور داہنی سمت موجود ذیلی سڑک پر دوڑ پڑا۔ میں اپنی پشت پر دروازے اور کھڑکیوں کے کھلنے کی آوازیں اور لوگوں کی حیرت بھری صدائیں سن رہا تھا، میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ مسلسل راستہ بدل رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی شخص مسلسل میری نگرانی کر رہا ہے اور موقع ملتے ہی میری جان لینے میں دیر نہیں کرے گا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ہلکی سی خراش بھی نہ آئی تھی۔

میں بڑی سڑک پر آیا تو میری نگاہ ایک پبلک فون بوتھ پر پڑی۔ ڈائل گھما کر میں نے آپریٹر سے نیویارک "جی" دفتر کا نمبر مانگا۔ فوراً ہی سلسلہ ملا دیا گیا اور دوسری جانب سے آواز آئی۔

"ہیلو... کوڈ نمبر پلیز۔"

میں نے اپنا کوڈ نمبر دہرایا اور اسے بتایا کہ الیروس روڈ کے ایک دو منزلہ گیرج میں دو آدمی بندھے پڑے ہیں۔ انہیں فوراً وہاں سے ہٹایا جائے اور کم از کم چودہ پندرہ دن حراست میں رکھا جائے، یہ خیال رہے کہ اس دوران میں وہ کسی سے مل سکیں نہ ان کا پیغام کسی تک پہنچ سکے۔ میرے مخاطب نے وعدہ کیا کہ سارا کام میری ہدایت کے مطابق انجام دیا جائے گا۔

فون بوتھ سے باہر نکل کر میں نے سگریٹ جلایا اور آئندہ اقدام کے بارے میں سوچنے لگا۔ حالات بتا رہے تھے کہ دشمن اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا اور میری جان لینے کے درپے تھا۔

صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اتنا وقت تھا کہ روڈی سے اس کی رہائش گاہ پر ملاقات کی جا سکتی تھی۔ میں روڈی کو بتانا چاہتا تھا کہ لوگوں کو ٹامی گن سے ہلاک کرنے کی کوشش میرے نزدیک انتہائی بزدلانہ فعل ہے لیکن روڈی سے ملنے سے پیشتر کورٹ ہوٹل میں جانا ضروری تھا جہاں میں پہلے مقیم تھا ممکن تھا کہ میں نے واشنگٹن دفتر سے جو باتیں دریافت کی تھیں۔ شاید ان کا جواب آ گیا ہو۔

ہوٹل پہنچا تو ڈیسک کلرک نے ایک لفافہ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے لفافہ چاک کیا تو اندر سے ایک صابن کمپنی کا اشتہار نکلا۔ اشتہار کی پشت پر خفیہ الفاظ میں حسب ذیل پیغام درج تھا۔

"رپورٹ مل گئی۔ نیویارک پولیس کو میلانڈر کے قتل کی تفتیش ملتوی کرنے کی ہدایت دے دی گئی ہے۔ دوسرا مقتول چارلس وال اسٹریٹ کے ایک معروف تاجر کا لے پالک بیٹا تھا۔ کچھ عرصے سے اس کے قانونی والد نے اس کی آوارہ مزاجی سے تنگ آ کر اس کے اخراجات کی ادائیگی سے ہاتھ روک لیا تھا جس کی وجہ سے اس نے جرائم پیشہ افراد سے ربط بڑھا لیا... دو کروڑ پونڈ کی مالیت کا سونا، جس کا کل وزن آٹھ ٹن ہے۔ اگلے دو دن میں انگلینڈ روانہ کر دیا جائے گا۔ فی الحال سونا فیڈرل بینک سے نکال کر ایک تیز رفتار بحری جہاز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جہاز کے بین الاقوامی سمندر میں پہنچتے ہی سونے کو ایک دخانی کشتی میں لاد دیا جائے گا اور یہی کشتی سونے کو منزل مقصود تک پہنچائے گی۔

واضح رہے، بار برداری کی یہ تبدیلی سونا لوٹنے والے گروہ کو غلط راہ پر ڈالنے کی غرض سے عمل میں لائی گئی ہے۔"

رپورٹ پڑھنے کے بعد مجھے مایوسی ہوئی، حکومت کا یہ خیال کہ سونے کو تیز رفتار بحری جہاز سے منتقل کر کے ایک معمولی دخانی کشتی کے ذریعے انگلینڈ پہنچایا جائے، میرے نزدیک درست نہ تھا، یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن اور بھٹک گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ چارلس بھی سونا لوٹنے والی سازش میں شامل تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ اس راز میں کسی کو شریک کرتا، اسے راستے سے ہٹا دیا گیا جبکہ میلانڈر کا قتل اس امر کا غماز تھا کہ سازشی لوگوں کو اس کی اصل شخصیت کا علم ہو گیا تھا۔

مجھے یہ بھی احساس تھا کہ سونا لوٹنے والے گروہ کا پتا چلانے کے بجائے میں اب تک اندھیرے میں بھٹک رہا تھا۔ میں نے رپورٹ جلا کر ضائع کر دی اور فون ڈائریکٹری میں روڈی کے گھر کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ میں نے ہوٹل کے زیریں حصے میں جا کر ڈیسک کلرک کے ہاتھ میں دس ڈالر کا نوٹ رکھا اور اسے بتایا کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ چھوٹا

سا مذاق کرنا چاہتا ہوں، اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے اسے روڈی کا نمبر دے کر تاکید کی کہ بیس منٹ بعد وہ اس نمبر پر فون کر کے میری رائس کو دریافت کرے۔

پندرہ منٹ بعد ہی میں روڈی کی رہائش گاہ کے سامنے کھڑا تھا، روڈی کی رہائش دوسری منزل کے تیسرے فلیٹ میں تھی، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ کسی نے دروازہ کھولا، وہ اپنے لباس سے تو ہٹلر نظر آتا تھا، مگر اس کے چہرے کی کرختگی کچھ اور ظاہر کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"روڈی کو بتاؤ کہ ہیری رائس اس سے ملنا چاہتا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"یہ بہانہ بنانے کی کوشش مت کرنا کہ روڈی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔" میرے اس جملے نے اس کی حیرت کو اور بڑھا دیا۔ وہ الٹے پیروں اندرونی حصے میں آ گیا اور پلک جھپکتے میں لوٹ آیا۔ اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر مجھے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ میں بے خوفی سے چلتا ہوا روڈی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ روڈی اور کارلوٹا کے علاوہ کمرے میں تین افراد ایسے بھی موجود تھے جنہیں اس سے پیشتر مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

"تمہاری آمد میرے لیے غیر متوقع ہے ہیری! یقین کرو، اتنی رات گئے میں کسی مہمان سے ملنا پسند نہیں کرتا۔" روڈی مجھے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا اور اضافہ کیا۔

"مگر تمہیں میرے اصولوں کا علم نہیں ہے اس لیے مجبوراً مل لینا مناسب سمجھا، کہو کیسے آنا ہوا؟"

"تمہارے اصول جلد ہی بدل جائیں گے روڈی!" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں تمہاری گردن ناپنے کے لیے آیا ہوں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟" اس نے بناوٹی حیرت کا اظہار کیا۔ "مت بھولو کہ تم میرے ہی گھر میں مجھے دھمکیاں دے رہے ہو۔"

"چالاک مت بنو روڈی!" میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے مجھ پر ٹامی گن سے گولیاں برسائی گئی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ تمہارے اشارے پر ہی کیا گیا تھا مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھ بے ضرر آدمی سے تمہیں کس قسم کا اور کیوں کر عناد ہے؟"

"مجھے نہیں پتا، تم کس واقعے کا ذکر کر رہے ہو۔" اس نے لاتعلقی سے شانے اچکائے۔

"اس کمرے میں موجود افراد میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو تمہارے قتل کا خواہاں ہو، نہ ہی اس فائرنگ سے جس کا ذکر تم نے ابھی کیا میرا یا میرے کسی دوست کا کوئی تعلق ہے۔"

"روڈی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس بار کارلوٹا نے لب کشائی کرتے ہوئے گویا اس کی حمایت میں گرہ لگائی اور مسکرا کے میری طرف دیکھا۔

اس دوران میں روڈی نے میز پر رکھی بوتل سے تھوڑی شراب گلاس میں انڈیلی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لو یہ گلاس پی لو، تمہیں سکون مل جائے گا۔" وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر مزید گویا ہوا۔

"ریگل نے مجھے بتایا تھا کہ چارلس کے قتل کے دوسرے دن تم اپنے طور پر حادثے کی تفتیش کے لیے اس سے ملنے گئے تھے، میری رائے مانو خود کو سفری بوند فروخت کرنے تک ہی محدود رکھو۔ اگر تم نے ہر معاملے میں دخل اندازی کی عادت نہ چھوڑی تو ایک دن پچھتاؤ گے....."

وہ میری جانب سے کچھ بولنے کا منتظر رہا لیکن میری بہ دستور خاموشی پر خود ہی بول پڑا۔

"ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسکینڈل سے ملنے میں تمہاری کیا مصلحت تھی؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم جواب نہیں دو گے میں ہی تمہیں بتاتا ہوں۔ تم اس سے یہ سوچ کر ملے تھے کہ اس کا تعلق یقیناً چارلس کے قاتل سے ہو گا مگر تم اس شخص کو بھول گئے جس کے بارے میں تم کھوج لگاتے پھر رہے ہو۔ ظاہر ہے، چارلس کا قاتل یہ کب گوارا کرے گا کہ ایک اجنبی شخص اس کے کاموں میں دخل دے اب اگر اس شخص نے تمہیں گزند پہنچانے کی کوشش چاہی ہے تو اس کا الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش مت کرو، مجھے نہیں پتا کہ کس نے تم پر فائرنگ کی تھی۔ میں اور میرے ساتھی کلب سے واپسی کے بعد یہیں ہیں، کوئی بھی اس کمرے سے باہر نہیں گیا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اسکینڈل سے ملنے گیا تھا؟" میں نے تیز نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا اور اضافہ کیا۔ "جبکہ بہ قول تمہارے کلب سے واپسی کے بعد تم میں سے کوئی بھی کمرے سے نہیں نکلا؟"

روڈی ذرا دیر ٹھٹکا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہاری آمد سے ذرا دیر قبل اسکینڈل یہاں آیا تھا۔"

"بالکل غلط۔" میں پھنکارا۔

"اسکینڈل تمہارے پاس آیا ہے نہ اس نے فون پر تمہیں اطلاع دی۔ میں نے اسکینڈل اور گیرج کے نگراں کو رسی سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ کوئی بھی حرکت کرنے سے قاصر تھے اور

http://pakfunplace.blogspot.com

تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اسکینڈل اور گیرج مستری، دونوں کو تم کچھ عرصے تک دیکھ بھی نہیں سکو گے۔ میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے۔"

روڈی اپنا "سفید جھوٹ" پکڑے جانے پر چکرا کر رہ گیا۔ اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بھی کافور ہو چکی تھی۔

میں نے کمرے میں موجود افراد کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔

"اگر میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ذاتی طور پر کسی معاملے کی تحقیق کرنا چاہوں تو کیوں نہ کروں۔ مجھے پہلے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ چارلس کا قتل تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔"

قدرے توقف کے بعد میں نے پھر کہا۔ "میرا ذاتی خیال ہے کہ مس کارلوٹا... بھی تمہاری کار شریک ہے۔ تم دونوں نے یہ جان کر کہ چارلس کی ذات تمہارے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے، اسے راستے سے ہٹا دیا۔"

"تمہارا رویہ ناقابلِ برداشت ہے ہیری!" روڈی بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں ایسا سبق دوں گا جسے تم زندگی بھر فراموش نہ کر سکو گے، اور آئندہ کسی معاملے میں مداخلت سے پہلے دس مرتبہ سوچو گے۔" وہ کھلی جارحیت پر اتر آیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ آتش دان پر رکھے شکاری چاقو کو اٹھا کر میری طرف لپکا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

"میرے دوستوں کو علم ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور اگر مقررہ وقت پر میں ان کے پاس نہ پہنچا تو وہ پولیس کو اطلاع دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔" میرا جملہ مکمل ہوتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر میں مطمئن ہو گیا جبکہ اس سے پیشتر فون کا نہ آنا مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔

کارلوٹا نے اٹھ کر فون پر جواب دینے کا فرض ادا کیا جبکہ روڈی جھلائے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ فون پر دوسری طرف سے آواز سنتے ہی اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا۔

"یہ کال ان کے لیے ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے میری جانب اشارہ کیا۔

میں ریسیور اس سے جھپٹتے ہوئے زور سے چلایا۔ "فون کرنے کا شکریہ۔ اگر میں پندرہ منٹ میں واپس نہ پہنچوں تو جیسا میں نے کہا تھا، اس پر عمل کرنا۔" ڈیسک کلرک میری بات سن کر یقیناً متعجب ہوا ہوگا مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا، میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ درحقیقت میری دور اندیشی کام دے گئی تھی ورنہ روڈی مجھے زندہ چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن تقریباً گیارہ بجے میں ہوٹل کورٹ گیا۔

استقبالیہ کلرک نے مجھے دیکھتے ہی ایک لفافہ تھما دیا۔ میں نے اسے دس ڈالر بطور انعام دیے اور اس سے کہا۔

"اگر کوئی شخص مجھے تلاش کرتا ہوا آئے تو اسے یہ نہ بتایا جائے کہ میں یہ ہوٹل چھوڑ چکا ہوں۔"

میں ہوٹل سے باہر آیا اور قریبی ریستوران کی ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ لفافہ کھول کر دیکھا تو اندر سے ہینگ کا خط برآمد ہوا۔ اس نے لکھا تھا۔

"ڈیئر ہیری!

میں نے سرکاری سونا لوٹ لے جانے کی سازش سے متعلق کئی مفید باتیں معلوم کر لی ہیں۔ حالات بہت پیچیدہ ہیں۔ چارلس، وال اسٹریٹ کے معروف تاجر کا لے پالک بیٹا ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں، اگرچہ چارلس کی بری عادتوں کے باعث وہ اس سے قطع تعلق کر چکا تھا لیکن اس محبت کی وجہ سے جو اسے اپنے نالائق لے پالک سے تھی، وہ اس کے قاتل کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اپنے طور پر قاتل کو تلاش کرنے اور اسے سزا دینے کا ارادہ کر چکا ہے۔ اس کے ملاقاتیوں میں جس کا نام سان رے ما ہے۔ وہ روحانی علوم میں ماہر سمجھا جاتا ہے۔ رابرٹ نے بہت سے مواقع پر اس کے علم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ پولیس، چارلس کے قاتل کی تلاش میں غفلت برت رہی ہے تو اس نے طے کر لیا کہ وہ سان رے ما کی مدد سے اس معمے کا حل تلاش کرے گا۔ سان نے رابرٹ کو بتایا کہ قاتل کا پتا چلانے کے لیے تو وہ ماحول پیدا کیا جانا ضروری ہے جو چارلس کے قتل کے وقت تھا۔ نیز وہ لوگ بھی وہاں موجود ہوں جو قتل کے وقت اس کے نزدیک بیٹھے تھے پھر وہ چارلس کے قاتل کی نشان دہی کر دے گا۔

"رابرٹ نے اس تجربے کے لیے اپنی دخانی کشتی اٹلانٹک کو منتخب کیا ہے۔ اور اس میں میڈرڈ کلب سے مشابہ اسٹیج، آرکسٹرا پلیٹ فارم اور نشست گاہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ انتظام مکمل ہوتے ہی تمام مشتبہ لوگوں کو بلانے کی کوشش کی جائے گی جن میں تمہارا اور روڈی کا نام بھی شامل ہے۔ سان کا کہنا ہے کہ آرکسٹرا جیسے ہی ساز بجانا شروع کرے گا وہ اپنی انگلی قاتل پر رکھ دے گا۔ بظاہر اس اجتماع کی کوئی قانونی حیثیت نہیں لیکن میں سان سے بھی مل چکا ہوں اور اس نے میرے بارے میں بہت سی باتیں ایسی بتائی ہیں جن کا علم سوائے میرے کسی کو نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر مجھے یقین ہے کیا عجب کہ سان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہو۔ میں بہرحال اس کی غیب دانی کا بھی معترف ہو

"اب میں تمہیں کچھ ویرا کے بارے میں بھی بتا دوں۔ ویرا ایک صاحب حیثیت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ قبل چارلس سے منسوب ہو گئی تھی اور بوڑھا رابرٹ دونوں کی شادی کی منظوری بھی دے چکا تھا لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ چارلس، کارلوٹا کی ذات میں دلچسپی لینے لگا جس کے باعث ویرا اس سے متنفر ہو گئی۔ میں رابرٹ اور سان سے ملاقات کے بعد ویرا سے ملنے بھی گیا۔ اس کا حال مجھے رابرٹ کی زبانی معلوم ہوا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جلد ہی تم سے ملنے والی ہے۔ ویرا قاتل کی تلاش میں رابرٹ کی اسکیم سے متعلق نہیں ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ چارلس کے قتل میں روڈی اور کارلوٹا کا ہاتھ ہے۔ میں حیران ہوں چارلس نے اسے نظر انداز کر کے کارلوٹا کی پوجا کیوں شروع کر دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ روڈی کے اشارے پر کارلوٹا نے کسی خاص نظریے کے تحت چارلس سے ربط بڑھایا تھا۔

"اب ایک اہم بات سنو اور وہ یہ کہ ویرا کا ایک کزن جو ویرا میں دلچسپی لیتا ہے۔ امریکی فیڈرل بینک میں کسی اہم شعبے میں متعین ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ویرا نے اپنے کزن کی وساطت سے سونے کی روانگی کا حال معلوم کر لیا ہوگا اور اس کے ذریعے یہ راز چارلس تک منتقل ہو گیا ہوگا۔ پھر چارلس کے توسط سے یہی راز سونا لوٹنے کی سازش کرنے والے گروہ تک پہنچ گیا ہوگا، لیکن یہ صرف اندازہ ہی ہے، اس کی صداقت میں فی الحال کسی قسم کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہوں۔"

تمہارا ہینگ"

ہینگ کا خط دلچسپ اور اہم تھا۔ مجھے اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا کہ ابھی اور بھی لوگوں سے سابقہ پڑنے والا تھا۔ شکوک و شبہات کے تمام بے نام و نشان پگڈنڈیاں روڈی کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ ہینگ کی قیاس آرائی میرے لیے تعجب خیز نہ تھی، اس کے علاوہ مجھے رابرٹ یا ویرا سے ملنے میں بھی کوئی تامل نہ تھا۔ میں ہوٹل واپس آ گیا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر ایک بار پھر ہینگ کا خط پڑھا۔

☆☆☆

شام کے چار بجے ہوٹل کورٹ کے کلرک نے مجھے فون پر بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ویرا نامی خاتون نے مجھے فون پر دریافت کیا تھا، میں اس سے بارہ بروک لین میں جا کر مل لوں۔ وہ پانچ بجے تک میرا انتظار کرے گی۔ متعلقہ کلرک نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک شخص میرے نام کا ایک خط بھی اس کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ لفافے پر "بہت اہم"...... تحریر تھا اور بھیجنے والے کا نام بھی رابرٹ تھا۔ میں نے ہوٹل کے ایک ملازم کو کورٹ ہوٹل جا کر کلرک سے وہ خط لانے کا حکم دیا۔ خیال تھا کہ ویرا سے ملاقات کے بعد واپس آ کر خط کا مطالعہ کروں گا۔

بروک لین نامی عمارت تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔ عمارت کے نگراں سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ وہ تیسری منزل کے بارھویں فلیٹ میں ملے گی۔ عمارت میں لفٹ نہیں تھی۔ لہٰذا سیڑھیاں طے کر کے تیسری منزل پر پہنچا اور فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کسی نے آ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ڈربی ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور خاصا جسیم اور وجیہ شخص تھا۔

"ہیری رائس!" وہ میری جانب دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کمرا سامانِ آرائش سے خالی تھا اور سوائے چند خالی بکسوں کے جن میں سامان بھر کر بھیجا جاتا ہے، کوئی شے بھی کمرے میں موجود نہ تھی۔ میرے ذہن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"مسٹر ہیری! ان بکسوں میں سے کسی پر بیٹھ جاؤ اور ہمارے چند سوالوں کا جواب دو۔" ڈربی ہیٹ والا مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر بولا۔

"میں یہاں تمہارے نہیں، مس ویرا سے ملنے آیا ہوں۔" میں اطمینان سے ایک بکس پر بیٹھ گیا۔ "بتاؤ وہ کہاں ہیں؟"

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے کا بغلی دروازہ کھلا اور ایک دوسرا شخص کمرے میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور میرے مقابل بکس پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈربی ہیٹ والے نے اپنی جیب سے ایک شناختی بیج نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

"ہم لوگ ڈیفنس ڈیٹیکٹیو ایجنسی کے رکن ہیں اور مس ویرا کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ براہ مہربانی ہمارے چند سوالوں کا جواب دو۔"

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری ایجنسی۔" میں جھلا کر بولا۔ "اگر مس ویرا موجود ہیں تو انہیں بلاؤ۔ بصورت دیگر میں یہاں ایک منٹ رکنے کے لیے تیار نہیں۔" میں بکس پر ہاتھ پیچھے کیے بیٹھا تھا۔ دفعتاً میری انگلیاں کسی سخت چیز سے جا ٹکرائیں میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ پیٹیاں کھولنے کا اوزار تھا۔ میں نے اسے اپنی مدافعت میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ لاتوں کا بھوت ہے۔ باتوں سے نہیں مانے گا۔" ڈربی ہیٹ والے نے اپنے ساتھی سے کہا اور جارحانہ انداز میں میری جانب لپکا۔ میں نے لوہے کا بھاری اوزار بکس سے اٹھایا اور اس

http://pakfunplace.blogspot.com

پر چینک مارا۔ آہنی اوزار اس کے چہرے پر پڑا، وہ بلبلاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس کا وار خالی گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں اس سے لپٹ گیا اور اسے رگیدتا ہوا بکس کی طرف لے گیا۔ میں نے مہلت دیے بغیر اس کے بال پکڑے اور اس کا سر زور سے آہنی بکس پر دے مارا وہ تکلیف سے کراہا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میں نے آخری بار اسے زوردار ٹھوکر رسید کی اور ہیٹ والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے ایک جانب بیٹھا تھا۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی اور خون بہتا ہوا آستینوں تک آ گیا تھا۔ میں نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے جبڑے پر لگا دیا۔ اس آخری ضرب نے اس کے ہوش اڑا دیے اور وہ لہراتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ میں نے اسے بھی گھسیٹ کر اس کے قریب ڈال دیا اور لوہے کا اوزار لے کر قریب پڑے بکس پر بیٹھ گیا۔

میں اب ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اچانک گلی کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھی پستول لیے ہوئے تھی۔ اس نے پستول کا رخ میری جانب کیا اور کہا۔

"مسٹر ہیری! اتفاق سے تم فتح یاب ہو گئے ہو لیکن یاد رکھنا اگر تم ذرا بھی ہلے تو میں گولی چلانے میں کوئی ... تامل نہیں کروں گی۔"

اس پری جمال حسینہ کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر مجھے بذلہ سنجی کی سوجھی۔

"پستول چلانے کی ضرورت نہیں، اے مہ وش ماہ جمال ... تمہاری نظروں کے تیر ہی کافی ہیں۔" مگر پھر اس کے تیور دیکھ کر فوراً گہری متانت سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ میں مس ویرا لائیڈ سے ہم کلام ہوں۔"

اس نے دھیرے سے اپنے سر کی اثباتی جنبش سے اقرار کیا تو میں نے پھر کہا۔

"لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس حرکت سے تمہارا مقصد کیا تھا؟" یہ کہہ کر میں بکس سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر ان دونوں کی طرف مدد طلب نگاہ سے دیکھا مگر وہ دونوں اس کی مدد سے قاصر تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پستول لیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے پستول، پتلون کی عقبی جیب میں ٹھونس لیا۔ وہ بے بسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم نے تو فون پر مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"آؤ، کسی مناسب جگہ بیٹھ کر بات کرتے ہیں، کچھ ایک دوسرے کی سنتے ہیں۔"

لیکن وہ اب بھی خاموش ہی کھڑی رہی۔ میں نے اسے مذبذب میں مبتلا دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر فلیٹ سے باہر نکل آیا اور اسے لے کر قریبی ریستوران میں گھس گیا۔ وہ گھسٹنے کے انداز میں میرے ساتھ چل رہی تھی اور کسی قدر ... ہراساں بھی نظر آنے لگی تھی۔

میں نے بیرے کو بلا کر کافی کا آرڈر دیا۔

"ڈولینس ایجنسی والوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک وحشی انسان ہو اور صرف تشدد ہی کے ذریعے وہ تمہیں زبان کھولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔" ویرا نے بالآخر لب کشائی کی۔ "لیکن اب پتا چلا، ان کی اطلاع غلط اور گمراہ کن تھی۔"

"جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ "یہ بتاؤ تم مجھ سے کون سی بات معلوم کرنے کی خواہش مند ہو؟"

"مسٹر ہیری!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "چارلس کے ساتھ میری منگنی ہو چکی تھی۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے اور میں یہ بات ثابت کرنے کے لیے زمین و آسمان ایک کر دوں گی۔"

پھر اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح اس رات کے حالات سننے کے بعد وہ میری جانب سے مشکوک ہو گئی تھی اور مجھے بروک لین بلانے سے اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ ان سراغ رسانوں کی مدد سے میری زبان کھلوا سکے۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ چارلس کے قتل سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں اور جس رات قتل ہوا اس رات میں نے چارلس کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس سے پیشتر میں اسے جانتا تک نہ تھا اور نہ ہی کبھی اس کے متعلق کہیں سنا تھا۔

"کیا تمہیں رابرٹ کی جانب سے کوئی خط موصول ہوا ہے؟" اس نے میری بات کاٹی۔

میں نے گہری سانس خارج کر کے نفی میں اپنا سر ہلایا تو اس نے درخواست کی کہ چارلس قتل کے بارے میں حاصل کردہ معلومات سے اسے بھی آگاہ کر دوں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ بروک لین میں اس نے مجھے اس خیال سے بلایا تھا کہ شاید میری جیب میں وہ خط بھی موجود ہو۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں مطلق دشواری نہ ہوئی کہ واقعات و حالات لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہو رہے تھے لیکن ایک حد تک میرے موافق ہی تھے۔

میں ویرا کے دلی جذبات معلوم کرنا چاہتا تھا مگر اب تک مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنی نشست پر پہلو بدلا

اور بےپروائی سے بولا۔ "تم چارلس کے قتل میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟"

"چارلس کسی اچھی عادتوں کا حامل تھا۔" ویرا نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ اچھی عادات و اطوار کا مالک نہیں تھا اس کے باوجود میں اس سے محبت کرنے پر مجبور تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں اس سے ہر حالت میں محبت کرتی تھی۔"

"برا مت ماننا، جب اسے تم جیسی بے مثل حسینہ کی محبت حاصل تھی تو پھر وہ کیوں شبینہ کلبوں میں جاتا تھا، اور کارلوٹا جیسی عورتوں سے ملتا تھا؟"

کارلوٹا کا نام سن کر اس کا ماتھا شکن آلود ہو گیا۔

"وہ اول درجے کا احمق تھا۔" وہ برہمی سے بولی۔ لیکن فوراً ہی نارمل ہو گئی اور آہستگی سے بولی۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ تم پر اعتماد کر لوں۔ مجھے یقین ہے کہ چارلس کا قاتل بہت کچھ جانتا تھا۔"

"کیا مطلب؟" اس کی بات پر میں تعجب میں پڑ گیا۔ "قاتل کیا جانتا تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔" وہ گومگو لہجے میں بولی۔ "مگر جب اس رات چارلس کو قتل کر دیا گیا، اس شب اس نے فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مشکل میں [illegible] کرلیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی کہ ان باتوں سے اس کا کیا مطلب ہے مگر اس نے تفصیل بتائے بغیر صرف اتنا کہا کہ وہ فیڈرل محکمے کے ایک ایجنٹ سے ملنے میڈرڈ کلب جا رہا ہے اور اس نے کسی کو اس سلسلے میں خط بھی لکھ دیا ہے پتا نہیں، اس نے وہ خط کسے لکھا تھا۔"

"جہاں تک میرا تعلق ہے یقین کرو مجھے کسی نے کوئی خط نہیں لکھا۔" میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے دوسری کوشش کی۔ "سنو ویرا! مجھے صحیح صورت حال کا علم نہیں ہے مگر یہ اندازہ ہے کہ چارلس کو اچانک ہی کسی ایسی بات کا علم ہو گیا ہوگا جو اس کے لیے صدمے کا باعث تھی۔ اس نے اس انکشاف پر کسی کو خط لکھ دیا ہوگا اب یہ نہیں معلوم کہ اس نے وہ اہم خط کسے لکھا تھا لیکن اب جبکہ چارلس مر چکا ہے اور تم کسی صورت بھی اسے واپس نہیں لا سکتیں۔ تمہیں اس سے کیا غرض کہ چارلس نے کس کو خط لکھا تھا۔ البتہ تمہاری یہ خواہش بجا ہے کہ اصل قاتل کو بے نقاب کیا جائے اور سچ پوچھو تو میری تمنا بھی یہی ہے کہ چارلس کے قاتل کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیکھوں۔"

جواب میں ویرا نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ وہ غالباً مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ چند ثانیے پرسوچ انداز میں خاموش رہی، پھر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ممکن ہے ابھی کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جو میں تمہیں بتانا چاہوں مگر برا مت ماننا... میں اس وقت کسی شخص پر اعتبار نہیں کر سکتی۔"

"کیا اپنے چچازاد بھائی پر بھی نہیں؟" میں نے اس پر دوسرے طریقے سے حملہ کیا۔

"جو یونائٹڈ اسٹیٹس کے فیڈرل بینک میں کسی اہم شعبے میں ملازم ہے۔" میری بات پر اس کی دلکش آنکھوں میں حیرت اتر آئی مگر پھر جلد ہی سنبھل کر بولی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ مزید گفتگو کے لیے تیار نہ تھی، میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور امید ظاہر کی کہ میں فون پر اس سے رابطہ رکھوں گا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ریستوران سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ہوٹل کا ملازم رابرٹ کا خط لے کر آ چکا تھا۔ میں نے کلرک سے خط لیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"ڈیئر ہیری! اس باپ کے احساسات کا اندازہ لگاؤ جس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا ہو اور قاتل کی تلاش میں کوتاہی برتی جا رہی ہو۔ مجھے وہ وجہ نہیں معلوم جس کے باعث میرے بیٹے کو میڈرڈ کلب میں ہلاک کر دیا گیا۔ تاہم مجھے معلوم ہوا ہے کہ حادثے کے وقت تم بھی وہاں موجود تھے۔ اور لیفٹیننٹ ریسلر تمہیں مشتبہ جان کر پولیس ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا جس وقت چارلس کے قتل کی خبر مجھ تک پہنچی، مجھے یقین تھا کہ قاتل کی گرفتاری محض چند گھنٹوں کا کام ہوگی لیکن ابھی تک پولیس کو کوئی بھی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جو قاتل کی شناخت میں معاون ہو، یہی وجہ ہے کہ میں نے خود اس معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا ایک واقف کار جس کا نام سان ہے۔ روحانی علوم کا ماہر ہے۔ اس نے بہت سے مواقع پر اپنے علم کی سچائی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر ..... روحانی نشست اٹلانٹک کے ہال کمرے میں وہی ماحول پیدا کیا جائے جو چارلس کے قتل کے وقت میڈرڈ کلب کا تھا تو وہ قاتل کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق جو لوگ حادثے کے وقت وہاں تھے، ان کا بھی موجود ہونا لازمی ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے جو جائے واردات پر موجود تھے، اس کارروائی میں شرکت کرنے کی درخواست کی ہے اور انہوں نے اپنی شرکت کا یقین دلایا ہے۔

http://paktunplace.blogspot.com

"لہٰذا... میں تم سے بھی انسانیت کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ اگر تمہیں سان پر اعتقاد نہ ہو تب بھی میری مدد سے دریغ نہ کرنا۔ امید ہے کہ خط پڑھتے ہی بندرگاہ پہنچنے کی کوشش کرو گے جہاں میری کشتی ان دنوں لنگر انداز ہے۔ اس کشتی کا انتخاب میں نے اس لیے کیا ہے کہ کسی قسم کی خلل اندازی کا امکان نہ ہو، خط کے ساتھ پانچ ہزار ڈالر کا چیک ہے مقررہ جگہ پہنچتے ہی اتنی ہی رقم اور پیش کی جائے گی میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اٹلانٹک وچ پہنچ کر میری مشکلات کو آسان کرو گے... نہ آنے کی صورت میں تمہیں قاتل قرار دیا جاسکتا ہے۔

خیر اندیش

رابرٹ"

میں نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج رہے تھے۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، مجھے اٹلانٹک وچ پر پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے سفری بیگ میں چند ضروری چیزیں ٹھونسیں، ریوالور کوٹ کے نیچے کمر میں باندھا اور کلرک کے پاس جا کر بل کی ادائیگی کرتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ کسی ایسی رینٹ اے کار کا نام بتائے جہاں سے میں ایک چھوٹی مگر تیز رفتار کار حاصل کرسکوں۔ اس نے متعلقہ رینٹ اے کار کا نہ صرف نام بتایا بلکہ وہاں فون پر کار بھجوانے کی تاکید بھی کردی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک کار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پہنچ گئی۔

میں ہوٹل سے باہر آیا اور ایک پبلک فون سے ویرا کو فون کیا۔

"تم یقیناً چارلس کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی خواہش مند ہو، میں اس بارے میں تمہیں چند باتیں بتانا چاہتا ہوں، ممکن ہے ان کے ذریعے تم کسی نتیجے پر پہنچ جاؤ۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ چارلس کا قتل ریوالور سے کیا گیا تھا لیکن پولیس ہیڈ کوارٹر میں کسی کے پاس سے ریوالور برآمد نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے قاتل نے پولیس کی آمد سے قبل ہی ریوالور کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے چھٹکارا پا کر میں چوری چھپے میڈرڈ کلب میں داخل ہوا تھا مگر کوشش کے باوجود میں ریوالور نہ ڈھونڈ سکا۔ تاہم مجھے کئی ایسی شہادتیں مل گئی تھیں جو روڈی کے علاوہ کسی کو قاتل ثابت نہیں کرتیں۔ ریوالور کا نہ ملنا ظاہر کرتا ہے کہ چارلس کو ہلاک کرتے ہی روڈی اسٹیج کے عقب میں چلا گیا ہوگا اور اپنے کسی ساتھی کو ریوالور دے کر اسے عمارت کے عقبی حصے سے فرار کردیا ہوگا۔ اب اگر تم یہ بات معلوم کرلو کہ وہ شخص کون تھا جو اسٹیج کے عقبی حصے میں روڈی کی واپسی کا منتظر رہا تھا اور ریوالور لیتے ہی فرار ہوگیا تو ہر بات ظاہر ہوجائے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ روڈی تھا جس نے چارلس کو قتل کیا؟" وہ ہیجانی انداز میں چیخی۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"مگر سردست میں اس کی تصدیق میں کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکتا اور ہاں... سنو! مجھے رابرٹ کا خط مل گیا ہے، اس نے ان تمام لوگوں کو جو حادثے کے وقت میڈرڈ کلب میں تھے۔ اٹلانٹک وچ پر اکٹھا ہونے کی دعوت دی ہے لہٰذا میں بھی گولی وہارف، نیو لندن کینکٹس جارہا ہوں۔ تم میری عدم موجودگی میں میڈرڈ کلب کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا لیکن خیال رہے، میں نے نظر رکھنے کو کہا ہے، کہیں معاملہ الجھانے کی کوشش مت کر بیٹھنا۔"

اتنا کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کرنا چاہا، عین اسی وقت ویرا چیخی۔

"نہیں ہیری! تم وہاں مت جانا۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن تب تک میں ریسیور کریڈل پر رکھ چکا تھا۔

میں نے سفری بیگ اٹھایا اور گاڑی میں بیٹھ کر نیو لندن کینکٹس کی سمت روانہ ہوگیا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی میں شہری حدود سے باہر نکل آیا۔

رات کا ایک بجنے والا تھا جب میں نیو لندن کینکٹس کے قریب جا پہنچا۔ قصبے میں داخل ہوتے ہی ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ میں نے وہاں جا کر ہیوں میں ہوا بھروائی، دریافت کرنے پر پتا چلا کہ گولی وہارف اس جگہ سے پانچ میل کی مسافت پر تھا جس شخص سے میں نے گولی وہارف کا پتا پوچھا تھا۔ وہ حیرت سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی حیرانی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ چند گھنٹے پہلے درجنوں مسافروں نے اس سے گولی وہارف..... کا پتا دریافت کیا تھا اور وہ بیک وقت اتنے افراد کے اس سمت جانے پر ہی حیران تھا۔

پیٹرول پمپ سے نکل کر میں سڑک پر آیا تو کار کی روشنی میں ان گنت کاروں کے گزرنے کے نشان کچی سڑک پر صاف ظاہر ہو رہے تھے جبکہ سامنے ہی درختوں کی اوٹ میں سمندری موجوں کی آواز آرہی تھی، میرا خیال تھا کہ میں جلد ہی گولی وہارف پہنچنے والا تھا۔

دفعتاً مجھے کار کی روشنی میں درخت کا ایک موٹا تنا نظر آیا۔ جو سڑک پر اس طرح پڑا تھا کہ آگے بڑھنے کا راستہ رک گیا تھا، میں نے پھرتی سے بریک لگائے اور کار کا رخ بدل گیا۔ تھوڑی دور جا کر کار رک گئی۔ یکایک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ اس سے قبل کہ میں اپنا ریوالور نکالتا، ایک شخص

تاریکی سے نکلا اور میرے سر پر رائفل کی نال لگا دی۔ اس نے مجھے ہاتھ اوپر اٹھا لینے کی تاکید کی تھی۔ تاریکی کے باعث میں اسے زیادہ نہ دیکھ سکا کہ اس نے ملاحوں والی جرسی پہن رکھی تھی۔

"کون ہو تم... ہیری رائس؟" اس نے استفسار کیا۔

"تمہارا خیال درست ہے مگر اس حرکت کا مقصد؟" میں نے درشتی سے پوچھا۔

"کیا تم ہر شخص سے اسی انداز میں پیش آئے تھے؟"

"زیادہ جوش میں نہ آؤ، خاموشی کے ساتھ کار سے اترو اور میرے ساتھ چلو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ نتیجے کے تم خود ذمے دار ہوگے؟"

کوئی چارہ نہ دیکھ کر میں کار سے اترنے لگا۔ عین اسی وقت تاریکی سے دو ہیولے اور نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا اور دوسرا ایک نوعمر لڑکا۔ وہ دونوں بھی ملاحوں والی جرسی پہنے ہوئے تھے۔

"اسے کیبن میں لے جاؤ۔" بوڑھے نے رائفل بردار شخص سے کہا۔ پھر وہ نوعمر لڑکے کی طرف مڑ گیا۔ "اور راڈرک! تم جا کر اطلاع دو کہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔"

میں کار کا دروازہ کھول کر پائدان تک آچکا تھا اور نیچے اترتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن بوڑھے کے اصرار پر نیچے اترنا ہی پڑ گیا۔ میں نے ایک قدم پائدان سے زمین پر رکھا، پھر گھوم کر اگنیشن سے چابی نکالی۔ اس دوران میں طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چابی نکالتے ہوئے میں نے پاؤں کو حرکت دی اور رائفل بردار شخص کے پیٹ پر زوردار لات ماردی۔ ضرب کی شدت سے وہ کمر کے بل جھک گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اس سے قبل کہ وہ اسے اٹھاتا، میں نے اپنا ریوالور نکالا اور ان پر تان لیا۔

"خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ انجام کی ذمے داری تم پر ہوگی۔"

بازی پلٹ چکی تھی۔

میں نے زمین پر پڑی رائفل اٹھائی اور اسے کار کے عقبی حصے میں پھینک دی۔ پھر تینوں کو سڑک پر پڑا ہوا تنا ایک طرف ہٹانے کا حکم دیا۔ وہ مشینی انداز میں مڑے اور بھاری بھرکم تنا ایک طرف ہٹانے لگے۔

ان کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جرائم پیشہ نہیں تھے۔ تنا ایک جانب ہٹا دیا گیا تو میں کار میں جا بیٹھا۔

"مس ویرا سے کہنا، مسٹر ہیری نے پیغام دیا ہے کہ اگر وہ اپنی عقل سے کام لیتی تو کبھی ایسی حرکت نہ کرتی۔"

یہ کہہ کر میں نے کار اسٹارٹ کردی۔ جیسے ہی کار آگے بڑھی میں نے رائفل ان کی طرف اچھال دی۔

☆☆☆

نصف میل کا فاصلہ طے ہوا ہوگا کہ سمندری لہروں کے شور کے ساتھ ہی چند انسانی آوازیں سنائی دیں... تھوڑا اور آگے بڑھا تو درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ میں نے کار اس جھنڈ کی آڑ میں لے جا کر کھڑی کردی۔ سامنے ہی اٹلانٹک وچ کے مستول نظر آرہے تھے۔ متحرک روشنیاں بتا رہی تھیں کہ کشتی پر خاصی چہل پہل ہے۔ میں نے اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی تو اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا نزدیک آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ راڈرک تھا۔ اس کا رخ پارک کی جانب تھا جہاں چند کاریں کھڑی تھیں۔

تھوڑا فاصلہ دے کر میں بھی اس کے عقب میں چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ سامنے نگاہ کرتے ہی کار کی اگلی نشست پر مجھے ویرا

گفتگو کے دوران

ہر دو اشخاص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر ایک دوسرے سے متفق ہو جائیں، اس سلسلے میں دو کسانوں کی گفتگو سنیے۔

"سناؤ! اتنا عرصہ کہاں رہے؟"

"میں اسپتال میں تھا۔"

"اوہ۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں بہت اچھا ہوا۔ میں نے وہاں ایک نرس سے شادی کرلی۔"

"اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"نہیں بہت برا ہوا اس کے پہلے ہی تو بچے ہیں۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں بہت اچھا ہوا۔ ایک بہت بڑا مکان اس کی ملکیت ہے۔"

"اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"نہیں بہت برا ہوا۔ چند روز قبل وہ مکان جل گیا۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں بہت اچھا ہوا۔ وہ بھی بچوں سمیت مکان میں جل گئی۔"

"اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"ہاں، یقیناً بہت اچھا ہوا۔"

اسلم پرویز کی خوشی... شیر شاہ کراچی سے

http://pakurdupoint.blogspot.com

بیٹھی نظر آئی۔ وہ راڈرک سے محوِ گفتگو تھی۔ گفتگو اتنی مدھم آواز میں ہو رہی تھی کہ کوشش کے باوجود میں اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکا۔ تاہم سمجھ گیا۔ راڈرک اسے ناکامی کی تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

راڈرک کے جاتے ہی میں اپنی جگہ سے نکلا اور اس کی کار کے قریب جا پہنچا۔

”ہیلو ویرا!“

پتا نہیں اسے میری آواز سن کر تعجب ہوا تھا یا نہیں۔۔۔ ”تم نے مجھے یہاں تک آنے سے روکنے کے جو جتن کیے، میں ان کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا مگر افسوس جن ملاحوں کی خدمات تم نے حاصل کی تھیں وہ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوئے۔“ میں نے اس پر طنز کیا۔

”اب بتاؤ، اس حرکت سے تمہارا کیا مقصد تھا؟“

ویرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل پکڑے خاموش ونڈ اسکرین کو گھورتی رہی۔

”دیکھو ویرا!“ میں نے اسے متوجہ کیا۔ ”صاف صاف بتاؤ، آخر تم مجھے کشتی پر جانے سے کیوں روکنا چاہتی ہو؟ کیا تم جانتی ہو کہ اس کشتی پر کیا ہونے والا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم چارلس کے قتل کی تفتیش کے علاوہ کسی اور واقعے میں بھی دلچسپی لے رہی ہو۔ پہلے تم نے دو سراغ رسانوں کو میرے پیچھے لگا کر مجھ سے معلومات حاصل کرنا چاہیں پھر جب میں نے ٹیلی فون کے ذریعے اپنے چیف کی اطلاع دی تو تم ایک دم گھبرا گئیں اور مجھ پر زور دیا کہ میں اس کھیل میں حصہ نہ لوں۔۔۔ کیوں۔۔۔ آخر کیوں؟ کیا محض اس لیے کہ میں اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں؟“

”یہ محض تمہارا خیال ہے۔“ ویرا مسکرائی۔ ”میں بھلا ایسا کیوں چاہنے لگی؟“

میں نے اپنی جیب سے اپنا خفیہ شناختی بیج نکالا اور اسے ویرا کے سامنے لہرایا اور بولا۔ ”اس لیے ڈارلنگ! کہ میرا نام کاشون ہے اور میں فیڈرل محکمے کی ”بی“ برانچ کا اسپیشل ایجنٹ ہوں۔“ میں نے اس پر انکشاف کیا۔

”میں حیران ہوئی۔“ وہ مسکرا دی۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔“

”چلو مان لیا۔“ میں نے گردن جھٹکی۔ ”مگر میں جاننا چاہوں گا کہ تم نے میرا کشتی پر جانا کیوں پسند نہیں کیا؟“

”تمہیں میلانڈر کی ہلاکت کا تو علم ہو گیا۔“ ویرا نے کہا۔ ”وہ بھی تمہارے محکمے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کا اصل نام ڈواکن تھا اور وہ ”بی“ محکمے کی ہدایت پر کام کر رہا تھا۔“

”تم جانتے ہو وہ کس معاملے کی تفتیش کر رہا تھا؟“ ویرا نے دریافت کیا۔

”سونا لوٹنے والے گروہ کے معاملے کی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم اس سلسلے میں کیا جانتی ہو؟“

”صرف اتنا کہ وہ مارا گیا، زندگی کی تاریک راہوں میں۔“ اس کے چہرے پر گمبھیر اداسی پھیل گئی۔

”میرا اندازہ تھا کہ چارلس بھی اس معاملے میں شامل تھا اور شاید اسی لیے وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں تمہیں کشتی پر نہیں جانے دوں گی۔ میں۔۔۔ میں چارلس کے بعد تمہیں بھی کھونا نہیں چاہتی۔“

کار کے اندر روشنی تھی، میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے اور چہرہ شکستگی کا شکار ہو گیا تھا۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔

”کل میں چارلس کے ڈیڈی سے بھی ملی تھی۔ میں نے اسے سان کی آمد سے قاتل کا پتا چلانے کی کوشش سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا، کیونکہ اول تو اس وجہ سے کہ روحانیت کے ماہر کی بات عدالت بغیر ثبوت کے ماننے کو تیار نہ ہوگی۔ دوم۔۔۔ اگر کسی شخص کو گرفتار کرا بھی دیا گیا اور اس نے سارا راز اگل دیا تو لوگ چارلس کو برا سمجھیں گے ہی لیکن رابرٹ کی بھی کچھ کم بدنامی نہ ہو گی۔ جب تم نے فون پر مجھے بتایا کہ تم اٹلانٹک وچ جا رہے ہو تو مجھے یقین ہو گیا کہ روڈی نے رابرٹ سے میرے پیچھے آنے کے بعد تمہیں خط لکھا ہوگا۔ حالانکہ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس اسکیم پر عمل نہیں کرے گا۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ میں کشتی پر محض اس لیے جانا چاہتا تھا کہ میری تفتیش ادھوری نہ رہ جائے مگر وہ بدستور اس ضد پر اڑی رہی کہ کشتی پر جانے اور پروگرام میں شریک ہونے سے بہتر ہے کہ میں یہیں ٹھہر کر واقعات کی رفتار دیکھوں۔۔۔ لیکن پھر بالآخر اس نے ہار مان لی اور جانے سے قبل مجھ سے وعدہ لیا کہ کشتی پر کارروائی ختم ہوتے ہی میں اس سے ملوں اور تمام روداد اسے سنا ڈالوں۔

میں چوبی پل سے گزرتا ہوا اٹلانٹک وچ پر پہنچا تو ایک شخص نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔ میرا نام دریافت کیا اور مطمئن ہو جانے کے بعد مجھے اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ڈیک سے گزارتے ہوئے نچلے حصے میں پہنچانے اور ایک کیبن کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

میں کیبن میں داخل ہوا تو ڈیسک کی دوسری جانب ایک بوڑھا سا شخص کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ کوئی موٹی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ میں نے اسے اندازے سے پہچان لیا۔ وہ سان درے ما کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”کرسی سنبھال لو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ ڈیسک کے عقب میں بیٹھے شخص نے کہا۔ اس کا لہجہ غیر ملکی تھا اور آنکھوں میں سانپ جیسی چمک تھی۔ میرے کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے سگار بکس میری جانب بڑھا دیا۔ میں سگار جلاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آیا وہ واقعی قاتل کو شناخت کرے گا یا کسی غلط آدمی کو قاتل قرار دے گا۔ مجھے ڈر ہوا کہیں وہ مجھے ہی قاتل نہ قرار دے ڈالے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز آئی، وہ کہہ رہا تھا۔

”نہیں، وہ تم نہیں ہو مسٹر ہیری! جسے میں قاتل قرار دوں گا۔“

مجھے اچانک ہی اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا، وہ یقیناً دوسروں کے خیالات پڑھنے کا ماہر تھا۔

”اگر میں قاتل نہیں ہوں تو یہ بتائیے کہ میں پینے کے لیے کہاں سے حاصل کروں؟“

اس نے قہقہہ لگایا پھر گھنٹی بجا کر نوکر کو طلب کیا اور اس سے مجھے باہر لے جانے کے لیے کہا۔ ملازم مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔ کمرا کیا اچھا خاصا بار تھا، بہت سے لوگ وہاں بیٹھے آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے جبکہ چند عورتیں ایک طرف بیٹھی قہقہے لگا رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی، اس ہجوم میں وہ چہرے نظر نہیں آ رہے تھے جو چارلس کے قتل کے وقت میڈو کلب میں اس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ روڈی اور کارلوٹا کے علاوہ تمام چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

”ہیلو ہیری!“ روڈی میری جانب لپکا۔ ”آؤ، ایک گلاس ٹھنڈی شراب کا نوش کرو۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ہال کے اس حصے میں لے گیا جہاں نسبتاً کم لوگ بیٹھے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے کارلوٹا کی طرف دیکھا، وہ ایک کونے میں بیٹھی وہسکی سے شغل کر رہی تھی مگر اس کی نگاہ میری جانب ہی تھی۔

”اب جبکہ تم بھی آ گئے ہو میرا خیال ہے، وہ لوگ جلد ہی کارروائی شروع کر دیں گے؟“ روڈی نے کہا۔ ”آج شام بھی کیسی دلچسپ ہوگی۔“

”یقیناً۔۔۔ مگر تمہارے لیے نہیں، دوسروں کے لیے۔“ میں نے ٹھہر کر کہا۔

”تم چارلس کے قاتل ہو اور سان نے بھی تمہیں قاتل قرار دے دیا تو یقین رکھو رابرٹ تمہیں الیکٹرک چیئر پر بٹھائے بغیر دم نہ لے گا۔“

روڈی نے کھا جانے والی نگاہ سے میری طرف دیکھا لیکن اس سے قبل کہ اب اس کا ارادہ مجھ پر حملہ کرنے کا تھا، دروازہ کھلنے کی آواز آئی کشتی کے عملے سے متعلق ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی وردی اس کے جسم پر فٹ نہیں تھی۔

”ایسے افراد جو کارروائی میں شامل نہیں ہیں۔ براہ کرم باہر تشریف لے جائیں۔“ اس نے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔ چند عورتیں اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں اس سمت بڑھا جدھر کارلوٹا بیٹھی تھی۔ وہ سیاہ لباس میں بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔

”ہیلو کارلوٹا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”تم ایک ذلیل انسان ہو۔“ وہ درشتی سے بولی، میں سمجھ گیا۔ تین بجے اس کے فلیٹ پر میرے نہ پہنچنے کو اس نے اپنی ہتک تصور کیا تھا، میں نے اسے چڑانے کی غرض سے کہا۔

”مجھے یہ باور کرانے کی کوشش مت کرنا کہ تمہارا باڈی گارڈ، روڈی ابھی یہاں پہنچ کر مجھ سے الجھنے کی کوشش کرے گا۔“

”زبان بند رکھو ہیری! ورنہ اس کا خمیازہ اٹھاؤ گے۔“ اسی وقت روڈی میرے قریب آ گیا۔ ”کارلوٹا تمہاری بکواس سننا پسند کرتی ہے نہ میں اسے گوارا کر سکتا ہوں۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اگر میں کارلوٹا کو یہ بتا دوں کہ میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو تم چیخ پا کیوں ہو رہے ہو؟“

جواب میں روڈی نے ایسا لفظ استعمال کیا جو کسی بھی لغت میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا اور شراب کی ایک بوتل اٹھا کر مجھ پر دے ماری، میں نے ایک جانب جھک کر خود کو زخمی ہونے سے بچایا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں نے اس کی پشت پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا اور مغلظات بکنے لگا۔ چند لوگ چیختے ہوئے میری جانب بڑھے لیکن اس سے پیشتر کہ وہ میرے قریب آتے، دروازہ ایک بار پھر کھلا اور ہر شخص اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کھلے دروازے کے درمیان سان درے ما کھڑا تھا۔

”خواتین و حضرات!“ اس نے اپنے مخصوص غیر ملکی لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”لڑائی کے لیے یقیناً یہ جگہ موزوں نہیں ہے، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہم سب ایک نیک کام انجام دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔“ اس کی آواز سن کر ہر شخص خاموش ہو گیا مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کشتی حرکت میں آ چکی تھی اور شاید سان کی ہدایت پر ہی کنارے سے دور ہٹ رہی تھی۔ سان۔۔۔ کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

http://paktunplace.blogspot.com

"گیلری کے دوسری جانب سیلون میں وہ تمام لوگ موجود ہیں جو حادثے کے وقت چارلس کے قریب بیٹھے تھے۔ آپ میں سے ہر شخص خاموشی سے اپنی جگہ جا بیٹھے، پھر میں بتاؤں گا کہ چارلس کا قتل کس نے کیا تھا۔"

"بہتر ہے پروفیسر۔ آپ کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا لیکن لوگوں کو بھی اندازہ ہے کہ قاتل کون ہے۔" روڈی کی شعلہ بار نگاہ مجھ پر جم گئی۔

"مجھے یقین ہے کہ اس نے چارلس کو قتل کیا تھا، اور اب بھی یہ مسلح ہوگا۔ اس سے ریوالور لے لیا جائے۔" میں تملا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے قبل کہ میں اپنی مدافعت میں کچھ کہتا، وہ آفیسر جس نے غیر متعلقہ افراد سے باہر جانے کی درخواست کی تھی، میرے قریب آ کر بولا۔

"کشتی پر ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں ہے اگر تمہارے پاس واقعی ریوالور ہے تو میرے حوالے کر دو۔ واپسی پر تمہیں دے دیا جائے گا۔" میں نے ریوالور نکالا اور خاموشی سے اس کے حوالے کر دیا۔

آفیسر ریوالور لے کر چلا گیا تو سب لوگ سان کی رہنمائی میں سیلون میں داخل ہوئے جہاں قاتل کی شناخت عمل میں لائی جانے والی تھی۔ کمرے میں ایک طرف الگ تھلگ کرسی پر ایک فربہ شخص بیٹھا تھا۔ میں سمجھ گیا وہ ورایٹ تھا۔ چارلس کا قانونی باپ۔ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ ایک یا دو منٹ کے قلیل وقفے میں ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ کرسیوں کی قطار کے عین سامنے سان... اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھ گیا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

"روشنی بجھا دی جائے۔" سان کی لرزتی آواز سیلون میں گونجی۔ فوراً ہی کسی نے بتیاں بجھا دیں۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔ سانس لینے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ثانیے ہال میں مکمل خاموشی رہی پھر سان رے... کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں یہ میڈرڈ کلب ہے۔ مس کارلوٹا رقص کر رہی ہے... لو... ایک شخص جس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور ہے وہ اسٹیج کے بائیں طرف آ پہنچا۔ اس نے لائٹ مین سے کچھ کہا۔ لائٹ مین نے دیوار گیر بلب بجھا دیا۔ اس شخص نے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو دیکھا اور جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ لو... اب وہ دروازے سے گزر کر ہال میں آ پہنچا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ ہر چیز بالکل صاف نظر آ رہی ہے۔ وہ چارلس سے چند قدم دور اندھیرے کی چادر میں لپٹا کھڑا ہے اور یہ لو... اس نے جیکٹ کی جیب میں رکھے ریوالور سے چارلس کو گولی مار دی۔

گولی لگتے ہی چارلس تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ افسوس... افسوس...

اتنا کہہ کر سان خاموش ہو گیا۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

"بتیاں جلا دو۔" سان رے ما کی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔ کسی نے فوراً لائٹ جلا دی۔ میں نے دیکھا سان... کرسی پر بیٹھا بدستور خلا میں گھور رہا تھا... یکایک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور روڈی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔

"یہ ہے چارلس کا قاتل... اس نے چارلس کو گولی ماری تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ یکایک روڈی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں جیبی سائز کا ایک ریوالور موجود تھا۔

"تمہارے کمال کی داد نہ دینا کم ظرفی ہوگی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ چارلس کو میں نے ہی مارا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے وعدہ خلافی پر اتر آیا تھا اور میرا ساتھ چھوڑ دینا چاہتا تھا۔" روڈی نے انکشاف کیا۔

میں نے سوچا یہی وہ موقع ہے کہ مجھے میدان عمل میں اترنا چاہیے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"مجمع کے انصاف پسند افراد سے درخواست ہے کہ وہ گواہ رہیں۔ ابھی روڈی نے اپنی زبان سے چارلس کے قاتل ہونے کا اقرار کیا ہے اور..."

روڈی نے میرا جملہ مکمل نہ ہونے دیا اور ریوالور چاروں سمت گھماتے ہوئے بولا۔

"یہاں کوئی تمہاری بکواس پر کان دھرنے والا نہیں ہے۔" اس کے چہرے پر درندگی کے آثار نمایاں تھے۔ پھر اس نے ریوالور کا رخ سان... کی طرف کر دیا۔ "میرا خیال ہے شاید تم یہ عمل بھی دیکھ چکے ہو گے؟"

سان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں میں دیکھ چکا ہوں اور قاتل..."

لیکن وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ روڈی کی چلائی نصف درجن گولیاں اس کے بدن میں چھ روشن دان بنا گئی تھیں۔ سان کرسی سے پھسل کر زمین پر آ گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

روڈی نے خالی ریوالور ایک طرف پھینکا اور میری طرف بڑھا۔ ہر شخص کی نظر میری سمت تھی۔ ہال کے دروازے پر چند وردی پوش افراد موجود تھے جو یقیناً کشتی کے ملازم تھے جبکہ ان کے عقب میں بھی بہت سے افراد کھڑے تھے۔

روڈی میرے قریب آ کر رک گیا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

"دوستو اب پیش خدمت ہے تمہارے سامنے یو ایس جی" برانچ کا بے مثل ہیرو... کاشون۔" اس نے انگلی سے میری جانب اشارہ کیا اور بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔ ہال میں موجود تمام افراد نے اس کا ساتھ دیا۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ میری حالت ایسی تھی کہ جیسے کوئی زخمی ہرن اچانک ہی بھیڑیوں کے غول میں پھنس گیا ہو۔ بچ نکلنے کی ہر راہ مسدود ہو گئی تھی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ویرا مجھے یہاں آنے سے کیوں روک رہی تھی۔ اسے یقیناً میرے ساتھ ہونے والے سلوک کا علم تھا۔

"اب بتاؤ مسٹر کاشون! اسپیشل ایجنٹ آف جی برانچ۔" روڈی طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

میں نے اپنے ہاتھ کو اس طرح جنبش دی جیسے جیب سے ریوالور نکالنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں روڈی کی توجہ بٹانا چاہتا تھا۔ جیسے ہی روڈی نے میرے ہاتھ کی طرف دیکھا، میں اس پر جھپٹ پڑا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی اور تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے چہرے پر جما دیے۔ فوراً ہی کچھ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور لاتوں اور گھونسوں سے میری تواضع شروع کر دی۔

میں نے حتی المقدور ان کے حملوں کا جواب دیا مگر وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ لہٰذا جلد ہی میں ان کے قابو میں آ گیا میری بائیں آنکھ سوج کر دیکھنے سے معذور ہو گئی تھی کپڑے پھٹ چکے تھے۔ ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بری طرح کپکپا رہے تھے۔

اس دوران میں روڈی اپنے اوسان بحال کر چکا تھا۔

"رسی سے جکڑ کر ڈال دو اس مردود کو۔" وہ چلایا، ذرا دیر بعد ہی مجھے اچھی طرح جکڑ دیا گیا۔ میں نے روڈی کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ میری ضربوں سے اس کی داہنی آنکھ سوج گئی اور سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے، مجھے از حد خوشی ہوئی۔

روڈی نے بڑی تکلیف سے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔

"میرا ارادہ تمہیں فوراً مار دینے کا تھا لیکن اب میں تمہیں زندہ رکھوں گا اور ایسی اذیت ناک موت دوں گا جس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ گیا۔

"اسے تہ خانے میں لے جاؤ، اور اچھی طرح اس کی نگرانی کرو۔ خبردار بھاگنے نہ پائے ورنہ ہمارا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔" چند لوگوں نے مجھے پکڑ کر کھڑا کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ابھی تک دھند چھائی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی میری نگاہ کارلوٹا پر پڑی۔

وہ حقارت سے بولی۔

"اوہو، کاشون! تم تو اس وقت بالکل گیدڑ بنے ہوئے ہو۔" پھر وہ میرے قریب آئی اور مسلسل کئی طمانچے میرے منہ پر مارے اور میرے منہ پر تھوک بھی دیا۔ دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑے اور تیسرے شخص نے میرے ہاتھوں کو کھول کر پشت کی جانب لے جا کر دوبارہ رسی سے باندھ دیا مجھے گویا بالکل بے دست و پا کر دیا۔

تہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچتے ہی ایک شخص نے میری پشت پر اتنی زور سے لات ماری کہ میں لڑھکتا ہوا تہ خانے کے فرش پر جا گرا۔ اس کے بعد مجھے علم نہیں کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور ایک آنکھ سوج کر بند ہو گئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ البتہ پیر آزاد تھے، کشتی کی حرکت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ روڈی کشتی پر کیا کر رہا تھا، کشتی کا عملہ بے چون و چرا اس کا حکم کیسے مان رہا تھا اور کشتی کس طرف جا رہی تھی؟

معاً ہی دروازہ کھلا۔

ایک شخص تہ خانے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اٹھنے اور تہ خانے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں بمشکل اٹھا اور اس کے ہمراہ چلتا ہوا کشتی کے ڈیک پر آ گیا۔ کشتی کے مختلف حصوں کو عبور کرتے ہوئے اس نے مجھے ایک کشادہ کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی میز تھی، اس کے پیچھے کرسی پر روڈی بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹ ابھی تک سوجے ہوئے تھے۔

مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ بدن کو جنبش دے سکتا۔ روڈی کے حکم پر میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور محافظ بھی باہر چلے گئے۔ میں روڈی کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سفید قمیص اور سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس سے میں نے جانا کہ وہ دن کا وقت تھا۔ روڈی کی نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ میری بے بسی سے حظ اٹھا رہا تھا اور فاتحانہ انداز میں مسکرا بھی رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں روڈی۔" میں نے اس کی جانب دیکھا۔ "بازی اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہ سب انتظام کیسے کر لیا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو میں نے پوچھا۔ "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

http://paktunplace.blogspot.com

"انگلینڈ۔" وہ مسکرایا۔ "تمہارا خیال تھا کہ سونا امریکا میں غائب کیا جائے گا اس سے پہلے میلانڈر اور پھر تم روک تھام کے لیے آئے مگر ہم لوگ سونا انگلینڈ پہنچ جانے پر غائب کریں گے۔"

میں اس کی ذہانت اور چالاکی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن میں اس کی پوری اسکیم جان لینا چاہتا تھا لہٰذا فوراً ہی بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پورٹ سے سونا کیسے غائب کرو گے؟ وہاں تو زبردست حفاظتی پہرا ہوگا؟"

"سونا پورٹ سے غائب نہیں کیا جائے گا۔" وہ اسرار بھری مسکراہٹ سے بولا۔ "تعجب ہے تم اتنی سی بات نہیں سمجھ پائے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے بڑا سا کاغذ نکالا اور کھول کر میز پر رکھ دیا۔

یہ ایک خفیہ رپورٹ تھی اور اس کا مضمون یہ تھا۔

"گزشتہ دو سالوں میں تین بار امریکا سے بیس کروڑ پونڈ کا سونا دوسرے ملکوں میں بھیجا جا چکا ہے۔ اٹلی سے جنگ چھڑ جانے کے اندیشے اور فرانس کے سکے کی قیمت گر جانے کے بعد نئی پالیسی کے تحت امریکا سے سونا انگلینڈ اور فرانس میں فروخت کرنے کے لیے بھیجا جائے گا اور جیسے ہی ان ممالک میں سونے کی قیمت گر جائے گی تو باقی سونا امریکا منگوا لیا جائے گا۔"

امریکا کی انشورنس کمپنیاں زور دے رہی ہیں کہ سونے کو ایک چھوٹے مگر تیز رفتار جہاز میں لاد کر انگلینڈ بھیجا جائے جبکہ فیڈرل محکمے نے طے کیا ہے دو کروڑ پونڈ مالیت کا آٹھ ٹن سونا جو سلاخوں کی صورت میں ہے سمندر کے بیچوں بیچ جہاز سے ایک تیز رفتار دخانی کشتی میں منتقل کر دیا جائے، پھر یہ سونا نہایت احتیاط سے اس کشتی کے ذریعے انگلینڈ پہنچا دیا جائے گا۔"

میں نے اس رپورٹ کو جتنی جلدی ممکن ہو سکا پڑھ لیا لیکن ظاہر یہ کیا کہ سوجی ہوئی آنکھ کے باعث پڑھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں نے کاغذ پر لگے واٹر مارک کو دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ یہ واٹر مارک بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس کاغذ پر تھا، جس پر باربیری نے مجھے خط لکھ کر کشتی پر آنے کی دعوت دی تھی میں سمجھ گیا کہ روڈی نے کسی کے ذریعے رابرٹ سے کچھ کاغذ چرا لیے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت انہیں استعمال کیا جا سکے۔ میں نے کن انکھیوں سے روڈی کی جانب دیکھا، وہ مجھے نظر انداز کیے سگریٹ کے مرغولے ہوا میں بکھیر رہا تھا۔ میں نے کاغذ کو تہ کیا اور اسے روڈی کی طرف بڑھا دیا، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا سیدھا ہاتھ جو ذرا دیر قبل حرکت کرنے سے معذور تھا، اب متحرک تھا مگر میں نے یہ بات روڈی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے کاغذ اسے بائیں ہاتھ سے لوٹا دیا۔

روڈی نے کاغذ جیب میں رکھا، قہقہہ لگایا اور بولا۔

"شاید تمہیں علم نہ ہو، ایک جہاز امریکا سے سونا لے کر انگلینڈ کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اس کی روانگی کے بعد تمہارے محکمے کو اطمینان کی سانس نصیب ہوئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تمام مراحل بہ خوبی انجام پا گئے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہم لوگ امریکا میں سونے کو چھیڑنا ہی نہیں چاہتے تھے لہٰذا کسی قسم کا ہنگامہ پیدا نہیں ہوا۔"

وہ سانس لینے کے لیے ذرا رکا پھر بولا۔

"جانتے ہو، اب کیا ہوگا۔ اصل میں ہم لوگوں نے اپنا پروگرام خاصے بڑے پیمانے پر مرتب کیا ہے اور اس میں امریکا اور انگلینڈ دونوں ممالک کے باشندے حصہ لے رہے ہیں۔ تفصیل کے مطابق سونے سے لدا جہاز پورٹ پر پہنچتے ہی سونے کو جہاز سے اتار کر ریل کے ڈبوں میں لاد دیا جائے، جو ایک اسپیشل ٹرین سے منسلک ہوں گے۔ سونا اور اس کے حفاظتی گارڈ کو لے کر ٹرین اپنی منزلِ مقصود کی سمت روانہ ہو جائے گی۔ جب ٹرین ساؤتھ ہیمپٹن سے گزرے گی، میرے ساتھی حرکت میں آ جائیں گے، وہ ٹرین رکوا کر منٹوں میں سونے کی سلاخیں ریل کے ڈبوں سے ٹرک میں منتقل کر دیں گے، یہ ٹرک سونے کو لے کر ریلوے لائن کے متوازی سڑک پر سے گزرتا ہوا، تیس منٹ میں ہاؤنٹ کے قریب بندرگاہ پر پہنچ جائے گا۔ ان کا مخصوص اشارہ پا کر یہ کشتی جس میں تم موجود ہو، کنارے پر پہنچ جائے گی۔ اب صرف سونے کو ٹرک سے اتار کر کشتی پر لادنے کا مرحلہ رہ جاتا ہے۔ یہ مرحلہ بھی ..... بہ آسانی طے ہو جائے گا اور ہم وہاں سے چل پڑیں گے پھر قبل اس کے کہ سونا چوری ہو جانے کی اطلاع انگلش پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو ملے گی ہماری کشتی سمندر کے کھلے پانی میں اطمینان سے اپنی نئی منزل کی طرف بڑھ رہی ہوگی، تلاش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ یہ کارروائی نیویارک والوں نے کی ہوگی، وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ اس واردات کے پیچھے انگلستان کے جرائم پیشہ لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

روڈی ذرا دیر رکا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "کہو منصوبہ پسند آیا؟"

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ روڈی کی زبانی سونا لوٹ لیے جانے کی اسکیم سن کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس بار "جی" محکمے کو غضب کے عیار لوگوں سے پالا پڑا ہے سونے کو بہ حفاظت انگلینڈ پہنچا دینے کے بعد امریکی حکومت مطمئن ہو جاتی، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ جو اقدام نیویارک میں متوقع تھا، وہ انگلینڈ میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ میرا اندازہ تھا کہ سونے کی چوری کی خبر سنتے ہی ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ انگلینڈ کی پولیس فوراً ہی مصروفِ عمل ہو

جاتی، ریلوے اسٹیشن، ہوائی اڈے، بس اسٹاپ، سڑکیں، بندرگاہ غرضیکہ ہر چیز اور ہر جگہ پولیس قبضہ کر لیتی اور کوشش کرتی کہ سونا کسی طور انگلینڈ کی حدود سے باہر نہ جانے پائے۔

میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ جب رابرٹ کو اپنی کشتی چوری ہو جانے کا علم ہوگا، اور وہ اس کی رپورٹ پولیس میں درج کرائے گا، تو ممکن ہے کہ کوئی ذہین شخص اٹلانٹک وچ کی چوری اور انگلینڈ میں سونے کی چوری کو ایک ہی زنجیر کے دو حلقے شمار کر لے ایسی صورت میں ممکن تھا کہ کشتی کی تلاش میں سمندر کا چپا چپا چھان مارے، اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی میری پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا کہ میں بدقسمتی سے دشمن کی گرفت میں تھا جبکہ مجھے میدانِ عمل میں سرگرم ہونا چاہیے تھا۔

میں نے اس سنگین صورتِ حال کا تصور کرتے ہوئے ایک گہری ہنکار لی اور روڈی کی طرف دیکھا۔ "تم نے ایک مرتبہ مجھ سے کوئی شرط پیش کرنے کا ذکر کیا تھا، وہ کون سا مرحلہ ہے جس کے سلسلے میں تم جیسا شاطر انسان میرے تعاون کا محتاج ہو۔"

"یہ میں پھر بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر روڈی کھڑا ہوا اور روشن دان کھول کر مجھے باہر دیکھنے کے لیے کہا۔ میں نے اس کے کہنے پر روشن دان سے باہر جھانکا۔ حدِ نگاہ تک سمندر کا پانی پھیلا ہوا تھا۔

"جانتے ہو آج صبح میرے ذہن میں کیا خیال آیا تھا؟" وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اگر اس شدید سردی میں تمہارے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر تمہیں سمندر میں پھینک دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ یقین جانو تمہیں اس طرح موت سے ہم آغوش ہوتے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملے گا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے کہا۔ "ہماری اسکیم آج رات یا کل صبح پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ اس دوران میں تم ایک کمرے میں قید رہو گے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دو محافظ ہاتھوں میں ریوالور لیے اندر داخل ہوئے اور مجھے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔

ذرا دیر بعد انہوں نے مجھے ایک ایسے کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں ہوا کی گزر کے لیے کوئی روشن دان تک بھی نہ تھا، ایک محافظ نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی جکڑ دی اور باہر نکل کر دروازے پر قفل ڈال دیا۔ میں اس بنچ پر، جو کمرے کے ایک جانب پڑی تھی، لیٹ گیا اور واقعات کا جائزہ لینے لگا۔

اگر یہ لوگ منصوبے کے مطابق سونا حاصل کر لیتے اور اسے لے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کی گرفتاری اور سونے کی بازیابی مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جائے گی، تاہم ایک موہوم سا خیال میری تسلی کا باعث تھا اور وہ یہ کہ کشتی کی گمشدگی اور سونے کے غائب کیے جانے کو کوئی شخص ایک دوسرے سے متعلق سمجھ لے تو شاید دونوں ممالک کی نیوی اس گمشدہ کشتی کی تلاش میں نکل کھڑی ہو اور اسے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی قابو میں کر لیا جائے، دوسری صورت میں روڈی کے منصوبے کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں اسی طرح قیاسی گھوڑے دوڑاتا رہا اور دن گزرتے چلے گئے۔ اس دوران میں میرے ساتھ خاصا بہتر سلوک کیا گیا۔ روزانہ دو وقت کھانا اور سگریٹ بلا ناغہ ملتے رہے، پانچویں دن شام کے وقت دروازہ کھلا اور روڈی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آتے ہی بنچ پر بیٹھ گیا، جیب سے سگریٹ نکال کے سلگایا اور اس کا دھواں میرے چہرے پر اگلتے ہوئے بولا۔

"شاید تمہیں یاد ہو کاشون! میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز پیش کرنے کے لیے کہا تھا، اب تم اس تجویز سے اتفاق کر لو یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ٹھنڈے پانی کی موت۔"

"یقیناً میں بے دست و پا ہو کر سمندر میں ڈوبنا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ "تم اپنی تجویز بتاؤ۔"

"مرنا تو تمہیں ہے ہی۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔ "اگر تم اپنی زندگی کو چند دن اور بڑھانا چاہتے ہو تو میری تجویز پر عمل کرو۔ میرے ساتھی لندن میں پرسوں، دو دسمبر کے بعد فرین پر قابو پا کر سونا اپنے قابو میں کر لیں گے اور رات کے وقت وہ سونا اس کشتی پر لاد دیا جائے گا، اس کے بعد ہم لوگ فرار ہو جائیں گے کہاں؟ یہ بتانا ضروری نہیں۔"

وہ سانس پینے کے لیے ذرا رکا، پھر بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ "جی" محکمے میں تم لوگوں کو وائرلیس کے ذریعے خبر رسانی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سونے کی چوری کی خبر مشتہر ہونے کے بعد تم ریڈیو پر نشر کیے جانے والے خفیہ پیغامات سنو گے اور اس کی تفصیل بتاؤ گے اور یہ کہ تم خفیہ الفاظ میں وائرلیس کے ذریعے اطلاع نشر کرو گے کہ تم اٹلانٹک وچ پر مقید ہو اور تم نے کشتی پر موجود لوگوں کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کشتی کی منزل خلیج میکسیکو ہے۔"

"اور تمہیں کہیں اطمینان سے دوسری جگہ روپوش ہونے کا موقع مل جائے گا، کیوں، یہی مقصد ہے نا تمہارا؟" میں نے اس کی گفتگو کا مقصد سمجھ کر کہا اور اضافہ کیا۔

"ویسے روڈی! تمہارا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل ہے اور جس طریقے سے تم نے جزئیات کو پیشِ نظر رکھا ہے اس کی تعریف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ اب ایک بات اور بتا دو، چارلس..... کا اس معاملے سے کیا تعلق تھا اور تم نے کس لیے اسے اپنے راستے

http://pakurdupoint.blogspot.com

سے ہٹانا بہتر سمجھا تھا؟"

"چارلس میرے منصوبے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا لیکن بعد میں وہ میلانڈر سے جا ملا، اگر میں چارلس اور میلانڈر کو اپنے راستے سے ہٹانے میں ذرا سی بھی تاخیر کرتا تو ہتھکڑی اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہے، وہ میرے ہاتھوں میں ہوتی اور میں اس وقت پولیس کی حراست میں ہوتا۔" روڈی نے بتایا۔

میں نے اس کی تائید میں ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ کیا۔

روڈی کمرے سے چلا گیا تو میں دوبارہ بینچ پر دراز ہو گیا۔

بہ ظاہر میں چھت کو گھور رہا تھا لیکن میرا ذہن مختلف چیزوں میں بھٹک رہا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک لحاظ سے کشتی پر آنا میرے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوا تھا، کیونکہ بہت سے عقدے خود بہ خود حل ہو گئے تھے مگر میرا کشتی پر آنا درست نہ تھا کہ میں کشتی پر آتے ہی قید کر لیا گیا تھا۔

روڈی کے جانے کے بعد کوئی نیا واقعہ ظہور میں نہ آیا لیکن دوسرے دن باورچی کے برتن لے جانے کے تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور کارلوٹا اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجائے اندر داخل ہوئی، اس کے ہمراہ ریوالور بہ دست گن مین تھا۔

"تم حالات سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے کاشون؟" وہ آتے ہی بولی۔

"جب روڈی نے میرے سامنے تجویز رکھی تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وائرلیس آپریٹر کے طور پر استعمال کرنے کا خیال یقیناً تمہارے ذہن کی پیداوار ہو گا۔" میں نے اسے بتایا۔

"تمہاری بات بالکل سچ ہے۔" کارلوٹا نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "لیکن وائرلیس سیٹ چھونے کی اجازت نہیں ہو گی تمہیں وائرلیس سیٹ پر بیٹھ کر صرف وہ پیغامات سننے ہوں گے جو سونے کی چوری ہو جانے کے بعد نشر کیے جائیں گے۔"

میں نے اس کی گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مجھے شراب کی ایک بوتل نہیں مہیا کی جا سکتی نیز جبکہ میرا برتاؤ خاصا شریفانہ ہے... کیا میں اتنی رعایت بھی نہیں پا سکتا کہ تھوڑی دیر کے لیے میرے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھول دی جائے۔"

اس نے میری دونوں باتیں منظور کر لیں اور اپنے ہمراہ محافظ کو میری ہتھکڑی کھولنے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی میری جانب سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے شراب کی بوتل لینے چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی، جس میں ایک بوتل، دو گلاس اور سگریٹ موجود تھے۔ میں نے بوتل سے ایک گلاس لبریز کیا اور اسے ایک ہی سانس میں معدے میں انڈیل لیا۔ کارلوٹا نے ہتھکڑی کی چابی میز پر ٹرے کے قریب رکھ دی تھی۔ ٹرے کے بائیں جانب ایک رسالہ پڑا تھا لہٰذا یہ امکان تھا کہ چابی اس کے دھیان سے نکل جائے۔

میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کارلوٹا کے محافظ کو مخاطب کیا۔ "کیا بات ہے کشتی بہت سست چل رہی ہے؟ یہ کچھ تیز رفتار نہیں ہے؟"

محافظ نے نفی میں سر ہلایا اور میرے خیال کی تردید کرتے ہوئے کشتی کی تیز رفتاری کے بارے میں کئی مثالیں پیش کیں مگر میں برابر اس بات پر اڑا رہا کہ کسی بھی.... حالت میں وہ کشتی جس میں ہم سوار تھے، کسی دوسری کشتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ عین اس وقت جب ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کارلوٹا کرسی سے پشت لگائے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور غیر محسوس انداز میں کہنیوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور ایک کہنی سے رسالے کو آگے کی جانب دھکیلنے لگا۔ رسالہ ایش ٹرے سے ٹکرایا اور ایش ٹرے الٹ کر ہتھکڑی کی چابی پر پڑی اور چابی اس کے نیچے دب کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ممکن تھا کہ کارلوٹا یہ حرکت نظرانداز نہ کرتی لیکن اس وقت ہماری بحث زور پکڑ چکی تھی اور کارلوٹا اس بحث سے اکتا چکی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ۔" یا [illegible] ہم ہو کر چلائی۔

محافظ نے اسے غصے میں دیکھا تو فوراً خاموش ہو گیا مگر میرے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ اسے مزید طیش دلاؤں اور اپنی کامیابی کو یقینی بناؤں لہٰذا میں نے اس سے کہا۔

"اے مغرور حسینہ! میں کیوں خاموش ہو جاؤں میں اس وقت تمہاری قید میں ضرور ہوں لیکن میرا دل اور دماغ تمہارے قبضے میں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے آنکھ دبا کے اشارہ کیا۔

کارلوٹا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، اس کو مزید برہم کرنے کے لیے میں نے کہا۔

"روڈی جیسے شیخی خورے کی رفاقت نے تمہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ تم بھی عقل رکھتی ہو اور تم اس بات پر پھول رہی ہو کہ تم نے مجھ پر قابو پا رکھا ہے۔ اس کشتی پر پروفیسر سان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نیویارک میں میلانڈر اور چارلس ہلاک کر دیے گئے اور اب تم سونا حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی ہو مگر یاد رکھو اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی ہار تمہاری ہی ہو گی ناکامی تمہارا مقدر بن چکی ہے۔"

میری اس گفتگو کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ طیش کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور محافظ سے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی جکڑ دینے کا حکم دیا۔ محافظ نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل

کی۔ میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگ چکی تو کارلوٹا نے اپنی پوری قوت سے میرے منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔ اس کے جواب میں، میں نے بھی اپنا پیر اٹھایا اور کارلوٹا پر دے مارا۔ اسے چوٹ تو کیا لگتی لیکن نتیجہ میرے حسب منشا نکلا۔

اس نے بات بڑھ جانے کے خوف سے فوراً ہی کمرے سے باہر نکل جانا مناسب سمجھا۔ دوسرے ہی لمحے کارلوٹا اور اس کا محافظ کمرے سے باہر تھے لیکن جاتے جاتے بھی وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں میری رہائی کا سامان کر گئے تھے۔ یعنی ہتھکڑی کی چابی ایش ٹرے کے نیچے دبی رہ گئی تھی۔

جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کارلوٹا کے ذہن سے چابی نکل گئی ہے، اور کوئی بھی شخص اس کی تلاش میں میرے کمرے میں نہیں آیا تو میں اپنی جگہ سے... اٹھا اور ایش ٹرے کے نیچے دبی ہوئی چابی اپنے قبضے میں کر لی۔ میں نے کیبن کی چوبی دیوار میں چابی کا پچھلا حصہ پھنسا دیا۔ پھر چابی ہتھکڑی میں ڈال کر اپنا ہاتھ اس طرح گھمایا کہ ہتھکڑی فوراً ہی کھل گئی۔

اب میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے چابی دیوار کی درز سے نکالی اور اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دی۔ اس کے بعد چند ماچس کی تیلیاں فرش سے اٹھا کر ان کو ہتھکڑی کے سوراخوں میں داخل کیں اور ہتھکڑی دوبارہ ہاتھوں میں ڈال کر اسے [illegible] ہتھکڑی مستقل طور سے تو بند [illegible] کے باعث عارضی طور پر بند ضرور ہو گئی، مگر اس طرح کہ ذرا جھٹکے سے پھر کھل جائے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک سگریٹ جلا کر بینچ پر لیٹ گیا۔

نصف گھنٹے بعد کشتی اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ شاید وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور روڈی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ اور اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ یہاں آنے سے پیشتر مے نوشی میں مصروف رہا۔

"باہر چلو کاشون! میں تمہیں اپنے انتظامات دکھانا چاہتا ہوں۔"

اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر مجھ پر تانتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بڑا عزم تھا۔ وہ آگے بولا۔ "مگر یاد رکھنا۔" اس نے آخر میں تنبیہ کی۔ "تمہاری خفیف سی بھی حرکت تمہیں موت کے منہ میں لے جانے کا باعث ہو گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ روڈی میرے پیچھے تھا اور اس کا ریوالور، میری پشت پر چبھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں کشتی کے ڈیک پر پہنچ گئے۔ گو رات تاریک تھی مگر اس اندھیرے میں مجھے رائٹ ٹاور کی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ خشکی کا کنارہ کشتی سے ایک میل سے زائد دور نہ تھا۔ میں نے آہنی ریلنگ پر ہاتھ رکھا اور نیچے سمندر میں جھانکتے ہوئے روڈی سے کہا۔ "رات کا سکون اور موسم دونوں خوش گوار ہیں۔"

"بے شک۔" روڈی ہنستے ہوئے بولا۔ "اور خوش گواری کا لطف اس وقت اور بھی بڑھ جائے گا جب دو سو ملین پونڈ کی مالیت کا سونا میرے قبضے میں ہو گا۔" قدرے توقف کے وہ دوبارہ بولا۔

"اگر تم اپنی زندگی کے کچھ واقعات یاد کرنا چاہتے ہو تو جلدی جلدی انہیں دہرا لو... کیونکہ جلد ہی میرے ریوالور کی گولیاں تمہیں یخ بستہ سمندر میں پہنچا دیں گی اور پھر تم مچھلیوں کی خوراک بن جاؤ گے جبکہ میں عین اس وقت جبکہ مچھلیاں تمہاری ضیافت اڑا رہی ہوں گی جنوبی امریکا کے کسی مقام پر سونے کو اپنی تحویل میں لیے آرام و چین کی زندگی بسر کر رہا ہوں گا اور ایک حسین لڑکی میری رفیقۂ حیات ہو گی۔"

"اس حسین عورت کے بارے میں مزید نہ بتانا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ کارلوٹا ہو گی۔" میں نے جواب میں کہا۔ "تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ تم اور کارلوٹا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور کرتے رہو گے، مگر اس حقیقت کو بھول بیٹھے کہ جلد یا بدیر کارلوٹا تم سے سیر ہو جائے گی پھر اس کے لیے کسی اور آدمی کو تلاش کر لینا کچھ مشکل نہ ہو گا۔" میری بات پر روڈی کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا مگر میں نے اس کی پروا کیے بغیر بات جاری رکھی۔

"ہاں، روڈی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم اس وقت اتنی دسترس رکھتے ہو کہ طیش میں آ کر مجھے اپنے ریوالور کا نشانہ بنا لو۔ گولیوں سے میرا جسم چھلنی کر دو، مگر تم مجھے سچ بات کہنے سے نہیں روک سکتے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" روڈی دہاڑا۔ "اگر تم خاموش نہ ہوئے تو میں وقت سے پہلے تمہیں راہِ عدم پر ڈال دوں گا جہاں سے آج تک کبھی بھی کوئی لوٹ نہیں سکا ہے۔ تمہارے بھونکنے سے میں اپنی راہ نہیں بدل سکتا، کارلوٹا میری ہے اور میری ہی رہے گی۔"

میں نے اسے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ قائم کرنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ کشتی پر موجود تمام افراد شدت سے کسی بات کے رونما ہونے کے منتظر تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مکمل خاموشی کے بعد مستول پر بیٹھے شخص نے روڈی کو متوجہ کیا۔

"اپنے سیدھی جانب دیکھو روڈی۔"

روڈی اور میں دونوں بہ یک وقت داہنی طرف گھوم گئے۔

http://paktunplace.blogspot.com

ساحلی لائٹ ٹاور پر روشنی کی ایک کرن لرز رہی تھی چند سیکنڈ جلتے رہنے کے بعد روشنی بند ہو گئی۔ پھر نظر آئی، پھر بند ہو گئی، یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا گیا۔ میں نے اس طرح کی روشنی پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ ساحلی لائٹ ٹاور سے کشتی والوں کو خفیہ پیغام دیا جارہا تھا۔ روشنی کو جلتے بجھتے دیکھ کر روڈی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے اس کا مطلب اخذ کیا کاشون؟ انہیں سمجھے؟ اگر نہیں سمجھے تو اب سمجھ لو، میرے آدمی سونا لادنے کے لیے کنارے پر بلائے گئے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ روڈی کا ریوالور اب بھی میری پسلیوں سے لگا ہوا تھا۔ فوراً ہی کچھ لوگ بھاگ کر ریلنگ کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اچانک وہیں کے دونوں جانب دو چھوٹی کشتیاں موجود تھیں، جن میں موٹر انجن نصب تھے۔ وہ سب ایک ایک کرکے دونوں کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ چند ثانیے بعد کشتیوں کے انجن چلا دیے گئے۔ باقی لوگوں نے دونوں کشتیوں کو دھکیل کر خالی کشتی سے علیحدہ کیا اور پھر وہ بھی دونوں کشتیوں میں سوار ہو گئے۔

عین اس وقت جب [illegible] انتظامات عمل میں لائے جارہے تھے، میں نے محسوس کیا کہ روڈی کی توجہ میری جانب سے ہٹ کر کشتیوں میں بیٹھنے والوں پر مبذول ہو گئی ہے۔ اس کا ریوالور میری پسلیوں سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور آہستگی سے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑی کی بندش سے آزاد کرالیا۔ اسی وقت روڈی میری جانب متوجہ ہوا، مگر قبل اس کے کہ وہ معاملے کی نوعیت سمجھتا، میں نے وہی ہتھکڑی اس کے سر پر دے ماری۔ وہ ذرا ڈگمگایا، لہرایا اور پیچھے کی جانب ہٹتے ہوئے ڈیک پر گرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ کارلوٹا اور وہ مسافر جو روڈی کے قریب ہی کھڑے تھے، آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ آور ہوتے، میں نے کارلوٹا کے پیٹ پر اپنی پوری قوت سے ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ دہری ہو کر محافظوں پر گری اور انہیں اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے ڈیک پر آرہی۔ مجھے کارلوٹا سے بہت سے بدلے چکانے تھے پھر میں نے اس کے چہرے پر ٹھوکر لگانے پر ہی اکتفا کیا۔

کارلوٹا کے چیخنے چلانے پر کشتی کے بقیہ لوگ میرے جانب متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد دیکھا تو شور مچاتے ہوئے میری جانب لپکے۔

موقع کی نزاکت نے میرے پیروں میں اسپرنگ لگا دیے تھے۔ میں ہوا میں اچھلا اور ریلنگ کا سہارا لے کر سمندر میں چھلانگ لگادی۔

سمندر کا پانی اس قدر سرد تھا کہ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مجھے اپنا لہو رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا اور میرے ہاتھ پاؤں جیسے اکڑنے سے لگے۔ وہ شاید سن ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے پانی کی سطح سے سر ابھارا اور بے ترتیب سانس کو معمول پر لانے لگا۔ کشتی پر شور غل اور بھاگ دوڑ سے ایک قیامت برپا تھی۔ کشتی پر موجود سرچ لائٹ کا رخ سطح سمندر کی جانب کردیا گیا۔ تیز روشنی میرے تعاقب میں پانی میں چاروں طرف حرکت کر رہی تھی۔ میں نے دوبارہ غوطہ لگایا اور کشتی کے پیندے کے نیچے جا پہنچا۔ اتفاق سے میری گرفت میں ایک زنجیر آگئی۔ جس کو پکڑ کر میں اپنا سر پانی سے نکال کر ٹھہر گیا۔ چونکہ اس جگہ جہاں میں نے پناہ لی تھی کشتی سے ڈالی جانے والی تیز روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی لہٰذا میں با آسانی متلاشی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے زنجیر پکڑی اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے کوٹ اور جوتے اتار کر اپنا وجود قدرے ہلکا کرلیا۔ اس وقت کنارے کی سمت جاتی دونوں کشتیاں مجھے واپس آتی دکھائی دیں۔ ان میں سے ایک کشتی کا رخ اس گوشے کی جانب تھا جہاں میں نے خود کو پوشیدہ کر رکھا تھا۔ کشتی میرے قریب سے صرف چند فٹ کے فاصلے سے گزری۔ میں نے اپنا سر پانی کے اندر چھپا لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دونوں کشتیاں اس خالی کشتی کے دونوں جانب کافی دور تک میری تلاش میں مصروف تھیں۔

کشتیوں نے اپنا رخ ساحل کی جانب بدلا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور خود کو پانی میں پوشیدہ رکھتے ہوئے ساحل کی مخالف سمت میں تیرنا شروع کردیا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ مجھے ساحل کی جانب تلاش کریں گے اور یہی ہوا بھی۔ وہ لوگ مجھے کشتی سے قریب اور ساحل کی جانب تلاش کرتے رہے۔ میں مخالف سمت میں تیرتا ہوا ایک فرلانگ دور نکل آیا۔ شدید سردی کے اور یخ بستہ پانی میں اتنی دیر تک تیرتے رہنے کے باعث میرے تمام اعضا شل ہو چکے تھے۔ میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور خود کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب میں کشتی سے اتنے فاصلے پر آچکا تھا کہ کشتی سے اٹھنے والی آوازیں سننے سے قاصر تھا۔ البتہ میں چلتی روشنی ضرور دیکھ سکتا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد میں نے کشتی کی جانب دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کشتی کی تمام روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ میں نے اپنا رخ ساحل کی طرف کیا۔ اور تیرنا شروع کردیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اتفاقاً ہی پانی کے دھارے پر آنکلا تھا جس کا رخ ساحل کی جانب تھا اور مجھے تیرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ تاہم میں اب تک یہ اندازہ لگانے سے قاصر

تھا کہ ساحل پر پہنچنے کے لیے ابھی مجھے کتنی دیر اور تیرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ لوگ جو سونا کشتی تک پہنچانے آئے ہوں گے، وہ کس جگہ ہوں گے اگر ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو میں دوبارہ مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔

سردی کی شدت کے باعث مجھ میں مزید تیرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ خشکی پر پہنچنا بھی میرا بے حد ضروری تھا۔ بس اسی خیال سے دل کو تقویت پہنچ رہی تھی کہ جس طرح قسمت نے رہائی دلانے میں مدد کی تھی، اسی طرح وہ مجھے ساحل تک بھی پہنچا دے گی۔ خدا خدا کرکے میں کنارے تک پہنچ گیا۔

میں نے اپنے پاؤں زمین پر ٹکائے اور کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ سمندر کا پانی میرے سینے تک آرہا تھا۔ بہت دیر تک کھڑے رہنے کے باوجود جب کسی طرح کی کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں آگے بڑھا اور رینگتا ہوا خشکی پر لیٹ گیا۔ تھوڑا فاصلہ میں نے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل زمین پر رینگتے ہوئے طے کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ روڈی کے ساتھی میرے اطراف میں نہ چھپے بیٹھے ہوں۔ تاہم جب کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا تو میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اپنی سمت میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کشتی جس پر میں قید تھا تیزی کے ساتھ سمندر کی طرف [illegible] پیغام رسانی کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ روڈی کے ساتھی ابھی تک کنارے پر موجود تھے اور کشتی سے ان کو یہ اطلاع دی جارہی تھی کہ سونے کو کشتی پر لادنے کا کام سر دست ملتوی کردیا گیا ہے۔ کشتی واپس جارہی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اطراف کا جائزہ لیا اور اٹھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کردیا۔ اس وقت میرے نزدیک سب سے اہم بات یہی تھی کہ کسی طرح اپنے جسم کو گرم رکھوں اور اپنے کپڑے سکھا لوں۔ دوسری صورت میں میرا وجود منجمد ہو کر رہ جاتا۔ راستہ خاصا ناہموار تھا لیکن جلد ہی میں ایک سپاٹ میدان میں پہنچ گیا۔ میدان میں پہنچتے ہی میرے بھاگنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں اس وقت موت کے منہ سے نکل آنے پر مسرور تھا۔ اور یہ تصور کہ روڈی کے پروگرام کو ملیامیٹ کرنا اور اسے ناکامی سے دوچار کرنے کا باعث میں ہی ہوں میرے لیے انبساط کا باعث بن رہا تھا۔

"ہائے بے چارہ روڈی!" میں نے تاسف سے کہا۔ اس کی کمند اقبال لب بام پر آکر ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے سونا حاصل کیے بغیر اس جگہ سے بھاگ لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ساحل پر پہنچتے ہی انگلستان کی پولیس تمام "احوال" سے واقف ہو جائے گی۔

وہ وائرلیس کے ذریعے فوری طور پر اس واقعے کو ہوا کے دوش پر نشر کردے گی اور تھوڑی دیر بعد ہی تیز رفتار جہاز اس کشتی کو نرغے میں لے لیں گے۔

لہٰذا روڈی کے پاس راہ فرار اختیار کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ کسی محفوظ جگہ پہنچتے ہی وہ دوبارہ سونے حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

میدان کے اختتام پر مجھے ایک رہائشی عمارت نظر آئی۔ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشے تاریک نہیں تھے۔ ان کے عقب میں روشنی جھانک رہی تھی۔ میں عمارت کے مرکزی دروازے پر پہنچا اور دروازے کو زور سے تھپتھپایا۔ میری نظریں اپنے عقب میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں روڈی کے ساتھی مجھے تلاش کرتے ہوئے اس طرف نہ آنکلیں۔ میں دروازہ کھٹکھٹانے ہی والا تھا کہ یکایک ہی دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا۔ روشنی کی ایک کرن جو کھلے دروازے سے مجھ پر پڑ رہی تھی، اس کی روشنی میں بوڑھے نے فوراً ہی میری حالت کا اندازہ لگالیا۔

"اوہ... تم تو بری طرح بھیگے ہوئے ہو۔" وہ چونک کر بولا۔

"کیا تم سمندر میں تھے؟"

"ہاں! اتفاق سے میں ایک دخانی کشتی [illegible] کے باعث سمندر میں گر گیا تھا۔ سمندر کے شور کی وجہ سے کسی نے بھی میری چیخ و پکار نہیں سنی۔ مجبوراً مجھے تیر کر ساحل تک آنا پڑا۔" میں نے جواب دیا۔

"ویسے کیا آپ کے یہاں ٹیلی فون ہے اور میں اسے استعمال کرسکتا ہوں۔"

"ضرور... یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" بوڑھے نے فراخ دلی سے کہا۔ "برابر والے کمرے میں چلے جاؤ۔"

جس وقت میں فون کا ریسیور پکڑے آپریٹر کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا، میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے فوراً ہی بوڑھے کو پہچان لیا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی لیکن اب مجھے یاد آیا کہ اس بوڑھے کو میں نے کہاں دیکھا تھا۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو روڈی کی ہدایت پر مجھے کار سے اتار کر کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو ہی رہا تھا کہ بوڑھے کی بیوی میرے لیے گرم گرم کافی کا ایک کپ لے آئی۔ میں کافی کو حلق میں انڈیل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف جانب سے فون آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مطلوبہ نمبر دریافت کر رہی تھی۔

"وہائٹ ہال نمبر 1212"۔ میں نے اسے بتایا۔ یہ نمبر اسکاٹ لینڈ یارڈ انکوائری کا تھا۔ رابطہ بحال ہوا تو میں نے اپنے

http://pakfunplace.blogspot.com

مخاطب سے کہا۔

"چیف انسپکٹر ہنری سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ہنری کئی بار میرے کام آ چکا تھا۔ مجھے اس کا طریقۂ کار بہت پسند تھا جبکہ وہ خود میرے طریقِ کار کو پسند کرتا تھا۔

"مسٹر ہنری فی الحال اسکاٹ لینڈ یارڈ میں موجود نہیں ہیں۔" دوسری جانب سے مجھے بتایا گیا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال تو مجھے ایک پتلون اور قمیص درکار ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ غالباً ان لوگوں کو ایک اسپیشل ٹرین سے سرکاری سونے کی چوری کا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں اس معاملے میں بہت کچھ جانتا ہوں مگر ہنری کے سوا کسی کو کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس نے مجھ سے وہ ٹیلی فون نمبر پوچھا جہاں سے میں بات کر رہا تھا اور کہا کہ وہ جلد ہی مجھ سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔

دس منٹ کا وقفہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ خوش قسمتی سے اس وقت ہنری خود ہی بول رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں لیوی کا شون۔۔۔ ہوں اور بھیگے کپڑوں میں ساحلِ سمندر کے قریب ایک مکان سے بول رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اختصار سے اسے پوری روداد بھی سنا ڈالی۔ جواب میں اس نے مجھے اس وقت تک یہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی جب تک متعلقہ پولیس افسر میرے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا اور کار لے کر نہیں پہنچ جاتا۔ پھر اس نے تاکید کی کہ لباس تبدیل کرتے ہی میں سلور گرین ہوٹل پہنچ جاؤں۔ جہاں میرے لیے ایک کمرے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ وہ جلد ہی مجھ سے وہاں آ کر ملے گا۔ میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اس کمرے میں چلا آیا جہاں وہ بوڑھا اور اس کی بیوی میرا انتظار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی مقامی پولیس ہیڈ کوارٹر سے ایک شخص کار لے کر آ پہنچا۔ اس کے ہمراہ گرم سوٹ بھی تھا۔ سلور گرین ہوٹل پہنچتے ہی مجھے فوراً کمرے میں پہنچا دیا گیا جو میرے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا میں کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

مجھے لیٹے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ہنری آن دھمکا۔ میں نے اسے اول تا آخر تمام روداد سنا ڈالی۔ وہ میرے اس خیال سے متفق تھا کہ سونا اب انگلینڈ کی حدود میں موجود ہے اور روڈی کے ساتھیوں نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر اسے کسی مناسب مقام پر چھپا دیا ہوگا۔ ہنری نے مجھے استعمال کے لیے چند چیزیں لا دیں جن میں قانپ ذکر شے پولیس کا شناختی بیج تھا جو لندن میں میرے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔ لہٰذا کچھ دیر آرام کر لینا ہی میرے حق میں بہتر ہے۔ اس نے مجرموں کی گرفتاری اور سونے کی بازیابی اپنے ذمے لے لی تھی۔

میں سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر کے میں نیند کی پُرسکون وادی میں اتر جانا چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آ سکی اور میرے ذہن کی رو پھر اس واقعے کی طرف مبذول ہو گئی۔

کارلوٹا کا خیال آتے ہی میں نے خود سے پوچھا۔

"کیا دنیا کی تمام عورتیں اتنی ہی خطرناک ہوتی ہیں؟"

جواب نفی میں تھا۔ تاہم میں یہ سوچ کر حیران تھا کہ وہ جس دل و دماغ کی عورت تھی، روڈی اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ پھر اتنی کامیابی کے ساتھ اس کی روڈی جیسے شخص کے ساتھ کیسے بن رہی تھی؟ کیونکہ جس وقت روڈی نے مجھے بتایا کہ یہ کارلوٹا کا نظریہ تھا کہ مجھے سمندر میں پھینک دینے کے بجائے وائرلیس آپریٹر کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے تاکہ میں نہ صرف نشر کیے جانے والے پیغامات وصول کر سکوں بلکہ اپنا کوڈ نمبر بتا کر انہیں غلط راستے پر ڈال سکوں تو میں اس وقت اس کی حاضر دماغی کا قائل ہو گیا تھا اور اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دوسرے دن تقریباً دس بجے تک میں سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو ضروریات سے فارغ ہو کر تازہ اخبارات دیکھنے بیٹھ گیا۔ ہر اخبار نے سرکاری سونے کی چوری کی خبر شہ سرخی میں شائع کی تھی جس نے روزنامہ سانچ کا مطالعہ بہتر سمجھا کیونکہ اس میں وہ رپورٹ شائع ہوئی تھی جو گزشتہ شب میں نے اور ہنری نے باہمی صلاح و مشورے سے ترتیب دی تھی۔

رپورٹ یہ تھی۔

"جرائم پیشہ لوگ عموماً آئے دن نت نئے ہنگامے کرتے رہتے ہیں مگر کل صبح ایک اسپیشل ٹرین سے سونے کی ایک بڑی مقدار لوٹنے کی جو واردات عمل میں آئی تھی، اس کی مثال انگلینڈ کی جرائم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تفصیلات کے مطابق تقریباً دو کروڑ پونڈ کی مالیت کا آٹھ ٹن سونا جو سلاخوں کی شکل میں تھا ایک معاہدے کے تحت حکومتِ امریکا نے انگلینڈ بھیجا تھا۔ یہ سونا خفیہ انتظامات کے تحت ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے پورٹ سے شہر میں لایا جا رہا تھا کہ ایک نامعلوم جرائم پیشہ گروہ نے راستے میں ٹرین رکوا کر سونے پر قبضہ کر لیا اور سونا لے کر فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گئے۔

چوری کی اس دلیرانہ واردات میں عملی طور پر چالیس پچاس افراد نے حصہ لیا تھا۔ ٹرین کے مقفل اور سر بمہر دروازے "نائٹرو گلسرین" کے ذریعے کیے جانے والے دھماکوں سے کھولے گئے تھے اور چند ہی منٹ میں ٹرین میں موجود تمام سونا قریب

کھڑی لاری میں منتقل کر دیا گیا۔

پولیس تمام تر کوشش کے باوجود ابھی تک کوئی ایسا سراغ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے جس کی مدد سے گروہ کا پتا چلایا جا سکے یا اس کی گرفتاری عمل میں لائی جا سکے تاہم خیال کیا جاتا ہے کہ نامعلوم گروہ سونے کو ملک سے باہر لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں اور سونا ابھی تک انگلینڈ کی حدود میں موجود ہے۔

پولیس چیف ہنری اور دیگر ذمے دار افسران کا کہنا ہے کہ اتنی مقدار میں سونا ملک سے باہر لے جانا آسان کام نہیں ہے اور جب بھی ایسا کیا گیا پولیس اس کا سراغ لگا لے گی۔"

میں نے یہ رپورٹ پڑھ کر صفحہ پلٹا۔ اگلے صفحے پر ایک دوسری رپورٹ موجود تھی، جو کچھ اس قسم کی تھی۔

"اسپیشل ٹرین سے سرکاری سونا چرا لیے جانے کے سلسلے میں ایلی ایجنسی کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کاشون جو واشنگٹن کے "بی" محکمے سے تعلق رکھتے ہیں اور نیویارک میں اس سونے کی چوری کیے جانے کی افواہ پر تحقیقات کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ آج صبح ایک دخانی کشتی سے جس پر وہ قیدی کی حیثیت سے حراست تھے، سمندر میں چھلانگ لگا کر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اٹلانٹک وچ نامی یہ کشتی جرائم پیشہ گروہ نے نیویارک سے چوری کی تھی۔ مسٹر کاشون فی الوقت سلور گرین ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

اس خبر کے نیچے ایک مختصر سی خبر اور بھی موجود تھی۔

"ایس ایس اوواشنگٹن جہاز جو آج صبح انگلینڈ پہنچا ہے، اس کے کپتان اور جہاز کے دیگر عملے کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے ساحل سے چند میل دور ایک دخانی کشتی کو جلتے اور پانی میں ڈوبتے دیکھا تھا۔"

میں نے دیکھا کپتان کی زبانی کشتی کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا۔ وہ اٹلانٹک وچ ہی کا تھا۔ میرے حلق سے بے ساختہ ایک طویل سانس نکل گئی۔ جس میں طمانیت اور آسودگی کا احساس بھی شامل تھا۔ میں گھومنے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی آمد اتنی غیر متوقع تھی کہ میرے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن یہ چیخ خوشی کے مارے میرے حلق سے برآمد ہوئی تھی کیونکہ آنے والا کوئی اور نہیں وِنگ تھا۔

"میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں میری آمد کی توقع نہیں تھی۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سچی بات یہ تھی کہ وِنگ کو دیکھ کر میں اپنی مسرت پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے اس سے اتنی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا گویا زندگی میں ہم دونوں پہلی بار ملے ہوں۔

"درحقیقت میں تمہاری روپوشی سے سخت متعجب تھا۔ میں صرف چند گھنٹے قبل ہی یہاں پہنچا ہوں۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا کہ تم کہاں ہو؟ لیکن آج کا اخبار پڑھ کر معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گیا۔" وِنگ نے مجھے بتایا۔

"چلو یونہی سہی۔" میں نے کہا۔

"کشتی چوری ہو جانے کے بعد کشتی کے مالک بوڑھے رابرٹ نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی تھیں اس سراغ رساں نے ایک دن روڈی کی غیر حاضری میں اس کے مکان کی تلاشی لی تو اسے ایک ایسا خط ملا جسے آتش دان میں جلانے کے لیے ڈال دیا گیا تھا مگر خوش قسمتی سے پورے طور پر جل نہ پایا۔ اس خط میں روڈی کا انگلینڈ کا پتا موجود تھا۔ وہ یہاں آتے ہی میرے روکنے کے باوجود ریوالور سمیت کار لے کر فیڈرل گیرج کی طرف جا چکا ہے، اب تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا مجھے اس کے تعاقب میں جانا چاہیے۔" وِنگ نے بتایا۔

"خدا کی پناہ۔۔۔ اور یہ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟" میں اپنی جگہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"تیار ہو جاؤ، ہم فوری طور پر فیڈرل گیرج چل رہے ہیں۔" میں نے ہنری کا دیا ہوا ریوالور ہولسٹر میں گھسیڑتے ہوئے کہا اور وِنگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے ہوٹل سے باہر لے آیا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں ہنری کی بھیجی ہوئی کار موجود تھی۔ میں نے وِنگ کو کار میں دھکا دیا اور گاڑی کو جلد ہی مرکزی شاہراہ پر لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ہنری کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر دوں لیکن فون کرنے میں دیر بھی لگ سکتی تھی، لہٰذا میں نے اسے اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ کار برق رفتاری سے فیڈرل گیرج کی طرف جا رہی تھی، یہ علاقہ میرا پہلے سے دیکھا ہوا تھا، لہٰذا وہاں پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ذرا دیر بعد میں فیڈرل گیرج کی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔

فیڈرل گیرج نامی یہ عمارت کئی منزلہ تھی۔

سب سے نچلی منزل پر دکانیں تھیں۔ بقیہ تمام حصہ رہائشی مقصد کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے کار عمارت سے کچھ فاصلے پر روک دی اور عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ عمارت کے عقبی حصے میں ایک جگہ جو نسبتاً خاصی ویران تھی۔ مجھے ایک سائن بورڈ "شارلی گیرج" لکھا نظر آیا۔ گیرج کے دروازے پر "بند ہے" کا بورڈ آویزاں تھا لیکن اس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔

میں نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور بلا توقف اندر گھس گیا۔

اندر کئی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن میں گیرج سے متعلق سامان بھرا ہوا تھا۔ میں ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا ہوا تھا اور وہاں

http://paktunplace.blogspot.com

سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ ویگ میرے عقب میں ریوالور لیے موجود تھا۔ میں نے دروازے پر لات مار کر اسے کھولا اور اندر گھس گیا۔

”ہینڈز اپ۔“ میں حلق کے بل گرجا۔

روڈی کی آواز سن کر میرے وجود میں آگ سی بھر گئی تھی۔

کمرے میں روڈی اور کارلوٹا کے علاوہ دو آدمی اور بھی موجود تھے جبکہ بوڑھا رابرٹ رسیوں سے بندھا زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ روڈی اور اس کے ساتھیوں نے کسی طرح رابرٹ پر قابو پالیا تھا اور اسے بے دست و پا کر کے زمین پر ڈال دیا تھا۔ میری آواز سنتے ہی روڈی اور کارلوٹا دونوں بیک وقت چونکے اور ہاتھ اوپر اٹھا کر مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھورنے لگے۔ روڈی کی آنکھوں میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا، شاید اسے میرے یہاں پہنچ جانے کی توقع نہیں تھی۔

”رسیاں کھول دو۔“ میں نے ویگ کو اشارہ کیا۔

”اور خبردار تم لوگ کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بھون دیے جاؤ گے۔“

میرا یہ جملہ روڈی اور کارلوٹا کے لیے تھا۔ ویگ نے ریوالور زمین پر رکھا اور بوڑھے رابرٹ کے جسم پر بندھی رسی کی بندش ڈھیلی کرنے لگا۔

میری تمام توجہ روڈی اور کارلوٹا کی طرف تھی۔ میں انہیں شرارت کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

رسیوں کی بندش ڈھیلی ہوتے ہی رابرٹ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھا اور ویگ کا ریوالور لے کر کارلوٹا اور روڈی پر فائرنگ شروع کر دی۔ مجھے رابرٹ سے اس پھرتی کی توقع نہیں تھی۔

”کتے ذلیل انسان... میں تجھے نہیں چھوڑوں گا تو چارلس کا قاتل ہے، میرے بیٹے کا قاتل۔“ رابرٹ گولیاں برساتے ہوئے جنونی انداز میں بڑبڑائے جا رہا تھا۔ گولیاں لگتے ہی روڈی اور کارلوٹا تیورا کر زمین پر گرے، کارلوٹا کے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی پیشانی میں جبکہ دوسری اس کے حلق کو ادھیڑتی ہوئی پار نکل گئی تھی، کارلوٹا نے زمین پر گرتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ دونوں آدمی ہاتھ اوپر اٹھائے حیرت سے رابرٹ کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں موت کے سائے لرزاں تھے۔ میں نے چونک کر روڈی کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ خون سے بھر گیا تھا۔ چاروں گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئی تھیں۔

”احمق آدمی! یہ تم نے کیا کر دیا؟“ میں نے پلٹ کر رابرٹ کو ڈانٹا۔ اور روڈی پر جھک گیا۔ وہ نزع کے عالم میں مبتلا تھا۔

”میں بازی ہار گیا کاشون! اسوتا تہ خانے میں موجود ہے۔“

روڈی بجھی بجھی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بڑبڑایا اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

میں نے ان دونوں آدمیوں کو نشانے پر لے لیا اور ویگ کو اشارہ کیا کہ وہ انہیں رسیوں سے باندھ دے۔ ویگ نے پلک جھپکنے میں ہی وہی رسی جو رابرٹ کے جسم پر بندھی ہوئی تھی انہیں دونوں کے ہاتھوں اور پیروں پر لپیٹ دی۔ رابرٹ نے روڈی کے خون میں اپنا ہاتھ بھگویا اور جنونی انداز میں اسے چاٹنے لگا۔ وہ شاید اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

”تو یہ ہے نا آسودہ خواہشوں کا حاصل۔“ میں نے ایک گہری ہنکار لے کر سوچا اور ریوالور کو دوبارہ ہولسٹر میں اڑس لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

”آؤ اب تہ خانے میں بھی جھانک لیا جائے۔“

میں نے ویگ سے کہا۔ وہ ابھی تک ان دونوں آدمیوں کے سروں پر کھڑا تھا۔ جو یقیناً روڈی کے ساتھی ہی تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک ریوالور بردار نسوانی وجود کمرے میں داخل ہوا۔

یہ ویرا تھی۔

”تم یہاں کیسے؟“ اسے دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھ رہی ہوں۔“ ویرا مسکرائی۔

”اس گھر کا پتا مجھے روڈی کا پتا مجھے بتا دیا تھا، جاتے ہی میں سیدھی یہاں چلی آئی۔ مجھے یقین تھا کہ تم یہیں ملو گے۔“

اس نے جواب دیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہ کمرے میں پھیلے خون اور روڈی اور کارلوٹا کی لاشوں پر جا کر جم گئیں۔ لاشیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہراس اُمڈ آیا۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ویرا۔“ میں نے اسے تنبیہ کی۔ وہ بھی پہلی فلائٹ سے یہاں آئی تھی۔

”کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟“ ویرا مسکرائی۔ ”میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔“

”مارے گئے۔“

میں دل ہی دل میں کراہا اور بے بسی سے ویرا کو دیکھنے لگا۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں چاہت کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

”مبارک ہو کاشون!“ ویگ چلایا۔ ”ہنی مون کب منا رہے ہو؟“

میں نے کھا جانے والی نگاہوں سے ویگ کو گھورا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کا یہ جملہ اچھا لگا تھا۔

ویرا نے شرما کر گردن جھکا لی۔

http://paksfunplace.blogspot.com

کافی عرصے کے بعد آج مسز سینڈرا بلیک مور اس پارٹی میں نظر آئی تھیں۔ انہوں نے سیاہ رنگ کا سادہ سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ گردن تک بند لباس، ہاتھوں کے پنجے تک پہنچتی ہوئی آستینیں... لباس پر نہ تو کوئی ڈیزائن کشیدہ تھا اور نہ ہی اس کی آرائش کے لیے کوئی غیر ضروری محنت کی گئی تھی۔ لگتا تھا کہ سادہ مگر دلکش کے اصول پر اسے تیار کیا گیا ہے۔ صرف لباس ہی سادہ نہیں تھا بلکہ انہوں نے نہ تو کانوں میں بندے پہنے ہوئے تھے، نہ ہی گلے میں لاکٹ تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھوں کی انگلیاں بھی انگوٹھی کے بغیر تھیں۔

مسز سینڈرا کی عمر پچاس کے قریب تھی لیکن اس کے باوجود

گونگے کی گواہی

محمد عفان آزاد

گونگے بہروں کی بسائی ہوئی دنیا میں اُس بولتے شخص کا قصہ جس کی قوتِ برداشت قابلِ حیرت تھی مگر جب ضبط کا بند ٹوٹا تو وہ خود خاموش ہوگیا۔

ایک بےزبان مجرم کا قصہ جسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے گویائی کی ضرورت تھی

صحت قابلِ رشک تھی۔ قد لمبا تھا اور اس عمر میں بھی ان کی کمر میں ذرا سا بھی خم نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ جوان لڑکیوں کی طرح بالکل تن کر کھڑی ہوتی تھیں۔ البتہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے سر کے بال پیچھے کی طرف کر کے جوڑا باندھ رکھا تھا۔ بس ایک ہی شے ایسی تھی جو ان کے چہرے پر نمایاں ہو رہی تھی۔ انہوں نے بھوؤں کو کمان کی طرح ہموار رکھا تھا... پتلی پتلی اور خم دار... ان کے چہرے پر بھوؤں کا یہ انداز خاصا دلکش لگ رہا تھا۔

"ہائے... میں ہوں جین سیارڈی۔" میں نے ان کے قریب جا کر اپنا تعارف کروایا۔

انہوں نے میری طرف نظریں گھمائیں اور لمحے بھر میں سر سے پیر تک میرا جائزہ لے ڈالا۔ مجھے ان کی نظروں میں پسندیدگی نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "شکریہ مس جین! اتنے مختصر سے نوٹس پر میری مدد کرنے کا۔" وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے بولیں۔ "بھئی بہت ہی گڑبڑ ہو گئی تھی تمہارے نہ ہونے سے۔ ویسے سچ کہوں تو کسی عورت کے شوہر کو دل کا دورہ پڑا ہو اور وہ اس کے ساتھ اسپتال میں موجود ہو تو اسے کیسے کسی کام کو کرنے کا کہا جا سکتا ہے۔" مسز سینڈرا بولے جا رہی تھیں۔ "یہ تو اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تمہیں کسی ایسے ملزم کی ترجمانی کرنی ہو جو قتل کے مقدمے میں گرفتار ہوا ہے۔"

"واقعی ایسی صورتِ حال میں تو ہاتھ پاؤں پہلے ہی پھولے ہوتے ہیں، کیا خاک صحیح سے کام ہو سکتا ہے۔" میں نے بیچ میں لقمہ دیا۔ "ویسے میں پہلے بھی عدالتوں کے سامنے گونگے اور بہرے لوگوں کی ترجمانی کرتی رہی ہوں لیکن چھوٹے چھوٹے مقدمات میں دیوانی عدالتوں کے سامنے... لیکن جو کام آپ نے کیا، ویسا کام مجھے نہیں کرنا پڑا۔"

"واقعی... ایسا تم نے کیا ہی نہیں ہو گا۔" مسز سینڈرا نے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ یہ چیزیں روز روز نہیں ہوتیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے بات مکمل کی۔

"ہاں، اشاروں کے ذریعے گواہی اور بیان کا وہ دلچسپ انداز تھا۔"

"جب میں نے تمہیں وہاں بیٹھے دیکھا تو مجھے حوصلہ ملا تھا ورنہ مجھے بڑی دقت پیش آتی۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی غلط بات نہ ہو جائے۔" مسز سینڈرا کہنے لگیں۔ "میں نے تو اس وقت اشاروں اور آوازوں، دونوں کا سہارا لیا تھا۔ ویسے گونگے بہروں کی گواہی اور وہ بھی قتل کے معاملے میں، مجھے تو خاصا دشوار کام لگا تھا مگر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ٹھیک ہی کر لیا تھا۔" انہوں نے ایک بار پھر بھویں اوپر چڑھا کر ایسے کہا جیسے مجھ سے تصدیق چاہتی ہوں۔

"بہت عمدہ کر لیا تھا آپ نے۔" میری بات سن کر وہ مسکرانے لگیں۔ میں اشاروں کی زبان کی ماہر ہوں اور میری زبان سے وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہی تھیں۔

"اصل بات تو یہ ہے کہ میں تھوڑی سی نروس بھی ہو رہی تھی۔" انہوں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت دلائل اور گواہ کے بیان کی ویڈیو فلم بھی بن رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ملزم کو تو شک کا فائدہ ملے گا ہی، پر مجھے بھی غلط بیانی اور حقائق مسخ کرنے کے جرم میں مقدمے کا سامنا ہو سکتا ہے۔" میں نے یہ سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں جانتی ہوں کہ کسی بھی گونگے بہرے شخص کی گواہی کو اشاروں کی زبان میں سمجھ کر اسے قتل جیسے مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت کے سامنے بیان کرتے ہوئے کسی بھی شخص کو یہ خوف لاحق ہو سکتا ہے۔

"مقدمے کے بارے میں تمہیں پہلے سے کچھ علم تھا؟" مسز سینڈرا نے سوال کیا۔

"کوئی خاص نہیں۔ اس بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی جتنا اخبارات میں شائع ہو چکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے اس بارے میں جو کچھ مقامی اخبارات میں شائع ہوا یا ٹی وی سے نشر ہوا، وہ بڑا تکلیف دہ تھا۔"

کیلی فورنیا میں گونگے بہروں کے لیے قائم اسکول کے لیے ماہرِ تعلیم مسٹر جیمز ڈگلس کو جب پرنسپل مقرر کیا گیا تو نہ صرف طلبا بلکہ اساتذہ نے بھی اس بات پر احتجاج کیا تھا کہ سماعت اور گویائی کی قوت رکھنے والے شخص کو گونگے بہروں کے اسکول میں کیوں تعینات کیا گیا ہے۔ اس مسئلے نے بہت زور پکڑا لیکن مسٹر ڈگلس بدستور کام کرتے رہے۔ تعیناتی کے صرف دو ماہ کے بعد ہی مسٹر ڈگلس اپنے دفتر میں مردہ پائے گئے۔ ان کا سر کچل کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ قتل کا الزام اسسٹنٹ پرنسپل پر عائد ہوا اور اسے اب مقدمے کا سامنا تھا۔

"قتل سے پہلے جو میڈیا کا رویہ تھا، وہ ان کی موت کے فوراً بعد یکسر بدل گیا۔ اب تو انہیں مرحوم سے بہت ہمدردی ہو گئی ہے۔ مجھے تو یہ بہت شرمناک رویہ لگتا ہے۔" مرحوم پرنسپل کا ذکر کرتے ہوئے مسز سینڈرا کے لہجے میں دردمندی تھی۔ "ویسے کبھی تم ان سے ملی تھیں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"دو چار بار تقاریب میں انہیں دیکھنے، سننے اور ملنے کا موقع ملا۔ بہت ہی پڑھے لکھے، نفیس، حلیم الطبع اور اپنے شعبے کی ماہر شخصیت تھے۔" میں نے مسٹر ڈگلس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ان کی موت تعلیم کے شعبے کے لیے خاصا بڑا نقصان ہے۔"

"مسٹر ڈگلس کے قتل کے حوالے سے دیکھیں تو بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی وجہ سے بعض لوگوں کے مفادات پر زد پڑی تھی۔ اسی لیے وہ انہیں برداشت نہیں کر سکے اور مار ڈالا۔"

"یہ بہت ہی خوفناک رجحان ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے یہ بہت عجیب سا معاملہ لگتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔ جائے وقوعہ سے ایسے شواہد... ملے ہیں جن کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قتل کی ہی واردات تھی۔ اب ایک پروفیسر کو کون قتل کر سکتا ہے؟ وہی جسے اس کے قتل سے فائدہ پہنچے... اور جسے فائدہ ہو گا وہ ہے اسسٹنٹ پرنسپل۔ ویسے بھی وہ ڈگلس کی تعیناتی کا سخت مخالف تھا۔" مسز سینڈرا کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ "اسے ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے کمرے میں ادھر ادھر چیزیں پھیلائی گئی تھیں اور کچھ نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والے پولیس کو چکمہ دینے کے لیے اسے ڈکیتی کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمرے کو بے ترتیب کر دیا، کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور سامان کو ادھر ادھر پھینک دیا تو کیا اس طرح جان بوجھ کر کیا گیا قتل چھپ جائے گا؟" ان کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ "جو ایسا جرم کرتے ہیں، اکثر اوقات پکڑے جاتے ہیں، تب جا کر راز کھلتا ہے کہ یہ جان بوجھ کر کیا گیا قتل تھا، اتفاقی حادثہ نہیں۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ مسٹر ڈگلس کے واقعے میں پولیس گمراہ نہیں ہوئی اور مجرم پکڑا گیا۔"

"ملزم کو اس وقت تک شک کا فائدہ حاصل ہوتا ہے جب تک عدالت اسے مجرم قرار نہ دے۔ ابھی مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ ہمیں کم از کم اپنے ذہن کو فیصلے تک کھلا رکھنا چاہیے۔"

"چھوڑو اسے۔ یہ میرا یا تمہارا کام نہیں ہے کہ قیاس آرائیاں کرتے پھریں۔ اس کام کے لیے پولیس اور عدالت موجود ہے۔ انہیں اپنا کام کرنے دو۔" میرے خیالات سننے کے بعد ان کے لہجے میں ناگواری کا تاثر صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"ہائے مسز البرٹ..." یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک خاتون کی طرف چل دیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اس موضوع پر مجھ سے مزید بات نہیں کرنا چاہتیں، اسی لیے جان چھڑانے کے لیے بہانہ بنا لیا۔

☆☆☆

یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے جب کلیولینڈ پولیس کے ایک افسر نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ قتل کے جرم میں گرفتار ملزم سے تفتیش میں، میں ان کی مدد کروں۔ یہ ملزم سماعت اور گویائی کی قوت سے محروم ہے۔ میں اشاروں کی زبان کی ماہر ہوں مگر اس وقت مصیبت یہ تھی کہ میرے شوہر کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ اسپتال میں تھے اور میں ان کی دیکھ بھال کے لیے وہاں موجود تھی۔ ایسے میں میرے اپنے حواس قابو میں نہیں تھے، میں ان کی خاک مدد کرتی۔ اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ بعد میں پتا چلا کہ سینڈرا بلیک مور نامی ایک عورت نے پولیس کی مدد کی۔ یہ عورت بھی اشاروں کی زبان کی ماہر تھی اور مقامی ٹی وی چینل سے اس بارے میں ایک پروگرام کرتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار ٹی وی شو میں دیکھا تھا۔ بہت عرصے پہلے میں اس کے ایک شو میں شریک بھی ہوئی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد کلیولینڈ کی عدالت کے ایک اہلکار نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ انہیں بطور ماہر میری خدمات کی ضرورت ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تو وہی کیس ہے جس میں پہلے ہی سینڈرا کو شامل کیا جا چکا ہے۔ میرے استفسار پر عدالتی اہلکار نے بتایا کہ مجھے عدالت میں سماعت کے موقع پر اس بات پر نظر رکھنی ہے کہ مسز سینڈرا اشاروں کی زبان میں گواہوں اور ملزم کی جو بات ہمیں بتا رہی ہیں، کیا یہ وہی باتیں ہیں جو ان لوگوں نے اشاروں میں کی ہیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ مسز سینڈرا سے جس ملاقات کا میں ذکر کر رہی ہوں، اس کے چند روز کے بعد باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا تھا۔ مسز سینڈرا نہ صرف پولیس تفتیش میں مدد دے چکی تھیں بلکہ مقدمے کی باقاعدہ سماعت سے قبل بھی انہوں نے ملزم کو عدالت میں پیش کیے جانے کے موقع پر اس کی ترجمانی کی تھی۔ اس موقع پر بھی میں موجود تھی۔

☆☆☆

ڈگلس قتل کیس کی پہلی سماعت شروع ہونے والی تھی۔ کمرۂ عدالت میں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان میں مشتبہ قاتل اور مقتول، دونوں کے کئی شاگرد، دوست اور گواہ بھی تھے۔ کمرۂ عدالت میں سب سے پہلے وکیل استغاثہ داخل ہوئی۔ یہ ایک پکی عمر کی خاتون تھی جس کے سر پر اتنے کم بال تھے کہ اسے گنجی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اٹارنی اور پھر سب سے آخر میں جج اور جیوری کے ارکان داخل ہوئے۔ میں بھی اس وقت عدالت کی معاونت کے لیے وہاں موجود تھی۔

میں پہلے بھی کئی بار ایسے معاملات میں عدالت کی معاونت کر چکی ہوں جہاں گونگے بہرے افراد بطور گواہ یا ملزم کے طور پر کٹہرے میں کھڑے کیے گئے تھے لیکن وہ معمولی نوعیت کے مقدمات تھے اور میں نے بآسانی اس کام کو نمٹا دیا تھا... مگر اس بار میں خاصی نروس ہو رہی تھی۔ معاملہ قتل کا تھا۔ ذرا سی بھول

http://paktunplace.blogspot.com

چوک بے گناہ کو مجرم اور مجرم کو بے گناہ ثابت کرسکتی تھی۔ معاملے کی نوعیت ہی سنگین تھی۔ ایک پروفیسر مقتول اور دوسرا پروفیسر مبینہ قاتل تھا۔ مرنے والا تو جان اور جہان، دونوں سے گزر چکا تھا لیکن جو زندہ تھا وہ نہ تو عدالت کے روبرو اقرارِ جرم کرسکتا تھا اور نہ فردِ جرم سے انکار۔ وہ کسی کی سن سکتا تھا اور نہ اپنی کہہ سکتا تھا۔

مقدمے کی سب سے اہم گواہ مقتول کی بیوہ تھیں۔ عدالت نے سماعت کا آغاز کیا تو انہیں گواہی اور وکیلِ صفائی کے سوالوں کے جوابات دینے کے لیے کٹہرے میں طلب کرلیا گیا۔

مسز ڈگلس الھڑ دوشیزہ کی طرح اٹھلاتی اور کمر لچکاتی ہوئی کٹہرے کی طرف بڑھی۔ اس کی چال ڈھال ایسی نہیں تھی کہ اسے شریف اور سنجیدہ خاتون کی چال قرار دیا جاسکے۔ اس میں دعوتِ نظارہ کا پہلو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بہت عمدہ براؤن اسکرٹ اور اس کی میچنگ کا جدید فیشن کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سنہری اور چہرے پر اچھی خاصی لیپاپوتی کی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ ابھی چند روز پہلے اس کا شوہر بہیمانہ انداز میں قتل کردیا گیا ہے اور وہ عدالت کو یہ بتانے کے لیے حاضر ہوئی ہے کہ اس کے شوہر اور مشتبہ ملزم کے درمیان تعلقات یا تنازع کے حوالے سے ایسی کوئی بات اس کے علم میں ہے جس سے ملزم پر جرم ثابت کرنے میں مدد مل سکے۔ جرم ثابت ... نے آخری بار اپنے شوہر سے جب ملاقات کی تھی، اس وقت مبینہ قاتل اس کے کمرے میں موجود تھا۔

وہ کٹہرے میں پہنچی تو میں نے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے گلے میں لاکٹ لٹک رہا تھا جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا۔ کانوں میں جو چھوٹے چھوٹے بندے تھے، اس میں بھی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ کٹہرے میں داخل ہوکر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی۔ چند لمحوں تک وہ سینے پر ہاتھ باندھے چہار اطراف ادائے بے نیازی سے دیکھتی رہی، پھر لچکتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ لکڑی سے بنے کٹہرے کے جنگلے کے اوپر رکھ دیا۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی اسکول کی طالبہ درخت کا سہارا لے کر، ترچھی کھڑی ہوئی کسی کی آمد کی منتظر ہو۔ اس نے شہادت کی انگشت میں جو انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، اس میں بھی ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس نے جو زیورات پہنے ہوئے ہیں، در اصل وہ سونے سے بنا اور ہیرے جڑا سیٹ ہے جس کی قیمت کم و بیش ایک لاکھ ڈالرز یا اس سے زائد ہوگی۔

یہ شادی یا منگنی کی انگوٹھی ہرگز نہیں تھی۔ ورنہ وہ سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں اسے نہ پہنتی۔ میں عدالت کو اشاروں کی زبان کے ذریعے مدد دینے کے لیے پیش ہوئی تھی مگر پروفیسر ڈگلس کی بیوہ کا یہ انداز مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کررہا تھا۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ ایک استاد، چاہے وہ پرنسپل ہی کیوں نہ ہو، اس کی تنخواہ اتنی زیادہ بھی نہیں ہوتی کہ اس کی بیوی اتنے مہنگے زیورات خرید سکے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ عورت خود کوئی کام کرتی ہو مگر پھر بھی اس نے جو سیٹ پہن رکھا تھا، وہ کم قیمت کا تو ہرگز نہیں تھا۔ اس پر یہ کہ جس چال ڈھال سے وہ آگے بڑھی تھی، یہ انداز ایسا ہرگز نہیں تھا جو چالیس کی دہائی عبور کرجانے والی عمر کی کسی ایسی معتبر خاتون کا ہو، جو کسی ادارے میں خود کام کاج کرتی ہو یا کسی بزنس سے وابستہ ہو۔

''آپ کا نام؟'' سرکاری وکیلِ صفائی نے اس سے سوال کیا تو میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''وکٹوریا... مسز وکٹوریا وارن ڈگلس۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''اپنے پس منظر کے بارے میں مختصر طور پر بتایئے۔'' سرکاری وکیلِ صفائی نے سوالات کا آغاز کیا۔

''میں اپنے شوہر کے قتل کے بعد کیلی فورنیا منتقل ہوگئی تھی اور اب وہیں پر مقیم ہوں۔ گزشتہ ہفتے میں اس لیے واپس آئی تھی کہ عدالت نے مجھے سماعت کے لیے طلب کیا تھا۔ برسوں پہلے میں ایک آرٹ گیلری میں کام کرتی تھی لیکن کئی برس ہونے کو آئے، میں کوئی کام نہیں کرتی۔ البتہ جب میں یہاں آئی تو حلقۂ ادب سے بطور رضاکار وابستہ ہوگئی۔ ڈگلس سے بائیس سال پہلے شادی کی تھی۔ ہماری کوئی اولاد نہیں۔ گزشتہ اگست میں جب مسٹر ڈگلس نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے کلیولینڈ آئے تو میں بھی ان کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ ہم اسکول کے رہائشی کیپاؤنڈ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔'' یہ کہہ کر وکٹوریا نے گہری سانس لی اور خاموش ہوکر وکیلِ استغاثہ کے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا تمہارے شوہر کو اسکول میں مسائل کا سامنا تھا؟'' وکیلِ صفائی نے وکٹوریا کے مختصر سے تعارف کے بعد مقدمے کا ایک اہم سوال کیا۔

''جی ہاں۔ انتظامیہ کو اس بات پر اعتراض تھا کہ قوتِ سماعت کے حامل ایک نارمل شخص کو گونگے بہروں کے اسکول کا پرنسپل کیوں بنایا گیا ہے۔ اس وجہ سے میرے شوہر کے خلاف مظاہرے شروع کردیے گئے تھے۔ اس بات پر وہ پریشان تھے مگر پُرامید تھے کہ معاملات بہت جلد سنبھل جائیں گے۔'' وکٹوریا کا لہجہ پُراعتماد تھا اور وہ نہایت سپے تلے الفاظ... میں اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ خود کو اس کٹہرے میں آنے سے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کرچکی ہے۔

جہاں ... ہوئے وہ بالکل سیدھی کھڑی تھی اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔

''اب ہم آتے ہیں اس سال کی پندرہ اکتوبر کی تاریخ پر۔ مسز وکٹوریا وارن ڈگلس... پلیز! آپ بتایئے کہ اس تاریخ کو کیا ہوا تھا؟'' وکیل نے بیان کا رُخ ڈگلس کے قتل کی طرف موڑتے ہوئے سوال کیا۔

''جس دن واقعہ ہوا، اس دن شام چار بجے حلقۂ ادب کی کمیٹی کا اجلاس تھا جس میں مجھے بھی شرکت کرنی تھی۔ ہم لوگوں نے ہیلووین کے سلسلے میں تقریب منعقد کرنے کا سوچا تھا اور یہ میٹنگ اسی سلسلے میں تھی۔'' وکیلِ استغاثہ کا سوال سن کر اس نے سینے پر بندھے ہاتھ کھول کے نیچے کیے، انگلیوں کو پھیلایا اور پھر ایک گہری سانس لے کر ہاتھ دوبارہ سینے پر باندھ لیے اور... سوال کا جواب دینے لگی۔

''اس دن سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے، جب میں اپنے شوہر سے ملنے کے لیے ان کے دفتر میں پہنچی۔'' وکٹوریا نے تفصیل سے قتل والے دن کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ''مجھے کوکنگ اور بیکنگ کا بہت شوق ہے۔ اس دن بھی میں نے میٹنگ کے شرکا کے لیے نئی ترکیب کے مطابق بسکٹ بنائے تھے۔ وہ بہت لذیذ بنے تھے۔ میں چند بسکٹ لے کر اپنے شوہر کو چکھانے کے لیے ان کے دفتر چلی گئی تھی تاکہ انہیں بھی پتا چلے کہ میں اپنے ... کتنے ... ہوں۔ میرے شوہر نے بسکٹ چکھے اور میری تعریفیں شروع کردیں۔ ہم باتیں کررہے تھے کہ اس دوران میں مس ہانسن کمرے میں داخل ہوئیں۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے مس ریتا ہانسن؟'' وکیلِ استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں، میں یہی کہہ رہی ہوں کہ ہم دونوں باتیں کررہے تھے کہ مس ریتا ہانسن کمرے میں داخل ہوئیں۔'' وکٹوریا نے سوال سن کر نہایت وضاحت سے جواب دیا۔ ''جب مس ہانسن کمرے میں داخل ہوئیں تو میرے شوہر اور وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ کسی رپورٹ کے بارے میں بات کررہے تھے جسے کل صبح بھیجنا ضروری تھا۔ مس ہانسن بتارہی تھیں کہ وہ رات گئے تک رپورٹ پر کام کرتی رہی ہیں۔ امکان ہے کہ آج بھی انہیں اپنے گھر میں رات دیر... تک بیٹھ کر اس رپورٹ پر کام کرنا پڑے گا تاکہ کل صبح اسے بھیجا جاسکے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رُکی۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''میرے شوہر مس ہانسن سے باتیں کررہے تھے کہ اسی دوران میں اسسٹنٹ پرنسپل ڈاکٹر ہاپکنس بھی کمرے میں داخل ہوئے۔''

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کرسکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

http://paktfunplace.blogspot.com

"آپ ڈاکٹر ہاپکنس بے کو پہلے سے جانتی تھیں؟" وکیل صفائی نے وکٹوریا کی بات کو بیچ میں کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید بہت اچھی طرح نہیں۔ میں ان سے صرف دو تین بار ملی تھی اور وہ بھی اسکول کی تقریبات میں۔ ہمارے درمیان صرف رسمی بات چیت ہوئی تھی۔"

"ایک تقریب میں... وہ جو آپ اور آپ کے شوہر کی آمد کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی اور دوسری وہ جس دن مسٹر ڈگلس نے پرنسپل کا چارج سنبھالا تھا۔ تو ان دونوں تقریبات میں آپ کی ڈاکٹر ہاپکنس بے سے اولین ملاقاتیں ہوئیں؟" وکیل نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی نہیں... ان دونوں میں سے کسی ایک تقریب میں بھی ڈاکٹر ہاپکنس بے شریک نہیں ہوئے تھے۔ میرا تو ان سے یہاں آنے کے کئی روز کے بعد تعارف ہوا تھا اور وہ بھی رسمی۔" وکٹوریا نے عدالت کو بتایا۔

"میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس موقع پر عدالت میں بیٹھی ایک خاتون نے ہاتھ اٹھا کر مداخلت کی۔ جج نے وکٹوریا کو روک کر اسے بولنے کا موقع دیا۔ "جب مسٹر اینڈ مسز ڈگلس کی آمد کے موقع پر استقبالیہ دیا گیا اور جس دن ان کے بطور پرنسپل چارج سنبھالنے کے موقع پر تقریب ہوئی، ان دونوں مواقع پر ڈاکٹر ہاپکنس بے طلبا کے مظاہرے میں شریک تھے جو مسٹر ڈگلس کی تقرری کے خلاف کیا جارہا تھا۔" مسز ہافن نے عدالت کو آگاہ کیا۔ مسز ہافن خود بھی اسی اسکول سے وابستہ تھیں لیکن وہ نارمل انسان تھیں۔ "میں یہ بات کہہ کر عدالت کا ریکارڈ مزید واضح رکھنا چاہتی تھی۔"

"بہت شکریہ۔ اب آپ اپنی جگہ جاسکتی ہیں۔" جج نے انہیں کٹہرے سے واپس اپنی نشست کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

"یور آنر... اکتوبر کی پندرہ تاریخ کو مسز ڈگلس اپنے شوہر کے دفتر میں موجود تھیں، جب ہاپکنس بے وہاں پہنچے۔" مسز ہافن کے مختصر وضاحتی بیان کے بعد وکیل صفائی نے مقدمے کے اہم ترین گواہ سے ایک بار پھر جرح شروع کی۔ "مسز ڈگلس... کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ وقوعہ کے روز، سہ پہر کے وقت جب آپ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے دفتر میں موجود تھیں تو ڈاکٹر ہاپکنس بے بھی وہاں پہنچے۔ اس کے بعد مسٹر ڈگلس اور ڈاکٹر ہاپکنس بے کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

"ڈاکٹر ہاپکنس بے اور میرے شوہر اشاروں کی زبان میں بات چیت کر رہے تھے اور میں ان اشاروں سے قطعی ناواقف ہوں۔ اس لیے میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بات کر رہے ہیں۔" اس نے جواب دے کر گہری سانس لی اور پھر کہنے لگی۔ "کچھ دیر تک دونوں اشاروں میں بات چیت کرتے رہے، پھر میرے شوہر کی سیکریٹری بھی اندر آگئی اور وہ بھی اس گفتگو میں شامل ہوگئی۔"

"کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت ڈاکٹر ہاپکنس بے کے رویے سے کیا تاثر ابھر رہا تھا؟" وکیل نے پھر سوال کیا۔

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں اشاروں کی زبان سے قطعی طور پر ناواقف ہوں اور ڈاکٹر ہاپکنس بے کو بھی صرف رسمی طور پر ہی جانتی ہوں۔ اس لیے یہ کہنا اور بتانا میرے لیے بہت مشکل ہے کہ ان کے تاثرات سے اس وقت میں کیا سمجھ سکی تھی۔" وکٹوریا نے اس طرح جواب دیا جیسے اب وہ جرح سے الجھن محسوس کرنے لگی ہے۔ اس نے سینے پر بندھے ہاتھ کھول دیے تھے اور بار بار اپنی انگلیوں کو کبھی کھول اور کبھی مٹھی کی طرح بند کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی جھنجلاہٹ نمودار ہو چکی تھی۔

"کیا وہ اس طرح کی گفتگو تھی جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ ہاپکنس بے اس وقت غصے میں ہو؟" وکیل صفائی نے وکٹوریا سے ایک بار پھر اپنا پرانا سوال تھوڑا سا گھما پھرا کر کیا۔

"مجھے اعتراض ہے یور آنر..." وکیل استغاثہ نے وکیل صفائی کا بیان سن کر اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلے ہی یہ بتا چکی ہیں کہ اشاروں کی زبان نہیں جانتیں۔ اس کے باوجود ان سے دوبارہ یہ سوال کیا جارہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔" وکیل صفائی نے اعتراض سن کر جھٹ سے کہا۔ "آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اس بات چیت کے دوران مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔" وکٹوریا نے ایک بار پھر جواب دینا شروع کیا۔ "اس کے بعد میں نے بسکٹ وہیں چھوڑے اور اپنے شوہر کو خدا حافظ کہہ کر گھر لوٹ آئی۔ مجھے اچانک طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے میٹنگ میں جانے کا پروگرام منسوخ کر کے گھر لوٹ آئی اور آرام کرنے لگی۔ شام ڈھلے اٹھ کر ڈنر تیار کیا۔ مسٹر ڈگلس کبھی کبھار رات کو دیر سے گھر لوٹتے تھے لیکن اس دن تو حد ہی ہوگئی۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن وہ گھر نہیں لوٹے۔ میں ڈنر پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ویسے بھی یہ ان کے معمول کے خلاف تھا۔ رات کو اتنی دیر تک وہ کبھی بھی باہر نہیں رہتے تھے۔ اس لیے مجھے ان کے اس وقت تک گھر نہ لوٹنے پر تشویش ہونے لگی۔ میں نے ان کے دفتر فون کیا مگر وہ فون نہیں اٹھا رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ادھر ادھر نہ ہوں، میں نے ان کے لیے آنسرنگ مشین پر پیغام چھوڑ دیا تاکہ جب وہ لوٹیں تو مجھے فون کرلیں۔" یہ کہنے کے بعد اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال نکال کر اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کرتی رہی۔ کمرۂ عدالت میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"رات کے گیارہ بج گئے تھے لیکن مسٹر ڈگلس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ ان کے دفتر فون کیا مگر وہ فون نہیں اٹھا رہے تھے۔ اس کے بعد میری تشویش بڑھتی چلی گئی۔ میں خود ان کے دفتر جانا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر گھر پر ہی ٹھہری رہی کہ کہیں میں ان کی طرف جاؤں اور وہ گھر نہ آجائیں۔ اس لیے میں نے تیسری بار ان کے دفتر میں فون کرنے کے بجائے اسکول کے سیکیورٹی آفیسر کا نمبر ملایا اور اس کو ساری بات بتا کر کہا کہ وہ ان کے دفتر میں جا کر دیکھے اور اگر وہ وہاں موجود ہوں تو پیغام دے کہ مجھ سے گھر پر فوراً بات کریں۔ اس نے میری بات سن کر فون بند کر دیا مگر ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا کوئی خبر نہیں ملی۔ اس کے بعد دو پولیس والے میرے گھر پہنچے اور بتایا کہ میرے شوہر ڈگلس جیمس کا قتل ہوگیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیلی فورنیا کا موسم معتدل جبکہ کلیولینڈ سخت سرد علاقہ ہے۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر ایسی کون سی خاص بات تھی کہ پوری زندگی کیلی فورنیا میں بسر کرنے کے بعد آپ اور آپ کے شوہر نے یہاں آنا پسند کیا؟" کچھ دیر بعد جب وکٹوریا کی حالت سنبھلی تو وکیل صفائی نے ایک بار پھر جرح کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"میرے شوہر پرنسپل بننا چاہتے تھے اور یہ موقع انہیں کلیولینڈ میں مل رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کیلی فورنیا کے جس اسکول میں تھے، وہاں وہ بطور اسسٹنٹ پرنسپل کام کر رہے تھے۔ پرنسپل کی عمر پچاس سال سے بھی کم تھی اور وہ اچھی صحت کا مالک تھا۔ میرے شوہر کا خیال تھا کہ جب تک وہ پرنسپل ریٹائر ہوگا، وہ خود بھی ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچ جائیں گے۔ اس لیے انہیں وہاں پرنسپل بننے کا موقع نہیں مل سکے گا اسی لیے جب یہ موقع انہیں کلیولینڈ میں ملا تو وہ فوراً یہاں آنے پر تیار ہوگئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور خاص وجہ نہیں تھی یہاں آنے کی۔" وکٹوریا نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"شاید ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے اور وہ ہے آپ کے مقتول شوہر کے اسکینڈلز... جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے آپ دونوں نے کیلی فورنیا سے یہاں آنا پسند کیا۔" وکیل صفائی نے کہنا شروع کیا۔ وکٹوریا خاموشی سے اس کی جانب تک رہی تھی۔

"آپ کے شوہر وہاں اپنے اسٹاف کی ایک ایسی ٹیچر کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے جو ان سے عمر میں بیس سال چھوٹی تھی۔ یہ اسکینڈل تو اسکول میں چٹخارے دار خبر تھی، ہر طرف اس بات کا چرچا تھا۔"

"مجھے اپنے شوہر پر اعتماد تھا، ویسے بھی اس طرح کی افواہیں اور اسکینڈلز تو ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کبھی ان باتوں پر کان نہیں دھرے۔" وکٹوریا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بعد وہ آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لے گئی اور گردن کو دبانے لگی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا۔ "بس! اب میں تھک چکی ہوں۔"

اس دوران میں وکیل صفائی اپنے نوٹ پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دوبارہ جرح شروع کی۔ "ہم ایک بار پھر پندرہ اکتوبر کی طرف چلتے ہیں۔ آپ نے اپنے شوہر کو بسکٹ دیے اور اس کے بعد انہیں خدا حافظ کہہ کر گھر لوٹ آئیں اور اس کے بعد اپنے گھر سے کہیں بھی نہیں گئیں... یہ بات درست ہے؟"

"بالکل درست..." وکٹوریا نے کہا۔ "مجھے اس شام ادبی حلقے کے اجلاس میں شرکت کرنا تھی لیکن میری طبیعت اچانک بگڑنے لگی تھی۔ طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہونے لگا تھا اس لیے میں گھر لوٹی اور اپنے بیڈروم میں جا کر آرام کرنے لگی۔"

"رات کو ساڑھے گیارہ بجے آپ نے سیکیورٹی افسر کو فون کیا۔ اس وقت تک نہ تو آپ کو کسی نے فون کیا اور نہ ہی کوئی ملنے آیا۔ نہ ہی آپ نے خود کسی سے بات کی۔ بڑا عجیب اتفاق ہے یہ۔"

"مجھے اعتراض ہے یور آنر... یہ بالکل غیر متعلق سوال ہے۔" وکیل صفائی کا سوال سن کر وکیل استغاثہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جج نے اعتراض مسترد کر دیا۔ "مسز ڈگلس... برائے مہربانی سوال کا جواب دیجیے۔" جج نے ہدایت کی۔

"ہم لوگ کلیولینڈ میں بالکل اجنبی تھے۔ یہاں ہمارے بہت زیادہ واقف کار نہیں۔ اس وقت ہمیں یہاں آئے..... صرف دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس دوران ایک بار بھی ہمارے گھر پر کوئی شخص ملنے کے لیے نہیں آیا۔ جہاں تک فون کی بات ہے، پولیس ٹیلی فون ریکارڈ کے ذریعے یہ بات معلوم کر سکتی ہے کہ اس دن میں نے کس کس کو فون کیے اور کتنے فون میرے پاس آئے۔ میں نے اس دن دو بار اپنے شوہر کے دفتر کا نمبر ملایا اور تیسرا نمبر سیکیورٹی افسر کا تھا۔ اس کے سوا تو کوئی فون آیا اور نہ کیا گیا۔" وکٹوریا کے لہجے سے اب تھکن کے ساتھ ساتھ غصہ بھی جھلکنے لگا تھا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"ٹھیک ہے۔" وکیلِ صفائی نے وکٹوریا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "مجھے مزید سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یور آنر۔"

اس کے بعد مسٹر ڈگلس کی سیکریٹری رینا ہاسن کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا۔ رینا نارمل انسان تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اگلے سمسٹر کے لیے بجٹ رپورٹ کے حوالے سے پرنسپل کے کمرے میں گئی تھی۔ "بورڈ نے بجٹ رپورٹ مانگی تھی لیکن یہ مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرنے کے لیے میں پرنسپل کے پاس گئی تھی۔ جب میں کمرے میں پہنچی تو وہاں پہلے سے ہی مسز ڈگلس اور مسٹر ہاپکنس بے موجود تھے۔ میں نے جب پرنسپل کو رپورٹ کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ وہ آج رات دیر تک بیٹھ کر اسے مکمل کر دیں گے۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ مسز ڈگلس وہاں سے اٹھ کر چلی دیں۔ میں جب تک وہاں موجود تھی، اس وقت تک مسٹر ہاپکنس بے بالکل خاموشی سے صوفے پر بیٹھے رہے۔ میرے جانے کے بعد اس کمرے میں کیا کچھ ہوا، اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ میں پرنسپل کے پاس سے واپس آئی تو چار بجنے والے تھے۔ میں نے اپنا بیگ سنبھالا، کمرا بند کیا اور گھر چلی آئی۔"

اس کے بعد وکیلِ صفائی اور استغاثہ نے اس سے ایک دو سوالات کیے اور اسے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد فرینک اسمتھ کو طلب کیا گیا۔ یہ ملزم ہاپکنس بے کا دوست تھا اور اسی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پندرہ اکتوبر کو وہ شام ساڑھے چھ بجے کے قریب مقامی ریستوران میں ملے اور رات پونے آٹھ بجے تک وہیں تھے۔ انہوں نے وہیں ڈنر کیا۔ اس دوران میں چند لمحوں کے لیے بھی ہاپکنس بے نے ریستوران سے قدم باہر نہیں نکالے۔

پولیس کے مطابق یہ قتل رات پونے سات سے سوا سات بجے کے درمیان ہوا تھا لیکن فرینک کا بیان یہ ثابت کر رہا تھا کہ ملزم اس وقت ریستوران میں تھا۔ عدالت میں ریستوران کے منیجر اور ویٹر کو بھی گواہی کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی ہاپکنس بے کی وہاں موجودگی کی تصدیق کی۔

ملزم ڈاکٹر ہاپکنس بے کا بیان تھا کہ وہ ذاتی طور پر مسٹر ڈگلس سے کوئی دشمنی نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ اس کا حق ہے، اس لیے وہ ان سے جلتا تھا لیکن اتنا بغض نہیں رکھتا تھا کہ اسے قتل کر دے۔ اس نے بتایا کہ جس دن پرنسپل کا قتل ہوا، وہ ان کے پاس اگلے سمسٹر کے حوالے سے چند سفارشات لے کر گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے سمسٹر کے بجٹ میں طالب علموں کے لیے مطالعاتی دورے کو شامل کر لیا جائے اور بس... اپنی سفارشات دینے کے بعد شام کے ساڑھے چار بجے کے قریب وہ دفتر سے نکلا اور اپنے گھر چلا آیا اور چھ بجے فرینک کے ساتھ باہر چل دیا اور ریستوران میں ڈنر کیا۔

بیانات کی روشنی میں تو یہ ثابت ہو رہا تھا کہ قتل ہاپکنس بے نے نہیں کیا تاہم ابھی عدالت کو فرانزک رپورٹ کا انتظار تھا اس لیے سماعت اگلے روز تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میری کارکردگی کیسی رہی؟" عدالت سے باہر نکلتے ہوئے مسز سینڈرا نے مجھ سے سوال کیا۔

"بہت عمدہ۔"

"مجھے تو یہ ہاپکنس بے بہت ڈھونگی لگ رہا ہے۔" اس نے چلتے ہوئے کہا۔ وہ میرے برابر چل رہی تھی۔

"معلوم نہیں۔" میرا جواب اس بار بھی مختصر تھا۔

☆☆☆

اگلے روز سماعت شروع ہوئی تو پولیس نے فرانزک رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کے مطابق کانسی کے ایک گل دان سے مسٹر ڈگلس کے سر کے پچھلے حصے پر بہت کاری وار کیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کاری وار کے سبب مقتول کا حرام مغز متاثر ہوا اور اس کی فوری موت واقع ہو گئی۔ پولیس نے گل دان بھی عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ کانسی کا بنا ہوا قیمتی اور کافی وزنی گل دان تھا۔

عدالت نے گواہوں کے بیانات قلم بند کر لیے تھے تاہم وکٹوریا اور دیگر گواہوں کے بیانات کا بغور جائزہ لینے پر تضاد نظر آ رہا تھا۔ مسز ڈگلس کا کہنا تھا کہ ان کے شوہر بنا اطلاع کے رات گئے تک نہیں لوٹے اور وہ پریشانی کے عالم میں گھر پر ان کا انتظار کرتی رہی لیکن رینا ہاسن کا کہنا تھا کہ مقتول نے اپنی بیوی کے سامنے یہ بات ان سے کہی تھی کہ وہ دیر تک بیٹھ کر اگلے سمسٹر کی بجٹ رپورٹ آج ہی مکمل کر دیں گے... جبکہ مسز ڈگلس نے کہیں بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا بیان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ سرے سے ہی اپنے شوہر کے دیر... تک گھر نہ لوٹنے کی وجہ سے لاعلم تھی۔

ملزم ہاپکنس بے نے عدالت کو اپنی جن سفارشات کے بارے میں بتایا تھا، عدالت نے جب نامکمل بجٹ رپورٹ کا جائزہ لیا تو وہ اس میں شامل تھیں۔ یہ بات ہاپکنس بے اور ڈگلس کے درمیان ملاقات کی وجہ کا ثبوت تھا۔ دیگر جن گواہوں نے اس وقت ہاپکنس بے کی ریستوران میں موجودگی کی گواہی دی تھی جس وقت پولیس رپورٹ کے مطابق قتل ہوا... تو پھر ملزم کون تھا؟ اب پولیس کو اس پیچیدہ سوال کا جواب ڈھونڈنا تھا۔

گیارہ بجے چائے کا وقفہ ہوا۔ اس کے بعد جیوری کے ارکان اپنے مخصوص کمرے میں صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے

کے بعد مجھے بلایا گیا۔ مجھ سے جیوری نے سوال کیا کہ جن گونگے اور بہرے گواہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے جوابات دیے ہیں، کیا مسز سینڈرا ایلیک مور نے ان کی درست تشریح کی ہے؟

"ہاں... مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے تشریح کرتے ہوئے کوئی غلط بیانی کی ہو۔"

ایک گھنٹے کے بعد عدالت دوبارہ لگی اور سماعت پھر شروع ہوئی۔ جج نے گواہوں کے بیانات اور پولیس رپورٹ کی روشنی میں ہاپکنس بے کو بے قصور قرار دیتے ہوئے باعزت بری کر دیا اور پولیس کو ہدایت کی کہ تفتیش جاری رکھی جائے تاکہ اصل ملزم کو گرفتار کیا جا سکے۔

جس وقت عدالت نے اپنا مختصر فیصلہ سنایا، اس وقت وکٹوریا وارن ڈگلس میرے برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ فیصلہ سنتے ہوئے اس کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ خوف کی جھلک بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ سب جج کو دیکھ رہے تھے اور میں جج کے الفاظوں کے اثرات وکٹوریا کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

"بہت برا ہوا۔ میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ قاتل ہاپکنس بے ہی ہے۔" عدالتی فیصلے کے بعد کورٹ ریستوران میں میرے ساتھ کافی پیتے ہوئے مسز سینڈرا نے مجھ سے کہا۔

"تمہارا خیال ہے کہ کیا تم اپنے خیال کو درست ثابت کرنے کے ٹھوس ثبوت پیش کر سکتی ہو؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ بھڑک گئیں۔

"یہ تو عدالت کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔"

"اور عدالت صرف ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے بیانات پر انحصار کرتی ہے، خیالوں پر نہیں۔"

"تم بھی ٹھیک کہہ رہی ہو۔" انہوں نے ہار مانتے ہوئے ہچکی کے لہجے میں کہا۔

کافی پینے کے بعد میں نے بل ادا کیا اور ہم دونوں اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔

☆☆☆

ڈگلس کیس میں ڈاکٹر ہاپکنس بے کے بری ہونے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ یہ کیس تقریباً میں بھول چکی تھی لیکن ایک ماہ بعد جب میں نے صبح کے ناشتے کی میز پر اخبار پڑھنا شروع کیا تو وہاں بڑے حاشیے میں خبر لگی تھی۔

"شوہر کے قتل کے جرم میں بیوی گرفتار۔"

خبر کے ساتھ ہی وکٹوریا، ڈگلس اور ایک راجر نامی شخص کی بھی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دلچسپی سے خبر پڑھنا شروع کر دی۔

خبر کے مطابق کیلی فورنیا میں نوادرات کے ایک دولت مند اسمگلر راجر سے وکٹوریا کے بہت پرانے تعلقات تھے۔ جب وہ لوگ کیلی فورنیا سے کلیولینڈ منتقل ہو گئے، تب بھی دونوں کے مراسم جاری رہے۔ راجر ہفتہ دس دن میں ایک بار چھپ چھپا کر وکٹوریا سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ جس دن ڈگلس کا قتل ہوا، اس دن بھی وہ آیا ہوا تھا۔ اسی سے ملنے کے لیے وہ بہانہ تراش کر گھر سے باہر جانا چاہتی تھی لیکن جب دفتر میں پہنچ کر اس نے اپنے شوہر کو سیکریٹری سے یہ کہتے سنا کہ وہ شام دیر تک بیٹھ کر آج ہی اس رپورٹ کو مکمل کرے گا تو وہ یہ سن کر اٹھی اور سیدھی گھر پہنچی۔ راجر گھر کے باہر کار میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئی۔

شام کے چھ بجے کے قریب ڈگلس نے اپنی بیوی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ وہ رات کو گھر دیر سے آئے گا مگر وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ فون لاؤنج میں تھا اور اس وقت وکٹوریا، راجر کے ساتھ اوپری منزل پر واقع بیڈروم میں تھی۔ اس لیے وہ فون کی گھنٹی نہ سن سکی۔ اس لیے وہ خود گھر پہنچ گیا۔ ابھی ڈگلس گھر کے داخلی دروازے پر ہی تھا کہ ... سروس کا نمائندہ آ گیا۔ وہ ان

Monthly Digest
مکتبہ اہلاً و سہلاً
Sole Distributor
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
Email: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

کے نام ایک خط لے کر آیا تھا۔ اس نے خط لے کر دستخط کیے اور اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

جب وہ بیوی کو تلاش کرتے ہوئے بیڈ روم میں پہنچا تو اس نے ..... وکٹوریا کو، اس کے آشنا کے ساتھ نازیبا حالت میں پایا۔ وہ غصے میں پلٹا اور دوبارہ آفس پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وکٹوریا بھی پہنچ گئی۔ ڈگلس دو بار پہلے بھی راجر کے ساتھ اپنی بیوی کو رنگے ہاتھوں پکڑ چکا تھا اور اسی وجہ سے وہ کیلی فورنیا سے کلیولینڈ منتقل ہوا تھا .... اسے یقین تھا کہ اتنی دور آنے کے بعد ان دونوں کے تعلقات شاید ختم ہو جائیں گے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس بار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وکٹوریا نے ہر بار راجر سے قطع تعلق کا وعدہ کیا اور پھر مکر گئی۔ اس دن بھی وہ شوہر کے پیچھے پیچھے اسے منانے پہنچ گئی تھی۔

ملزمہ وکٹوریا نے پولیس کو بتایا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اسے طلاق دے۔ وہ راجر کے ساتھ شادی نہیں صرف تعلقات رکھنا چاہتی تھی اور راجر بھی ان مراسم سے خوش تھا۔ اس لیے جب وہ شوہر کو منانے کے لیے پہنچی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ بس اسی دوران میں اس نے کہا کہ وہ کل صبح عدالت میں طلاق کا مقدمہ دائر کر دے گا۔ یہ سن کر وہ طیش میں آ گئی۔ وہ طلاق دیے جانے کو اپنی عزتِ نفس پر وار سمجھتی تھی اس لیے اس نے غصے میں میز پر رکھا ہوا بھاری گل دان اٹھا کر شوہر کے سر پر دے مارا۔ جب اسے لگا کہ وار کاری ہے اور شاید وہ مر چکا ہے تو اس نے گل دان سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور واپس چلی آئی۔ اسے آتے جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ واپس گھر پہنچی تو اس وقت بھی راجر وہیں موجود تھا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر کہانی گھڑی اور وکٹوریا نے الزام ہائیکس بے کے سر تھوپ دیا۔

خبر کے مطابق ہائیکس بے کی بریت کے بعد پولیس نے مزید تفتیش کی تو اسے پرنسپل کے کمرے کی میز پر سے ایک لفافہ ملا جس پر ڈیلیوری ٹائم شام سوا چھ بجے اور تاریخ پندرہ اکتوبر کی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ خط پر پتا اس کے گھر کا تھا جبکہ یہ ملا اس کی میز پر سے۔ حالانکہ وکٹوریا پہلے ہی بیان دے چکی تھی کہ سہ پہر کے بعد سے لے کر شوہر کی موت تک وہ گھر سے باہر نہیں گئی تھی تو پھر گھر کے پتے پر ڈیلیور کیا گیا خط دفتر میں کیسے پہنچا؟

اخبار کی خبر کے مطابق پولیس نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ ڈیلیوری مین نے یہ خط اس کے گھر کے پتے پر ہی ڈیلیور کیا تھا اور وہ بھی خود مسز ڈگلس کو۔ جب ریکارڈ میں دستخط چیک کیے گئے تو وہ بھی اسی کے تھے۔ تب سوال پیدا ہوا کہ ڈگلس گھر کیوں گیا اور پھر دفتر واپس کیوں آیا؟ جب وہ گھر گیا تھا تو وکٹوریا نے اس کی آمد کے بارے میں کیوں جھوٹ بولا کہ وہ اس کا انتظار کرتی رہی مگر وہ گھر نہیں لوٹا۔

راجر اور وکٹوریا کو کیلی فورنیا کے ایک اپارٹمنٹ سے گرفتار کیا گیا اور پولیس کے مطابق دونوں نے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔

یہ پڑھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”میرا شک درست تھا کہ یہ عورت بدکردار ہے مگر یہ تو اس سے بھی دو قدم آگے کی چیز نکلی۔“ میں نے نفرت سے اخبار میز پر پھینک دیا۔

☆☆☆

وکٹوریا اور راجر کی گرفتاری والی خبر کو دو دن بیت چکے تھے۔ میں اپنے معمول کے کام کاج میں مصروف تھی جب مجھے عدالت سے ایک افسر کا فون موصول ہوا۔ اس نے استدعا کی تھی کہ میں کل صبح ایک مقدمے میں عدالت کی معاونت کروں جس میں گواہ گونگا اور بہرا ہے۔

میں دوسرے دن عدالت پہنچی تو پتا چلا کہ یہ ڈگلس قتل کیس کی سماعت ہے جس میں سینڈرا گواہ کی ترجمانی کرے گی اور میں اس کی تصدیق۔ ڈیلیوری مین گونگا بہرا تھا، ملزمان اعترافِ جرم کر چکے تھے اور یہ سب اب ضابطے کی کارروائی تھی۔

مختصر سی سماعت کے بعد عدالت نے راجر اور وکٹوریا پر فردِ جرم عائد کر کے سماعت ملتوی کر دی۔

☆☆☆

”خدا کا شکر ہے کہ مسز ڈگلس کے قاتل پکڑے گئے۔ بڑے شریف آدمی تھے وہ جو انہوں نے وکٹوریا کو پانچ سال تک برداشت کر لیا۔“ کافی پیتے ہوئے مسز سینڈرا نے کہا۔ ”واقعی ہائیکس تو بے قصور تھا۔ میں خوامخواہ اسے قاتل سمجھ رہی تھی۔“

”جب تک کوئی ثبوت نہ ہو، تب تک کسی کو بھی ذمے دار نہیں ٹھہرانا چاہیے۔“ میں نے اس کی بات سن کر اطمینان سے کہا۔

”واقعی... شک کا فائدہ تو دینا ہی چاہیے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اچھا بتاؤ میری کار کروگی کیسی رہی؟“

”بہت عمدہ... بس ذہن کو کھلا رکھا کرو... تنگ نظری ٹھیک نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑیں۔

”تم میرے شو میں ایک بار پھر آؤ۔ اس بار اسی موضوع پر بات کرتے ہیں۔“ اس نے پیشکش کی۔

”شکریہ... میں دیکھوں گی۔ اب چلتے ہیں۔ مجھے گھر پر بچوں کے لیے لنچ تیار کرنا ہے۔“ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا تو انہوں نے جھٹ سے پرس کھول کر کافی کے پیسے میز پر رکھے کپ کے نیچے رکھ دیے۔

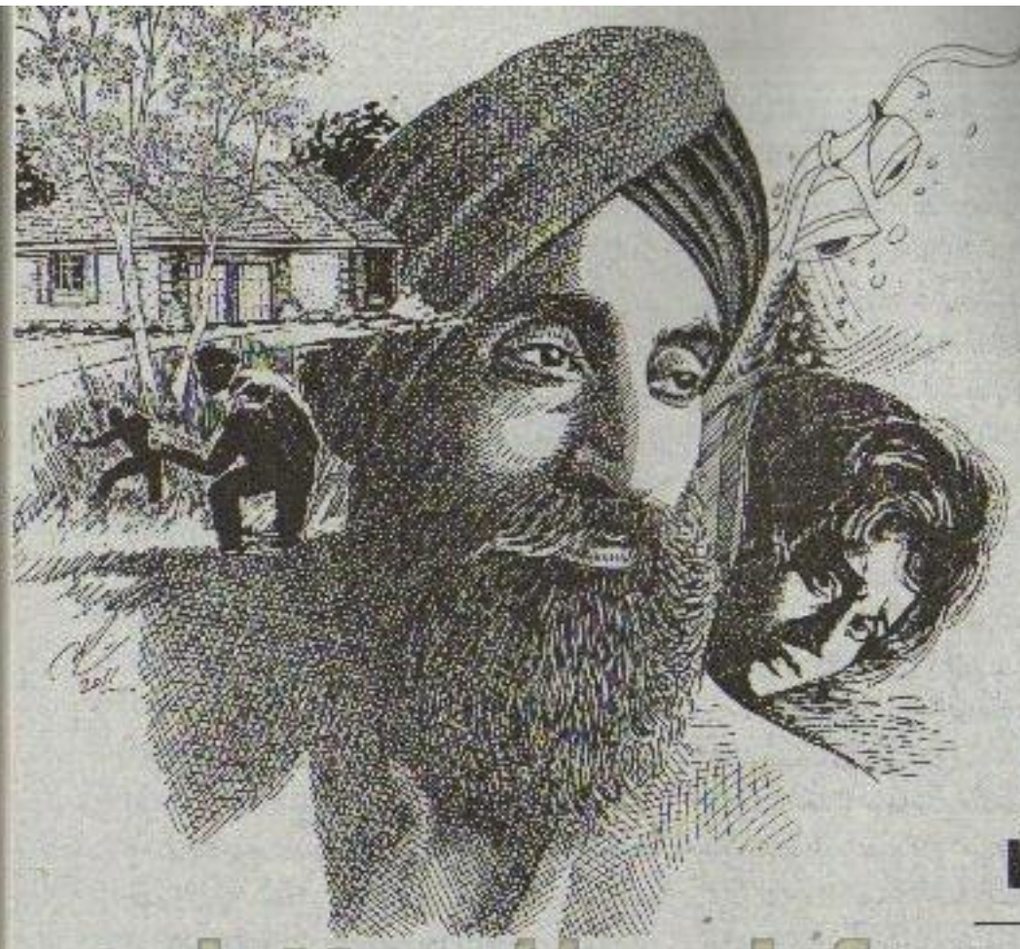

نادان دوست

آصف ملک

http://pakfunplace.blogspot.com

مسیحی بھائیوں کے تہوار کرسمس کی آمد کے ساتھ ہی دنیا بھر میں گہما گہمی اور تیاریوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے اس کو منانے کی کوشش کرتا ہے ...کرسمس کے تناظر میں لکھی جانے والی کہانی... جس نے خوشیوں دوبالا کرنے کے بجائے غمگین لمحات سے دوچار کر دیا تھا

ایک نادان دوست کی دوستی نما دشمنی کا شاخسانہ

ڈاکٹر ٹونی ہل پیشے کے اعتبار سے ماہرِ نفسیات تھا لیکن جرائم کا سراغ لگانے میں بھی اسے خاصی مہارت تھی۔ شاید اسی لیے کیرول اکثر اہم معاملات میں اس سے مشورہ کیا کرتی تھی۔ پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی بہت اچھی دوست بھی تھی اور ٹونی کی مدد سے اس نے کئی پیچیدہ کیس حل کیے تھے۔ اس رات بھی وہ آتش بازی کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ یکا یک ہی اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھا اور بولی۔

”سارجنٹ ڈیون! کیا مسئلہ ہے؟“

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹونی کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

”مجھے جانا ہوگا۔“

”تمہیں میری ضرورت تو نہیں ہے؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“ کیرول نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

ٹونی مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اسے اس بار بھی الجھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس نے اپنے طور پر کیرول کی گاڑی کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔

وہ ایک روشن الاؤ تھا جو تہوار کے موقعے پر لوگ قریبی میدانوں یا کھیت کھلیان میں جلاتے ہیں لیکن اس کے لیے

جس جگہ کا انتخاب کیا گیا، وہ آبادی سے ہٹ کر تھی اور اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہاں بیٹھ کر گیت گائے گئے ہوں یا رقص کی محفل سجائی گئی ہو۔ جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو ناقابلِ برداشت تھی۔ خصوصاً کیرول جیسی نازک مزاج اور باذوق عورت کے لیے وہاں کھڑے رہنا بہت مشکل تھا لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی کی وجہ سے مجبور تھی۔ ٹونی نے گھوم پھر کر جائے واردات کا جائزہ لیا اور فائر آفیسر سے بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، لاش کو آگ لگائی گئی یا اسے الاؤ میں پھینکا گیا؟“

”لکڑیوں کے جلنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے الاؤ روشن کیا گیا اور اس کے بعد لاش کو وہاں پھینکا گیا۔“

ٹونی جو کچھ سوچ رہا تھا، فائر آفیسر کے جواب سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے کیرول کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھنا ٹونی جیسے شخص کے لیے بھی تکلیف دہ تھا۔ وہ ایک جوان شخص کی لاش تھی جس کی عمر کا اندازہ پچیس اور چالیس سال کے درمیان لگایا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اسے زندہ آگ میں جلایا گیا تھا۔ اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ آگ میں جھونکنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں تار سے باندھ دیے گئے تھے جبکہ منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ اس تکلیف دہ موت کے تصور سے ہی ٹونی کو جھرجھری آگئی اور وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”لاش کی شناخت ہوئی؟“

”فی الحال وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ جوناتھن میڈوز کی لاش ہوسکتی ہے۔ اس کی گرل فرینڈ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی ہے۔ وہ وقوعہ والے دن صبح سے ہی غائب تھا۔ اب ہم اس کے ڈینٹل ریکارڈ سے تصدیق ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔“

”اور جوناتھن کے بارے میں کیا معلومات ملی ہیں؟“

”وہ چھبیس سالہ گیراج مکینک ہے اور اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ مور سائڈ میں واقع ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔“

”مور سائڈ تو اس جگہ سے کافی دور ہے جہاں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔“

”ہاں۔“ کیرول نے سر ہلایا۔ ”وہ شہر کا دوسرا کونا ہے۔ جوناتھن نے مقررہ وقت پر چھٹی کی اور اپنی گرل فرینڈ کو بتایا کہ وہ کام ختم کرنے کے بعد جم جارہا ہے۔ عام طور پر وہ ہفتے میں تین چار مرتبہ وہاں جایا کرتا تھا لیکن اس شام وہ جم نہیں پہنچا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ شام چھ اور آٹھ بجے کے درمیان اسے اغوا کیا گیا اور بے بس کرکے آگ میں جھونک دیا گیا۔“ ٹونی نے پوسٹ مارٹم کے کاغذات کو پلٹتے ہوئے کہا۔ وہ اس قتل کے محرکات پر غور کررہا تھا لیکن جوناتھن کے بیک گراؤنڈ کو دیکھتے ہوئے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس طرح کی موت ان لوگوں کا مقدر ہوتی ہے جن کا کسی سے جھگڑا ہوا ہو، کسی عورت کی وجہ سے لڑائی ہوئی ہو یا تنازع کی بنیاد منشیات یا طوائف ہو... جبکہ جوناتھن کا ریکارڈ اس حوالے سے بالکل صاف تھا۔ وہ بہ ظاہر صاف ستھری زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے پاس اچھی ملازمت تھی اور ایک عورت کی رفاقت بھی اسے میسر تھی۔

”تمہارے خیال میں کوئی ذاتی وجہ ہوسکتی ہے؟“ کیرول نے پوچھا۔

”جب تک جوناتھن کے بارے میں مکمل تفصیلات کا علم نہ ہو اس وقت تک کچھ کہنا مشکل ہے۔“

”مشکل تو یہ ہے کہ اس جگہ پر کسی گاڑی کے ٹائر یا قدموں کے نشانات بھی نہیں ملے۔ لگتا ہے کہ اس کے جوتوں پر بھی کور چڑھا دیا گیا تھا تاکہ کوئی نشان نہ مل سکے۔ اس کے علاوہ جائے واردات پر کوئی سگریٹ کا ٹکڑا، کوک کا ٹن یا اس طرح کی کوئی اور چیز بھی نہیں ملی جس سے مجرم تک پہنچنے میں کوئی مدد مل سکتی۔“ کیرول نے بے بسی سے کہا۔

ٹونی نے ایک بار پھر رپورٹ کے صفحات پر سرسری نظر ڈالی اور بولا۔ ”یہ کسی پیشہ ور قاتل کا کام لگتا ہے۔ اس نے بڑی صفائی سے اپنا کام مکمل کیا ہے جس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کی واردات کرچکا ہے۔“

کیرول نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں نے سارا ریکارڈ چیک کرلیا ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں برطانیہ میں اس طرح کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔“

کیرول بھی دوسرے پولیس والوں کی طرح ناک کی سیدھ میں دیکھنے کی عادی تھی لیکن ٹونی نے برسوں کی تربیت اور تجربے کے بعد سیکھا تھا کہ بعض اوقات جرم کا سراغ لگانے کے لیے اس کے پس پردہ محرکات کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس نے کیرول کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اپنی ساری توجہ لاش کو جلائے جانے پر مرکوز کررکھی ہے۔“

”اس لیے کہ مقتول کو جلایا گیا ہے۔“ کیرول کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”آگ کو بھول جاؤ۔ قتل کی وجہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ مقتول کے ہاتھ پاؤں تار سے باندھے گئے اور اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا۔ اسے بے بس کرنے کے لیے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟“

☆☆☆

کیرول اپنے دفتر میں بیٹھی اسی کیس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ٹونی نے کہا تھا کہ یہ اس نوعیت کی پہلی واردات نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر ریکارڈ چیک کیا اور اسی نوعیت کے ایک اور کیس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیڈز سے تعلق رکھنے والی ٹینا جیپ مین کی لاش جوناتھن کے قتل سے چند روز پہلے لیڈز لیورپول کنال سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بھی ہاتھ پاؤں تار سے باندھ دیے گئے تھے۔ کرسی پر بٹھا کر رسی سے باندھا اور نہر میں پھینک دیا۔ کرسی کے ساتھ سیمنٹ کے بلاک بھی باندھ دیے گئے تھے تاکہ وزنی ہونے کی وجہ سے کرسی پانی کی تہ میں چلی جائے۔ اس طرح پانی میں ڈوبنے سے اس کی موت واقع ہوئی۔ اس کے تیرہ سالہ بیٹے نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ وہ وقت پر اپنے کام سے فارغ ہوئی اور اس کا بیٹا یہی سمجھتا رہا کہ وہ گھر آتے ہوئے سپر مارکیٹ چلی گئی ہوگی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی اور اس کے کریڈٹ کارڈ سے کوئی شاپنگ نہیں ہوئی۔

کیرول نے سینئر تحقیقاتی افسر سے رابطہ کیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ حقائق جاننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ”ابھی تک ہم صرف اس کی کار تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ڈون کاسٹر میں ایک ہوٹل کے پارکنگ لاٹ سے ملی ہے۔ یہ ہوٹل اس سپر مارکیٹ سے نصف میل کے فاصلے پر ہے جہاں ٹینا کو جانا تھا۔ مقتولہ کے بیٹے نے بھی کار کو شناخت کرلیا ہے۔ یہ کار اندھیرے میں ایک ایسی جگہ کھڑی کی گئی تھی جو کیمرے کی زد میں نہیں آتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹینا وہاں کیا کرنے گئی تھی؟“

”بیٹے کے علاوہ اس عورت کا کسی اور شخص سے کوئی تعلق سامنے آیا؟“

”اس کا ایک بوائے فرینڈ ہے لیکن ان دونوں میں چھ ماہ پہلے علیحدگی ہوچکی ہے۔ ان کے بیچ کوئی جھگڑا نہیں ہوا لیکن ان کے لیے ساتھ چلنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ خوش اسلوبی سے علیحدہ ہوگئے۔ وہ بوائے فرینڈ اب بھی ان سے ملتا رہتا ہے اور ٹینا کے بیٹے کو سیر و تفریح کے لیے ساتھ لے جاتا ہے۔“

”ٹینا کا شوہر اب کہاں ہے؟“ کیرول نے پوچھا۔

”وہ بہت پہلے انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا جب ٹینا کا بیٹا صرف چار ماہ کا تھا۔“

”اس نے بعد میں بھی اپنے بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ویسے بھی چار سال پہلے اس کا انتقال ہوچکا ہے۔“

”ساتھیوں کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات تھے... وہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں، ان میں سے کسی نے بھی ٹینا کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کی بلکہ وہ سب اس کی تعریف ہی کررہے تھے۔ وہ وہاں چار سال سے کام کررہی تھی اور اس دوران کسی اسٹاف ممبر یا بچوں کے والدین سے اس کا کوئی تنازع نہیں ہوا۔“

☆☆☆

دونوں مقتولین کا کبھی ایک دوسرے سے واسطہ نہیں رہا۔ ان کے گھروں کے درمیان میں میل کا فاصلہ تھا۔ کیرول نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ ٹینا نے کبھی جوناتھن کے گیراج سے اپنی کار کی سروس نہیں کروائی اور نہ ہی جوناتھن نے کبھی اس اسکول میں پڑھا جہاں وہ ملازمت کرتی تھی۔ ان دونوں میں کوئی بات مشترک نہیں تھی اس لیے ان دونوں کیسز میں کوئی تعلق تلاش کرنا بعید از قیاس تھا لیکن ٹونی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹینا ایک فرنچ ٹیچر تھی۔ اسے پانی میں ڈبو کر مارا گیا جبکہ گیراج مکینک کو آگ کے سپرد کردیا گیا۔ اس نے

خاندان بھر کے لیے ایک منفرد ڈائجسٹ
علمی ادبی اور اصلاحی کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ ”کہانی گھر“ شائع ہوگیا ہے
تازہ شمارہ =/20 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر منگوایا جاسکتا ہے
آپ بھی لکھیے: ہم آپ کی لکھی ہوئی کہانیوں اور نگارشات کے منتظر ہیں۔ اپنی تحریریں جوابی لفافے کے ہمراہ روانہ کریں
کاروباری دنیا کا حقیقی ترجمان
ماہنامہ ”چینل ایٹ“
عنقریب شائع ہورہا ہے۔ کہانی گھر اور چینل ایٹ کے لیے ملک بھر سے نمائندگان اور نیوز ایجنٹ درکار ہیں۔ خواہش مند جوابی لفافے کے ساتھ رابطہ کریں۔
رابطہ: چینل ایٹ پبلشرز پوسٹ بکس نمبر 33
چوک کچہری الا جھنگ (پاکستان) SMS:0324-7775525

http://pakfunplace.blogspot.com

بچپن میں پڑھا تھا کہ دنیا چار عناصر سے مل کر بنی ہے... یعنی پانی، آگ، ہوا اور مٹی۔ کیا ان مقتولین کی موت میں ان چاروں عناصر کے علاوہ بھی کوئی قدر مشترک ہو سکتی ہے؟

اس نے فائل کو بار بار پڑھا۔ تمام کاغذات زمین پر پھیلا دیے تاکہ وہ ایک ساتھ تمام معلومات کا جائزہ لے سکے اور اس بار اسے وہ بات معلوم ہو گئی جس نے اس کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب اس نے وہ دونوں کاغذ کیرول کو پکڑائے تو وہ انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ان میں کیا خاص بات ہے؟“

”تم نے تاریخوں پر غور نہیں کیا۔“ ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اکتیس اکتوبر اور پانچ نومبر۔“

”یہ دونوں تو مقدس راتیں ہیں جن میں خوشی کا الاؤ روشن کیا جاتا ہے۔“ کیرول حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”اور ان تاریخوں میں کیا خاص بات ہے؟“

”ظاہر ہے کہ انہیں تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ لوگ اس دن خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ یہ برطانیہ کی روایت ہے۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاتل نے انہی تاریخوں کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو برطانیہ اور یہاں کی روایات کے خلاف ہے یا اس کا تعلق کسی دوسری نسل سے ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دونوں مقتولین گورے ہیں۔ اگر وہ کوئی ایشیائی ہے تو اس نے اس مقصد کے لیے دیوالی یا عید کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ تمہارا کیا کہنا ہے؟“

”اگر تمہاری تھیوری پر یقین کر لیا جائے، تب بھی یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ قاتل نے انہی دونوں کا انتخاب کیوں کیا؟“

”فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا... لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے قاتل کو نہیں پکڑا تو اس کا اگلا نشانہ سامانتا کلارز ہوگا۔“

ٹونی کے الفاظ کیرول کے دماغ میں گونجتے رہے۔ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتی لیکن یہ لفظ اس کے دماغ کی اسکرین پر بار بار روشن ہوتے رہتے۔ وہ کینٹین میں بیٹھی ناشتا کر رہی تھی کہ اچانک ٹی وی اسکرین پر چلنے والی پٹی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئی۔ ”سامانتا کو سڑک پر سے اٹھا لیا گیا۔“

ٹونی میں بچپن سے ہی تحقیق و جستجو کا مادہ پایا جاتا تھا۔ اسی لیے کیرول اور دوسرے پولیس آفیسرز کے برعکس اس کا... تحقیق کرنے کا انداز مختلف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ سچ نہیں بلکہ اسے تلاش کرنے کے لیے بہت دور تک جانا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس نے بھی اپنی پوری توجہ ٹینا اور جوناتھن کے پوشیدہ گوشوں کو تلاش کرنے پر مرکوز کر دی۔

ٹینا کے حوالے سے جو بات اس کے لیے دلچسپی کا سبب تھی، وہ یہ کہ اسے موجودہ ملازمت کرتے ہوئے صرف چار برس ہی ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اکثر اوقات جرم کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ فرنچ پڑھانے کے لیے لیڈز آنے سے پہلے ٹینا کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔ اس نے ٹینا کا ماضی کھنگالنے کے لیے نیٹ کا سہارا لیا لیکن ایک فیس بک کے علاوہ جس میں اسے سب کی پسندیدہ ٹیچر قرار دیا گیا تھا، کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ زیادہ تر کہانیاں اس کے قتل کے بارے میں تھیں تاہم ایک اشارہ ایسا مل گیا جس نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں ٹینا کے بیٹے کا نام بین جیپ مین کے بجائے بین ویلیس لکھا ہوا تھا۔ ٹونی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹینا کے شوہر کا نام ویلیس تھا۔ پھر اس نے ٹینا ویلیس کے نام سے کچھ جاننا چاہا لیکن اس نام سے دوسری عورتوں کا ڈیٹا سامنے آ گیا پھر اس نے مختلف ناموں سے کوشش کی۔ مارٹینا جیپ مین، کرسٹینا جیپ مین، مارٹینا ویلیس اور آخر میں کرسٹینا ویلیس۔ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ وہ حیرت سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا اور جو کچھ اس نے دیکھا، وہ ناقابل یقین تھا۔ اب اسے قتل کے محرک کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

تفتیشی افسر مائک، کیرول کو اس کی شہرت کے حوالے سے جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ بریڈ فیلڈ کے دوسرے سراغ رساں کیرول کی آمد کو پسند نہیں کریں گے لیکن وہ اس معاملے میں غیر جانب دار تھا اور نہ ہی دوسروں کی طرح اس سے خوف زدہ... یا ناراض تھا۔ اس نے خوش گوار حیرت کے ساتھ کیرول کا استقبال کیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم مارکیٹ اسٹریٹ میں ہونے والے اغوا کے کیس کی تفتیش کر رہے ہو؟“

مائک نے اثبات میں سر ہلایا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”ہاں، یہ اعزاز میرے ہی حصے میں آیا ہے۔“

”مجھے اس سے غرض نہیں کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔“ کیرول سنجیدگی سے بولی۔ ”میرے خیال میں یہ کوئی مذاق نہیں ہے کہ ایک شخص کو دن دہاڑے بریڈ فیلڈ کی سڑک سے اغوا کر لیا جائے۔ بائی دی وے... تمہاری تحقیقات کہاں تک پہنچیں؟“

”اس شخص کا نام ٹومی گریٹی ہے اور وہ سانتا کے روپ میں بچوں کو تحائف دینے کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا کہ دو آدمی نیلے رنگ کی ڈانگری میں ملبوس ایک وین میں آئے اور ٹومی کو اٹھا کر لے گئے۔ ہم نے کیمرے کی مدد سے اس گاڑی کا نمبر معلوم کر لیا ہے جو کہ اسی صبح ایک زیر تعمیر عمارت کے پاس سے چرائی گئی تھی۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دراز سے ایک نقشہ اٹھا کر لے آیا۔ ”سرخ لکیر اس راستے کی نشان دہی کرتی ہے جس پر وہ گاڑی گئی لیکن کیمپل فیلڈ کے بعد راستہ تنگ اور پُرپیچ ہے اس لیے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ کسی مرکزی راستے سے شہر سے باہر نہیں گئے۔“

”ٹومی گریٹی کے بارے میں کیا تفصیلات ہیں؟“

”وہ ایک آرٹس کلب میں کام کرتا ہے اور اپنا بیشتر وقت فلاحی کاموں میں صرف کرتا ہے۔ اس کی عمر پچپن سال ہے۔ اس کے تین بچے ہیں جبکہ اس کی بیوی کسی اسکول میں ملازمت کرتی ہے۔ میں نے کھوجیوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے جو اس سفید وین کو تلاش کر رہی ہے لیکن تاحال اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔“ کیرول نے کہا۔

مائک کا تجسس اور بڑھ گیا اور اس نے کیرول کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم برا نہ مناؤ تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟ یہ ایک اغوا کا کیس ہے لیکن اتنا اہم بھی نہیں کہ تم اس کی تفتیش میں حصہ لینے کے لیے دوڑی چلی آئیں۔“

کیرول نے نقشہ میز پر رکھا اور بولی۔ ”فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ ایک چیلنجنگ کیس ہے اور مجھے چیلنج قبول کرنے میں مزہ آتا ہے۔“

اس کے جانے کے بعد مائک سوچنے لگا کہ اس خوب صورت لڑکی کے ساتھ کام کرنا یقیناً ایک خوش گوار تجربہ ہوگا لیکن اس کیس میں اس کی دلچسپی اسے پریشان اور بے چین کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

ٹونی عام طور پر اخبار کی خبروں میں اتنی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ پہلے بھی اس کے پاس وقت کی بہت کمی تھی اور وہ زیادہ تر ضروری کاموں میں مصروف رہنا پسند کرتا تھا لیکن سامانتا کے اغوا ہو جانے کی خبر نے اسے بھی چونکا دیا۔ اس نے غور سے پوری خبر پڑھی لیکن اسے اس میں حقائق سے زیادہ لفاظی نظر آئی۔ فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا کہ اس ڈرامے کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے۔ اس نے تفصیل جاننے کے لیے کیرول کے دفتر کی راہ لی جو اس وقت بھی اسی فائل کا مطالعہ کر رہی تھی۔ ٹونی کو دیکھتے ہی وہ بولی۔

”لگتا ہے کہ تمہارا خدشہ درست ثابت ہوا۔“

”نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے اس طرح نہیں سوچا تھا۔“ ٹونی اپنے ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے بولا۔ ”یہ اس سلسلے کی کڑی نہیں ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ کیرول جھنجلاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگلا مقتول کوئی سامانتا ہو سکتا ہے۔“

”سامانتا کو اغوا کرنے میں دو افراد ملوث ہیں جبکہ میں نے دو آدمیوں کی بات نہیں کی تھی۔“

”میں یہ مانتی ہوں کہ تم نے ایسا نہیں کہا تھا لیکن دو آدمی کسی کو بہ آسانی قتل کر سکتے ہیں اور ہم دونوں جانتے ہیں کہ نسلی بنیادوں پر کیے جانے والے قتل عام طور پر ایک سے زیادہ افراد مل کر کرتے ہیں۔“

”اس کے لیے پہلے ہمیں مقتولین کے پس منظر کو دیکھنا ہوگا۔ ٹینا کا اصل نام کرسٹینا ویلیس تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ ڈیوون کے ایک اسکول میں فرانسیسی پڑھاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ اسکول کے بچوں کو پکنک پر لے کر گئی جہاں کشتی کی سیر کے دوران دو بچے ڈوب گئے۔ عدالتی تحقیقات کے نتیجے میں تو وہ بری ہو گئی لیکن ان بچوں کے والدین نے اس حادثے کا ذمے دار اسی کو ٹھہرایا۔ کرسٹینا کے لیے اس صورت حال کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، چنانچہ اس نے چپکے سے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور یہاں آ کر ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔“

”تمہارے خیال میں اسے قتل کرنے میں ان والدین کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ کیرول نے پوچھا۔

”نہیں... فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ ٹونی نے اپنے بیگ سے دوسرا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ”ٹینا کے بارے میں جاننے کے بعد میں نے جوناتھن کی کھوج لگائی۔ اس کا ماضی بھی پوری طرح صاف نہیں ہے۔ سات سال پہلے ایک پانچ سالہ بچی ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ پہلے بتایا گیا کہ یہ کار اس گیراج سے چرائی گئی تھی جہاں جوناتھن کام کرتا تھا۔ میں نے وہاں جا کر مقامی ٹریفک آفیسرز سے بات کی... ان کا کہنا تھا کہ اس وقت سب لوگ یہی محسوس کر رہے تھے کہ کار چرائی نہیں گئی لیکن جوناتھن اسے چلا رہا تھا کہ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو گئی بلکہ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کار پر کام کر رہا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ نے بھی گواہی دی کہ وہ موقع واردات پر موجود نہیں تھا۔ اس طرح یہ معاملہ دب گیا۔“

کیرول نے دونوں کاغذوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ کسی نے اپنے طور پر انصاف کے تقاضے

http://paktfunplace.blogspot.com

پورے کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''لگتا تو یہی ہے۔ دونوں مقتولین پر بچوں کی موت کا الزام تھا لیکن وہ سزا سے بچ گئے تھے۔ اس کی وجہ ناکافی ثبوت یا قانونی سقم ہوسکتا ہے۔ قاتل سمجھتا ہے کہ بچوں کو ان کی فیملی سے جدا کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا چاہیے جو اسی طرح اپنے بچے سے محروم ہوا ہو اور سمجھتا ہو کہ کسی کو اس جرم کی سزا نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ اس نے ان مقتولین کا انتخاب اسی لیے کیا ہو کیونکہ اس کے خیال میں یہ لوگ قابلِ مواخذہ تھے۔''

ایک گھنٹے کے اندر ٹونی اور کیرول کو سات ایسے بچوں کی فہرست مل گئی جو ایسے ہی حالات میں موت کا شکار ہوئے تھے۔ کیرول نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہ یک وقت ان کے والدین اور قریبی رشتے داروں کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ اس فہرست میں سے اصل قاتل کو تلاش کرنا ہوگا۔''

''بہ ظاہر اور کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔'' ٹونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہم سانتا گریٹی کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں جسے وہ لوگ کسی بھی وقت قتل کر سکتے ہیں اور مجھے تمہاری اس تھیوری میں بھی جان نظر نہیں آتی کہ یہ قتل دو آدمیوں نے مل کر نہیں کیے۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ان والدین سے مل کر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں؟'' ٹونی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں یہ محض وقت کا زیاں ہوگا۔ ہم ان کے چہرے دیکھ کر قاتل کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔''

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے پھر اچانک ہی کیرول بولی۔ ''ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح اپنے شکار کا انتخاب کرتا اور ان تک پہنچتا ہے۔ تم نے اپنے طور پر کھوج لگا کر یہ حقائق معلوم کیے ہیں جبکہ ریکارڈ سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جوناتھن کون ہے اور ٹینا نے اپنا نام کیوں تبدیل کیا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ٹونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس طرح کی معلومات کون حاصل کر سکتا ہے۔''

اچانک ہی کیرول کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ ''یہ کام کوئی صحافی ہی کر سکتا ہے۔ ان کی رسائی ہر جگہ تک ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے پرانے ریکارڈ سے ٹینا کی تصویر حاصل کر لی ہو اور اگر اس نے پولیس سے رابطہ کیا ہو تو یہ بھی جان گیا ہوگا کہ جوناتھن پر اس لڑکی کی حادثاتی موت کا شبہ ظاہر کیا گیا تھا۔''

ٹونی نے فہرست پر نظر ڈالی اور کہا۔ ''ان میں سے کتنے جرنلسٹ ہو سکتے ہیں؟''

☆☆☆

مائک کو اطلاع ملی کہ گریٹی کو اغوا کرنے والوں نے رابطہ کیا ہے۔ وہ یہ فون سنتے ہی کرسمس چلڈرن کے دفتر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسکول کی منتظمہ ایک چھوٹے قد کی دبلی پتلی عورت تھی جس کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ وہ مائک کو اپنے کمرے میں لے گئی اور کمپیوٹر آن کر دیا۔ مائک کی نظروں کے سامنے ایک مختصر ای میل موجود تھی۔ ''ہمارے پاس سانتا ہے اور تمہارے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہے۔ بیس ہزار پاؤنڈز نقد دے دو۔ سانتا تمہیں مل جائے گا۔ ہم ایک گھنٹے بعد دوبارہ رابطہ کریں گے۔ پولیس کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔''

''ان کی دھمکی نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے۔'' وہ عورت سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔''

''تمہیں یہ ڈر نہیں کہ وہ گریٹی کو مار سکتے ہیں یا کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں؟'' مائک بولا۔

''وہ سانتا کو تکلیف نہیں دیں گے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ایسا کر کے وہ اپنے لیے جیل کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جرائم پیشہ لوگ مذہب کے معاملے میں بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔''

☆☆☆

کیرول اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ڈیوڈ سینڈرز ہی اصل قاتل ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے گرفتار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت موجود نہیں تھا۔ سینڈرز، بریڈ فیلڈ ایوننگ سینٹینل ٹائمز میں فیچر رائٹر کے طور پر کام کرتا تھا اور اس نے بڑی ہوشیاری سے تمام ثبوت ضائع کر دیے تھے۔ ایک لاش کو آگ میں جلا دیا اور دوسری پانی میں ڈبو دی۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقتولین کو موت کے منہ میں جھونکنے کے لیے کیا چیز استعمال کی گئی تھی۔

ان واقعات کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی اور نہ ہی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج سے کچھ پتا چل سکتا تھا۔ ایک دو لوگوں نے یہ ضرور بتایا کہ انہوں نے ٹینا کو نہر کی طرف جاتے دیکھا تھا لیکن وہ اسے نہر میں دھکا دینے والے کا چہرہ نہ دیکھ سکے کیونکہ اس نے نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ کیرول کو اس شہادت میں کوئی حقیقت نظر نہیں آئی۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے اس طرح کا دعویٰ کر رہے تھے۔

ٹونی کا خیال تھا کہ قاتل کرسمس سے پہلے کوئی واردات

ضرور کرے گا، اسی لیے وہ سینڈرز کی مکمل نگرانی کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے لیے افسرانِ بالا کو تیار کرنا بہت ہی مشکل کام تھا کیونکہ اس طرح کی نگرانی پر اخراجات زیادہ آتے تھے اور اس کے لیے بہت سے آفیسرز کو دوسرے کیسز سے ہٹانا پڑتا تھا لیکن ان کے پاس کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ بچا تھا، اس لیے سینڈرز کی نگرانی شروع ہوگئی۔ وہ اس کے معمولات کا بہ غور مشاہدہ کرنے لگے۔ انہوں نے اسے کام پر جاتے، کلب، جم اور کرسمس کی شاپنگ کرتے دیکھا لیکن کسی کو اغوا یا قتل کرتے نہیں پایا۔

وہ کرسمس کی شام تھی اور سینڈرز کی نگرانی کا آخری دن۔ کیرول نے لباس تبدیل کیا اور اپنی ساتھی پاؤلا کے ساتھ کار کی پسنجر سیٹ پر بیٹھی سینڈرز کے دروازے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک گھنٹا پہلے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس دوران کوئی شخص نہ تو باہر آیا اور نہ ہی اندر گیا۔ ویسے بھی لگتا نہیں کہ یہ لوگ تہوار منا رہے ہیں۔ نہ تو روشنیاں ہیں اور نہ ہی کرسمس ٹری نظر آ رہا ہے۔''

پاؤلا نے کندھے جھٹکے اور بولی۔ ''جس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہو، اس کے لیے کرسمس کی خوشی بے معنی ہے۔''

سینڈرز کی چار سالہ بچی گزشتہ ستمبر میں تیراکی سیکھتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہوگئی تھی۔ اس کا انسٹرکٹر ایک اور بچے کو کچھ سمجھا رہا تھا کہ اسی دوران سینڈرز کی بیٹی کا سر پول سائڈ سے ٹکرایا اور اب تک لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے، بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ کیرول کچھ کہتی، گیراج کا دروازہ کھلا اور اس میں سے سینڈرز کی کار برآمد ہوئی۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو انہوں نے بھی اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ پندرہ منٹ بعد وہ گاڑی مورسائڈ میں واقع ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ کونے پر ایک دکان برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی اور اس کے شیشوں پر سستی شراب کے اشتہار چسپاں تھے۔ سینڈرز گاڑی سے اترا اور سیدھا اس دکان میں چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں کھیلوں کا سامان رکھنے کا ایک تھیلا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں بھی کار سے باہر آ گئیں اور دکان میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ کیرول دو قدم پیچھے ہٹی اور زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ شاید دروازے کی چٹخنی پوری طرح نہیں لگائی گئی تھی اس لیے دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

سینڈرز کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کرکٹ بیٹ تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ کیرول نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''پولیس... اپنا ہتھیار پھینک دو۔''

پاؤلا کاؤنٹر کے دوسرے کنارے تک پہنچی اور زور سے چلائی۔ ''چیف! یہاں کوئی ہے۔ بے ہوش لگتا ہے۔''

کرکٹ بیٹ کے گرنے سے ایک آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سینڈرز بھی زمین پر جھک گیا اور دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب تمہاری غلطی کی وجہ سے ہوا۔ تم کبھی صحیح آدمی کا انتخاب نہیں کرتے... اب بھگتو۔''

☆☆☆

کیرول آرام کرسی میں دھنسی ٹونی سے کہہ رہی تھی۔ ''اس نے انکار کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ لگتا ہے کہ پکڑے جانے سے اس نے سکون محسوس کیا ہے۔''

''تم نے اسے ایک اور قتل سے روک دیا، کیا یہ غیر معمولی کامیابی نہیں ہے؟'' ٹونی نے جواب دیا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ جاہندر سنگھ کی فیملی بھی خاصی مطمئن ہوگی اور اس کے بچے سوچ رہے ہوں گے کہ ان کا باپ آنے والے بھیانک نتائج سے محفوظ ہوگیا ہے جو بچوں کو سستی شراب بیچنے سے ہو سکتے تھے۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب کیا ہوا؟''

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولی۔ ''یہ اطلاع دینے کا شکریہ!''

اس نے فون بند کیا اور ٹونی سے کہنے لگی۔ ''مائک کا فون تھا۔ سانتا کو چھڑا لیا گیا ہے اور دو آدمی گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ کوئی زخمی نہیں ہوا۔''

ٹونی جواب میں مسکرا کر رہ گیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ سینڈرز کو اکسانے میں جاہندر سنگھ کا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنی غیر قانونی سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے گریٹی کے اغوا کا ڈراما رچایا تاکہ پولیس کی توجہ اس کی جانب ہو جائے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے روایتی تہوار کے موقع پر فساد پھیلانے کی کوشش کی لیکن سینڈرز کو یہ سب کچھ کر کے کیا ملا؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیدائشی طور پر یا شاید موروثی طور پر مجرمانہ رجحانات رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے نہ مدعا۔ بس وہ جرم کرتے ہیں اور اس سے انہیں عجیب سی ذہنی راحت یا آسودگی ملتی ہے اور پھر یکے بعد دیگرے وہ جرائم کرتے چلے جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی انسانوں کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ٹونی کے پاس بھی نہیں تھا۔

http://pakistanipoint.blogspot.com

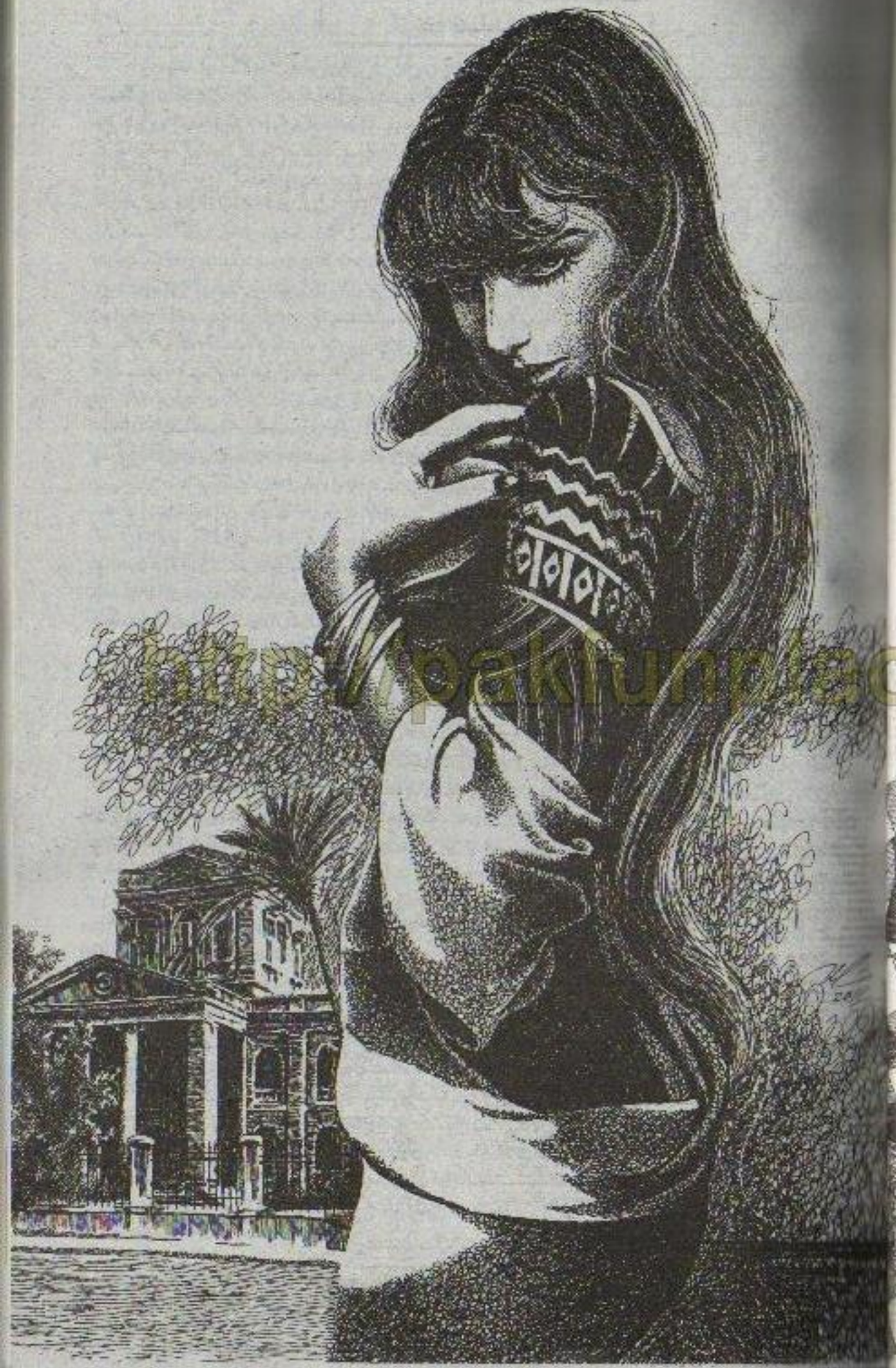

اسما قادری

قسط نمبر 19

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کتنی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی انہونی گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

http://pakfunplace.blogspot.com

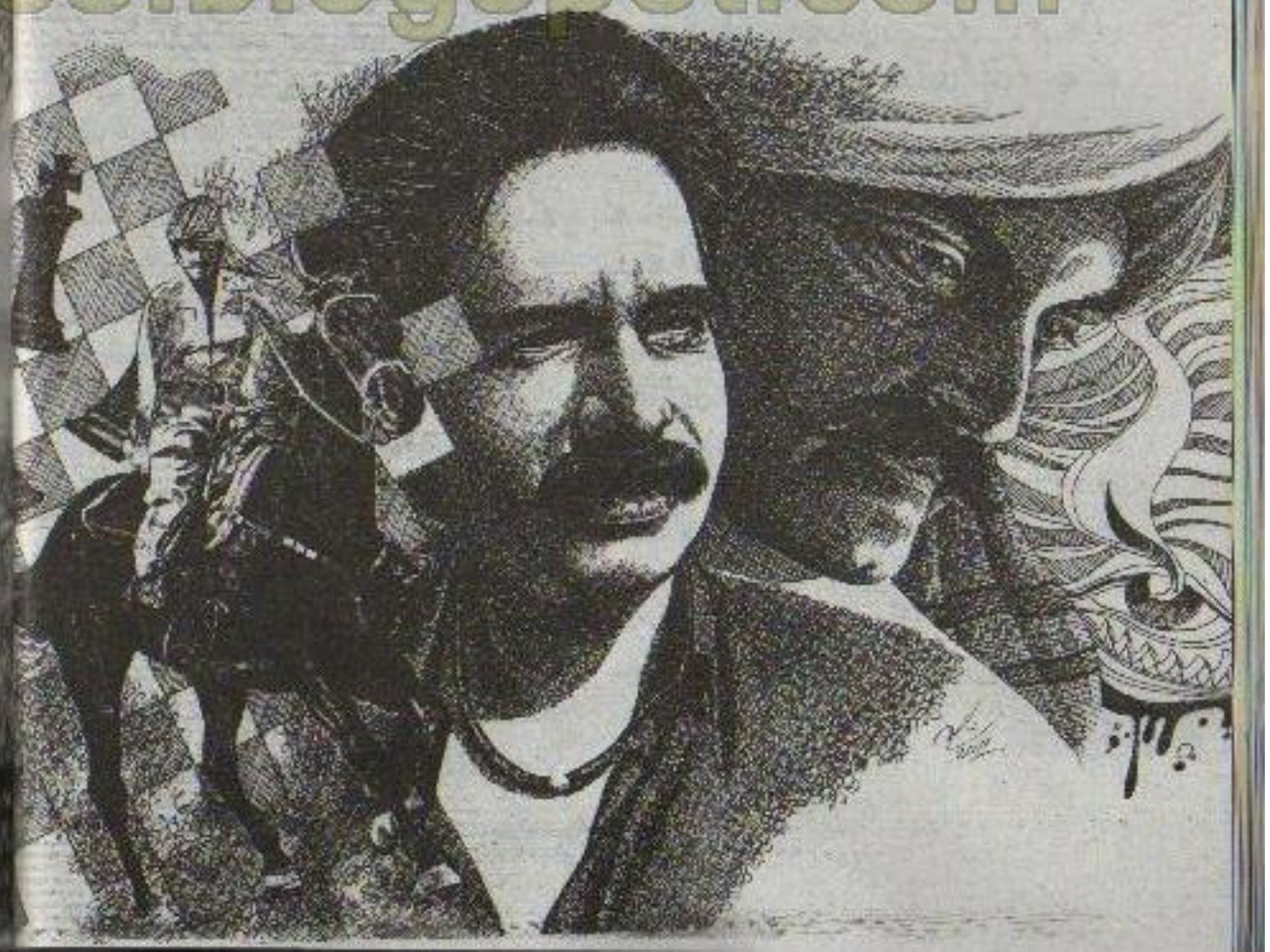

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر وکلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں نور آباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ نور آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پا کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی نور آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی ہے لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا نور آباد آنا جانا رہتا تھا۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر نور آباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چوہدری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں۔ پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی حسینہ کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ حسینہ کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چوہدری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشارم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو لندن منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ماہ بانو کی تلاش میں ہے وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر چوہدری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِ عتاب آ جاتی ہیں۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ برفانی تودے کی زد میں آ جاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ادھر چوہدری افتخار نیویارک سے واپس آ کر کشور کی ملازمہ خاص میں دلچسپی لیتا ہے [illegible] موقع پا کر چوہدری کے [illegible] خودکشی کر لیتی ہے۔ شہریار [illegible] جاتا ہے جہاں [illegible] میں چلے جانے والے [illegible] کا باپ [illegible] شہریار کا احسان مند [illegible]۔ مشارم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے [illegible]۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کر لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کالا شمر ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشارم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آ کر [illegible] ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگنو کا سہارا لیتا ہے اور جگنو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مجسٹریٹ سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مجسٹریٹ کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار لندن پہنچ جاتا ہے اور مشارم خان اور ماہ بانو کو آزادی کی کسوٹی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بنا لیتا ہے۔ صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں افضل پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور وہ اس حملے میں مارا جاتا ہے اور حملہ آور بھی وہاں موجود گارڈز کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو کر مارا جاتا ہے تاہم مرنے سے پہلے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیتا ہے۔ لنڈا پاکستان آ کر خفیہ ٹھکانے پر تباہی کا پتا لگاتی ہے۔ ادھر چوہدری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور مجسٹریٹ کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں [illegible] ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہریار اس واقعے کی رپورٹ چوہدری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی آ جاتی ہے اور میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے داخلے ہی میں ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کالج سے باہر چاٹ کھانے نکلتی ہے۔ وہاں ایک خواجہ سرا گرو اسے پہچان جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست یار کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو وہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا اوباش بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کچھ لوگ فائرنگ کر کے [illegible] کا نشانہ بناتے ہیں جس کا الزام چوہدری شہریار پر لگاتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی کلاس فیلو اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بنگلے میں خواجہ سرا گرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی جانے کا سوچتا ہے اور کراچی پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے ایک دوست کے خالی بنگلے میں ٹھہرتا ہے اور ماہ بانو کے بتائے ہوئے بنگلے کی نگرانی شروع کر دیتا ہے۔ بنگلے سے ایک سرخ کار نکلتی ہے۔ شہریار اس کا پیچھا کرنے کے لیے کار اسٹارٹ کرتا ہے مگر سرخ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے اور تعاقب کرنا بھول جاتا ہے۔ سرخ کار اپنی پچھلی نشست پر موجود طرح دار حسینہ کو لیے آگے نکل جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

سرخ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود باوردی ڈرائیور کا چہرہ اس کے لیے اتنا شناسا تھا کہ اسے گاڑی کا تعاقب کرنے یا اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور چند لمحوں کا توقف کرنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی بھی آگے بڑھا دی۔

راحیلہ والے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس کے ٹیرس پر ڈالی۔ ٹیرس خالی تھا اور وہاں کچھ دیر پہلے نظر آنے والا لڑکا اور لڑکی موجود نہیں تھے۔ وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس سے کافی آگے سرخ کار جا رہی تھی اور محض ایک دھبے کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اس کار کے ڈرائیور کو دیکھنے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر اپنا منصوبہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ سرمد تھا...... سیٹھ موتی والا کا سابقہ ڈرائیور۔ سیٹھ موتی والا جو بھی چوہدری کے حلیفوں میں شامل ہوا کرتا تھا اور جنگل سے اسمگل کی جانے والی لکڑی کی اسمگلنگ میں پوری طرح شامل تھا۔ شہریار کا متعدد بار سرمد سے سامنا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماہ بانو کے تعاون اور بہادری کے نتیجے میں ہی سرمد اپنی محبت نیلم کو پانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ چنانچہ اس احسان کے بدلے وہ اس کا ساتھ ضرور دیتا۔ سرمد کا ساتھ مل جاتا تو اسے اپنے پہلے منصوبے میں موجود مشکلات اور خطرات کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بہرحال ابھی تنہا کسی گاڑی کو روک کر اس میں سوار لڑکی کو اغوا کرنا اتنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ یہ منصوبہ بنا کر اس نے ایک طرح سے خود کو خطرے میں ہی ڈالا تھا۔ سرمد ساتھ دیتا تو یہ رسک ہی نہیں لینا پڑتا۔ سرمد کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے اس سے ملاقات ضروری تھی لیکن اس ملاقات سے پہلے وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے نئے منصوبے کے بارے میں مزید سوچ لینا چاہتا تھا چنانچہ سرخ کار سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے مخالف سمت میں اپنی گاڑی کا رخ موڑا اور زبیر کے اس بنگلے کا رخ کیا جہاں آج کل وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

☆☆☆

اخبار کے دفتر سے نکل کر بابر اپنی نیلی سوزوکی مہران میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے کیسٹ پلیئر کو بھی آن کر دیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں گاڑی میں پھیل گئیں۔ وہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگناتے ہوئے مسرور انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ پچھلے دنوں حالات بہت خراب رہے تھے۔ ملک کے تین بڑے شہروں میں دہشت گردی کے بڑے واقعات پیش آئے تھے اور انتظامی مشینری کے ساتھ جو لوگ سب سے زیادہ مصروف اور بھاگ دوڑ کا شکار رہے تھے، وہ میڈیا کے نمائندے ہی تھے۔ بابر بھی بطور صحافی اس بھاگ دوڑ کا حصہ رہا تھا۔ اس آفیشل مصروفیت کے علاوہ وہ افضل سے دوستی نبھانے کے چکر میں آفتاب والے معاملے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ گھر والے جو پہلے ہی اس کے گھر پر وقت نہ دینے کی شکایت کرتے رہتے تھے، کچھ اور بھی شاکی ہو گئے۔ ان شکوہ کرنے والوں میں اس کی بیوی بھی شامل تھی جس کا شکوہ اب بڑھتے بڑھتے ناراضی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور پچھلے ایک ہفتے سے یہ حال تھا کہ وہ بطور احتجاج اس سے ضروری بات کرنے کے سوا مخاطب بھی نہیں ہوتی تھی۔ بابر اسے اس رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا اور تلافی کا خواہش مند تھا لیکن فی الحال جان بوجھ کر کوئی عملی اقدام اٹھانے سے گریزاں تھا۔ حالانکہ دہشت گردی کے بعد پھیلنے والی بدامنی پر اب قابو پا لیا گیا تھا اور اس کی مصروفیات بھی خاصی کم ہو گئی تھیں۔ دراصل بیوی کو منانے کا معاملہ اس نے خاص موقع کے لیے اٹھا رکھا تھا اور وہ خاص موقع آج آ گیا تھا۔

آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ بابر اپنی مصروفیات میں عموماً اس دن کو بھول جاتا تھا یا یاد بھی رہے تو اسے کوئی خصوصی اہتمام کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی، البتہ اس کی بیوی اس موقع کو ہمیشہ یاد رکھتی تھی اور بہت جوش و خروش سے اسے منانے کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ بابر کو یقین تھا کہ اس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس کی بیوی نے یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ آج بھی اس اہم دن کو بھول گیا ہوگا..... لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس بار اس نے پورے ہفتے اس دن کے آنے کا انتظار کیا تھا اور روٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے لیے کچھ خصوصی انتظامات بھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ آج خلافِ معمول ذرا جلدی گھر پہنچے گا اور بیوی کے لیے خاص طور سے خریدے گئے تحائف اس کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد اسے تیار ہو کر اپنے ساتھ ڈنر پر چلنے کی دعوت دے گا تو وہ خوشی سے جھومتے ہوئے کسی ادھ کھلی کلی کی طرح مسکرا اٹھے گی۔

بیوی کی اس خوشی اور سرشاری کا خیال اسے ابھی سے مسرور کیے دے رہا تھا اور اپنی اس خوشی کو خود ہی انجوائے کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ موسیقی سن رہا تھا۔ وہ اتنا مگن تھا کہ اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اخبار کے دفتر سے ایک گاڑی مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اپنی اس کیفیت میں وہ ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے موبائل فون کی رنگ ٹون پر بھی قدرے تاخیر سے متوجہ ہو سکا۔ متوجہ ہونے پر اس نے سیل فون اٹھا کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال اس کی بیوی کی طرف سے آ رہی تھی۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"ہاں بولو۔" اس نے پہلے موسیقی بند کی پھر کال ریسیو کرتے ہوئے جان بوجھ کر بیزار کن لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس پل اس کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اسے ستا رہا تھا تاکہ منانے کا پورا پورا لطف حاصل کر سکے۔

"آپ گھر کب تک پہنچیں گے؟" بیوی نے اس سے دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو بہت اہم کام سے جا رہا ہوں۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کوشش کیجیے گا کہ کھانے کے وقت گھر پر ہی ہوں۔ ہم سب لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔" وہ ہر سال شادی کی سالگرہ والے روز رات کے کھانے پر زبردست انتظام کرتی تھی اور اپنی تمام تر ناراضی کے باوجود اس بار بھی اس نے اپنا یہ معمول یقیناً برقرار رکھا تھا لیکن خود بابر کا تو کچھ اور ہی پروگرام تھا اس لیے اصل بات ظاہر کیے بغیر اپنی سابقہ ٹون برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے میرا انتظار کرنے کی۔ میرا کچھ بھروسا نہیں ہے کہ میں بارہ ایک بجے تک بھی گھر پہنچ سکوں یا نہیں۔ کیا سب لوگوں کو میرے انتظار میں آدھی رات تک بھوکا بٹھا کر رکھو گی؟" وہ جانتا تھا کہ سب لوگ کھانا کھا لیں گے لیکن اس کی بیوی ناراض ہونے کے باوجود اس کے گھر پہنچنے سے پہلے کھانا نہیں کھائے گی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔" بالآخر اس نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔ فون بند ہوتے ہی بابر کے حلق سے بہت دیر سے ضبط کیے جانے والے قہقہے ابل پڑے اور وہ موبائل ڈیش بورڈ پر ڈالنے کے بعد ایک بار پھر کیسٹ پلیئر آن کر کے مگن ہو گیا۔ یونہی مگن سی کیفیت میں اس نے تقریباً پندرہ بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنی گاڑی ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے لے جا کر روکی اور گاڑی لاک کر کے شاپنگ سینٹر میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک جیولری شاپ پر اس نے بیوی کے لیے ایک بریسلیٹ کا آرڈر دیا تھا۔ شاپ پر پہنچ کر اس نے رسید دکھائی اور اپنا آرڈر کردہ بریسلیٹ وصول کر لیا۔ وہاں سے اٹھ کر شاپنگ سینٹر کے بیرونی گیٹ کا رخ کرتے ہوئے اس کی نظر ایک ہلکی سبز رنگ کی ساڑی پر پڑ گئی۔ ساڑی کی رنگت اور کام دونوں ہی خوب صورت تھے۔ اس کا دل چاہا کہ بیوی کے لیے خرید لے۔ وہ دکان پر رک کر سیلز مین سے اس کی قیمت دریافت کرنے لگا۔

مول تول کرنے کے بعد ساڑی پیک کروانے میں اس کے دس سے پندرہ منٹ مزید خرچ ہو گئے لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ آج وہ اپنے سارے کام نمٹا کر دفتر سے نکلا تھا اور کل صبح تک فارغ ہی تھا اس لیے کچھ وقت ضائع بھی ہو جاتا تو بس اتنا ہی ہوتا کہ وہ گھر قدرے تاخیر سے پہنچتا اور یہ اس لحاظ سے اچھا ہوتا کہ باقی اہل خانہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جاتے اور اسے اپنی بیوی کو اکیلے گھر سے لے کر ڈنر کے لیے نکلتے ہوئے معیوب نہیں لگتا۔ اپنی اسی سوچ کے تحت وہ کافی سست روی سے چلتا ہوا شاپنگ سینٹر سے باہر آیا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے قریب پہنچنے پر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر چابی دروازے کے لاک میں ڈالنی چاہی لیکن چابی اندر داخل نہیں ہوئی۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہونے پر اس نے چابی کو قریب کر کے غور سے دیکھا کہ شاید وہ غلطی سے گچھے میں موجود کوئی اور چابی استعمال کر رہا ہے لیکن چابی بالکل درست تھی۔ اس نے ذرا الجھتے ہوئے ایک بار پھر چابی کو لاک کے سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکامی کا سامنا ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ غلط چابی استعمال نہیں کر رہا بلکہ گڑبڑ لاک کے ساتھ ہے۔ کسی نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ پریشانی اور الجھن کی ملی جلی کیفیت میں اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔

"کیا بات ہے یار! کیا اس گاڑی کو چرانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اچانک ہی اس کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگا۔ بابر کو خیال آیا کہ اس شخص کو اس نے اندر شاپنگ سینٹر میں بھی اپنے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ ساڑی کے لیے مول تول کر رہا تھا تو یہ شخص بھی دکان پر کپڑوں کے تھان کھلوا کھلوا کر دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس گاڑی کو چرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ میری اپنی گاڑی ہے لیکن شاید کسی نے اس کے لاک کے ساتھ شرارت کی ہے اس لیے لاک کھل نہیں رہا ہے۔" اپنے اوپر لگنے والے الزام کا برا ماننے کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"لاؤ میں چیک کرتا ہوں کہ کیا گڑبڑ ہے۔ شاید میری کوشش سے لاک کھل جائے۔" وہ شخص اس کے بالکل قریب چلا آیا اور اس سے چابی لینے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ بابر نے میکانکی انداز میں چابی اسے تھما دی۔

"میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے جو میری انگلی کے صرف ایک اشارے پر تمہارے جسم میں چھید کر سکتا ہے۔ اس لیے تم بغیر شور شرابا کیے خاموشی سے پیچھے کھڑی سفید گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ دوسری صورت میں نتائج کی ذمے داری میری

نہیں ہو گی۔" چابی تھام کر وہ ایسے انداز میں بابر سے یہ دھمکی آمیز جملے بولنے لگا جیسے اس سے کسی موضوع پر تبادلہ خیال کر رہا ہو۔ بابر نے اس کے مطالبے پر چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ قمیص کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اس ہاتھ کی جنبش اور جیب سے اوپر پیدا ہونے والا ابھار بتا رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

"تم مجھے کہاں اور کس لیے لے جانا چاہتے ہو؟" پہلے بھی کچھ دہشت گردوں کے ہاتھوں اس کے چند ساتھی صحافی اغوا ہو چکے تھے اور وہ اس شخص کو بھی اسی ٹولے کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا اس لیے جرأت کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ اندر سے بہرحال وہ خوف زدہ تھا کہ اغوا کار کسی مغوی صحافی سے عموماً کافی بُرا سلوک ہی کرتے تھے۔

"سوال جواب اور بحث نہیں۔ جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ میرا ریوالور بے آواز ہے۔ گولی چلی تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کچھ ہوا ہے۔" وہ شخص غرایا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ بابر نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے کہے پر عمل کرنے سے گریز نہیں کرے گا چنانچہ بابر نے اس کا مطالبہ مانتے میں ہی عافیت جانی اور پیچھے کھڑی سفید گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک موٹا تھل ڈرائیور بیٹھا تھا جبکہ پچھلی نشست بھی خالی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی پچھلی نشست پر موجود شخص نے دروازہ کھول کر اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے سے زیادہ اس بڑی نال کی گن کی دہشت تھی جسے بھاری تن و توش کے آدمی نے اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان دبا رکھا تھا کہ بابر انکار نہیں کر سکا اور بے چون و چرا گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اسے گھیر کر یہاں تک لانے والے شخص نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی اور فوراً ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ پُرہجوم شاپنگ سینٹر کے باہر اگر کسی نے یہ سارا واقعہ دیکھا بھی ہو گا تو ہرگز یہ گمان نہیں کر سکا ہو گا کہ یوں بنا کسی شور شرابے کے ان کے سامنے ایک آدمی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ کسی مشکل میں گرفتار شخص کو لفٹ دینے کا منظر تھا۔

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" آتشیں اسلحے کی موجودگی میں بے بس سے بیٹھے بابر نے ہمت کر کے اغوا کاروں سے سوال کیا۔

"وقت آنے پر بتا دیں گے۔ ابھی تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔" اگلی نشست پر بیٹھے شخص نے سرد مہری سے جواب دیا تو اسے مزید کسی سوال کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ خاموشی سے سفر ختم ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اضطراری طور پر اپنی انگلیاں اس ڈبے پر پھیرتا رہا جس میں کچھ دیر قبل بیوی کے لیے بڑے چاؤ سے خریدی گئی ساڑی موجود تھی۔ وہ جن حالات میں گھر گیا تھا اس میں یہ تو قطعی ناممکن نظر آتا تھا کہ اب وہ یہ ساڑی اسے دے سکے گا۔ اس کا بیوی کو سرپرائز دینے کا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بہت شدت سے دل چاہا کہ گھر فون کرے اور اپنی بیوی کو کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ وہ آج کا دن بھولا نہیں ہے لیکن ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا اپنا موبائل فون گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی رکھا رہ گیا تھا اور اگر پاس ہوتا بھی تو اسے اغوا کرنے والے اس کی اجازت کب دینے والے تھے؟

وہ اسی طرح کی سوچوں میں گھرا بیٹھا رہا اور گاڑی جانی پہچانی سڑکوں سے گزرتے ہوئے گلبرگ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس کی منزل ایک ون یونٹ بنگلا تھا جس کا نمبر تک بابر نے گاڑی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے قبل خوب اچھی طرح دیکھا۔ اس طرح کے واقعات میں عموماً یہی سننے میں آتا تھا کہ اغوا کنندہ کو مکمل اندھیرے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں اور کس جگہ موجود ہے لیکن اسے تو بالکل کھلے عام یہاں تک لایا گیا تھا۔ شاید یہ بنگلا ان کا عارضی ٹھکانا تھا اور وہ تھوڑی دیر اسے یہاں رکھنے کے بعد یا تو آزاد کرنے والے تھے یا کسی اور خفیہ جگہ پر منتقل کرنے والے تھے۔ وہ بہرحال کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکا تھا اور قیاس آرائیوں سے کام چلاتا رہا۔ بنگلے میں لے جانے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے اور یہاں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی۔

"اسے کرسی سے باندھ دو۔" شلوار قمیص میں ملبوس شخص نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ اس حکم کے ملنے پر ان لوگوں نے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی پھر کرسی سے باندھ دیا۔ بابر نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اتنی طاقت اور صلاحیت نہیں کہ اکیلا اسلحے سے لیس ان غنڈوں کا مقابلہ کر سکے۔

"ہم تمہیں صرف ایک سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس سوال کا جواب کتنی جلدی دے کر اپنی جان چھڑاتے ہو۔ ہمیں بہرحال ہر صورت جواب چاہیے۔" شلوار قمیص میں ملبوس شخص اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

http://pakistanipoint.blogspot.com

"کون سا سوال؟" بابر نے حیرت سے سرسرائے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے ماسٹر آفتاب اور اس کی ساتھی لڑکی کو کہاں چھپایا ہے؟" اس شخص نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو بابر چونک گیا۔ اسے تو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ آفتاب کے چکر میں دھرا گیا ہے۔

"کون ماسٹر آفتاب؟ میں کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتا۔" خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"لگتا ہے تمہاری یادداشت کچھ کمزور ہے۔ اسے بحال کرنے کے لیے ہمیں کچھ علاج شلاج کرنا پڑے گا۔" وہ بابر کا جھوٹ نوٹ کر چکا تھا اور پھر اسے اطلاع بھی یہی دی گئی تھی کہ یہ شخص ماسٹر آفتاب کا پتا بخوبی جانتا ہے۔ چنانچہ استہزائیہ لہجے میں بولا اور اپنے ساتھی کو کوئی اشارہ کیا۔ بابر نے بھی یہ اشارہ دیکھ لیا اور تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے وہ لوگ اس پر کس قسم کا تشدد کر کے سچ اگلوانے والے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت جب اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا تو وہاں ایسا کوئی آلہ نظر نہیں آیا تھا جو تشدد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو لیکن ایک منٹ کے وقفے میں اپنی پشت پر محسوس ہونے والی معمولی کھٹر پٹر کے بعد جو کچھ اس کے سامنے آیا اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ بھاری تن وتوش کے آدمی نے بجلی کا ایک تار نیلی شلوار قمیص والے کے ہاتھ میں لہرایا تھا اور خود وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔

"سنا ہے پاگل خانوں میں مریض کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اسے بجلی کا جھٹکا لگاتے ہیں۔ تمہاری یادداشت بھی چلی گئی ہے اس لیے ہم تم پر بھی یہ طریقہ آزما کر دیکھیں گے۔" نہایت سفاکی سے کہتا ہوا وہ بابر کے قریب آیا اور تار کا ننگا سرا اس کے بازو پر رکھ کر انگلی سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ فوراً ہی بابر کے پورے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے اپنے دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس کیں۔ برقی رو ایک ڈیڑھ سیکنڈ سے زیادہ اس کے جسم سے نہیں گزری تھی پھر بھی وہ پور پور پسینے میں نہا گیا۔

"یہ معمولی سا جھٹکا تھا۔ اگر اس نے تمہاری یادداشت ٹھیک کر دی ہو تو صحیح ہے ورنہ اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہو گا۔ میں تمہیں پانچ منٹ دیتا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔" وہ بابر کے قریب سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔ بابر کے بازو پر جہاں بجلی کا تار رکھا گیا تھا، وہاں انگارے سے دہک رہے تھے لیکن اسے اس تکلیف کو نظر انداز کر کے فی الحال سوچنے کا کام کرنا تھا۔ خود کو ملنے والی پانچ منٹ کی مہلت اس نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے گزاری۔ اسے علم تھا کہ آفتاب کو ڈھونڈنے والا پیر آباد کا چودھری افتخار ہے اور آفتاب کے ساتھ جو لڑکی موجود ہے وہ چودھری کی بیٹی ہے۔ یعنی اس وقت جو لوگ اسے اغوا کر کے یہاں لائے تھے وہ چودھری کے گماشتے تھے۔

چودھری یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ جب وہ یہاں سے نکلے گا تو پولیس کو بیان دیتے ہوئے اپنے اغوا کی وجہ ضرور بتائے گا۔ بابر عام آدمی ہوتا تو بات چھپ بھی جاتی لیکن وہ میڈیا کا بندہ تھا جو زبان بھی کھولتا اور ہر طرف چودھری کی بدنامی بھی ہوتی۔ یعنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی بابر کی رہائی کسی صورت چودھری کے مفاد میں نہیں تھی۔ بابر کو یہ بات بھی سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اس بنگلے تک لاتے ہوئے اس سے اس کی لوکیشن چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے، وہ یہاں زندہ لایا ضرور گیا تھا لیکن زندہ واپس جانے والا نہیں تھا اس لیے اس سے ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ وہ بعد میں اس جگہ کی نشان دہی کر سکے گا۔ حالات کا یہ تجزیہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس کی زندگی بس اس وقت تک ہے جب تک اس کی زبان بند ہے ورنہ ادھر وہ آفتاب کا پتا بتائے گا اور ادھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

"ہاں بھئی، کیا سوچا تُو نے؟ کچھ یاد آیا کہ کدھر چھپا رکھا ہے تُو نے اس ماسٹر کو؟" پانچ منٹ کی مہلت ختم ہو گئی تھی اور وہ شخص ایک بار پھر اس کے سر پر مسلط تھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کسی آفتاب کو نہیں جانتا۔" اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بابر نے جواب دیا۔

"لا بھئی پہلوان! مجھے تار پکڑا۔ لگتا ہے صحافی بابو کو ابھی ہور علاج کی ضرورت ہے۔" اس کا جواب سن کر نیلی شلوار قمیص والا اپنے بھاری تن وتوش کی وجہ سے ہی پہلوان کہہ کر پکارا جاتا ہو گا۔ پہلوان نے حکم کی تعمیل میں ایک بار پھر بجلی کا تار لا کر اپنے لیڈر کو تھمایا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بابر کے عقب میں موجود سوئچ بورڈ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اشارہ ملنے پر بٹن آن آف کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیڈر نے اس بار تار بابر کی ران پر رکھ کر اشارہ کیا۔ اشارہ ہوتے ہی برقی رو دندناتی ہوئی بابر کے جسم میں داخل ہوئی اور جسم کے ایک ایک خلیے سے گزرتے ہوئے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ چیخوں کا ایک تسلسل تھا جس سے پورا کمرا گونج اٹھا لیکن شلوار قمیص والا شخص یوں مطمئن تھا جیسے کسی تڑپتے ہوئے انسان کی چیخوں کے بجائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اپنے طے شدہ وقت کے حساب سے جب اس نے پہلوان کو برقی رو کا سلسلہ منقطع کرنے کا اشارہ کیا تو بابر

کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور بے ہوشی کی وجہ سے اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس دوسرے جھٹکے نے اس کی حالت اس حد تک تباہ کر دی تھی کہ منہ سے رال بہہ نکلی تھی۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" وہ واپس کرسی پر جا بیٹھا اور پہلوان کو حکم دیا۔ پہلوان حکم کی تعمیل میں آگے آیا اور اس کی نبض چیک کی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار منٹ کی کوشش کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوئی اور بابر ہوش میں آ گیا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا اور وہ خالی نظروں سے اپنے سامنے موجود لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر کیا ارادے ہیں صحافی صاحب! ہمیں ماسٹر آفتاب کا پتا بتاتے ہو یا ایک جھٹکا اور کھانا ہے لیکن سوچ لو کہ کہیں اگلا جھٹکا تمہیں دوسری دنیا میں نہ پہنچا دے۔ ابھی تو تم صرف بے ہوش ہوئے تھے اس لیے ہم ہوش میں لے آئے ..... مر مرا گئے تو لاش کسی کچرا خانے میں پھینکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔" سفاکی میں ڈوبی یہ آواز سن کر بابر کو یاد آیا کہ وہ کس صورت حال سے گزر رہا ہے۔ اس نے اپنی حالتِ زار پر بھی غور کیا۔ باچھوں سے بہتی رال جسے وہ بند ھا ہوا ہونے کی وجہ سے صاف بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ یک دم ہی اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو بیٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ابے کیا عورتوں کی طرح دہاڑیں مار کر رو رہا ہے۔" پہلوان نے اس کے پیٹ میں اتنی زوردار لات ماری کہ وہ کرسی سمیت الٹ کر گرا۔ گرنے کے باعث اس کا سر بڑی زور سے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس سے نکلنے والا خون فرش پر بہنے لگا۔

"مار ڈالو، مجھے جان سے مار ڈالو لیکن میں پھر بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں بتا بھی دیا تو تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔ تم مجھے مارنے کے لیے ہی یہاں لائے ہو ورنہ اپنے یہ مکروہ چہرے کبھی مجھے نہیں دکھاتے۔" ایک اور نئی چوٹ کھا کر وہ رونا بھول گیا اور ہیجانی انداز میں چیخنے لگا۔ اس کے الفاظ نے پہلوان اور اس کے لیڈر کو احساس دلایا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ ان کی بے پروائی نے بابر کو سمجھا دیا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور یہ آگہی خطرناک تھی۔ جس شخص کو اپنی موت کا یقین ہو جائے پھر اس سے جسمانی تشدد کے ذریعے کچھ نہیں منوایا جا سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے مرنا تو ہر صورت ہے۔

"پہلوان! مجھے وہ ڈبا تو دینا جو یہاں آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھا۔" کچھ دیر بابر کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد شلوار قمیص والے شخص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی وہ ڈبا لے آیا۔ ڈبے میں وہی ساڑی تھی جو اس نے اپنی بیوی کو دینے کے لیے خریدی تھی۔ وہ ڈبا لے کر اسے کھولنے لگا لیکن اس سے قبل وہ پہلوان کو گری ہوئی کرسی سیدھی کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ جب تک پہلوان نے کرسی سیدھی کی، وہ ڈبے پر موجود خوب صورت ریپر کو پھاڑ کر اسے کھول چکا تھا اور اس میں موجود ساڑی باہر نکال لی تھی۔

"یہ تم نے یقیناً اپنی بیوی کے لیے خریدی ہے؟" ساڑی اس نے بابر کی نظروں کے سامنے لہرائی۔ وہ بنا جواب دیے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنی بیوی کو اس ساڑی میں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ چچ چچ ..... مجھے تو تمہاری قسمت پر رونا آ رہا ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتے ہیں۔ پھر تم اسے یہ ساڑی پہنا لینا..... لیکن ایک شرط ہے۔ اس کے بدن پر جو کپڑے پہلے سے ہوں گے انہیں ہم اتاریں گے۔" وہ جو دھمکی دے رہا تھا، بابر کو بہ خوبی سمجھ آ رہی تھی۔ معاملہ اب اس کی جان سے بڑھ کر عزت تک آ پہنچا تھا۔ جان اسے ہر حال میں دینی تھی لیکن بیوی کو بے آبرو کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"وہ اسلام آباد میں میری خالہ کے گھر میں ہیں۔ وہ سیکٹر....." پست آواز میں وہ خالہ کے گھر کا پورا ایڈریس بتاتا چلا گیا۔ اُدھر مکمل پتا بتا کر اس کی زبان خاموش ہوئی، اِدھر کمرے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ چنداچ کے سیسے نے اس کے سینے میں اتر کر اس دل کی دھڑکنوں کو خاموش کر دیا تھا جو مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹے قبل بڑی لَے میں دھڑک رہا تھا اور اپنی بیوی کو سرپرائز دینے کے خیال سے مسرور تھا۔ سرپرائز تو اس بے چاری کو اب بھی ملتا..... جب شوہر کی زخم زخم لاش اس کی چوکھٹ پر اترتی اور اس پر خوشیوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے.....

☆☆☆

"کشور....." وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی کہ آفتاب نے اسے آہستہ سے ہلاتے ہوئے سرگوشی میں پکارا۔

"کیا بات ہے آفتاب..... آپ ابھی تک سوئے نہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھی اور حیرت سے پوچھنے لگی۔ رات اگرچہ بہت زیادہ نہیں گزری تھی اور گیارہ بجے سے کچھ اوپر کا ہی وقت ہوا تھا لیکن یہاں جلد سو جانے کے رواج کی وجہ سے وہ دونوں بھی جلد ہی سو جاتے تھے۔ کشور جب سونے کے لیے لیٹی تھی تو

http://pakurdupage.blogspot.com

آفتاب بھی اس کے ساتھ ہی بستر پر لیٹا تھا اور فوراً ہی آنکھیں بند کر کے خاموشی بھی اختیار کر لی تھی۔ اس نے یہی گمان کیا تھا کہ وہ دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھک گیا ہے اس لیے جلد نیند آگئی ہے لیکن اب وہ جس طرح چاق و چوبند اور تیار اس کے سرہانے کھڑا تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ سرے سے سویا ہی نہیں تھا۔

"آپ اٹھ کر منہ ہاتھ دھولیں اور برقع پہن لیں۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا ہے۔" آفتاب نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"یااللہ خیر! ایسا کیا ہو گیا کہ ہمیں رات کے اس اندھیرے میں یوں اچانک روانہ ہونا ہے؟" پکڑے جانے کا خوف تو ہر پل ہی اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ آفتاب نے نیند سے اٹھا کر اچانک روانگی کی اطلاع دی تو یہی خیال ذہن میں آیا کہ کوئی انہونی ہو گئی ہے اس لیے سراسیمہ ہو کر پوچھنے لگی۔

"آپ گھبرائیں مت اور آرام سے تیار ہوں۔ فوری طور پر خطرے کی کوئی بات نہیں ہے..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مزید اس گھر میں رہنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہو گا اس لیے میں نے کسی اور جگہ رہائش کا بندوبست کر لیا ہے اور کچھ دیر بعد ہم وہیں جانے والے ہیں۔" آفتاب نے نہایت رسان سے اسے بتایا تو وہ چونک کر اور غور سے آفتاب کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کے اس فوری فیصلے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بدر کی دوپہر والی بدتمیزی سے واقف تھا اور اس وقت جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔

"آپ ایسا بدر کی وجہ سے کر رہے ہیں نا..... لیکن اُسے تو خالہ نے اسی وقت گھر سے نکال دیا تھا۔ اب ہم اس طرح اچانک خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ اُن کے ساتھ زیادتی والی بات ہو گی۔" اسے آفتاب کا فیصلہ اس حساب سے مناسب نہیں لگا تھا کہ خالہ نے ان کی محبت میں اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر بدر کر دیا اور اب وہ خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو وہ بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔

"آپ جذباتی ہو کر مت سوچیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بدر اپنے گھر واپس لوٹ کر نہ آئے۔ خالہ نے فی الحال جذبات میں اسے نکال دیا ہے لیکن ہیں تو بہرحال وہ اس کی ماں۔ دو چار دن میں ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور وہ آپ سے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر آنے کی اجازت دے دیں گی۔ بالفرض وہ اپنے قول پر قائم بھی رہتی ہیں تو کیا آپ کے خیال میں بدر جس قماش کا آدمی ہے، وہ چپ چاپ یہ سب برداشت کر لے گا؟ وہ تو ہنگامہ مچا دے گا اور ہم پہلے ہی اتنے مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ مزید کسی نئی دشمنی کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ مناسب یہی ہے کہ ہم خاموشی سے یہ گھر چھوڑ دیں۔" اس نے کشور کو سمجھایا۔

"ہم صبح خالہ کو بتا کر بھی تو جا سکتے ہیں؟ ہمارے اس طرح جانے سے انہیں دکھ ہو گا۔" وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

"نہیں، ہم نے انہیں بتایا تو وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گی اور آپ ان کے پُرخلوص اصرار پر جذباتی ہو کر مجھے ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کریں گی..... تو اس لیے بہتر ہے کہ میں ایسی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑوں کہ ایسی کسی چویشن کا سامنا کرنا پڑے۔" آفتاب نے صاف انکار کیا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ جب آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو میں آپ سے اختلاف کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ کچھ دکھی ہوئی سی بستر سے اٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانے میں جاتے جاتے اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جو سفری بیگ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، بالکل تیار کمرے کے وسط میں رکھا تھا اور آفتاب نے ٹیبل پر موجود اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی سمیٹ لیا تھا۔ یعنی وہ اس کے سونے کے دوران روانگی کی مکمل تیاری کر چکا تھا بلکہ اصل تیاری تو دن میں کسی وقت اس کی کمرے میں عدم موجودگی کے دوران ہوئی ہو گی۔ رہائش گاہ کا بندوبست کیے بغیر وہ دونوں بھلا اس وقت کہاں جا سکتے تھے۔ آفتاب کے اس رویے پر اس سے کچھ ناراض ہو کر وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ دوسری طرف آفتاب اس کے انتظار میں بستر پر ہی ٹک گیا تھا۔ اس نے کشور کی ناراضی کو بخوبی محسوس کیا تھا لیکن فی الحال نظرانداز کر دینے پر اس لیے مجبور تھا کہ اس کی اپنی اندرونی کیفیت کچھ مضطرب سی تھی۔

بدر کی کشور سے بدتمیزی کے بعد اس نے خالہ کا رویہ دیکھا تھا اور ان کے خلوص اور حق پرستی سے متاثر بھی ہوا تھا۔ کسی غیر کو اپنے سگے بیٹے پر چاہے وہ غلطی پر ہی تھا، ترجیح دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس کا دل نہیں مانا تھا کہ وہ کشور کے ساتھ مزید یہاں رکے۔ یہاں مزید رکنے کے خیال سے ہی اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کی مدد سے ایک اسٹیٹ ایجنسی سے رابطہ کیا اور کسی نہ کسی طرح مالک کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اشتہار میں مذکور فلیٹ کو آج ہی ان کے حوالے کر دے گا۔ اس سلسلے میں اس نے مالک کی تمام شرائط قبول کرنے اور ایڈوانس و کرایہ فوری طور پر ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسے اس فیصلے میں آسانی اس لیے بھی رہی تھی کہ اسلام آباد پہنچتے ہی کشور نے اپنی انگلی میں موجود ایک ڈائمنڈ رِنگ فوری طور پر فروخت کر دی تھی تاکہ وقتِ ضرورت ان کے پاس نقد رقم موجود رہے۔ ڈائمنڈ رنگ ٹھیک ٹھاک قیمت پر فروخت ہوئی تھی۔ کرایہ اور ایڈوانس دینے کے بعد بھی ان کے پاس معقول رقم ضرور بچ جاتی۔ اس رقم سے وہ اپنے ابتدائی اخراجات پورے کر سکتے تھے۔ اس کے بعد تو آفتاب کو اس کے کالم کا معاوضہ ملنا شروع ہو جاتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ وہ دونوں بہت آرام سے، بشرطیکہ دشمن انہیں رہنے دیتے..... اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ انہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھا وہ بیڈ پر بیٹھا تھا کہ کشور چہرے کو تولیے سے تھپتھپاتی ہوئی غسل خانے سے باہر نکلی۔

"مجھے ذرا کاغذ قلم تو دے دیں۔ میں خالہ کے نام ایک مختصر سا رقعہ ہی لکھ دوں۔" ناراضی کا اظہار کرتے لہجے میں اس نے آفتاب سے مطالبہ کیا تو اس نے بنا کسی تعرض کے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ کشور نے مختصر وقت میں رقعہ لکھ کر اسے ٹیبل پر پیپر ویٹ تلے رکھا اور برقع اوڑھ کر اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے آفتاب سے یہ تک پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ واحد عمل تھا جس کے پیچھے اس کی ناراضی کے بجائے آفتاب پر موجود حد درجے کا اعتماد تھا۔ بہت احتیاط سے سیڑھیاں طے کر کے وہ دونوں نچلی منزل پر پہنچے۔ وہاں مکمل خاموشی اور تاریکی تھی۔ البتہ صرف خالہ کے کمرے کے دروازے کے پیچھے سے جھانکتی نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی ذی نفس موجود ہے۔

اس بوڑھی عورت کو یوں تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے کشور کا دل بھر آیا لیکن اس کی مجبوری تھی کہ وہ آفتاب سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ نہایت بوجھل دل کے ساتھ وہ اس کے ہمراہ گھر سے باہر نکل آئی۔ دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا تھا اس لیے وہ دونوں مطمئن تھے کہ گھر کو غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جا رہے۔ باہر نکلتے ہی کشور نے آفتاب کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایسا اس نے اسے سہارا دینے کے لیے کیا تھا تاکہ اس کو اپنی ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب زیرلب مسکرایا۔ اسے اطمینان تھا کہ کشور اس سے ناراض تو ہو سکتی ہے لیکن محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔ اندھیرے کی وجہ سے کشور اس کی یہ مسکراہٹ نہیں دیکھ سکی۔

وہ دونوں قدم بہ قدم ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے گلی سے باہر نکل گئے اور دائیں طرف اس راستے پر چلنے لگے جو بس اسٹینڈ تک جاتا تھا۔ انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ جب وہ اس راستے پر مڑے ہیں تو عین اسی وقت بائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی خالہ کی گلی میں داخل ہوئی ہے اور سیدھی خالہ کے دروازے کے آگے جا ٹھہری ہے۔ گاڑی سے اترنے والے افراد وہی تھے جنہوں نے بابر کو اغوا کرنے کے بعد اس سے بے پناہ جسمانی و ذہنی تشدد کے ذریعے آفتاب کا یہ موجودہ پتا معلوم کیا تھا۔ ان افراد کی تعداد میں البتہ مزید دو کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن ان کا لیڈر وہی نیلی شلوار قمیص والا شخص ہی تھا۔ یہ آدمی اور اس کا ساتھی پہلوان، دونوں کا پیر آباد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ لاہور کے رہائشی تھے اور رقم لے کر ہر قسم کے مجرمانہ کام سرانجام دیتے تھے۔ بالے کے بستر سے لگ جانے کے بعد چودھری کو مجبوراً ان لوگوں سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ انہیں ہائر کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ اپنے مزید ملازموں کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جس قدر رازداں بنائے گا، بات اتنی ہی کھلے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے خاص لوگوں کو پوست کی کاشت کرنے والے مزارعوں کی نگرانی پر رکھ چھوڑا تھا۔ کچھ افراد اسے اپنی سیکیورٹی کے علاوہ مہمان بن کر آنے والی لنڈا کے لیے بھی درکار تھے۔ ان اتنے سارے کام کے بندوں کو چھوڑنے کے بعد بھی بے شک اس کے پاس کئی نمک خوار بچ جاتے تھے لیکن یہ وہ لوگ تھے جن کی موٹی عقلوں پر وہ بھروسا نہیں کر سکتا تھا اور وہ بس مار دھاڑ کے ہی کام آتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں اسے کرائے کے ان ٹٹوؤں کا سہارا لینا پڑا۔

نیلی شلوار قمیص والے شخص کا نام شاور تھا اور وہ بہت اونچے دام لے کر کسی پارٹی کے لیے کام کرتا تھا۔ خالہ کے گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتا ہوا گاڑی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر لاک پر جھکنے کے بعد اس نے مشکل سے ایک منٹ ہی صرف کیا ہو گا کہ لاک کھل گیا۔ لاک کھولنے والا یہ شخص بہت ماہر نقب زن تھا اور نقب زنی کی بڑی بڑی وارداتوں میں خفیہ لاکرز کے پیچیدہ ترین لاکس کو بھی بڑی کامیابی سے کھولنے یا توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس جیسے شخص کے سامنے بھلا ایک گھر کے گیٹ پر موجود لاک جو بے شک مکینوں کے خیال میں خاصا مضبوط تھا، کیا اہمیت رکھتا تھا۔ ایک منٹ سے بھی قلیل وقت میں لاک کھولنے کے بعد اس نے گاڑی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے کامیابی کا اشارہ کیا تو شاور، پہلوان اور ان کا ایک اور ساتھی گاڑی سے اتر آئے۔ ان کے اترتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی جبکہ وہ سب دندناتے ہوئے گھر کے اندر جا گھسے۔ پورے گھر

http://paktunplace.blogspot.com

پر خاموشی کا راج تھا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ ایک کمرے میں سوئی ہوئی خالہ کے سوا انہیں وہاں کوئی دوسرا ذی نفس نظر نہیں آیا۔

"اوپر کی منزل چیک کرو۔" شاور نے حکم دیا تو پہلوان اور ایک آدمی اوپر چڑھ گئے۔

"اوپر بھی پورا گھر خالی پڑا ہے۔ کوئی موجود نہیں ہے۔" ذرا دیر بعد نیچے آ کر انہوں نے اطلاع دی تو شاور سوچ میں پڑ گیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ بابر نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور مرتے مرتے جھوٹ بول گیا ہو؟" اس نے پہلوان سے رائے لی۔

"ایسا لگتا تو نہیں۔ اس کی اطلاع میں کوئی تو سچائی تھی۔ اس گھر کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ لوگ رہتے ہیں اور فی الحال کہیں گئے ہوئے ہیں۔" پہلوان نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے رائے دی۔

"ایسا کرو کہ اس بڑھیا کو اٹھا کر اس سے پوچھو۔ اگر وہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں تو اسے ضرور معلوم ہوگا۔" پہلوان کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے شاور نے حکم دیا۔

"اے بڑی بی! بہت سو لیں۔ اب اٹھ جاؤ۔" حکم ملنے پر ایک آدمی نے بدتمیزی سے خالہ کو جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ بے چاری بلڈ پریشر کی دوا کھا کر سوئی تھیں اسی لیے گھر میں مچی ہلچل سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھیں۔ اس طرح جگائے جانے پر ہڑبڑا کر اٹھیں اور اپنے اردگرد موجود ان چاروں افراد کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"کک..... کون ہو تم لوگ؟" انہوں نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل یہ سوال کیا۔

"ہم جو بھی ہیں تم بتاؤ کہ وہ ماسٹر کہاں ہے جسے تم نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے؟" شاور نے آگے بڑھ کر ان کی گردن دبوچتے ہوئے پوچھا تو خالہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بابر نے آفتاب اور کشور کو یہاں بھیجتے ہوئے سرسری سا ذکر تو کیا تھا کہ انہیں اپنے کچھ دشمنوں سے بچنے کے لیے پناہ کی ضرورت ہے لیکن وہ دشمن ایسے خطرناک ہوں گے کہ آدھی رات کو تالا توڑ کر ان کے گھر میں آ گھسیں گے، اس کی انہیں امید نہیں تھی۔

"جلدی بتا بڑھیا! کہاں ہیں وہ لوگ؟" شاور نے خالہ کی گردن پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی منہ پر ایک تھپڑ بھی دے مارا۔ اس بے چاری بوڑھی عورت کے لیے اتنا تشدد بھی بہت تھا۔

"او..... پر۔" انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بہ مشکل بتایا۔

"وہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔" اس ڈر سے کہ کہیں بڑھیا کچھ بتانے سے قبل ہی مر نہ جائے، شاور نے ان کے گلے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ اوپر ہی ہیں۔" گلا چھوڑے جانے پر خالہ پہلے کھانسیں۔ کھانسی قابو میں آئی تو بڑے وثوق سے زور دے کر بولیں۔ ویسے انہیں حیرت تھی کہ آفتاب اور کشور کہاں چلے گئے ہیں جو ان لوگوں کو نہیں ملے۔ اس حیرت میں یہ خوشی بھی شامل تھی کہ وہ دونوں ان دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ اُن کے دشمنوں سے بچ جانے پر دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتی وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔ "میں خود اوپر جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ دونوں وہیں ہوں گے۔" اُن کے اس اعتماد کو دیکھتے ہوئے شاور نے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

"یہ میرے بیٹے کا کمرا ہے اور اس کمرے میں آفتاب اور اس کی بیوی ٹھہرے ہوئے ہیں۔" اوپر پہنچ کر انہوں نے اس انداز میں شاور کو بتایا جیسے انہیں اب بھی پختہ یقین ہو کہ آفتاب اور کشور کمرے میں ہی موجود ہوں گے۔ اُن کے پُریقین لہجے نے شاور کو بھی تذبذب میں ڈال دیا کہ کہیں تلاشی کے لیے اوپر آنے والوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ کیا معلوم کہ وہ دونوں کمرے میں ہی کسی ایسی جگہ چھپ گئے ہوں جہاں اس کے آدمیوں کا دھیان نہ گیا ہو۔ وہ کچھ چوکنا سا خالہ کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ خالہ خود کچھ پریشان سی کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پوری طرح سے روشن کمرے کا منظر بالکل واضح تھا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ اور الماریوں کے کھلے پٹ بتا رہے تھے کہ وہاں کی بہت اچھی طرح تلاشی لی جا چکی ہے۔ خالہ نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ نہ تو الماری میں آفتاب اور کشور کا سامان ہے اور نہ ہی میز پر کتابوں اور کاغذات کا وہ پلندا جو سارا دن آفتاب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی جس کے بارے میں انہوں نے گمان کیا تھا کہ دشمنوں کے گھر کے اندر آ گھسنے سے واقف ہو جانے کی وجہ سے وہ دونوں میاں بیوی پھاند کر فرار ہو گئے ہوں گے، اندر سے بند تھی۔ اس صورتِ حال پر وہ خود خاصے تذبذب کا شکار نظر آنے لگیں۔ آثار تو یہی بتا رہے تھے کہ آفتاب اور کشور پہلے ہی اپنا سامان سمیٹ کر خاموشی سے وہاں سے چلے گئے ہیں۔ یک دم ہی ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور دوپہر والا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ وہ دونوں اس واقعے کی وجہ سے ہی اچانک وہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ دل شکستہ سی رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر ٹک گئیں۔ اسی وقت ان کی نظروں میں پیپر ویٹ کے نیچے دبا وہ کاغذ آ گیا۔ انہوں نے کاغذ نکال

کر اس پر لکھی تحریر پڑھی۔ وہ تحریر کشور کی طرف سے تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"پیاری خالہ!

میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو اطلاع دیے بغیر ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اصل میں آفتاب نے دوپہر والا واقعہ دیکھ لیا تھا اور اب وہ ایک دن بھی یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں، فی الحال مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ کبھی موقع ملا تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارے ہونے والے بچے کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

آپ کی شرمسار بیٹی کشور۔"

خالہ نے یہ مختصر رقعہ پڑھنے کے بعد شاور کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مشکل سے آخری لائن پڑھ سکا تھا کہ ڈور بیل زور زور سے بجنے لگی۔

"نیچے چلو۔" کچھ نہ ملنے کا یقین ہو جانے پر شاور نے انہیں حکم دیا تو انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ان کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ شاور نیچے پہنچا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو تذبذب کے عالم میں پایا۔

"کیا ہوا؟ کون ہے باہر؟" اس نے ان تینوں سے دریافت کیا۔

"لگتا ہے اس بڑھیا کا بیٹا ہے۔ کم بخت نشے میں ہے اور بڑا شور مچا رہا ہے۔ کہیں شور سن کر محلے والے نہ جمع ہو جائیں۔" پہلوان نے تشویش سے جواب دیا تو شاور نے بھی اپنے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیے۔

"دروازہ کھولو۔ کوئی الو کا پٹھا مجھے اس گھر میں آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ میری ماں بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتی۔ جس کے لیے اُس نے میری بے عزتی کی ہے اس کا میں حشر خراب کر دوں گا۔ خود کو سمجھتی کیا ہے وہ آوارہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت۔ میں بیچ چوراہے پر لے جا کر اس آوارہ کی عزت خراب کروں گا۔" اس سے آگے گالیوں کا ایک طوفان تھا جو وہ مسلسل کسی نامعلوم عورت کو دے رہا تھا۔ شاور جس نے کشور کا خط پڑھ لیا تھا، کافی حد تک معاملے کو سمجھ گیا تھا لیکن اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ باہر موجود اس شرابی کا کیا کیا جائے جسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ دروازہ غیر مقفل ہے اور ذرا سا دھکا دینے پر کھل سکتا ہے۔ وہ بس اپنی ہی دھن میں بیل بجانے اور گالیاں دینے میں مصروف تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مت کھولو دروازہ۔ میں لاک ہی توڑ دوں گا۔" شاور نے اپنے ایک آدمی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ باہر سے بدر کی دھمکی سنائی دی اور اگلے ہی لمحے فائر کی آواز گونجی۔ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھنے والا آدمی اس گولی کی زد میں آ گیا اور اس کے حلق سے زوردار چیخ بلند ہوئی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اسی پل بدر نے گھر میں قدم رکھا۔ اپنے ساتھی کو لگنے والی گولی نے شاور کو طیش دلا دیا تھا چنانچہ اس نے ہاتھ میں موجود گن سیدھی کی اور لگاتار کئی گولیاں بدر کے ڈگمگاتے وجود میں اتار دیں۔ اس انتقامی کارروائی کے بعد وہ اور اس کے ساتھی وہاں رکے نہیں اور اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر باہر کی جانب بھاگے۔ ڈرائیور سمیت کچھ فاصلے پر کھڑی ان کی گاڑی فوراً ہی نزدیک آئی اور وہ سیکنڈوں میں اس میں سوار ہو کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس سارے شور ہنگامے پر بیدار ہو جانے والے محلے دار فرار ہوتے مجرموں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے البتہ دوڑ کر خالہ کے گھر تک پہنچے۔ گیٹ سے دو قدم اندر ہی بدر کی اپنے خون میں نہائی ہوئی لاش پڑی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹے سے اس کی آوارہ گردی پر سدا نالاں رہنے والی ماں گری ہوئی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اپنے لختِ جگر کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر اس کا دل ہمت ہار بیٹھا کیونکہ وہ ایک ایسی ماں کا دل تھا جو بیٹے پر گھر کے دروازے تو بند کر سکتی تھی، دل کے دروازے نہیں۔

☆☆☆

"آپ کی کارکردگی قابلِ اطمینان ہے۔ میں واپس جا کر ڈیوڈ کو رپورٹ دوں گی تو وہ بہت خوش ہوگا ورنہ پچھلے دنوں آپ جس بے پروائی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ تشویش کا شکار تھا اور آپ کی جگہ کسی اور کو دینے پر غور کر رہا تھا..... لیکن میں نے اُسے روکا کہ میں خود جا کر چودھری صاحب کو دیکھتی ہوں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ چودھری صاحب میری خاطر بھی کام پر توجہ نہ دیں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے ناامید نہیں کیا۔" وہ لوگ کاشت شدہ پوست کا جائزہ لے کر واپس پلٹ رہے تھے جب لنڈا نے چودھری کے ساتھ چلتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں اس سے یہ باتیں کہیں۔ اس کے موجودہ لہجے کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل یہی عورت اپنی مکمل حاکمیت ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور چودھری جیسے بندے سے پُرغرور انداز میں بات کر رہی تھی۔ چودھری نے اس کا یہ لگاوٹ بھرا لہجہ سنا لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔

"اپنا موڈ ٹھیک کر لیں چودھری صاحب! آپ اس طرح

http://pakfunplace.blogspot.com

خاموش رہیں گے تو شکار کا کیا خاک مزہ آئے گا؟" لنڈا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ایک ادا سے ٹوکا تو اس کے لمس کی سنسناہٹ چودھری کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جانے اس عورت میں کیا جادو تھا کہ جب چاہے مرد کو ایک پل میں چاروں شانے چت کر دیتی تھی۔

"فکر نہ کرو ڈارلنگ! ہم تمہیں ایسا شکار کروائیں گے کہ ہمیشہ یاد رکھو گی لیکن خود ہم افسردہ ہیں کہ ہمارا شکار ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ جب تک ہم اس ماسٹر کے بچے اور اپنی باغی بیٹی کو ان کے انجام تک نہیں پہنچا دیتے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔" لنڈا کے ہاتھ کی نرمی اور حدت کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے جواب دیا۔

"اب یہ تو آپ کی بیڈ لک ہے نا کہ وہ دونوں پہلے ہی نکل گئے تھے ورنہ ہم نے تو آپ سے دوستی نبھاتے ہوئے آپ کو بالکل صحیح کلیو دیا تھا۔ حالانکہ اس طرح کے مسائل حل کرنا ہمارے اور آپ کے درمیان ہونے والے ایگریمنٹ میں طے بھی نہیں ہوا ہے۔" بے نیازی سے شانے جھٹکتے ہوئے اس نے جواب دیا تو چودھری جواباً کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ آفتاب اور کشور والا معاملہ اس کا نجی مسئلہ تھا جسے حل کرنے کی ذمے داری ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی تھی۔

"یہاں جنگل میں شکار کی کیا صورت حال ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بہت زیادہ وقت برباد کرنا پڑے۔ میں چار پانچ گھنٹوں سے زیادہ یہاں رکنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میرا شیڈول کافی سخت ہے۔ پرسوں صبح تک مجھے ہر صورت روانہ ہونا ہے۔" چودھری کی خاموشی کو بھانپ کر لنڈا نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ وہ لوگ شکار کے بہانے ہی جنگل میں آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر ایک مناسب مقام پر انہوں نے جیپیں روکیں اور ملازموں کو خیمے نصب کرنے اور شکار کے سلسلے میں دیگر تیاریاں کرتا ہوا چھوڑ کر پیدل اس سمت نکل گئے جہاں پوست کی کاشت کی جارہی تھی۔ ان کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی تھے جو اب بھی کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ خود چودھری کے شانے سے بھی اس کی شکاری بندوق لٹک رہی تھی۔ گاؤں کی طرح جنگل میں بھی اس کا راج چلتا تھا اس لیے اس سے زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"شکار یہاں بہت ملتا ہے۔ دو تین گھنٹوں میں بھی ہم اچھا خاصا شغل کر لیں گے۔ اس حوالے سے تم پریشان مت ہو۔" چودھری نے اسے تسلی دی اور پھر خود یک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیا ہوا چودھری صاحب؟" اس کے اس طرح ٹھٹکنے پر لنڈا نے بھی اپنے قدم روک لیے اور پوچھا۔

"شش ....." چودھری نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند فٹ کے فاصلے پر موجود جھاڑیوں پر نظر گاڑتے ہوئے شانے پر لٹکی بندوق اتاری۔

"ان جھاڑیوں کے پیچھے ایک ہرن چھپا ہوا ہے۔" بندوق سیدھی کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں لنڈا کو بتایا تو وہ غور سے جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی نظروں نے بھی ہرن کو گرفت میں لے لیا۔

"مجھے دیں بندوق۔ میں اسے شکار کروں گی۔" اس نے چودھری کے ہاتھوں سے بندوق جھپٹ لی لیکن اس دوران ہرن نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی چنانچہ اس کے لبلبی دبانے سے پہلے ہی جھاڑیوں سے نکل کر بھاگا۔ اس کے بھاگنے کی پروا نہ کرتے ہوئے لنڈا نے بندوق سیدھی کی اور پورے سکون کے ساتھ فائر داغ دیا۔ بھاگتا ہوا ہرن گولی کھا کر اچھلا اور زمین پر گر گیا۔ ان کے پیچھے چلنے والے چودھری کے ملازم تیزی سے اس ہرن کی طرف دوڑے۔

"بہت خوب! بھاگتے ہوئے جانور کا اتنا سچا نشانہ لینا بڑے کمال کی بات ہے۔" چودھری نے اسے بے ساختہ سراہا۔

"میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا چودھری صاحب۔" لنڈا نے ایک ادا سے سر جھٹکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں جواب دیا اور بندوق واپس چودھری کو تھما دی۔

"یہ تو خیر ماننے والی بات ہے۔" چودھری مسکرایا۔ وہ اپنے سابقہ موڈ سے نکل آیا تھا اور پوری طرح لنڈا کی طرف متوجہ تھا۔ لنڈا نے اس کے مزاج میں در آنے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور زیر لب مسکرائی۔ اس کی موجودگی میں کوئی مرد زیادہ دیر تک اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، اس بات کا اسے خاصا تجربہ تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ کل شام اے سی اور دوسرے خاص خاص لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کر لیں۔ ذرا مل کر دیکھتے ہیں آپ کے اے سی صاحب سے کہ موصوف کتنے پانی میں ہیں۔" وہ لوگ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں ان کے خیمے نصب تھے، تب لنڈا نے چودھری سے کہا۔

"میں نے معلوم کروایا تھا۔ اے سی آج کل پیشیوں پر اپنے گھر لاہور گیا ہوا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں دوسرے لوگوں کو انوائٹ کر لیتا ہوں۔"

"نہیں پھر رہنے دیں۔ مجھے تو صرف اے سی سے ہی ملنے کا اشتیاق تھا۔" لنڈا نے انکار کیا۔ اس کے پاس شہریار سے متعلق جو خبریں پہنچتی رہی تھیں، انہیں سن سن کر اس کے دماغ میں اس سے ملنے اور اسے تسخیر کرنے کا سودا سما گیا تھا لیکن اب

اکیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں

ولادت

☆15 جنوری 2001ء تہلکہ خیز "وکی پیڈیا" کا یوم ولادت۔ اس آن لائن انسائیکلوپیڈیا نے انٹرنیٹ کے کروڑوں صارفین کے لیے سہولت کے ساتھ معلومات کے ایک بیکراں سمندر تک رسائی کو ممکن بنا دیا۔

☆23 اکتوبر 2001ء کو "آئی پوڈ" متعارف ہوا جس نے نئی نسل میں دلچسپی اور سنسنی کی ایک نئی لہر دوڑا دی کیونکہ اس میں ہزار گانے سما سکتے تھے۔ اس جیبی آلے کی مدد سے 30 پسندیدہ گانے بلا توقف سنے جا سکتے تھے۔

☆01 جنوری 2002ء کو عالمی لین دین میں ڈالر کے مقابلے میں یورو متعارف ہوا۔ یورپی یونین کی اس مشترکہ کرنسی کو روز بروز توانائی مل رہی ہے۔

☆01 جولائی 2002ء کو جرائم کی بین الاقوامی عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ اس انٹرنیشنل کرمنل کورٹ میں تھامس لوبانگا اور جرمین کاتانگا جیسے مبینہ جنگجوؤں کے خلاف مقدموں کی داغ بیل پڑی۔

☆25 نومبر 2002ء کو امریکا میں وزارتی سطح پر 22 خفیہ سرکاری ایجنسیوں کے ادغام سے ہوم لینڈ سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ نے جنم لیا جس کی چیرہ دستیوں سے بہت سے امریکی بھی نالاں ہیں۔

☆15 نومبر 2008ء کو جی 20 سربراہ کانفرنس کا آغاز ہوا۔ مضبوط ترین معاشی بنیادوں پر استوار، بارسوخ ملکوں کے سربراہوں کے یہ اجلاس اقوام متحدہ کے سربراہی اجلاسوں کے مساوی اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔

وفات

☆23 مارچ 2001ء کو روس کا خلائی اسٹیشن "میر" 15 سال اپنے مدار میں رہنے کے بعد بھٹکا اور کشش ثقل نے اسے خلا سے کھینچ کر بحرالکاہل کی اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے غرقاب کر دیا۔

☆23 اکتوبر 2003ء برٹش ائرویز اور ائر فرانس کے لیے ایک سوگوار دن تھا۔ یورپ اور امریکا کے درمیان آواز سے زیادہ رفتار سے مسافروں کو لانے اور لے جانے والے "کانکرڈ" نامی طیاروں کی پروازیں بند کر دی گئیں۔ آواز سے دگنی رفتار سے یورپ اور امریکا کے درمیان پھیلے بحراوقیانوس کو عبور کرنے والے کانکرڈ کی پہلی آزمائشی پرواز 2 مارچ 1969ء کو ہوئی، یہ 1976ء میں باقاعدہ پروازوں میں شامل ہوا اور 2003ء میں متروک ہو گیا۔

☆29 اپریل 2004ء کو جنرل موٹرز نے اپنے باوقار اور روایتی برانڈ "اولڈس موبائل" کی تیاری بند کر دی۔ 90 کے عشرے سے امریکی اس شان دار اور بھاری بھرکم کار کی خریداری سے گریز کر رہے تھے۔ اس مندی کے سبب جنرل موٹرز نے 2000ء میں اعلان کر دیا کہ 2004ء کے ماڈل کے بعد اس کار کی تیاری بند کر دی جائے گی۔ اب یہ کار رفتگان کی فہرست میں ہے۔

☆بعض نگلنا چیز دھیرے دھیرے موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ ٹیلی گرام کی مدتوں دھوم رہی پھر یہ متروک ہوتا چلا گیا۔ دنیا اسے بھول گئی۔ عشروں بعد، آخرکار 27 جنوری 2007ء کو ویسٹرن یونین نے بھی اسے ترک کر دیا۔

☆15 ستمبر 2008ء کو لیہ مین برادرس نامی امریکی بینک نے تاریخ کے سب سے بڑے دوالیے کی درخواست دائر کر دی، بے قاعدگیوں اور مشکوک سرمایہ کاریوں نے جہاں کھاتے داروں کے مفاد کو نقصان پہنچایا وہاں عالمی مالیات کو بھی سنگین بحران سے دوچار کر دیا۔

☆22 جون 2009ء مشہور عالم کوڈک کمپنی کی رنگین فلم "کوڈاکروم" کا یوم وفات ہے۔ روایتی کیمروں سے بہترین رنگین نتائج حاصل کرنے کے لیے ہر پیشہ ور فوٹو گرافر اس فلم کو ترجیح دیتا تھا۔ نیشنل جیوگرافک میگزین سرورق سے اندرونی صفحات تک اس فلم کے کمال کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ ڈیجیٹل کیمروں کی آمد اور عمدگی نے آخرکار ہر فوٹو گرافر کو فلم کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا خریدار نہ رہے تو کوڈاکروم کہاں رہتی۔

☆01 جنوری 2002ء کو یورو مارکیٹ میں آتے ہی رکن ممالک کی ساری کرنسیز آنجہانی ہو گئیں۔ ان میں فرانک، گلڈر، مارک، لیرا، پاستیا، ڈراکما، مارکا اور ایسکوڈو شامل ہیں۔

http://pakistanipoint.blogspot.com

چودھری نے اسے جو اطلاع دی تھی، اسے سن کر وہ نہ صرف مایوس ہوئی تھی بلکہ یہ بھی سوچا تھا کہ شہریار کی قسمت اچھی ہے جو اس کے حسن کے جال میں پھنسنے کے لیے موجود ہی نہیں۔ اس گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور پھر وہ تین خیموں کے درمیان موجود سب سے بڑے خیمے میں گھس گئے۔

”تھکن سی ہو گئی ہے۔ ذرا کچھ پینے کو تو نکالیں۔“ اندر پہنچ کر وہ ایک نرم میٹرس پر گرنے کے انداز میں بیٹھی اور شکار کی مناسبت سے پہنی گئی چمڑے کی جیکٹ اتار کر دور پھینکتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔ جیکٹ کے نیچے اس نے سفید رنگ کا نہایت مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا۔ انگڑائی لینے کے عمل میں بلاؤز کا اختصار کچھ اور بھی واضح ہو گیا۔ چودھری نے للچائی ہوئی نظروں سے اس کے سنہری دہکتے جسم کی ہوش ربائیوں کو دیکھا اور شراب کی بوتل اور جام لے کر اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کے عریاں بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔

”اگر تھک گئی ہو تو تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اپنے حصے کا شکار تو تم نے ویسے بھی مار گرایا ہے۔“

لنڈا نے فوراً اس مشورے کو قبول کر لیا اور ایک جام حلق سے اتارنے کے بعد آرام کے لیے دراز ہو گئی۔ آزاد معاشرے کی اس آزاد ترین عورت کا آرام جانے کی قید میں تو ممکن نہیں تھا چنانچہ جب وہ میٹرس پر دراز ہوئی تو چودھری کے حیوانی جذبات مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔

”میں تمہارے پاؤں دبا دیتا ہوں۔“ کسی کو خاطر میں نہ لانے والا کسی پالتو کتے کی طرح اس کے قدموں میں جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ ان لمبی سڈول ٹانگوں کو دبانے لگا جو لنڈا کی شخصیت میں سب سے نمایاں اور خوب صورت تھیں۔ چند لمحوں کے لیے ہی ٹانگیں دبانے کے بعد اس کے ہاتھوں نے بھٹکنا شروع کر دیا۔ چت لیٹی لنڈا کی طرف سے کوئی تعرض نہیں ہوا چنانچہ چودھری کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

”کل صبح ایک گاڑی ڈرائیور سمیت میرے حوالے کر دیجیے گا۔ میں آپ کے گاؤں کی سیر کروں گی اور یہاں رہنے والوں سے ملاقاتیں بھی۔“ لنڈا نے فرمائش کی۔

”ٹھیک ہے۔“ چودھری نے بنا کسی سوال کے ہامی بھر لی۔ ان لمحوں میں اگر وہ کوئی بادشاہ ہوتا اور لنڈا اس سے اس کا تاج و تخت مانگ لیتی تو وہ، وہ بھی دے دیتا۔ اتنی معمولی سی فرمائش کے لیے تو کسی حجت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھری ہوئی شراب کی بوتل سے بڑھ کر نشیلی عورت..... جس کا نشہ چھلکا پڑ رہا ہو، بڑے بڑے پارساؤں اور عقل مندوں کی مت مار دیتی ہے۔ چودھری جیسا نفس پرست تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتا تھا جسے وقت کے اس حصے میں اگر کوئی فکر تھی تو بس اتنی کہ کسی طرح ان لمحات کو طویل سے طویل تر کیا جا سکے۔

☆☆☆

”اگر اپنے وطن سے محبت کرتے ہو تو کیفے شان میں گیارہ بجے مجھ سے ملنے آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے اجنبی نہیں۔ امید ہے کہ تم دیکھتے ہی پہچان لو گے۔“ مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کو تیسری چوتھی مرتبہ پڑھنے کے باوجود سرمد اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ اسے یہ عجیب و غریب پیغام کس کی طرف سے ملا ہو گا۔ اسے ملنے والا یہ خط کوریئر سے آیا تھا اور لفافے کے باہر صاف لکھائی میں اس کا نام لکھا تھا چنانچہ وہ یہ شک نہیں کر سکتا تھا کہ کسی اور کا خط اس تک پہنچ گیا ہے۔

”یہ کس کا خط لے کر گم صم بیٹھے ہو، کسی پرانی محبوبہ نے تو نہیں پکار لیا؟“ نیلم کمرے میں آئی تو اسے مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر چھیڑا۔ سرمد نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ تو بڑا عجیب سا پیغام ہے۔“ مختصر تحریر کو پڑھنے کے بعد اس نے تبصرہ کیا۔

”اسی لیے تو میں پریشان ہو گیا ہوں۔ بھلا یہ کون ہو سکتا ہے جو مجھے جانتا ہے اور میری وطن سے محبت کو آزمانا چاہتا ہے۔“

http://paktunplace.blogspot.com

”کہیں تمہارا کوئی دوست تو نہیں؟ ہو سکتا ہے کسی دوست نے تمہیں یہاں دیکھ لیا ہو اور اسے مذاق سوجھا ہو کہ تمہیں تنگ کرے۔“ نیلم نے خیال ظاہر کیا۔

”ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن یہ کوئی پکی بات تو نہیں۔ کچھ اور بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔“ سرمد تشویش کا شکار تھا۔ نیلم سے شادی کے بعد اس نے جب سے لاہور چھوڑا تھا، کبھی کسی پرانے دوست سے نہیں ملا تھا۔ بس ایک عامر تھا جس سے کبھی کبھی فون پر رابطہ ہو جاتا تھا اور اس کی طرف سے ایسا پیغام ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ عامر اچھا خاصا سنجیدہ مزاج تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ سرمد اپنے اور نیلم کے گھر والوں سے سامنا نہیں کرنا چاہتا اس لیے ماضی کے تمام دوستوں کو چھوڑ کر کراچی میں بیٹھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اسے اس طرح کا مبہم پیغام بھیجنا، اسے پریشان کر دینے کے مترادف تھا اور وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔

”ایسا کرو کہ تمہیں جہاں بلایا گیا ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہ جو بھی ہے، بھرے بازار میں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ نیلم کے نزدیک یہ کسی دوست کی ہی شرارت تھی اور پھر پیغام بھیجنے والے نے بلایا بھی ایک پر ہجوم بازار میں واقع کیفے میں تھا، اس لیے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

”میرے خیال میں جانا تو پڑے گا ہی ورنہ خواہ مخواہ ذہن الجھا رہے گا۔“ سرمد نے ہامی بھر لی لیکن اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ خط کے پیغام کو اپنی موجودہ ملازمت کے تناظر میں دیکھ رہا تھا اور اس صورت میں یہ صورت حال کافی گمبھیر لگ رہی تھی۔

”میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔ ابھی سوا دس بجے ہیں۔ چائے پی کر تم نکلو گے تو آرام سے گیارہ بجے تک وہاں پہنچ جاؤ گے۔“ اسے جانے کے لیے آمادہ دیکھ کر نیلم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ سرمد چائے بہت شوق سے پیتا تھا اس لیے جب بھی وہ اسے خوش کرنا چاہتی یا اس کا دھیان بٹانا مقصود ہوتا تو گرماگرم چائے کی پیالی تیار کر کے پیش کر دیتی۔

”نہیں، رہنے دو اور اگر تمہیں اندر بیگم صاحبہ کے کسی کام سے نہیں جانا تو تھوڑی دیر یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ سرمد یہاں ڈرائیور تھا جبکہ نیلم کچن کا کام سنبھالتی تھی۔ سرمد کو نیلم کا کام کرنا پسند نہیں تھا لیکن یہاں ملازمت کی شرط ہی یہ تھی کہ کوئی ایسا جوڑا ہو جو یہ دونوں کام سنبھال لے چنانچہ نیلم نے از خود کچن کی ذمے داری سنبھالنے کی ہامی بھر لی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو انہیں بڑی مشکل ہو جاتی۔ وہ لاہور سے کراچی آتے وقت جو رقم اپنے ساتھ لائے تھے، وہ تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی اور ملازمت نہ ملنے کی صورت میں انہیں رہائش اور کھانے پینے دونوں کا مسئلہ ہو جاتا جبکہ یہاں یہ دونوں ہی مسئلے آرام سے حل ہو رہے تھے۔

”بیگم صاحبہ بارہ بجے سے پہلے اٹھتی ہی کب ہیں جو مجھے ان کا کوئی کام کرنا ہو گا..... اور اٹھ کر بھی انہوں نے کیا کھا لینا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گلاس جوس اور اس بد ذائقہ براؤن بریڈ کے دو پیس ہی کھائیں گی تو اس کے لیے مجھے کون سے ہل جوتنے ہیں۔ ادھر حکم دیں گی، ادھر میں دو منٹ میں لے جا کر سامنے رکھ دوں گی۔“ نیلم برے برے منہ بنا کر تبصرہ کرتی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئی۔

”ایسا کھانا کھاتی ہے بیگم صاحبہ تب ہی تو اتنی اسمارٹ اور خوب صورت ہے۔ تُو نے تو پراٹھے کھا کھا کر خود پر مُٹاپا چڑھا لیا ہے۔“ سرمد نے اس کے فربہی مائل جسم کی طرف دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”تو مجھے کون سا بیگم صاحبہ کی طرح سارے شہر کے لوگوں کا دل لبھانا ہے۔ میں ادھر تیرے لیے اپنا آپ سنبھال کر بیٹھی ہوں۔ اگر تجھے..... مجھے سوکھا چرخ دیکھنا ہے تو بول۔ آج سے ہی فاقے شروع کر دوں گی۔“ نیلم نے چمک کر اس کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

”تو تو بُرا ہی مان گئی۔ میں کیوں تیرے سے فاقے کرواؤں گا۔ جو دل میں آئے کھایا پیا کر۔ مجھے تو ہر حال میں اچھی لگتی ہے۔“ اس نے تعریف کے کارگر ہتھیار سے پل میں بیوی کا موڈ بحال کر دیا۔ وہ اس کی بات سن کر خوشی سے مسکرانے لگی۔

”اچھا میں ابھی کیفے پہنچ کر تجھے وہاں سے فون کروں گا۔ اگر کوئی دوست ہوا تو لازمی ہے، منع نہیں کرے گا ورنہ تو سمجھ جانا کہ میں کسی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ ادھر چوکیدار وغیرہ کو خبر کر دینا۔“ اپنے اندر ابھرتے اندیشوں اور خدشات کے پیش نظر اس نے نیلم کو ہدایت کرنا ضروری سمجھا۔

”ہائے سرمد! اگر کسی گڑبڑ کا ڈر ہے تو مت جا۔ رہنے دے۔ جس کو ملنا ہو گا، وہ آپ یہاں آ جائے گا۔“ اس کی ہدایت سن کر نیلم خوف زدہ ہو گئی اور اسے روکا۔

”لے..... ابھی تو خود کہہ رہی تھی کہ اتنے ہجوم میں کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے اور اب مجھے روک رہی ہے۔ پاگل! میں تو صرف احتیاط کے طور پر ایسا کہہ رہا ہوں ورنہ کسی نے میرا کیا بگاڑنا ہے۔ میری واحد دشمن تو تیری سوتیلی ماں ہے اور اس کی اتنی پہنچ نہیں کہ ادھر کراچی میں مجھے اور تجھے ڈھونڈ کر نکال سکے۔“ اپنے خدشات کے برعکس وہ ہلکے پھلکے لہجے میں نیلم کو تسلی دینے لگا۔

”ٹھیک ہے پھر تو مجھے پہنچتے ہی فون ضرور کر دینا۔“ وہ رضامند ہو گئی۔ سستے سے سیکنڈ ہینڈ موبائل فونز دونوں ہی میاں بیوی کے پاس موجود تھے اس لیے ایک دوسرے سے رابطے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

”اچھا تو پھر میں نکلتا ہوں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ دوست سے ملنے گیا ہوں۔“ سرمد گھڑی میں وقت دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے نکل کر کیفے شان پہنچنے میں بیس سے پچیس منٹ تو لگ ہی جاتے اور اب ساڑھے دس بج چکے تھے۔ بیگم صاحبہ سے اجازت لینے کی اسے اس لیے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ عموماً شام کے بعد ہی گھر سے نکلتی تھی۔ کبھی دن میں کہیں جانا ہوتا تو اسے ایک دن پہلے یا صبح صبح پیغام مل جاتا اور آج کے لیے ایسا کوئی پیغام نہیں تھا۔ وہ نیلم کو خدا حافظ کہہ کر آرام سے بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق وہ گیارہ بجے سے ایک دو منٹ قبل ہی کیفے شان پہنچ گیا۔ کیفے میں زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو کر وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لینے لگا لیکن اسے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔ ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔“ یک دم ہی کسی

نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اس کی طرف دیکھا۔ شناخت کے مراحل طے کرنے میں اسے چند پل سے زیادہ وقت نہیں لگا۔

''اے جی صاحب آپ! آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے؟'' اس نے تحیر سے سوال کیا۔

''پہلے وہاں چل کر بیٹھو پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔'' شہریار نے اس سے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اس میز کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

''ایک منٹ .... میں اپنی بیوی کو خیریت کا فون کردوں پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔'' کرسی سنبھالتے ہی اسے نیلم یاد آئی۔ چنانچہ شہریار سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولتے ہوئے موبائل نکال کر نیلم کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔

''ہاں نیلم! دیکھو، میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دوست کے ساتھ ہوں۔ تم کسی سے کچھ مت کہنا۔'' اس نے مختصر بات کرکے فون بند کردیا۔

''میں نے آپ کو دوست کہا، آپ برا مت مانیے گا۔ میری اور آپ کی دوستی کا بھلا کیا سوال .... لیکن دس سوالوں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں بیوی سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بول دوں۔'' سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں شہریار کو وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں، میں نے برا نہیں مانا۔'' شہریار نے اپنے مختصر نپے تلے لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر غور سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے سرمد نروس ہونے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں سر؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کیا؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے خط کے الفاظ پڑھ کر واقعی اپنا جذبۂ حب الوطنی ثابت کرنے آئے ہو یا محض تجسس دور کرنے۔''

''گھر سے نکلا تھا تو دماغ میں دونوں ہی باتیں تھیں لیکن اب آپ کو سامنے دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ وطن سے محبت کے دعوے کو سچ ثابت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ آپ حکم کریں، میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

موتی والا کے ڈرائیور کی حیثیت سے وہ شہریار کے کردار سے کافی حد تک واقف تھا اس لیے خلوص سے بولا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ آج کل تم جس عورت کے ہاں ملازمت کررہے ہو اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ کس کردار کی عورت ہے؟'' شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''وہ کچھ مشکوک سے کردار کی عورت ہے۔ اس کا مردوں سے آزادانہ میل ملاپ ہے۔ کبھی کبھی مجھے شک گزرتا ہے کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو کوٹھوں سے اٹھ کر کوٹھیوں میں چلی آئی ہیں لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سا رعب و دبدبہ ہے جو اسے طوائف کہنے سے روکتا ہے۔ عام طوائفوں کی طرح وہ راگ رنگ کی محفلیں بھی نہیں سجاتی لیکن راتوں کو اکثر غیر مرد بنگلے پر رکنے کے لیے آتے ہیں۔ ان مردوں کو دیکھ کر ہی پتا لگ جاتا ہے کہ وہ بڑی اونچی حیثیت کے مالک ہیں۔ ایک دو وزیروں کو تو میں نے خود بھی پہچانا ہے۔'' سرمد نے خوب سوچ کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا وہاں آنے والوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کا مستقل آنا جانا لگا رہتا ہو؟''

''جی ہاں، ایک دو بندے ایسے ہیں جو وہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان سے بیگم صاحب کی دوستی بھی بہت ہے۔''

''میں تمہیں ایک آدمی کا حلیہ بتارہا ہوں۔ اس شخص کو ابھی دو تین دن پہلے ہی تمہاری بیگم صاحب کے ساتھ بنگلے میں دیکھا گیا ہے۔ ذرا اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ تم اس بندے کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں۔'' اس نے سرمد کو مہاگرو کا وہ حلیہ بتایا جس حلیے میں ماہا اور [illegible] نے اسے راحیلہ کے گھر کے پورچ پر دیکھا تھا۔

''یہ تو چوہان صاحب کا حلیہ ہے۔ وہ بیگم صاحب کے خاص دوست ہیں اور اکثر ان سے ملنے آتے رہتے ہیں۔'' حلیہ سن کر سرمد نے جوش سے بتایا۔

''مجھے تمہارے ان چوہان صاحب سے ہی غرض ہے۔ اس شخص کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔ تمہاری بیگم صاحب اگر اس کی دوست ہے تو یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بیگم صاحب کے ذریعے چوہان نامی اس شخص تک پہنچ سکوں۔ اس سلسلے میں میرا منصوبہ یہ ہے کہ کسی طرح اس عورت کو اغوا کیا جائے اور پھر اس سے چوہان کا پتا اگلوایا جائے۔ تم کیونکہ اس کے ڈرائیور ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہی آتی جاتی ہے تو تمہاری مدد سے میں یہ کام بہت آسانی سے کرسکتا ہوں۔'' اس نے سرمد کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔

''اگر آپ کو چوہان کا پتا چاہیے تو اس کے لیے اتنے لمبے چوڑے بکھیڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دو بار بیگم صاحب کو چھوڑنے اس کے گھر گیا ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے

کہ وہ کہاں رہتا ہے۔'' سرمد نے اسے اطلاع فراہم کی تو وہ کھل اٹھا۔ قدرت خود ہی اس کے کام کو آسان بناتی جارہی تھی۔ اس نے سرمد سے چوہان کا پتا اچھی طرح سمجھ لیا۔ یہ ایک ایسے رہائشی پروجیکٹ کا پتا تھا جہاں لگژری اپارٹمنٹس تعمیر کیے گئے تھے۔

''تھینک یو سو مچ سرمد! تم نے میرا کام آسان کردیا۔ تم ذہین آدمی ہو اور یقیناً مجھے تم سے یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی بیوی کو بھی کچھ مت بتانا۔ عورتیں ہلکے پیٹ کی ہوتی ہیں، اگر اس کی زبان سے کچھ نکل گیا تو دشمن ہوشیار ہوجائیں گے۔'' اس نے سرمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

''میں سمجھتا ہوں سر! میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا جس سے میرے وطن کے دشمنوں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل سکے۔'' سرمد جذباتی لہجے میں بولا۔

''گڈ!'' شہریار نے اسے سراہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھائے۔ ''یہ رکھ لو۔ گھر جاتے ہوئے بیوی کے لیے کوئی تحفہ لے جانا اور اس سے کہنا کہ یہ تحفہ تمہارے دوست نے اس کے لیے دیا ہے۔''

''نہیں سر! میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ اگر میں نے آپ سے یہ روپے لے لیے تو مجھے لگے گا کہ میں نے اپنے وطن کی ایک معمولی سی خدمت کرنے کا بھی معاوضہ وصول کرلیا۔'' سرمد نے نوٹ لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔

''میں تمہیں معاوضہ نہیں دے رہا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ میری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔''

''آپ کی بڑی مہربانی سر لیکن اس موقع پر میں نے کوئی تحفہ بھی قبول کیا تو میرے اندر یہی احساس ابھرے گا کہ میں نے معاوضہ لیا ہے۔ اس لیے بس آپ رہنے دیں۔'' وہ کسی صورت اس سے رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شہریار نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ درحقیقت سرمد کے انکار نے اسے ایک طرح سے یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس نے کسی غلط آدمی پر اعتماد نہیں کیا ہے اور معاملہ راز میں ہی رہے گا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اس لیے مزید اصرار نہیں کروں گا۔'' اس نے سرمد سے مصافحہ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور ساتھ ہی اسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ مہاگرو، چوہان یا پھر کوئی اور شناخت رکھنے والے اس دشمن پر گرفت کرنے کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر اقدامات کرنے تھے۔ سرمد کو رخصت کرنے کے بعد وہ کیفے سے روانہ ہوا تو اس کا ذہن اسی سلسلے میں منصوبہ بندی کررہا تھا۔ پیچھے میز پر کافی کی وہ پیالیاں ان چھوئی ہی رکھی رہ گئی تھیں جو اس نے سرمد سے گفتگو کے دوران آرڈر کی تھیں۔ گفتگو کی گمبھیرتا میں ان دونوں ہی کو کافی پینے کا خیال نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے.... آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں؟''

کشور ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر آفتاب کے پاس آکر بیٹھنے کے خیال سے کمرے میں آئی تو اسے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ نماز کے لیے دوسرے کمرے میں جانے سے قبل تو وہ اسے بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئی تھی۔ نئے فلیٹ میں یہ ان کا پہلا دن تھا۔ رات کو تو وہ کافی دیر سے وہاں پہنچے تھے پھر اسٹیٹ ایجنٹ سے کرائے اور ایڈوانس کے معاملات نمٹانے اور بے حد مختصر سامان کے ساتھ آمد کے سلسلے میں وضاحت پیش کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوگیا تھا۔ ایجنٹ کو رخصت کرنے کے بعد بھی دونوں ہی کو بہت دیر تک نیند نہیں آسکی۔ نتیجتاً ان کے دن کا آغاز اس وقت ہوا جب یقیناً لوگ اپنے گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہے ہوں گے۔ ان کے پاس کچن میں استعمال ہونے والا ساز وسامان اور کھانے پینے کی اشیا تو تھیں نہیں کہ کچھ پکایا جاسکتا۔ آفتاب نے بہت ضروری اشیا کی فہرست بنائی اور بلڈنگ کے چوکیدار کو وہ فہرست مع رقم دے کر اس سے یہ چیزیں منگوالیں۔ اپنی ٹانگ کی تکلیف اور بیوی کے پردے دار ہونے کے علاوہ شہر سے ناواقف ہونے کا عذر اس موقع پر ان کے کام آیا تھا۔ منگوائی جانے والی چیزوں میں پکا پکایا کھانا اور آج کا اخبار بھی شامل تھا۔ چونکہ انہوں نے رات کے کھانے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے کھانا اخبار سے پہلے توجہ کا حق دار ٹھہرا۔ کھانے کے بعد کشور تو نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی جبکہ آفتاب نے اخبار تھام لیا اور اب کشور واپس آئی تھی تو اخبار ایک طرف رکھا تھا اور آفتاب چہرے پر غم و غصہ لیے پریشان بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو زبان سے جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا۔ جلد ہی وہ دونوں خبریں کشور کی نظر میں بھی آگئیں جنہوں نے آفتاب کو اس کیفیت میں مبتلا کیا تھا۔

اخبار میں ان کی محسن خالہ کے گھر کے برباد ہونے کی خبر کے ساتھ ساتھ سینئر صحافی بابر رضا کے قتل کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ اسلام آباد سے شائع ہونے والا اخبار تھا لیکن بابر کے

http://pakfunplace.blogspot.com

صحافی ہونے کی وجہ سے اس کے قتل کی خبر کو نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ تفصیلات کے مطابق بابر رضا کو شام کے وقت دفتر سے نکلنے کے بعد اغوا کیا گیا تھا اور بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش رات گئے ایک کچرا گھر کے پاس پڑی ملی تھی جبکہ گاڑی ایک پُررونق شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑی پائی گئی تھی۔ گاڑی کے لاک کے ساتھ کی گئی گڑبڑ نے ہی پولیس کو اس امکان پر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ بابر کو شاپنگ سینٹر کے سامنے سے اغوا کیا گیا تھا۔

خبر کے مطابق پولیس اغوا اور قتل کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ مجرموں تک پہنچا جا سکے۔ دوسری طرف خالہ کے گھر ہونے والے حادثے کو ڈکیتی کی ناکام واردات قرار دیا جا رہا تھا جو اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ عین وقت پر خالہ کا بیٹا بدر گھر پہنچ گیا تھا۔ اہلِ محلہ کے مطابق بدر جس وقت گھر پہنچا، نشے میں تھا اور شاید اسی وجہ سے گھر میں پہلے سے موجود ڈاکوؤں سے بھڑنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ڈاکوؤں نے مشتعل ہو کر اسے گولی ماری اور خود فرار ہو گئے۔ خالہ بے چاری بیٹے کی موت کا صدمہ نہ سہار سکیں اور ہارٹ فیل کا شکار ہو کر موقع پر ہی چل بسیں۔

یہ دونوں خبریں اخبار میں الگ الگ جگہ پر شائع ہوئی تھیں اور کسی عام قاری کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں خبروں کے درمیان کوئی ربط موجود ہے لیکن کشور نے اس ربط کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے باپ کے گماشتے کسی طرح بابر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تشدد کے ذریعے بابر سے ان دونوں کا پتا اگلوایا پھر اسے قتل کر کے رات گئے خالہ کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ وہ تو ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے ورنہ بے خبری میں مارے جاتے۔ اب بھی اگر وہ بچ گئے تھے تو اپنی خوش قسمتی کے احساس سے زیادہ اپنے محسنوں کی موت کا ملال دل پر حاوی تھا اور دل گہری اداسی میں ڈوب گیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ بیٹھے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے۔ صرف کشور کے ہونٹوں سے نکلنے والی سسکیاں تھیں جو کمرے کے خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ورنہ آفتاب کا تو یہ حال تھا کہ وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ جب کشور کی سسکیاں زیادہ ہی تیز ہو گئیں تو اس کے ساکت وجود میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے کشور کو مزید بکھیر دیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ جو لوگ مرے، ان سے احسان کا تعلق تو تھا ہی لیکن خالہ تو ایک ایسی ہستی تھیں جن کے وجود میں اس نے ممتا کا احساس پایا تھا اور اس چند روز ممتا کے کھو جانے پر وہ بُری طرح دل گرفتہ تھی۔

"بس کریں۔ اس طرح تو آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آپ کی جو حالت ہے، اس میں آپ کو پُرسکون رہنے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے لیکن حالات مسلسل ایسے ہیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی آپ کو یہ دونوں چیزیں مہیا نہیں کر پا رہا ہوں۔" آفتاب اسے سمجھاتے ہوئے خود بھی بڑا افسردہ تھا۔

"اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے اور یہاں لوگ اتنے بے درد کس لیے ہیں کہ دو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ من پسند زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے؟ میں نے اباجی کی حویلی، ان کی دولت و جائداد سمیت سب کچھ چھوڑ دیا ہے تو پھر وہ کیوں میرا پیچھا چھوڑ کر مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیتے؟ کیوں ان کے گرگے ہر جگہ میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں؟" وہ ایسے سوالات کر رہی تھی جن کا جواب مبہم نہیں تھا اور وہ خود بھی بخوبی جانتی تھی۔ دنیا میں ہر ظلم اور زیادتی کے پیچھے صرف اور صرف فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ خس و خاشاک سے بھی کم تر حیثیت رکھنے والا انسان ذرا سا اقتدار اور اختیار پا کر خود کو کل کائنات کا مالک سمجھنے لگتا ہے اور پھر اس زعم میں وہ وہ حرکتیں کرتا ہے جو اسے زیب نہیں دیتیں۔

"خود کو سنبھالیں کشور! ابھی حالات ہمارے لیے ناموافق ہیں لیکن یہ حالات سدا ایسے ہی نہیں رہیں گے۔ اللہ نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا جب ہم اس دربدری اور خوف کی زندگی سے آزاد ہو کر کہیں کسی جگہ سکون سے رہ سکیں گے۔" وہ اسے وہی خواب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا جن سے وہ ہمیشہ بہل جاتی تھی۔

"معلوم نہیں مجھے قبر سے باہر سکون کا وہ دن کبھی نصیب ہو گا بھی یا نہیں۔... لیکن میں سچ کہوں آفتاب! میں اس دنیا میں بہت زیادہ نہیں لیکن اتنا ضرور جینا چاہتی ہوں کہ ہمارے پیار کی نشانی آپ کو دے سکوں۔ میں ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ بہت خوف زدہ اور مایوس تھی۔

"پھر وہی مایوسی کی باتیں؟ شاید پہلے بھی ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ ایسی باتیں آئندہ نہیں ہوں گی۔" آفتاب نے خفگی کا مظاہرہ کیا۔

"میں کیا کروں؟ میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتی لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں۔" وہ کسی معصوم بچے کی سی بے بسی

بولی تو آفتاب نے بے اختیار اسے چوم لیا اور بولا۔

"میری جان! حالات بھی سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ہمارے حالات بھی بدلیں گے اور ہم بھی انشاء اللہ ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔"

"سچ؟" کشور نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل سچ۔ آپ میرا یقین کریں۔" آفتاب نے اسے یقین دلایا تو وہ گویا مطمئن ہو کر اس کی گود میں سر رکھے وہیں فرش پر دراز ہو گئی اور شاید کوئی نیا خواب بُننے لگی لیکن اسے یہ تسلی دینے والا آفتاب خود کہاں مطمئن تھا۔ اسے یاد تھا کہ خالہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے کشور ان کے نام ایک رقعہ لکھ کر آئی تھی۔ وہ رقعہ چودھری کے آدمیوں کے ہاتھ بھی لگا ہوگا۔ یہ کوئی امکان سے باہر کی بات نہیں تھی اور اس رقعے کو پڑھ کر نہ صرف اس کی اور کشور کی وہاں موجودگی کنفرم ہوئی ہوگی بلکہ یہ اندازہ بھی لگا لیا گیا ہوگا کہ وہ دونوں اسلام آباد کی حدود میں ہی موجود ہیں۔

چودھری جس نے نامعلوم کس طریقے سے بابر تک رسائی حاصل کر لی تھی، اسلام آباد میں اسے ڈھونڈنے پر تل جاتا تو یہ کوئی ناممکن تو نہیں تھا کہ اس فلیٹ تک بھی پہنچ جاتا۔ کوئی بھی ہوشیار شخص کسی اجنبی شہر میں باہر سے آئے ہوئے افراد کو ڈھونڈنے کے لیے ہوٹلوں وغیرہ کے بعد ان اسٹیٹ ایجنٹوں کی طرف ہی متوجہ ہوتا جن کے ذریعے جائداد کی خرید و فروخت اور کرائے پر چڑھائے جانے کے معاملات طے پاتے ہیں۔ وہ اور کشور جن مشکوک حالات میں اس فلیٹ میں آئے تھے، اس سے ان کا اسٹیٹ ایجنٹ پہلے ہی چونکا ہوا تھا اور بظاہر اس نے آفتاب کا یہ بہانہ قبول کر لیا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی جلدی میں مختصر سامان کے ساتھ وہاں آ گئے ہیں اور ان کا دیگر سامان ایک ہفتے بعد پہنچے گا لیکن حقیقت میں تو وہ مطمئن نہیں ہو گا اور کسی کے معلوم کرنے پر فوراً اگل دے گا کہ ایک مشکوک جوڑا فلاں فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سے آگے کی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو، اس فلیٹ کو چھوڑ دیں۔ ایڈوانس میں دی ہوئی بھاری رقم کی وجہ سے اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی لیکن وہ کچھ رقم کی قربانی دے کر کسی معقول بہانے کے ساتھ رقم نکلوا سکتا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کشور کے ساتھ کسی چھوٹے سے گمنام گاؤں یا قصبے میں پڑاؤ ڈال دیتا۔ اس کے لکھنے لکھانے کا کام تو کہیں بھی رہ کر جاری رہ سکتا تھا۔

اپنے ذہن میں یہ ساری منصوبہ بندی کرنے کے بعد اس

حساب دانی

ایک بڑے میاں ہر اتوار کو اپنے پوتے کے ساتھ گرجا گھر جاتے اور پادری کے وعظ کے دوران میں سو جاتے۔ ایک روز پادری نے پوتے سے کہا۔

"بیٹے! میں تمہیں دو ڈالر انعام دوں گا۔ تم اپنے دادا جان کو میرے وعظ کے دوران میں سونے نہ دیا کرو۔"

بچہ بڑی خوشی سے راضی ہو گیا مگر اگلے ہفتے بڑے میاں پھر زور شور سے خراٹے لے رہے تھے۔ وعظ کے بعد پادری نے غصے میں پوتے سے کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہیں دو ڈالر دوں گا، تم دادا جان کو سونے نہ دینا۔"

"جی جناب! مگر دادا جان نے مجھے تین ڈالر دیے تھے اور کہا تھا کہ مجھے جگانا نہیں۔"

نے اپنی گود میں سر رکھے آنکھیں موند کر لیٹی کشور کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور نرمی سے اس کے نقوش کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھونے لگا۔ اس عورت کی محبت میں وہ بے شک اپنے مقصدِ حیات سے دور ہٹ کر جینے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن سچ یہ تھا کہ اسی عورت نے اسے محبت کی اس شدت سے آشنا کروایا تھا کہ اسے اکثر خود پر رشک آنے لگا تھا۔ وہ لوگ جنہیں کوئی اپنا سب کچھ مان کر خود سے بڑھ کر چاہے، کم خوش قسمت تو نہیں ہوتے اور آفتاب کو بہرحال اپنی خوش قسمتی کا یقین تھا۔

☆☆☆

ابھی صبح کا اجالا پوری طرح سے پھیلا نہیں تھا اور مناظر کو صبح دم گرنے والی دھند نے اپنی لپیٹ میں لے کر قدرے چھپا

http://pakistanipoint.blogspot.com

رکھا تھا۔ اتنی صبح بس چند مخصوص لوگ ہی تھے جو راستے پر سے گزرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سڑک پر کوئی گاڑی بھی بہت وقفے کے بعد نمودار ہوتی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں دھند کی چادر کو چیرتی ہوئی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوجاتی تھیں۔ اس دھندلی صبح میں ایک کالا بھجنگ جوڑا فٹ پاتھ پر پیدل چلا جارہا تھا۔ عورت دبلی پتلی اور مناسب قامت کی تھی اور اس نے اپنے جسم پر ایک پرانی سی سوتی ساڑی لپیٹ رکھی تھی۔ ساڑی کا پلو اس کے سر پر تھا جس نے اس کا آدھا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے پشت پر سے دیکھتا تو اس کی متناسب جسامت پر بھی ساڑی کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن اسی شخص کو سامنے سے اس عورت کو دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی۔ بے تحاشا سیاہ رنگت نے اس کے پورے وجود کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر ڈالنے کے بعد دوسری کی خواہش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ چلتا اسی جیسی رنگت والا مرد لمبے قد کا مالک تھا۔ اس نے بے حد پرانی جینز کے ساتھ اس سے بھی زیادہ گھسی ہوئی سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ٹی شرٹ کی ہاف آستینوں سے جھانکتے اس کے بازوؤں پر کہاں آستینیں ختم ہوجاتی ہیں۔ جسامت اس کی بھی البتہ بہت شاندار تھی اور دیکھنے والے برملا کہہ سکتے تھے کہ وہ یا تو باقاعدگی سے ورزش کرنے کا عادی ہے یا پھر کوئی ایسا مشقت کا کام کرتا ہے جس کے باعث اس کے جسم پر کہیں ذرا بھی اضافی گوشت نہیں چڑھ پاتا۔

"تم نے پوزیشن کو پوری طرح سمجھ لیا ہے نا؟ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟" فٹ پاتھ پر سیدھے چلتے ہوئے اس نے اپنی ہم قدم عورت سے سوال کیا۔

"میں سب سمجھ گئی ہوں اور مجھے ڈر بھی نہیں لگ رہا۔" ساڑی کے پلو کے اندر سے خوب صورت اور نرم آواز ابھری۔

"اگر تمہیں لگے کہ گڑبڑ ہے اور پوزیشن تمہارے ہاتھ سے نکل رہی ہے تو بلادریغ گولی چلا دینا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔ میرا دیا ہوا پسٹل تم نے احتیاط سے اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہے نا؟" ان کی گفتگو اور انداز کسی بھی طرح ان کے موجودہ حلیے سے میل نہیں کھا رہے تھے اور حقیقت بھی یہ تھی کہ ان کا یہ حلیہ دراصل بہروپ تھا۔ وہ ماہ بانو اور شہریار عادل تھے جو ساتھ ساتھ چلتے فلک سٹی کی طرف جارہے تھے۔ فلک سٹی کے بلاک بی میں سیکنڈ فلور پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں سرمدی فراہم کردہ معلومات کے مطابق مہاگرو، چوہان کے نام سے رہائش پذیر تھا۔ شہریار نے اپنے طور پر ان معلومات کی تصدیق کرلی تھی اور ان معلومات کی روشنی میں ہی اس نے ایک منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس کا کل کا سارا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ ماہ بانو کو بھی اپنی مدد کے لیے بلانا پڑا تھا لیکن کچھ پریشان تھا کہ جانے یہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی صحیح طریقے سے اپنا کردار ادا کر بھی سکے گی یا نہیں۔ وہ اسے کوئی نقصان پہنچنے کے خیال سے بھی ڈر رہا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ یہاں اس شہر میں ماہ بانو سے بڑھ کر کسی اور پر اعتماد بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ماہ بانو نے اس کے بنائے ہوئے منصوبے میں شامل ہونے کے لیے ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر بلا جھجک ہامی بھرلی تھی اور اب اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے شک اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن وہ شہریار کے سامنے اپنی اس کیفیت کو ظاہر کرنے سے مکمل گریزاں تھی۔

"آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک خطرناک مجرم اور قاتل کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑی تو مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔" اس نے اپنی طرف سے شہریار کو اطمینان دلایا۔

"گڈ..... ہم جو کام کرنے جارہے ہیں اس کی کامیابی کے لیے اسی اسپرٹ کی ضرورت ہے لیکن تم اس بات کو دھیان میں رکھنا کہ تمہاری جان کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے اس لیے بلاوجہ خود کو خطرے میں مت ڈالنا اور میری ہدایت پر عمل کرنا۔" مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ادا کیے گئے ان الفاظ میں اگرچہ کسی جذبے کی آمیزش کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا پھر بھی ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھا اور یہ اندازہ ہونے کے باوجود کہ شہریار یہ الفاظ اپنے کسی بھی ساتھی کے لیے ادا کرسکتا تھا، اس نے خود کو کچھ دیر کے لیے خوش فہمی میں مبتلا رکھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں فلک سٹی کے مین گیٹ تک جا پہنچے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں سرتاپا دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"یہ روپ وتی ہے۔ پاروتی کی بہن اور میں اس کا گھر والا مہندر ہوں۔ پاروتی کی ساس کا کل شام دیہانت ہوگیا تھا اس لیے وہ اور اس کا پتی اس کا کریاکرم کرنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے پاروتی میری روپا سے کہہ گئی تھی کہ ہم پتی پتنی ایک دو دن کے لیے ان کے حصے کا کام سنبھال لیں اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ ہمیں آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟" لہجے میں زمانے بھر کی عاجزی سموتے ہوئے شہریار نے اپنی سوچی ہوئی کہانی سنائی اور آخر میں بڑی فکرمندی سے سوال بھی

کرڈالا۔

"دیر تو خیر نہیں ہوئی لیکن پاروتی اور کمار کو چاہیے تھا کہ جانے سے پہلے خود اطلاع دے جاتے۔" چوکیدار نے اعتراض کیا۔

"بات تمہاری بھی ٹھیک ہے بھائی لیکن ذرا سوچو کہ ایسی پریشانی میں کس کا دماغ کام ہی کہاں کرتا ہے جو ان پتی پتنی کو سوجھتا ہمیں بول گئے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں اندر جاکر کام کرنے دوگے یا ہم یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟ پر یاد رکھنا کہ ایسی صورت میں ان دونوں کی پگار میں سے کچھ نہیں کٹنا چاہیے۔ پہلے ہی کمار قرضے میں پھنسا ہوا ہے، پگار میں سے رقم کٹی تو اور مشکل میں پڑ جائے گا۔" اس بار اس نے لہجے کی عاجزی کو کم کرکے تھوڑا جارحانہ رویہ اپنالیا تھا۔

"میں کیوں روکوں گا تمہیں کام سے؟ تم شوق سے کام کرو۔ میں دوسرے چوکیدار کو بھیج کر چیک کروادوں گا کہ صحیح سے صفائی ہوئی ہے یا نہیں۔" چوکیدار نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا اور ایک سمت میں اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر اے بلاک کی سیڑھیوں کے نیچے جھاڑو وغیرہ اور دوسرا ضرورت کا سامان رکھا ہے۔ وہاں سے نکال لو اور کام ختم کرنے کے بعد جانے سے پہلے ساری چیزیں واپس جگہ پر رکھ دینا۔"

اس کی ہدایات پر سر ہلاتے ہوئے ماہ بانو اور شہریار خاموشی سے اشارہ کی ہوئی سمت میں بڑھ گئے۔ ذرا دیر بعد ان کے ہاتھوں میں بھاری جھاڑو..... اور کھجور کی ٹوکریوں کے علاوہ صفائی سے متعلق دوسرا سامان بھی نظر آرہا تھا۔ اتفاق سے چوہان کے اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شہریار نے جن کرداروں کا انتخاب کیا تھا، وہ یہاں خاکروب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بلڈنگ کے برآمدوں، سیڑھیوں اور کمپاؤنڈ کی زیادہ تر صفائی کمار خود کرتا تھا جبکہ اس کی پتنی پاروتی نے دو تین چھڑے چھانٹ مردوں کے گھروں کی صفائی کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان مردوں میں سے ہی ایک مرد چوہان بھی تھا جس کے اپارٹمنٹ کی پاروتی صبح سب سے پہلے صفائی کرتی تھی۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے لیے شہریار کو ان دونوں میاں بیوی کو اپنا مہمان بنانا پڑا تھا۔

کل جب وہ فلک سٹی کا جائزہ لینے آیا تھا تو اس نے اس خاکروب جوڑے کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس خاکروب جوڑے کا تو بلڈنگ کے ہر بلاک اور فلور پر آنا جانا ہوگا اور وہ تمام رہائشیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے..... تو کیوں نا انہیں چوہان نامی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس نے ان دونوں کا پیچھا کیا اور رقم کا لالچ دے کر ان سے چوہان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں جو کہ بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسے پتا چلا کہ پاروتی چوہان کے اپارٹمنٹ میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے اور علی الصباح سب سے پہلے وہیں جاتی ہے۔ پاروتی کے مطابق چوہان سحر خیز تھا اور اس کے پہنچنے سے بھی پہلے جاگ جاتا تھا۔ وہ جب تک صفائی ستھرائی کا کام نمٹاتی، چوہان لاؤنج کی کھڑکیاں کھولے ورزش اور یوگا وغیرہ میں مصروف رہتا۔ اس دوران کمار بھی بلاک کے دیگر اپارٹمنٹس سے کچرا اکٹھا کرتا اور سیڑھیوں کی صفائی کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا تھا۔ پاروتی چوہان کے اپارٹمنٹ کا کوڑا کرکٹ اس کے حوالے کرتی اور خود بھی اس کے ساتھ اگلے بلاک میں کام کرنے کے لیے چلی جاتی۔

شہریار نے جو میاں بیوی کا یہ معمول سنا تو فوری طور پر اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل پاگیا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پاروتی اور کمار اگلے دن اپنی ڈیوٹی پر نہ پہنچیں۔ وہ ان دونوں کو بہلا پھسلا کر زبیر کے بنگلے پر لے گیا اور انہیں مزید رقم کا لالچ دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اگلے دن ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ خاکروب جوڑا بے اولاد تھا اس لیے اسے انہیں بنگلے پر روکے رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ماہ بانو کو وہ خود اس کے ہاسٹل سے جاکر لے آیا تھا اور اسے تمام تفصیلات سمجھانے کے ساتھ اس کا حلیہ بدلنے میں بھی مدد دی تھی۔ اب وہ دونوں پاروتی کے بہن بہنوئی کے روپ میں فلک سٹی میں موجود تھے اور پاروتی اور اس کا شوہر کمار زبیر کے بنگلے میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی طرف سے تعاون کے وعدے کے باوجود شہریار نے احتیاطاً انہیں کھانے میں خواب آور دوا ملا کر کھلادی تھی اور انہیں کمرے میں لاک کرکے آیا تھا تاکہ وہ کسی پریشانی کا باعث نہ بن سکیں۔

"میں تمہارے چوہان کے اپارٹمنٹ میں جانے کے پانچ منٹ بعد ہی گھنٹی بجادوں گا۔ تم جلدی سے آکر دروازہ کھول دینا۔ اس کے بعد کی ساری پوزیشن کو میں خود سنبھال لوں گا۔" بلاک بی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ہدایت دی۔ اصل میں وہ چوہان یا مہاگرو کو اس کے اپارٹمنٹ کے اندر ہی گھیرنا چاہتا تھا اس لیے اسے ماہ بانو کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اپارٹمنٹ میں گھسنے میں آسانی ہوجاتی ورنہ وہ جانتا تھا کہ چوہان جیسے لوگ اتنے ہوشیار رہتے ہیں کہ کسی اجنبی کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

http://pakfunplace.blogspot.com

کہ چوہان کو نائیلون کی ڈوری کی مدد سے ایک کرسی سے باندھ رہا تھا، اس کی موجودگی کو محسوس کر کے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ اس وقت وہ ایک مختلف بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا جس کے چہرے سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ قدرے سفاکی بھی چھلک رہی تھی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد شہریار، چوہان کو باندھنے سے فارغ ہوا تو اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پتلا سا تیز دھار چاقو باہر نکال لیا۔ چاقو کی دھار کی چمک نے اس کے چہرے پر موجود سفاکی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا۔ اس کی نرم خوئی اور قانون پسندی کو پے در پے ملنے والی ناکامیوں اور ظالموں کی بالادستی نے وقتی طور پر سُلا دیا تھا اور پھر یہاں تو سامنے تھا بھی وہ شخص جس نے اس کی معصوم اور کم عمر بھتیجی شینا کو نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا۔ سجاد رانا کی موت کی ذمے داری بھی یقیناً اسی شخص پر عائد ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے بارے میں شک تھا کہ وہ ملک کا دشمن ہے جو یہاں رہ کر پڑوسی ملک کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے کسی رو رعایت سے کام لیے بغیر چاقو کی نوک چوہان کے رخسار پر رکھی اور تقریباً دو انچ لمبی ایک لکیر کھینچ دی۔ خون کی اس سرخ لکیر کے ابھرتے ہی چوہان نے ہلکی سی سسکاری لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" آنکھ کھلتے ہی اس نے بے خوفی سے شہریار سے سوال کیا۔

"سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔" شہریار اس کے زخمی رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے غرایا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ چوہان کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چوہان کے لمبے بالوں کی پونی ٹیل پکڑ کر اس کا منہ سیدھا کرتے ہوئے شہریار نے دریافت کیا۔

"چوہان خان۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور شہریار کے چہرے کو جانچتی ہوئی نظروں سے ٹٹولنے لگا۔ یک دم ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ اس نے سیاہی کے پیچھے چھپا اے سی شہریار عادل کا چہرہ شناخت کر لیا تھا۔

"اصل نام بتاؤ۔" شہریار نے جنون کے عالم میں پے در پے کئی مکّے اس کے منہ پر دے مارے۔ ان مکّوں نے چوہان کے کئی دانت توڑ ڈالے اور اس نے ابکائی لیتے ہوئے ان دانتوں کے ساتھ بہت سا خون بھی اگل ڈالا۔

"مجھے اپنا صحیح نام بتاؤ ورنہ میں تمہارے جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیڑ ڈالوں گا۔ اور ہاں، اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم را کے ایجنٹ ہو جس کے جرائم کی لسٹ اتنی لمبی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں جاتے ہی سیدھے پھانسی کے پھندے پر لٹکائے جاؤ گے۔" اس نے ضروری سمجھا کہ چوہان پر اس کی حیثیت واضح کر دے۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر! میں ایک پاکستانی شہری ہوں۔ تم چاہو تو میرا شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہو۔" اس نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کی آواز بہت عجیب سی نکل رہی تھی۔

"تمہاری مرضی۔ اگر تم میرے ہاتھوں اپنا حلیہ بگڑوانے پر ہی مصر ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" شہریار کو اس کا جواب پسند نہیں آیا اور اس نے چاقو کی نوک چوہان کے سر پر عین اس جگہ رکھ دی جہاں کچھ دیر قبل دیوار سے ٹکرا جانے کے باعث بڑا سا گومڑ بن گیا تھا۔ چاقو کی نوک کو اس مقام پر رکھنے کے بعد اس نے اسے گھمانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ نوک سوراخ بناتی ہوئی اندر اترنے لگی۔ بننے والے سوراخ سے خون نکل کر چوہان کے چہرے پر بہنے لگا۔ ابتدائی ایک ڈیڑھ منٹ تک اس نے ضبط سے کام لیا اور ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا لیکن پھر اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ شہریار نے اس کی چیخوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ چاقو کی نوک آدھے انچ سے زیادہ اندر جا چکی تھی اور وہ جس مستقل مزاجی سے یہ کام کر رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چاقو کا پھل دستے تک چوہان کے سر میں اسی پُراذیت طریقے سے اتارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوہان نے اس کا یہ جنون بھانپ لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"رک جاؤ..... تم جو کچھ پوچھو گے میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر شروع کرتے ہیں۔ تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ جہاں تمہاری زبان رکی، وہاں میرا ہاتھ چلنا شروع ہو جائے گا۔"

"پہلے مجھے پانی پلا دو۔" اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے فرمائش کی۔

"تم نے میری معصوم بھتیجی کو اپنی پتھر کی مورتی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے پانی پلایا تھا جو اپنے لیے پانی مانگ رہے ہو؟" شہریار اس کی فرمائش سن کر ایک بار

مشتعل ہو گیا اور پونی ٹیل سے پکڑ کر اس کے سر کو کئی جھٹکے دیے۔

"او کے..... مت پلاؤ پانی۔ جو پوچھنا ہے پوچھو۔" اپنے لیے کوئی رعایت نہ پا کر اس نے سپر ڈال دی اور نڈھال سے لہجے میں بولا۔

"نام؟" شہریار نے یک لفظی سوال کیا۔

"ورما۔"

"را کے لیے کب سے پاکستان میں کام کر رہے ہو؟"

"تقریباً تین سال سے۔"

"لاہور میں سیٹھ سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں خواجہ سراؤں کو جمع کر کے دیوی کے چرنوں میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو بھینٹ چڑھانے کا جو ڈراما کھیلا گیا اس کے پیچھے کیا مقصد تھا؟"

"میں نے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کی مدد سے ہندو خواجہ سراؤں کا ایک گروہ تشکیل دیا تھا۔ چند ایک کے سوا گروہ کے تمام افراد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے لیکن میں نے مہا گرو کی حیثیت سے ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ ہندو ہونے کے ناتے ان کی ساری وفاداریاں بھارت ماتا کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ میں ان کا مذہبی پیشوا بھی بنا ہوا تھا اور میں نے یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ اگر ہم دیوی ماں کے چرنوں میں پابندی سے ہر پورم ماشی کی رات ایک جوان کنیا کی بھینٹ چڑھائیں اور پرارتھنا کریں تو دیوی ماں اُن جیسے ادھورے وجودوں کو جنم دینا چھوڑ دے گی۔ اس طریقے سے وہ لوگ ذہنی طور پر میرے غلام بن گئے تھے اور میں جو کچھ کہتا تھا، اس پر عمل کرتے تھے۔ ان میں سے کئی خوب صورت خواجہ سراؤں نے میرے حکم پر کئی شوقین مزاج سرکاری عہدے داروں کو اپنے دام میں گرفتار کر کے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں لیکن پھر میری جاری کردہ رسم ہی نے میرے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔

"خواجہ سراؤں کا ایک گروہ انجانے میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو اغوا کر کے لے آیا۔ میں نے بھی لڑکی کا بائیو ڈیٹا جاننے کی کوشش نہیں کی، نتیجے میں سجاد رانا نے پیچھا پکڑ لیا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے خود اپنے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑا اور میں گروہ کو منتشر کر کے بنا بنایا سیٹ اپ ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔" وہ جانتا تھا کہ کسی عدالت کے سامنے اقبالی بیان نہیں دے رہا ہے جو اس بیان کی بنیاد پر اسے کوئی سزا سنا دی جائے۔ یہ بیان ایک ایسے شخص کے سامنے دیا جا رہا تھا جو پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا اور زبان بند رکھنے کی صورت میں فوری طور پر بھی اس کی جان لے سکتا تھا، چنانچہ اپنے لیے مہلت حاصل کرنے کے لیے بولتا جا رہا تھا۔ بعد میں جب اسے کسی حکومتی ادارے کی تحویل میں دیا جاتا تو وہ ہر بات سے مکر جاتا۔ لمبی عدالتی کارروائیوں اور پیشیوں کے دوران کوئی ایسا موقع بھی مل سکتا تھا جب وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا..... لیکن ابھی وہ اپنی زبان بند رکھ کر اس جنون میں مبتلا شخص کے اشتعال کو اتنا بڑھانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار دے۔ بھارت ماتا کے لیے جان وار دینے کا سبق ان لوگوں نے صرف اپنے نیچے کے کارکنوں کو پڑھایا تھا۔ خود اسے اور اس کے لیول کے دوسرے لوگوں کو اپنی جانیں بہت عزیز تھیں چنانچہ وہ سب سے پہلے خود کو ہی بچانے کی کوشش کرتے تھے اور خود کو اور دوسروں کو بہلانے کے لیے یہ دلیل ہوتی تھی کہ ہم زندہ رہیں گے تو اپنی دھرتی کے لیے بہت کچھ کر سکیں گے۔

"ڈی آئی جی سجاد رانا کو بھی تم نے ہی قتل کروایا تھا؟" ورما کا اعترافی بیان سنتے ہی شہریار نے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سجاد رانا کا قتل ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن وہ ہماری راہ پر اس طرح لگ گیا تھا کہ اگر ہم اس سے اپنی جان نہ چھڑاتے تو وہ ہمیں تباہ کر دیتا اس لیے ہمیں مجبوراً اس کا پتا صاف کرنا پڑا۔" ورما نہیں جانتا تھا کہ اس کا ہر اعتراف شہریار کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز کرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اس یقین کی بنیاد پر کہ بالآخر اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے گا، اعتراف پر اعتراف کیے جا رہا تھا۔

"اپنے ساتھیوں کے نام اور ان کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔" اس کے تسلسل سے ہم اور ہمیں کا صیغہ استعمال کرنے پر شہریار نے اس سے فرمائش کر ڈالی لیکن اس سوال کا جواب آسانی سے دے دینا ورما کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے یک دم ہی ہونٹ بھینچ لیے۔

"بتاؤ، ورنہ میں تمہارا قیمہ کر ڈالوں گا۔" اس کی خاموشی شہریار کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ چپ ہوا تو اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور اس نے پے در پے کئی وار ورما کے دونوں بازوؤں پر کر ڈالے۔ یہ وار کھا کر ورما کسی ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ اس کی یہ چیخیں ہی تھیں جو ماہ بانو کو دوسرے کمرے سے یہاں لے آئیں۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئیں۔ خون میں نہایا ہوا ورما اور درندگی پر اترا شہریار اس کی نرم خو طبیعت کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ ایک پل کے لیے اس منظر کو دیکھ کر ٹھٹکنے کے بعد وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور شہریار کے ورما کے جسم پر گھاؤ لگانے کے لیے ایک بار پھر بلند ہوتے ہاتھ کو

http://pakistanipoint.blogspot.com

اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"نہیں سر! ایسا مت کریں۔ یہ بہت زخمی ہو گیا ہے۔ اب اور زخم لگے تو مر جائے گا۔" وہ بولتے بولتے شہریار سے چمٹ گئی۔ اس کے بدن کے لمس نے شہریار کے اندر حیرت انگیز تبدیلی رونما کی اور اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ایک نظر خود سے لپٹ کر کانپتی ہوئی ماہ بانو پر ڈالی اور اس کے گرد بازو کا گھیرا بنا کر ورما سے دور ہٹ گیا۔

☆☆☆

"میں تمہیں کیا کہوں جوان.... میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ ایک طرف دیکھا جائے تو تم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن حقیقت میں تم نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے قانون کو ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ میں نے کتنی مشکل سے اس سچویشن کو ہینڈل کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔" آئی جی مختار مراد کے لہجے میں اس کے لیے بیک وقت شفقت اور ناراضی دونوں موجود تھیں۔ ان کا شکوہ سن کر وہ ہنس پڑا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ اس سچویشن کو ہینڈل کر لیں گے اسی لیے تو میں نے آپ کو کال کی تھی۔ ورنہ وہ خبیث تو گیا تھا میرے ہاتھ سے۔"

"اب بھی اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے جسم سے خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود ڈاکٹرز ابھی تک حتمی طور پر اس کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔" مختار مراد نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ایسے ڈھیٹ لوگ اتنی آسانی سے دنیا کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بچ جائے گا۔ نہیں بھی بچا تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے جو اعترافات کروانے تھے، وہ اس سلوک کے بغیر کر ہی نہیں سکتا تھا جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔" شہریار کا لہجہ بے لچک تھا۔ ورما سے اس کی نفرت کے پیچھے کوئی ایک وجہ نہیں تھی اور تمام ہی وجوہات ایسی تھیں جن کے بدلے وہ اس کی جان لینا درست سمجھتا تھا۔ وہ تو ماہ بانو عین وقت پر اس کے سامنے آگئی اور اسے اپنا ہاتھ روکنا پڑا ورنہ ورما کی جان تو چلی ہی جاتی۔

ماہ بانو نے اسے روکا تو وہ اپنی جنونی کیفیت سے باہر آیا اور مختار مراد کو فون کر کے مختصراً ساری صورت حال بتائی۔ مختار مراد کے لیے لاہور میں بیٹھ کر کراچی میں درپیش اس صورت حال کو ہینڈل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر فون گھمائے اور کراچی کی انتظامیہ حرکت میں آگئی۔ زخمی ورما کو اس کے اپارٹمنٹ سے ایمبولینس میں اسپتال منتقل کرنے سے لے کر اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے اور کلفٹن کے بنگلے سے اس کی ساتھی عورت کو گرفتار کرنے تک کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے تھے۔ شہریار اور ماہ بانو پولیس کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔ اس نے ماہ بانو کا حلیہ درست کروا کر پہلے اسے اس کے ہاسٹل پہنچایا پھر زبیر کے بنگلے میں موجود پاروتی اور اس کے شوہر کمار کو انعام و اکرام سے نوازنے کے بعد اس دھمکی سمیت کہ جو کچھ ہوا وہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی.... اور اگر ان دونوں میاں بیوی نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ بھی دھر لیے جائیں گے، رخصت کر دیا۔

ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ کراچی سے لاہور جانے والی پہلی فلائٹ کے ذریعے روانہ ہو گیا۔ زبیر کو بھی اس نے فون پر اپنے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے ایئرپورٹ پہنچنے کا کہا تھا۔ بے چارہ زبیر بھاگم بھاگ ایئرپورٹ پہنچا تو اس نے اسے اس کے بنگلے کی چابیاں تھمائیں اور آئندہ کبھی فرصت میں اس کے گھر آنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر بھی اس نے مشکل سے تین چار گھنٹے لیاقت رانا کی کوٹھی پر گزارے اور پھر وہاں سے نورکوٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ نتیجتاً اگلی صبح وہ ٹھیک وقت پر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے دفتر میں موجود تھا۔ مختار مراد کی یہ کال اسے دفتر میں ہی موصول ہوئی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے کل کے مقابلے میں آج بہت پُرسکون ہو کر ان سے بات کر رہا تھا۔

"میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں کہ ورما سے تم نے جو اعترافات کروائے، وہ اسی سلوک کے ساتھ ممکن تھا...... لیکن تمہارے سامنے کیے گئے اعترافات کی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک ورما ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ سب کچھ قبول نہیں کر لیتا۔ البتہ اس کے اپارٹمنٹ سے ملنے والے دستاویزی ثبوتوں اور اس کی گرفتار ہونے والی ساتھی کی وجہ سے ہمیں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ان ثبوتوں کی روشنی میں ہی ورما پر کافی مضبوط کیس بنے گا۔ میرے محکمے کے لوگ بھی اگر میری تاویلیں قبول کر رہے ہیں تو اس لیے کہ ملنے والی دستاویزات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ورما مبینہ طور پر بھارتی جاسوس ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے تمہارا اقدام پسند نہیں آیا۔" انہوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔

"حالانکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میری وجہ سے آپ کے محکمے کی ساکھ ہی تھوڑی سی بہتر ہو گئی۔ سنا ہے آپ کا وہ آفیسر تو بہت خوش ہے جسے میری جگہ اس کارنامے کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے۔" شہریار نے لطیف سے لہجے میں ان پر طنز کیا۔

"وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ تم نے خود اپنے لیے کتنا بڑا رسک لیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ سب کچھ تمہارے طے کردہ منصوبے کے مطابق ہی ہوتا۔ بازی الٹ بھی سکتی تھی۔ وہاں کراچی میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہمیں خبر بھی نہ ہو پاتی۔ تم تو جانے سے پہلے کسی کو ذرا سی ہوا بھی نہیں لگا کر گئے تھے۔ ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر پاتے تو یہی کہ تمہاری لاش کھوج نکالتے۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے ہمیں کون ملتا؟ اور مل بھی جاتا تو تمہیں کھونے کے بعد ہمیں کیا حاصل ہوتا؟ ہم بوڑھوں کے حال پر رحم کرو بیٹا! میں نے اور رانا نے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی اپنے بوڑھے شانوں پر دو جوان جنازوں کا بوجھ سہا ہے۔ ہم دونوں کے خاندان ٹوٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس واحد تم بچے ہو اور ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔" مختار مراد کے الفاظ اور لہجے نے اسے اس جذباتی بحران کا احساس دلایا جس سے وہ گزر رہے تھے۔ وہ اس کی وجہ اوف سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی شرمندہ ہو گیا۔

"آئی ایم سوری انکل! آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا۔" اسے بجائے یہ دلیل دینے کے کہ جو رات قبر کے اندر لکھی ہے، وہ کسی صورت باہر نہیں گزاری جا سکتی.... اس نے سیدھے سیدھے معذرت کر لینا مناسب سمجھا۔ یہ پسپائی مختار مراد کی باتوں سے قائل ہو کر نہیں اختیار کی گئی تھی بلکہ اس محبت کے خراج تحسین کی تھی جو بہرحال اس کے دل میں بہت قابل احترام تھی۔

"میں نے تمہاری بات پر بالکل بھی یقین نہیں کیا کیونکہ ایسے لیکچرز میں پہلے بھی تمہیں بہت دے چکا ہوں اور ان کا اثر بھی میں نے دیکھ رکھا ہے۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو میری پوسٹ پر کام کرنے والے کسی شخص سے ایسی جذباتیت کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی.... لیکن سچ یہ ہے کہ بہرحال ہم پولیس اور آرمی وغیرہ کے لوگ بھی آخرکار ہوتے تو انسان ہی ہیں اور انسان جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا۔" اس کی اتنی فرماں برداری سے کی گئی معذرت کے جواب میں مختار مراد ہنس پڑا اور اس پر واضح کر دیا کہ بہرحال وہ اس سے بہت سینئر ہے اور اس کے اندر انسانوں کو پڑھ لینے کی صلاحیت اس سے کہیں زیادہ موجود ہے۔

"ٹھیک گاڈ کہ آپ نے میری بات پر یقین نہیں کیا ورنہ مجھے خوامخواہ وعدے کی پاسداری کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا پڑتا۔" اس کا موڈ تبدیل ہوتا محسوس کر کے وہ خود بھی ہنس پڑا اور یوں ان کے درمیان جاری گمبھیر گفتگو ہلکے پھلکے انداز پر ختم ہوئی۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے عبدالمنان کو اپنے دفتر میں کال کر لیا۔ اس سے اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے حالات کی رپورٹ بھی تو لینا ضروری تھا۔

"سب کچھ معمول پر رہا سر! تمام پروجیکٹس بارش سے متاثر ہونے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے جاری ہو چکے ہیں۔ پیر آباد کے اسکول کو بھی مرمت کے بعد اس لائق کر دیا گیا ہے کہ وہاں تدریسی سلسلہ جاری ہو سکے۔ مسز جوزف وہاں پڑھانا شروع بھی کر چکی ہیں۔ ان کے ساتھ فی الحال کوئی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی گئی البتہ آپ کے لیے ایس پی صاحب کی طرف سے ایک پیغام ملا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ ان کی ذاتی فرمائش پر ٹھنڈے دل سے اس آفر پر غور فرمائیں۔" عبدالمنان اس کے بلاوے پر اندر آیا اور اس کے حکم پر اسے مختصراً رپورٹ پیش کرنے لگا۔

"کیسی کون سی آفر لے کر آئے ہیں ایس پی صاحب میرے لیے؟" اس نے ٹیبل پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

میں

میں نے ہمیشہ تین نصیحتوں پر عمل کیا ہے اور مرنے سے پہلے یہی نصیحتیں اپنی اولاد کو کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی نصیحت یہ ہے کہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میرا مطلب ہے، زیادہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میری عمر تہتر سال چھ مہینے ہے اور میں پچھلے تہتر سال سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں مگر میں نے کبھی زیادہ سگریٹ نہیں پیے۔ ہمیشہ اعتدال سے کام لیا اور ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی سگریٹ پیا۔

دوسری نصیحت یہ ہے کہ عشق مت کرو یعنی زیادہ عشق مت کرو۔

تیسری نصیحت یہ ہے کہ شادی مت کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اعتدال سے کام لو اور میری طرح ایک وقت میں ایک ہی شادی پر اکتفا کرو۔

مائیکل ایس جانز ..... اسد، کراچی

http://pakfunplace.blogspot.com

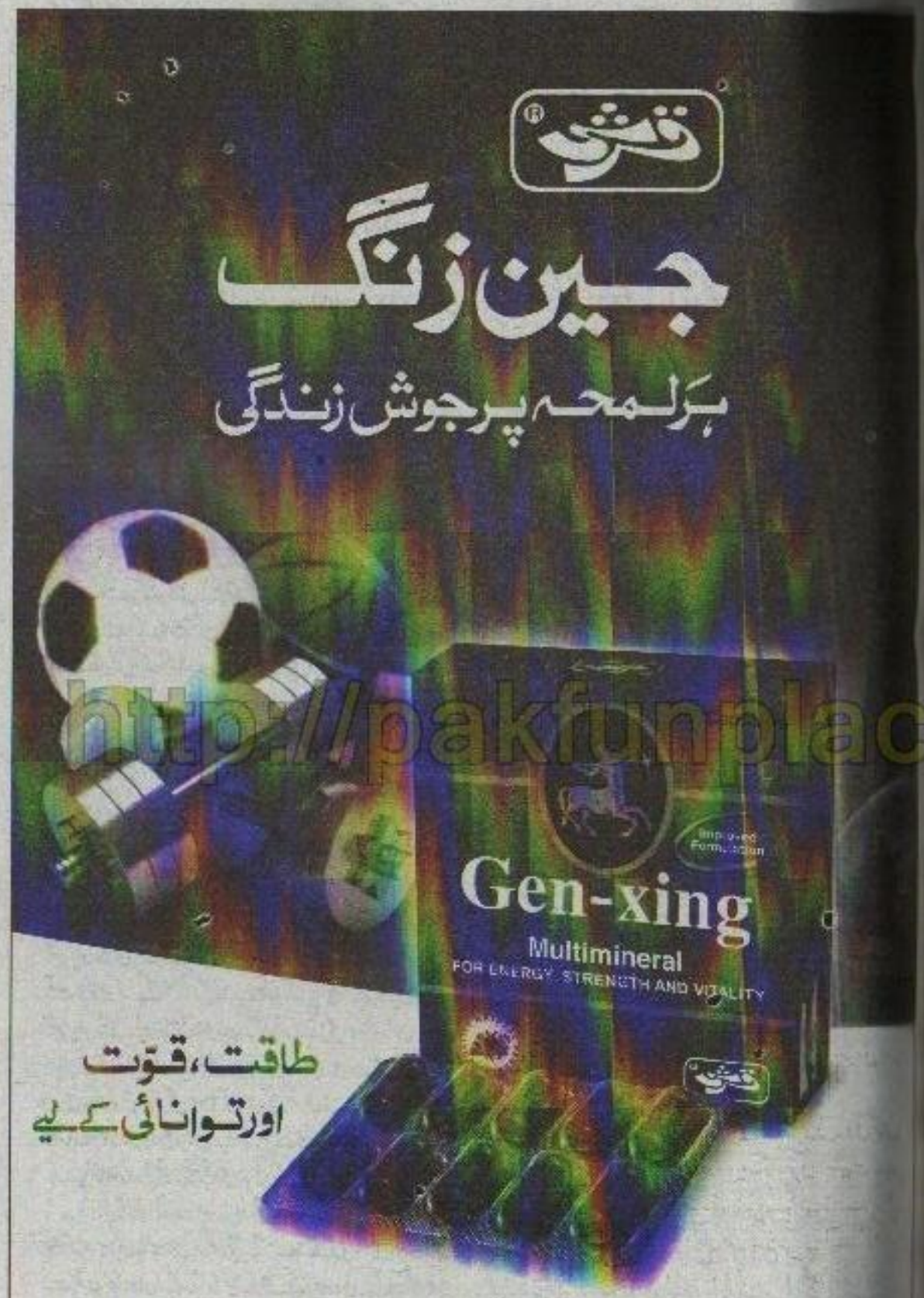

"ان کا کہنا ہے کہ اگر آپ اور چودھری صاحب چاہیں تو وہ عدالت سے باہر آپ دونوں کے درمیان صلح کروا کر کوئی سیٹل منٹ کروا سکتے ہیں۔ آپ چودھری صاحب پر نجیب اور دوسرے ٹیچرز کے قتل کے کیس سے دستبردار ہو جائیں، جواب میں چودھری صاحب بھی آپ پر کیے گئے مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ بقول ایس پی صاحب، جان تو دونوں طرف کے کیسز میں نہیں ہے۔ آپ دونوں ہی ایک دوسرے کو عدالت میں مجرم ثابت نہیں کر سکیں گے اس لیے بیکار کی کھینچا تانی سے کیا حاصل؟ بہتر ہے آپس میں صلح کر لیں اور شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے کی مثال قائم کریں۔" عبدالمنان نے ذرا سا مسکراتے ہوئے اسے ایس پی کا پیغام سنایا۔

"مگر یہ کیسے طے ہوگا کہ ہم دونوں میں سے شیر کون ہے اور بکری کون؟" ورما کی گرفتاری نے اس کے موڈ پر بڑا ہی خوش گوار اثر ڈالا تھا اس لیے اس پیغام کو سن کر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر بزلہ سنجی سے سوال کیا۔

"سوری سر! مجھے یہ اتنا ٹیکنیکل سوال پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ اگر آپ کہیں تو ابھی ایس پی صاحب سے وضاحت طلب کر لی جائے؟" اس کا موڈ بھانپ کر عبدالمنان نے خود بھی شوخ انداز اختیار کیا۔

"نہیں، رہنے دو۔ شیر بھی کسی سے اپنی شناخت پوچھتا ہے نہ بیان کرتا ہے۔ اس کا عمل خود بتا دیتا ہے کہ وہ شیر ہے۔ تم ایس پی صاحب کو جوابی پیغام بھجوا دو کہ کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ بے شک اس کیس کا فیصلہ عدالت میں نہ ہو سکے لیکن یہ کیس حق و باطل کی جنگ کی علامت کے طور پر کھلا رہے گا۔" ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"اوکے سر! میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔" عبدالمنان نے بھی فوراً سنجیدگی اختیار کر لی۔

"ویسے آج کل اپنے چودھری صاحب کی مصروفیات کیا ہیں؟ پچھلے دنوں ان کے جو نقصانات ہوئے، ان کے دکھ سے تو وہ باہر نکل آئے ہوں گے؟" ایک فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

"آپ کی غیر موجودگی میں چودھری صاحب کی تالیف قلب کے لیے بڑا شاندار انتظام ہو گیا۔ ان کی کوئی امریکن دوست ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ میں نے خاتون کو دیکھا تو نہیں لیکن ان کے حسن کی شہرت بہت سنی۔ معلوم نہیں کہ وہ واقعی حسین ہیں یا ہمارے ہاں کے لوگوں کی عادت کے مطابق ہر گوری میم کی طرح حسین لگی ہیں۔ بہر حال، سنا ہے کہ چودھری صاحب خاتون کے ساتھ خوب گھومے پھرے، انہیں جنگل میں شکار کے لیے بھی لے جایا گیا۔ شکار کس کا ہوا، یہ اطلاع نہیں مل سکی۔ البتہ خاتون کے گاؤں میں ذوق و شوق سے گھومنے پھرنے کی اطلاعات ملتی رہیں۔ مسز جوزف کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی ہے کہ چودھری صاحب کی مہمان لیڈی گاؤں کے اسکول بھی تشریف لے گئی تھیں جہاں انہوں نے اسکول کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے مسز جوزف کو اچھے خاصے ڈالرز امداد کی مد میں دیے ہیں جو انہوں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہاں سے کوئی جائے تو اس کے حوالے کیے جائیں یا پھر یہاں سے جو ہدایات ملیں اس کے مطابق خرچ ہوں۔" عبدالمنان نے اسے بتایا۔

"کاش میں چودھری کو ان دونوں عورتوں کی مثال دے کر کوئی اچھی سی نصیحت کر سکتا۔ وہ غیر مذہب اور قوم کی ہو کر یہاں کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتی ہیں جب ہی تو ایک اسکول میں پڑھانے کھڑی ہے اور دوسری امداد دے گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ چودھری صاحب پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ انہیں دولت اور اختیار کے ساتھ ساتھ فرعونی صفات بھی اپنے اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور وہ جب تک اپنے عمل پر قائم رہیں گے، جب تک کوئی موسیٰ کا وارث بن کر ان کے سامنے ڈٹ کر نہیں کھڑا ہوگا۔" اس نے افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا جسے سن کر عبدالمنان کچھ بولا نہیں لیکن اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ضرور ڈالی۔ روشن پیشانی اور بے ریا آنکھوں والے اپنے اس باس کو وہ کسی سے بھی تشبیہ نہ دے سکا۔

☆☆☆

"پھر آج تم میرے ساتھ گھر چل رہی ہو نا؟ میں نے بھائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر ہی رہیں، مجھے اور صبرین کو آپ سے کچھ اہم ٹاپکس سمجھنے ہیں۔ محترم کچھ نخروں سے مانے لیکن مان گئے۔ آخر سامنے بھی تو میں ہی تھی۔" اس کے برابر میں بیٹھ کر سوال کرتے ہوئے راحیلہ خود ہی اپنے کارنامے پر اترائی اور فرضی کالر کھڑے کرنے لگی۔

"اگر وہ مصروف تھے تو تمہیں ان کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی کتنی ٹف روٹین ہوگی۔ ایسے میں ان کے آف ڈے پر ہم زبردستی ان کے سر پر مسلط ہو جائیں تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔" ڈاکٹر طارق کے مشکل سے راضی ہونے کا سن کر وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔ اصل میں وہ جس روز شہریار کے کہنے پر کالج کی چھٹی کر کے اس کے ساتھ ورما کے اپارٹمنٹ پر گئی تھی، اس روز اس کے کئی اہم لیکچرز مس ہو گئے تھے۔ اس نے اگلے روز راحیلہ سے

http://pakfunplace.blogspot.com

ان لیکچرز کے نوٹس لے لیے اور اس سے مشکل پوائنٹس سمجھانے کی درخواست بھی کر ڈالی۔ اب معلوم نہیں راحیلہ کے سمجھانے میں کچھ کمی تھی یا وہ ورما کے ایپارٹمنٹ پر ہونے والی کارروائی سے ذہنی طور پر اتنی ڈسٹرب تھی کہ باوجود کوشش کے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ راحیلہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو آفر کر دی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق سے گھر چل کر پڑھ سکتی ہے۔ ماہ بانو کو ڈاکٹر طارق کے پڑھانے کا مؤثر انداز پسند آیا تھا اس لیے اس نے اس آفر کو قبول کر لیا لیکن اب راحیلہ کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ وہ مشکل سے آمادہ ہوا ہے، ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

"یہ فضول تکلف کی باتیں جانے دو۔ بھائی کی ساری نخرے بازی میرے لیے ہوتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اصل میں مہرین کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ویسے بھی تم کافی پسند آئی ہو انہیں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے راحیلہ کا انداز کچھ معنی خیز تھا لیکن اپنی دُھن میں بیٹھی ماہ بانو نے غور نہیں کیا۔ آج کل اس کا دماغ کچھ یونہی اڑا اڑا سا رہ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس سے اچانک آ کر ملنے والا اور پھر اُسے ایک اہم مشن میں شامل کر لینے والا شخص شہریار ہی تھا۔ وہ تو بس ایک خواب کی طرح سے آ کر چلا گیا تھا۔

شہریار سے اس کی ہونے والی یہ غیر متوقع ملاقات اتنی سنسنی خیزی سے بھرپور تھی کہ کہیں کوئی رومانس کا چانس نکلتا ہی نہیں تھا پھر بھی اسے بار بار وہ لمحے یاد آ جاتے تھے جب وہ ورما کو شہریار کی جنونی خیزی سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اس کے اس عمل نے یک دم ہی شہریار کے جنون کو قابو میں کر لیا تھا اور وہ ورما سے دور ہٹ گیا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے ایک خوش فہم سا سوال ضرور جنم لے چکا تھا۔ "کیا میں شہریار عادل کے لیے اتنی اہم ہوں کہ وہ میرے کہنے پر اپنے غصے کو قابو کر گئے؟" کبھی اسے لگتا کہ یہ سچ ہے اور واقعی وہ شہریار کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کبھی وہ خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیتی اور یہ دلیل دیتی کہ وہ جس کیفیت میں مبتلا تھا، میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی طرف سے اسی ردِعمل کا اظہار ہوتا۔ اس اُدھیڑ بن نے اس کے ذہن کو اچھا خاصا منتشر کر دیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے کھو سی جاتی تھی۔

"اچھا چلو اٹھ جاؤ اور زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ بھائی کو پتا چلا کہ تم میری بات سن کر گھر آنے سے انکاری ہو گئیں تو وہ مجھ سے سخت خفا ہوں گے۔" راحیلہ کو اس کی اندرونی کیفیت کا بھلا کیا علم تھا۔ وہ اپنے اندازوں سے جو سمجھ رہی تھی، اس کے مطابق ہی بولتی جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" ماہ بانو اس کے مسلسل اصرار پر ہتھیار ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ حسبِ سابق انہوں نے رکشے پر راحیلہ کے گھر تک کا سفر طے کیا۔

"پچھلی بار تم نے ہمارے برابر والے بنگلے میں جس عورت کو دیکھا تھا، اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" راحیلہ کے گیٹ پر اترنے کے بعد اس کی نظریں بے ساختہ اس کے پڑوس کے بنگلے پر اٹھ گئی تھیں۔ یہیں تو اس نے مہا گرو کو دیکھ کر اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کیا تھا۔

"کیوں؟ پولیس نے اس عورت کو کیوں گرفتار کیا؟" وہ سب جانتی تھی لیکن اصولی طور پر اسے راحیلہ سے سوال کرنا چاہیے تھا چنانچہ اس نے کیا۔

"واضح طور پر تو کوئی وجہ سامنے نہیں آئی، بہت خاموشی سے ریڈ کیا گیا تھا۔ بعد میں اخبارات تک میں کوئی ذکر نہیں آیا لیکن میرا جہاں تک خیال ہے، وہ عورت کوئی کال گرل ہی تھی۔ کسی نے مخبری کر دی ہو گی اس لیے پولیس نے ریڈ کر ڈالا۔ لیکن ایسی عورتیں پھنس جائیں تو نکلنے کے سو گر جانتی ہیں۔ اُن کے عاشقوں کی کوئی کمی تو ہوتی نہیں۔ دیکھنا چند دن بعد ہی باہر ہو گی اور شان سے اپنا کاروبار چلائے گی۔" اس سے باتیں کرنے کے دوران راحیلہ نے دروازے کی گھنٹی بھی بجائی تھی اور چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر وہ دونوں اندر بھی داخل ہو گئی تھیں۔ اپنی پڑوسی عورت کے بارے میں راحیلہ نے جو خیال آرائیاں کی تھیں، ماہ بانو نے ان پر کوئی جوابی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا ورنہ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ وہ عورت جس چکر میں گرفتار کی گئی ہے، وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔

"دیکھیں خاتون! میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہاں سے تشریف لے جا سکتی ہیں۔ آپ کی بہن کس کے ساتھ اور کہاں گئی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری اس سے آخری بار اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے نہ تو اسے دیکھا اور نہ ہی کہیں ملاقات کے لیے بلایا۔" وہ دونوں ابھی لاؤنج کے دروازے پر ہی تھیں کہ انہیں اندر سے ڈاکٹر طارق کی سخت آواز سنائی دی۔ اس کے اور راحیلہ کے قدم ٹھٹک گئے اور وہ وہیں رک گئیں۔ کھلے دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ سامنے ڈاکٹر طارق چہرے پر غصے کی سرخی لیے کھڑا نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے مقابل ایک فربہی مائل عورت بیٹھی تھی جس کی دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھیں، البتہ پشت پر موجود اس کے بالوں کی موٹی سی چوٹی کی سیاہ رنگت اتنا ضرور بتا رہی تھی کہ عورت جوان العمر ہے۔

"لیکن روبی نے خود گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر طارق یعنی آپ سے ملنے جا رہی ہے۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ میں نے اس کے لیے ہمیشہ بڑی بہن سے زیادہ سہیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ جب سے اس کی زندگی میں آئے تھے، میں تب سے ہی آپ کو جانتی ہوں۔ روبی نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا۔ کل شام بھی وہ تیار ہو کر گھر سے نکلی تھی تو اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹر طارق کی سالگرہ ہے اور انہوں نے خاص طور پر مجھے انوائٹ کیا ہے۔ میں رات دس ساڑھے دس بجے تک بنا تشویش اس کا انتظار کرتی رہی کہ ڈنر وغیرہ سے فارغ ہونے میں اتنا ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے .... پھر روبی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر طارق خود مجھے چھوڑنے گھر تک آئیں گے اس لیے بھی مجھے خاص فکر نہیں تھی .... لیکن روبی رات بھر گھر نہیں آئی۔ میں اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بند تھا۔ میں نے کئی بار آپ کا نمبر بھی ملایا۔ آپ کا نمبر بھی نہیں مل سکا۔ رات بھر پریشانی میں گزار کر میں صبح اسپتال گئی تو معلوم ہوا کہ آپ نائٹ ڈیوٹی کر کے گھر واپس جا چکے ہیں۔ میں اسپتال سے آپ کے گھر کا پتا لے کر یہاں پہنچ گئی تا کہ آپ سے روبی کے بارے میں معلوم کر سکوں لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کہاں سے اپنی بہن کو ڈھونڈ کر لاؤں؟" اپنی بات کے اختتام پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے افسوس ہے خاتون کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ روبی مسلسل آپ سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کل میری سالگرہ کا دن ہی نہیں تھا تو میں اسے کیسے ڈنر پر انوائٹ کر سکتا تھا؟ ہو سکتا ہے روبی کا کسی اور شخص سے افیئر چل رہا ہو اور وہ شخص اس لائق نہ ہو کہ وہ اسے گھر والوں کے سامنے پیش کر سکے اس لیے اس نے اپنے وقت بے وقت باہر آنے جانے کے لیے ایک اچھے جواز کے طور پر آپ کے سامنے میرا نام لے لیا ہو۔ بہرحال، میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میرا روبی سے ایسا کوئی تعلق تھا اور نہ ہی وہ اس حساب سے میرے معیار پر پوری اترتی تھی کہ میں اس کے بارے میں ایسا کچھ سوچتا۔" طارق کا انداز بے حد دوٹوک بلکہ ایک طرح سے کافی بے رحم تھا۔

"میں نہیں مان سکتی۔ میری بہن ایسی لڑکی نہیں ہے کہ اس قسم کے جھوٹ بولے۔" خاتون نے روتے ہوئے طارق کی بات کو رد کیا۔

"بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں محترمہ! اس بات کی گواہی تو میں بھی دے سکتی ہوں کہ کل شام میں یہ سات بجے تک گھر پر ہی تھے اور اس کے بعد اپنی ڈیوٹی کے لیے اسپتال چلے گئے تھے اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے آپ کی بہن کو کہیں بلایا ہو۔" ماہ بانو کے ساتھ دروازے پر ہی رکی راحیلہ یک دم ہی لاؤنج میں داخل ہوئی اور اپنے بھائی کی حمایت میں بیان دیا۔

"تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟" خاتون کی آواز میں نمایاں بے بسی تھی۔

"وہ جہاں بھی گئی ہو، کم از کم یہاں نہیں آئی۔ اس لیے پلیز آپ یہاں سے تشریف لے جائیں اور کہیں اور اسے تلاش کریں۔ میں اپنی بہن کی موجودگی میں اس بے ہودہ موضوع کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتا۔" خاتون نے سوال تو جانے کس سے کیا تھا لیکن جواب طارق نے نہایت خراب موڈ کے ساتھ دیا۔ اس کے اس رویے کے بعد خاتون کے لیے وہاں رکنا ہر صورت میں بے کار تھا۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی ماہ بانو کے قریب سے گزر کر بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئیں۔ پینتیس سے چالیس کی درمیانی عمر کی وہ قبول صورت سی خاتون جس مایوسی کے عالم میں وہاں سے لگی تھیں، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا لیکن بات وہی تھی کہ خاتون جس مسئلے سے دوچار تھیں، اس میں وہ ان کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ کون محترمہ تھیں بھائی جو اس طرح منہ اٹھا کر آپ پر الزام دھرنے چلی آئی تھیں؟" خاتون کے جانے کے بعد ڈاکٹر طارق سر تھام کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ راحیلہ نے اپنے ہاتھ میں موجود کتابیں اور فائلیں وغیرہ میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھیں اور تیز لہجے میں اس سے سوال کیا لیکن انداز سے صاف ظاہر تھا کہ لہجے کی یہ تیزی بھائی کے لیے نہیں بلکہ اُن خاتون کے لیے ہے جو ابھی ابھی وہاں سے روانہ ہوئی تھیں۔

"پہلے اپنی سہیلی کو تو اندر بلا کر بٹھاؤ پھر یہ تفتیش کر لینا۔" ابھی تک دروازے کے قریب تذبذب کے عالم میں کھڑی ماہ بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق نے راحیلہ کو ٹوکا۔

"اوہ، سوری مہرین! پلیز تم تو اندر آ کر آرام سے بیٹھو۔ اصل میں گھر میں گھستے ہی ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ دماغ کچھ کام نہیں کر رہا۔" وہ جلدی سے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے اندر آ کر بیٹھنے کے بعد ایک بار پھر بھائی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم تو اس طرح مجھے گھور رہی ہو جیسے میری نانی جان ہو۔ بہرحال، تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں تفصیل بتا دیتا ہوں۔

روبینہ عرف روبی اس اسپتال میں نرس ہے جہاں میں جاب کرتا ہوں۔ ایک دو دفعہ میں اس کی فرمائش پر اس کی بیمار والدہ کا چیک اپ کرنے اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ روبینہ کے والد یا کوئی بھائی نہیں ہے۔ پہلے اس کی والدہ ملازمت کرتی تھیں پھر بڑی بہن نے ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب کر کے ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ روبینہ نے بھی نرسنگ کی ٹریننگ لے کر دو سال پہلے جاب کا آغاز کیا تھا۔ والدہ اپنی بیماری کی وجہ سے بہت عرصے سے ملازمت چھوڑ چکی تھیں۔ یوں بھی لوگ میں ان لوگوں سے ملا تو مجھے یہ خاصا بے بس اور تنہا خاندان محسوس ہوا اور ہمدردی کے جذبے کے تحت میں کبھی کبھار روبینہ کے گھر فون کر کے اس کی والدہ اور بہن سے خیر خیریت لینے لگا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری اس ہمدردی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روبینہ نے گھر میں کیا کہانی سنائی اور میری آڑ لے کر کس سے ملنے جاتی رہی۔ اس کی بہن سے میری جو بات چیت ہوئی ہے، وہ تم لوگوں نے بھی سنی ہے اس لیے میرے خیال میں ہمیں اب مزید اس موضوع کو ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں آرام سے بیٹھو، میں ابھی تھوڑی دیر میں کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔ خاتون کی آمد کی وجہ سے میں پہلے باہر نہیں نکل سکا تھا۔" مختصراً ساری بات بتا کر ڈاکٹر طارق باہر چلا گیا۔

"آج کل جانے لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس راہ پر چل رہی ہیں۔" ڈاکٹر طارق کے جانے کے بعد راحیلہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح تبصرہ کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ماہ بانو کو ایسے کئی قصے سناتی رہی جن میں گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کا ذکر تھا۔ ماہ بانو بے دلی سے یہ قصے سنتی رہی۔ ڈاکٹر طارق کے واپس آنے کے بعد ان لوگوں نے کھانا کھایا لیکن ہر شخص ہی اپنی جگہ اعصابی دباؤ کا شکار تھا اس لیے کسی نے بھی اچھی طرح کھانا نہیں کھایا۔

"میرے خیال میں آج میں تم لوگوں کو یکسوئی سے نہیں پڑھا سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ کسی اور دن پر یہ پروگرام رکھ لو۔" کھانے کے بعد ڈاکٹر طارق نے اعلان کیا۔

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس صورت میں، میں مزید یہاں رکنے کے بجائے ہاسٹل جانا پسند کروں گی۔ روز روز ہاسٹل سے دیر تک باہر رہ کر میں کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتی۔" اس کی بات سن کر ماہ بانو یک دم ہی کھڑی ہو گئی۔

"ابھی بھی کیا جلدی ہے یار! تھوڑی دیر ٹھہر کر چلی جانا۔" راحیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"مہرین ٹھیک کہہ رہی ہے راحیلہ! یہ ہاسٹل میں رہتی ہے اس لیے اسے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" ماہ بانو کے کچھ کہنے سے قبل ڈاکٹر طارق نے بہن کو جواب دیا اور پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آؤ مہرین! میں آپ کو ہاسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت یہ علاقہ بالکل ہی سنسان ہوتا ہے اس لیے آپ کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ ایسا کرو راحیلہ تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔" راحیلہ کو ساتھ چلنے کا کہہ کر اس نے ماہ بانو کے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی چنانچہ وہ تینوں ایک ساتھ گھر سے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر طارق کے پاس سواری کے لیے موٹر سائیکل تھی جس پر ظاہر ہے، وہ تینوں ایک ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں ٹیکسی کے لیے خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے روڈ تک جانا پڑا۔ امرا کے اس علاقے میں جہاں لوگ اپنی ذاتی سواریوں کے مالک ہوتے ہیں، ٹیکسی کا اس بھری دوپہر میں ملنا بھی ایک کارِ دشوار تھا۔ انہیں انتظار میں کھڑے کھڑے تقریباً دس منٹ گزر گئے لیکن کسی ٹیکسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ سڑک سے جتنی بھی گاڑیاں گزر رہی تھیں، وہ لوگوں کی ذاتی ملکیت تھیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر کوفت زدہ سے کھڑے وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے بوریت سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنے قریب بریکس کی چرچراہٹ سن کر چونک گئے۔ تینوں نے بیک وقت نظر اٹھا کر اپنے قریب رکنے والی گاڑی کو دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کلف جیسی تنی مونچھوں والا ایک لمبا چوڑا آدمی بیٹھا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر ماہ بانو کی روح فنا ہونے لگی۔ وہ چودھری کے اہم کارندوں میں سے ایک کارندہ رشید اتھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے انگلی سے یوں اشارہ کیا جیسے اُسے اپنے پاس بلا رہا ہو۔ چودھری کے خاص ملازمین اتنے سرچڑھے تھے کہ اپنے اشارے کو بھی حکم کا درجہ دیے جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر ماہ بانو میں اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں اپنے قدموں کو حرکت دے پاتی۔ سرد ہوتے ہاتھ پیروں کے ساتھ وہ وہیں کھڑے کھڑے بھربھری مٹی کی طرح نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"مہرین! کیا ہوا؟" ہوش کھونے سے قبل اس نے ڈاکٹر طارق کی تشویش بھری آواز سنی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

حسنِ کارکردگی

بابر نعیم

قلم اور عمل کے درمیان فرق کو نظرانداز کر دینے والے شخص کا عبرت انگیز ماجرا

ڈراما نگاری اور اداکاری میں جو فرق ہے، اسے کوئی مصنف یا اداکار ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایک ایسے ہی کہانی کار کا قصہ، وہ زندگی بھر جرم کی داستانیں تخلیق کرتا رہا مگر اپنے ہی لکھے ہوئے لفظوں کی حقیقت کو سمجھ نہ سکا۔

اس خوب صورت شام میں تمام مہمان میلبو کلف ٹاپ مینشن میں سائنز پارٹی کا جشن منانے کے لیے جمع ہوئے تھے کیونکہ یہ پارٹی ایک اداکارہ کی پچاسویں سالگرہ کے سلسلے میں تھی اس میں وہ تمام لوازمات موجود تھے جو کسی بھی مثالی ہالی ووڈ پارٹی کا حصہ ہوتے ہیں۔ میٹ سائمن فلموں کے اسکرپٹ لکھا کرتا تھا اور اس اداکارہ نے ہی ایک مرتبہ گلیمر کو اس سے متعارف کروایا تھا جسے وہ دوسرے درجے کی اداکارہ سمجھتا تھا۔ گزشتہ چار برس سے وہ کام کی تلاش میں پاتھ پیر مار رہی تھی اور اس پارٹی میں شرکت بھی اسی منصوبے کا حصہ تھی۔ میٹ تمسخرانہ نظروں سے اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ایک سنکی کی طرح

http://pakfunplace.blogspot.com

اسٹوڈیو مالکان اور کاسٹنگ ایجنٹ کے گرد منڈلا رہی تھی جبکہ میٹ نے اپنے آپ کو قریب ترین ہونے تک محدود کیا ہوا تھا جہاں سے ساحل کا نظارہ بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔ اس سے بھی اچھی بات یہ کہ اس میز پر اس کے پسندیدہ مشروب کی سپلائی تسلسل سے جاری تھی جبکہ دوسرے مہمانوں میں سے صرف ایک ہی ان مشروبات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس میز پر موجود تھا۔ لیری فلائیڈ نامی یہ وکیل ہالی ووڈ کے لوگوں کے قانونی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ بات دوسری تھی کہ شاید اسے یہ موقع دوبارہ نہ مل پاتا... کیونکہ میٹ سائمن اسے قتل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ جب لیری فلائیڈ نے اپنا موم بھدا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا تو میٹ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں کی تمام انگلیوں پر تازہ تازہ نیل پالش لگی ہوئی ہے۔ میٹ سوچنے لگا کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ نصف شب تک اس کی موت واقع ہو جائے گی تو کیا تب بھی وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی دیکھ بھال کے لیے اتنا وقت نکال سکے گا؟ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ اپنی زندگی کے آخری دن کیسے گزارتے ہوں گے؟ اسی لیے موت کہہ کر نہیں آتی۔ لیری فلائیڈ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ چند گھنٹوں یا چند منٹوں بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ وہ میٹ کی بیوی کلیئر کا محبوب تھا اور یہ بات میٹ کو صرف ایک ہفتے پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔

☆☆☆

گزشتہ سنیچر کی شب وہ ایک چھوٹی ڈنر پارٹی کی تیاریوں میں مصروف تھے یعنی میٹ کھانا بنا رہا تھا جبکہ کلیئر میز پر پلیٹیں لگانے میں مصروف تھی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور میٹ اس خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی جلدی اپنا کام نمٹانے کی فکر میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی بھی نکتے پر ان کے درمیان بحث چھڑ گئی تو بات دور تک چلی جائے گی۔ اب ان کے پاس صرف پینتالیس منٹ تھے۔ اس کے بعد صرف ایک گھنٹا بچتا جس میں کلیئر کو اپنی تیاری بھی کرنی تھی۔ مہمانوں کی آمد کا وقت آٹھ بجے مقرر تھا۔

کلیئر اتنی دیر تک خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ میٹ نے سوچا اور اپنے لیے ایک گلاس میں اسکاچ انڈیل کر اس کے قریب آ گیا۔ یہ وہ مخصوص انداز تھا جو گزشتہ پندرہ سالہ ازدواجی زندگی میں کئی بار اپنایا جا چکا تھا۔ میٹ اس سے پوچھتا اور وہ کندھے اچکا کر اپنا سر ہلاتی جیسے اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہو جو کام نہ ملنے کی وجہ سے اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا ہے۔ لوگوں نے اسے اس لیے مسترد نہیں کیا کہ اس میں ٹیلنٹ کی کمی تھی بلکہ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے اسے کام ملنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میٹ جانتا تھا کہ اس کی بیوی میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک خامی ان سب خوبیوں پر حاوی تھی یعنی یہ کہ وہ خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

کلیئر لیونگ روم میں کھڑی نیپکن ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ میٹ اپنے ہاتھ میں گلاس پکڑے اس کے قریب آ کر بولا۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

کلیئر کا جواب سن کر میٹ کے ہوش اڑ گئے۔ یہ جملہ اس اسکرپٹ سے ہٹ کر تھا جو وہ گزشتہ پندرہ سال سے دہراتے چلے آ رہے تھے۔

"مجھے کسی سے محبت تھی۔"

اپنے پچیس سالہ کیریئر میں میٹ نے یہ جملہ نہ جانے کتنی بار مختلف ڈراموں اور فلموں کے لیے لکھا ہوگا لیکن پہلی بار اسے ان الفاظ میں چھپا درد محسوس ہوا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھ میں آنسو آئے اور وہ ایپرن کے کونے سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتا ہوا قریبی کرسی میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دھنس گیا۔ اس صورتِ حال میں وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کلیئر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"مت روؤ ڈارلنگ! وہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔"

"وہ کون تھا؟" میٹ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ وہ بات ختم ہو چکی ہے۔"

"تم صرف مجھے اس کا نام بتا دو؟" میٹ نے اصرار کیا۔

"تم اسے نہیں جانتے۔" کلیئر نے ایک بار پھر ٹالنے کی کوشش کی۔

"خدا کے واسطے کلیئر! مجھے اس کا نام بتاؤ؟"

"لیری فلائیڈ۔" کلیئر نے آہستہ سے کہا۔

میٹ نے ذہن پر زور ڈالا لیکن اس کے دماغ کے کسی خانے میں لیری فلائیڈ موجود نہ تھا۔ یہ جان کر کلیئر کو خاصی مایوسی ہوئی حالانکہ ان کی تو دنیا ہی ناموں کے گرد گھومتی تھی۔ ان کے ذہن کی اسکرین پر ہالی ووڈ کے پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، ایکٹرز اور پلاسٹک سرجن وغیرہ کے نام جگمگاتے رہتے تھے۔ بدقسمتی سے فلائیڈ کا تعلق ان میں سے کسی بھی کیٹیگری سے نہیں تھا، وہ ایک وکیل تھا اور میٹ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا موڑ نہیں آیا جب اس کا کسی وکیل سے واسطہ پڑا ہو۔

کلیئر بولی۔ "اس کی شادی ایناہیرس سے ہوئی تھی۔ شاید تم بھول رہے ہو۔ ہماری اس سے ملاقات اپریل میں اس کی فلم کی نمائش کے موقع پر ہوئی تھی۔"

میٹ کو وہ اچھی طرح یاد تھی سوائے اس کے کہ اس نے کلیئر کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ دراز قد اور خوب صورت ایناہیرس نے اپنی ملاقات میں اس پر گہرا تاثر چھوڑا تھا۔ وہ ایک قابلِ احترام پروڈیوسر تھی اور ایک گھنٹے کے ٹیلی ویژن ڈرامے پیش کرنے کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتی تھی۔ اپنے شوہر کے برعکس اینا کا شمار ایسے لسٹ پروڈیوسرز میں ہوتا تھا جو ہر سال موسمِ خزاں میں کم از کم ایک شو ضرور پیش کرتی تھی۔ اس شہرت کا فائدہ اس کے شوہر کی قانونی فرم کو بھی ہو رہا تھا اور اس حوالے سے وہ دوسرے درجے کا وکیل خوش قسمت کہلانے کا مستحق تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں کہ یہ قصہ اب ختم ہو چکا ہے۔" کلیئر نے ایک بار پھر اپنے شوہر کو یقین دلانے کی کوشش کی لیکن میٹ کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس کے دل میں شدت سے حسد کا جذبہ ابھر چکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی اور اسی وقت اپنی بیوی کا گلا دبا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ فوراً ہی اس کے حواس قابو میں آ گئے اور اس نے سوچا کہ فی الحال ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بھی کھٹک رہا تھا کہ کلیئر کو اب یہ انکشاف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

دوسرے ہفتے میٹ کی مصروفیات معمول کے مطابق رہیں۔ البتہ غیر محسوس طور پر ان میں ایک تبدیلی ضرور آئی۔ اس کا دفتر والا دفتر لیری فلائیڈ کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دن میں پانچ چھ مرتبہ اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا، محض اس امید پر کہ اس کے ڈرائیوے میں کلیئر کی بی ایم ڈبلیو کھڑی نظر آ جائے لیکن ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پیر، منگل، بدھ یونہی گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ اگر تیسری کوشش کے بعد بھی تمہیں کامیابی نہ ہو تو کھیل سے باہر ہو جانا چاہیے۔ اسے ہمیشہ سے ہی اس جملے سے چڑ تھی کیونکہ وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔

جمعرات کی سہ پہر وہ اپنے آپ کو لیری فلائیڈ کے گھر کا چکر لگانے سے باز نہ رکھ سکا۔ اس روز کلیئر کو اپنے مساج تھراپسٹ کے پاس جانا تھا۔ حسبِ توقع اس کی کار لیری فلائیڈ کے ڈرائیوے میں موجود تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تب بھی اس نے اپنی عزیز از جان بیوی کی گاڑی کو اسی جگہ کھڑے دیکھا۔ اس نے اپنی کار کا رخ شمال میں واقع بنے ہوئے پہاڑی کیبن کی جانب موڑ دیا جہاں اس نے ایک ہینڈ گن رکھی ہوئی تھی جس کے بارے میں اس نے اپنی بیوی سے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک لکھنے والے کو بھی اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، ایسی صورت میں جب کوئی ہمارے گھر پر حملہ کر دے تو یہی گن ہمیں تحفظ فراہم کرے گی۔"

پاکیزہ

جنوری 2011ء

کی ایک جھلک

انجم انصار کا ناول

محبت ہم سفر میری ایک نئے موڑ پر

عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر

ایک نئی مہک کے ساتھ ذکیہ بلگرامی کا ناول اگر

ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن

ناہید فاطمہ حسنین ، سائرہ عارف

اور صائمہ اکرم کے شوخ و شریر، اور فکر انگیز ناولٹ

نوشین ناز اختر کا مکمل ناول

"اسم اعظم" جو آپ کو چونکا دے گا

افسانوں میں غزالہ عزیز، شیریں حیدر، ارم زہرہ، آئینہ مثال، رابعہ نیازی

اور ثریا انجم کی خوب صورت دھنک

بہنوں کی محفل پاکیزہ کی

فیس بک جس میں آپ بھی اپنے کھٹے میٹھے

اور تیکھے خطوط کے ساتھ شرکت کر سکتی ہیں

ہماری محبوب مصنفہ نیلو فر کے قلم سے

شہزوری کی آخری قسط

دین کی باتیں، روحانی مشورے، طبی مشورے، میں اکثر گنگناتی ہوں، میرا انتخاب، بزم پاکیزہ، جلترنگ، ہومیو کلینک اور وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتی ہیں

اگر آپ پاکیزہ میں اپنی تحریر اور تصویر دیکھنا چاہتی ہیں تو جنوری کا پاکیزہ پڑھنا نہ بھولیں

http://pakistanipoint.blogspot.com

لیری فلائیڈ نے اس کے گھر پر حملہ ہی کیا تھا اور اب میٹ مستقبل کے حملوں سے بچنے کے لیے اپنا بندوبست کر رہا تھا۔ وہ لیری کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ اس گن کو واپس اپنی جگہ پر رکھ سکتا تھا اور کلیئر کبھی اس کی گم شدگی کے بارے میں نہ جان پاتی اور اگر اسے شبہ ہو جاتا تب بھی وہ کیا کر لیتی۔ پولیس کو اطلاع دیتی۔ اس سے صرف اتنی پیکنی ضرور ملتی کہ اسے مزاحیہ پروگراموں میں آنٹی کا چھوٹا موٹا رول مل جاتا۔

اس شام کلیئر نے رقص کرتے ہوئے میٹ کا استقبال کیا جو اس کے لیے بڑا سا بیزا لے کر آیا تھا۔ کلیئر کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ "میری کمر کا درد بالکل غائب ہو گیا ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اتنا پُرسکون محسوس نہیں کیا۔"

"واقعی تم بڑی پُرسکون نظر آ رہی ہو۔" میٹ نے ہلکا سا طنز کیا حالانکہ وہ اس تبدیلی کی اصل وجہ کے بارے میں بالکل سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

"آج تمہارا مساج تھراپسٹ سے اپائنٹ منٹ تھا؟" میٹ نے پوچھا۔

"کمال ہے۔ تمہیں یہ بات کیسے یاد رہ گئی؟"

"عام طور پر تھراپی کے بعد تم دیر تک پسینا پونچھتی نظر آتی ہو۔ لگتا ہے آج اس نے کچھ زیادہ ہی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"میری مسلسل تھراپسٹ مرد نہیں عورت ہے۔" وہ ہنسی سے بولی۔ "واقعی آج اس نے بڑی اچھی تھراپی کی ہے۔ جسم کا جوڑ جوڑ کھل گیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ دفتر سے تمہیں پک کر لوں پھر ساتھ ہی کہیں بیٹھ کر لنچ کرتے لیکن تمہاری مصروفیت کا سوچ کر ارادہ بدل دیا۔"

جمعرات کی سہ پہر لنچ ٹائم کے وقت کلیئر، لیری فلائیڈ کے گھر پر تھی اس لیے نہ تو اسے اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا اور نہ ہی میٹ کو اپنی بیوی کے جھوٹ پر غصہ آیا۔ جمعے کے روز بھی کلیئر کی کار تقریباً سارا دن ہی لیری فلائیڈ کے ڈرائیو وے میں کھڑی رہی۔ ہفتے کی صبح کلیئر مسل کر رہی تھی کہ میٹ کی نگاہ اس کے سیل فون پر گئی۔ اس نے مارے تجسس کے کالز کا ریکارڈ دیکھنا شروع کیا اور اسے یہ جان کر بالکل بھی حیرانی نہیں ہوئی کہ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران میں تین درجن سے زیادہ کالز لیری فلائیڈ کے گھر کے نمبر پر کی گئی تھیں جن میں حالیہ فون کال اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے کی گئی تھی۔ اسی وقت میٹ نے اپنی گن اٹھائی اور کار کے گلووکمپارٹمنٹ میں رکھ دی۔

☆☆☆

"یہ واقعی جان لیوا ہے۔" لیری فلائیڈ نے مرغابی کی ڈش اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس میں کولیسٹرول کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے جس سے شریانیں بند ہونے کا خطرہ ہے لیکن کیا کروں، میں اپنا ہاتھ روک نہیں سکتا۔" دوسرے مہمان بھی اسی میز کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اس لیے میٹ اور لیری کو وہاں سے ہٹنا پڑا اور وہ اپنی پلیٹیں لے کر ایک طرف چلے گئے۔ لیری نے میٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "بہتر ہو گا کہ میں اپنی بیوی کو تلاش کروں۔"

"اینا ہیرس۔ یہی نام ہے نا تمہاری بیوی کا؟"

"تم اسے جانتے ہو؟" لیری نے تعجب سے پوچھا۔

"اس نے چند سال پہلے اپنے ایک شو کے لیے مجھ سے اسکرپٹ لیا تھا۔"

"گزشتہ سیزن میں اس نے دو پرائم ٹائم سیریز پروڈیوس کی تھیں۔" لیری فخر سے بولا۔ "کیا تمہاری بیوی بھی شوبز نس میں ہے؟"

میٹ نے دور کھڑی کلیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کلیئر سائمن اوہ بھی ایکٹریس ہے۔"

لیری نے یہ نام سن کر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ حد درجہ محتاط تھا۔ اس نے میٹ کی طرف دیکھا۔ "یہاں قدم قدم پر سیاست ہے۔ بولتے وقت بھی صحیح الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔"

میٹ کو یاد آیا کہ اس کی ہینڈ گن کار میں رکھی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا کہ مارنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ شاید ہینڈ گن کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے۔

اگلے ایک گھنٹے کے دوران میں میٹ نے مسلسل لیری فلائیڈ کو اپنی نظروں کے حصار میں رکھا۔ نصف شب سے کچھ قبل اس نے کلیئر کو تلاش کیا جو بڑی سنجیدگی سے ایک ریٹائرڈ شو کے میزبان سے ہالی ووڈ کی اخلاقیات پر لیکچر سن رہی تھی۔ میٹ اس کے قریب جا کر جھکا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارا ایک دوست یہاں موجود ہے۔"

"کون؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔

"لیری فلائیڈ!" اس نے دھیمے ہوئے لہجے میں کہا۔

کلیئر کے چہرے پر گلاب کھل اٹھے۔ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ پلیز! مذاق چھوڑو۔"

میٹ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ کلیئر کا جھکاؤ واضح طور پر لیری کی جانب تھا۔ رقیب روسیاہ نے اس کی بیوی کے دل پر پوری طرح قبضہ جمایا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اپنی بیوی کی جذباتی کیفیت سے محظوظ ہوتا رہا اور پھر اپنے شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ جب وہ آدھ گھنٹے بعد پُرہجوم بیٹھک روم میں واپس آیا تو لیری فلائیڈ مر چکا تھا اور اسے قتل کرنے کے لیے گن کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ میٹ نے دیکھا کہ لیری وائن کا گلاس ہاتھ

میں پکڑے گھر سے باہر جا رہا ہے تو اس نے بھی اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ دوپہر کو ہونے والی بارش کی وجہ سے پورا راستہ کیچڑ سے بھر گیا تھا۔ جب لیری چٹان کے سرے پر پہنچا جہاں سے سمندر صاف نظر آتا تھا تو میٹ بھی اس کے برابر میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس فضا میں بلند کیا اور بولا۔ "کلیئر کے نام!"

لیری نے پلٹ کر اسے دیکھا اور وہاں اس کی موجودگی پر تھوڑا سا حیران بھی ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکتا، میٹ نے اپنا ہاتھ لیری فلائیڈ کی کمر پر رکھا اور اسے زور سے دھکا دے دیا۔ چالیس فٹ کی بلندی سے گر کر اس کا سر ایک ابھری ہوئی چٹان سے ٹکرایا۔ ایک زوردار آواز فضا میں ابھری اور سمندر کی موجوں کے شور میں دب گئی۔

اتوار کی صبح میٹ نے دفتر جانے کا پروگرام بنایا تاکہ اپنا اسکرپٹ مکمل کر سکے۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا ضروری کام نہ تھا جس کی خاطر وہ اپنا اتوار کا آرام قربان کر دیتا۔ درحقیقت وہ دو ہفتے پہلے ہی یہ اسکرپٹ اپنے ایجنٹ کو ای میل کر چکا تھا۔ دفتر جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی بیوی کی نظروں سے دور رہ کر سوچنا چاہتا تھا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہو گئی ہے اور اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ یہ اندازہ تو اسے اب ہوا تھا کہ کسی انسان کی جان لینا، اس کے بارے میں لکھنے سے کہیں زیادہ سنجیدہ عمل ہے۔ قتل کرنے کے بعد انسان جذبات کے تلاطم میں گھر جاتا ہے اور ایک ایک کر کے ہر پہلو اس کے ذہن میں تازہ ہونے لگتا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر میٹ نے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ اس نے ایک شخص کو سمندر میں دھکا دے کر اس کی جان لے لی تھی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اور اسے اس پر طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ اتنا احمق بھی نہیں تھا کہ گزشتہ شب کی کامیابی کو اپنی بیوی سے شیئر کرتا۔

سہ پہر کے وقت جب وہ گھر واپس آیا تو پہلی اطلاع اسے یہی ملی۔ "لیری فلائیڈ غائب ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ گزشتہ شب تو وہ پارٹی میں موجود تھا۔"

"اس کی بیوی کا خیال ہے کہ وہ سر درد یا کسی اور وجہ سے وقت سے پہلے پارٹی چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن جب وہ گھر نہیں پہنچا تو اس کی بیوی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔"

"تمہیں یہ خبر کیسے معلوم ہوئی؟" اس نے کلیئر سے پوچھا۔

"صبح سے ہی مقامی خبروں میں بار بار بتایا جا رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں کہ کوئی آدمی پارٹی میں جائے اور وہاں سے کسی کو بتائے بغیر غائب ہو جائے۔"

"سوری بے بی!" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں اس لیے اس معاملے پر مزید دماغ سوزی نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد واپس آ جائے گا۔"

☆☆☆

شام تک وہ تو واپس نہیں آیا لیکن اس کی لاش ضرور مل گئی۔ سمندر کی لہریں اسے ساحل تک واپس نہ لا سکیں لیکن غوطہ خوروں کو اس کی لاش دو چٹانوں کے درمیان پھنسی ہوئی مل گئی۔ ہالی ووڈ کے دوسرے کئی لوگوں کی طرح لیری فلائیڈ بھی مرنے کے بعد مشہور ہو گیا جبکہ زندگی میں کوئی اسے پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس رات گیارہ بجے کی خبروں میں یہی نمایاں کہانی تھی جس میں پولیس کو اس کی لاش ساحل سے اٹھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ کلیئر اور میٹ نے یہ منظر اپنے دیوار گیر پلازما ٹی وی پر دیکھا۔ میٹ کا چہرہ جذبات سے عاری تھا لیکن کلیئر کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میٹ سے اپنی پیاری بیوی کا اداس چہرہ نہ دیکھا گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جذباتی انداز میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

اس نے غصے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ تم نے اسے مارا ہے۔" پھر اس نے رونا شروع کر دیا اور بولی۔ "ساری غلطی میری ہی ہے۔ مجھے لیری کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ جانتی ہوں کہ تم کتنے شکی مزاج ہو۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ مشتعل ہوتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی دوسرے مرد کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھرے۔"

☆☆☆

پیر کی صبح دو پولیس سراغ رساں ان کے گھر آئے تو کلیئر نے ہی دروازہ کھولا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر ایک ہالی ووڈ ایکٹریس نظر آ رہی تھی۔ اس نے قیمتی جینز اور فرانسیسی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میٹ بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ پولیس والے اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ کلیئر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک کامیاب اداکارہ کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میٹ کو امید ہو چلی کہ سراغ رسانوں کا چوری چوری اس کی بیوی کو دیکھنا بالآخر اس کے حق میں مفید ثابت ہو گا۔ انٹرویو کا آغاز بڑے ہی مہذب انداز میں ہوا۔ اس کی بیوی کافی بنا کر لائی۔ وہ اس وقت ایک خوش و خرم خاتونِ خانہ کا کردار ادا کر رہی تھی۔

سراغ رساں لارسن اور گومیز نے اپنی آمد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پارٹی میں موجود کئی مہمانوں نے میٹ اور لیری فلائیڈ کو اکٹھے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی سراغ رساں گومیز کی نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ اس نے کلیئر کے خوب صورت چہرے سے نظریں ہٹائیں اور پوری توجہ میٹ پر مرکوز

http://pakistanplace.blogspot.com

کرتے ہوئے بولا۔

"کیا تم مسٹر فلائیڈ سے اچھی طرح واقف تھے؟"

"میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات ہفتے کی شب پارٹی میں ہی ہوئی تھی۔ البتہ میں نے اس کا نام سن رکھا تھا کیونکہ ہم دونوں کا تعلق ایک ہی بزنس سے ہے اس لیے ملاقات کا امکان ہمیشہ رہتا تھا۔ میرا ایک دوست پانچ یا چھ سال پہلے لیری کا کلائنٹ رہ چکا تھا۔"

سراغ رساں لارسن نے کلیئر کو دیکھا اور بولا۔ "اور تم... تم، مسٹر فلائیڈ کو جانتی تھیں؟"

"ذاتی طور پر تو نہیں لیکن وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں اخبارات میں پڑھتی رہتی تھی۔ جیسا کہ میرے شوہر نے کہا کہ ہالی وڈ ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ یہاں بھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی انداز میں جانتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو گزشتہ جمعرات اور جمعے کو تمہاری کار اس کے گھر کے ڈرائیو وے میں کیوں کھڑی تھی؟"

کلیئر کا ہاتھ بری طرح کانپنے لگا جیسے وہ رعشہ کی پرانی مریض ہو۔ اسی ہاتھ میں اس نے کافی کا مگ بھی پکڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور مگ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ گزشتہ ہفتے تو تقریباً روزانہ ہی ڈائریکٹرز اور کاسٹنگ ایجنٹ سے میری میٹنگز ہوتی رہی ہیں۔"

سراغ رساں لارسن نے بے یقینی کے عالم میں کلیئر کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ میٹنگز کی تصدیق تو ہو جائے گی بشرطیکہ یہ فرضی ناموں والے ڈائریکٹرز اور کاسٹنگ ایجنٹ کے ساتھ ہونے والی تصوراتی میٹنگز نہ ہوں۔

دونوں سراغ رساں باری باری گھما پھرا کر ان سے سوالات کرتے رہے پھر اچانک ہی سراغ رساں گومیز کو کچھ خیال آیا اور اس نے وہ جوتے دیکھنے کی فرمائش کی جو گزشتہ شب میٹ پارٹی میں پہن کر گیا تھا۔ میٹ کو یاد آیا کہ جس راستے پر چل کر وہ چٹان کے سرے تک پہنچا تھا وہ بارش کے سبب کیچڑ میں لت پت تھا۔ اس نے سوچا کہ ضرور اس کے جوتوں کے تلے میں لگے سول کے نشانات کیچڑ میں ثبت ہو گئے ہوں گے۔ وہ بھی تو اپنے ڈراموں میں قاتل کے جوتوں کی مدد سے ہی اس تک پہنچا کرتا تھا۔

کلیئر نے میٹ کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ لی اور ایسی نگاہوں سے اسے دیکھا جن کا مفہوم سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اشاروں اشاروں میں اپنے شوہر کو یقین دلا دیا کہ وہ اسے اس مصیبت سے نجات دلا دے گی۔ دس منٹ بعد جب وہ لیونگ روم میں واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں آکسفورڈ کے جوتے تھے جنہیں میٹ نے آخری بار اس وقت پہنا تھا جب اس کا سر بالوں سے بھرا ہوا اور پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ جب اس نے وہ جوتے سراغ رساں گومیز کے حوالے کیے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ نہ جانے گومیز نے اسے محسوس کیا یا نہیں البتہ ایک سیکنڈ کے لیے میٹ کو یقین آ گیا کہ کلیئر نے اسے اس مصیبت سے نجات دلا دی ہے۔

سراغ رساں لارسن نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکالی جو گزشتہ شب پارٹی کے دوران لی گئی تھی۔ اس تصویر میں میٹ اور لیری فلائیڈ بوفے ٹیبل کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹیں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ لارسن نے میٹ کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے مسز سائمن۔"

کلیئر کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ آکسفورڈ کے جوتے اٹھا لائی تھی جبکہ تصویر میں میٹ نے لوفرز ٹاپ جوتے پہن رکھے تھے وہ بات بناتے ہوئے بولی۔

"سوری! مجھے بالکل بھی یاد نہیں کہ میرے شوہر نے پارٹی میں جانے کے لیے کون سے جوتے پہنے تھے۔ دراصل ہم دونوں ہی بہت جلدی میں تھے اس لیے یہ دھیان ہی نہیں رہا کہ پارٹی میں جانے سے پہلے ایک دوسرے کی تیاری کا جائزہ لے سکتے۔"

دونوں سراغ رسانوں نے جانے سے پہلے میٹ سے وہ جوتے بھی طلب کیے جو وہ گزشتہ شب پارٹی میں پہن کر گیا تھا۔ انہوں نے وہ جوتے پلاسٹک بیگ میں رکھے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ دوسرے دن میٹ کو لیری فلائیڈ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ میٹ نے گزشتہ برسوں کے دوران میں اس طرح کا سین درجنوں بار لکھا ہو گا لیکن اس نے محسوس کیا کہ... گرفتار ہونے کے بعد اس سین کے معنی اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

کلیئر بعد میں اس سے ملنے جیل آئی۔ جب اس نے اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے درمیان میں لگی سلاخوں کو دبایا تو میٹ کو یہ منظر جانا پہچانا سا لگا۔ تب اسے یاد آیا کہ کئی سال پہلے اس نے اپنے ایک اسکرپٹ میں ایسا ہی ایک منظر لکھا تھا لیکن پروڈیوسر نے اسے کاٹ دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ منظر پہلے بھی کئی بار دکھایا جا چکا تھا لیکن اس کی بیوی پر تو یہ سب پہلی بار گزر رہا ہے۔

کلیئر کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وکیل کیا کہتا ہے؟"

"میرے جوتے کے نشان موقع واردات پر پائے گئے قدموں کے نشانات سے ملتے ہیں۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

دی انسٹی ٹیوٹ
Registered with CBR Govt. of Pakistan
پلاٹ نمبر 3349 سعود آباد ملیر کراچی 75080
MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074

"مجھے بہت افسوس ہے۔" گلیسز بولی۔ اس کا انداز ایسا تھا
کہ اگر وہ جوتے لے کر نہ آتی تو میٹ کی جان بچ سکتی تھی۔
"ایسی باتیں مت کرو۔" میٹ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔
"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔" گلیسز
سرد لہجے میں بولی۔ "میرا خیال تھا کہ پولیس کو دوسرے جوتے
دینے سے معاملہ دب جائے گا لیکن انہوں نے تصویر کی مدد سے
اصلی جوتا پہچان لیا۔"
"میں تمہاری کوشش کی قدر کرتا ہوں۔" میٹ بولا۔ "اگر
اس وقت وہ دوسرے جوتے لے جاتے تب بھی بات نہ بن پاتی۔
اصل بگاڑ تو وڈیو ٹیپ نے پیدا کیا۔"
"کیسی وڈیو؟" گلیسز حیران ہوتے ہوئے بولی۔
"مکان کے عقب میں کیمرا لگا ہوا تھا۔ اس کی وڈیو میں
لیری کو چٹان کی جانب جاتا ہوا دکھایا گیا ہے جبکہ میں اس کا تعاقب
کر رہا ہوں۔ چند منٹ بعد مجھے اکیلا واپس آتے ہوئے دکھایا گیا
ہے۔ اس کے بعد شک و شبے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔"
گلیسز بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر اس نے اپنا
ہاتھ سلاخ پر سے ہٹایا اور بولی۔
"اب کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔"
"سچ تو یہ ہے کہ ابھی بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر
اس نے ایک گہرا سانس لیا اور وہ بات کہہ ڈالی جو شاید اس کے
لیے اتنی ہی اطمینان بخش تھی جتنا کہ لیری فلائیڈ کو قتل کرنا۔ وہ اس
کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم بہت
ہی بڑی اداکارہ ہو۔"

☆☆☆

ایک ماہ تک مقدمے کی کارروائی چلتی رہی۔ اس دوران
گلیسز بڑی باقاعدگی سے ہر روز عدالت آتی رہی۔ وہ ایک
ملزم کی بیوی کا رول بڑی خوبی سے ادا کر رہی تھی جس کے
بری ہونے کے امکانات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتے
جا رہے تھے۔ لیری کی بیوی اینا بیرس بھی عدالت میں موجود
ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر پتھر جیسی سختی تھی۔ دونوں عورتوں
میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔
دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں الجھی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ
لیری فلائیڈ کی مسخ شدہ لاش کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی انہوں
نے کسی قسم کے جذباتی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں البتہ اس
تصویر کو دیکھنے کے بعد میٹ نے... بڑی مشکل سے اپنی ابکائی
پر قابو پایا۔ جب اس نے مڑ کر گلیسز کی طرف دیکھا تو وہ اپنے
ہاتھوں میں ایک معطر ٹشو پیپر دبائے اسے مسل رہی تھی۔ یہ گلیسز
کی پرانی عادت تھی جس سے اسے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔

جیری نے یہ نظریہ مسترد کر دیا کہ اس قتل کا محرک فوری
اشتعال تھا جس کی بنیاد گلیسز اور لیری کے ناجائز تعلقات تھے۔ اسی
نظریے کی بنیاد پر میٹ کے وکیل کو یقین تھا کہ جیوری اسے بری کر
دے گی لیکن گلیسز کے بیان کے بعد کمرۂ عدالت میں کوئی بھی
شخص یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اور لیری فلائیڈ آپس
میں محبت کرتے تھے۔ ریکارڈ کے مطابق وہ ایک ناکام ایکٹریس تھی
اور اسے شدت سے کام کی تلاش تھی اور اس نے فون کالز کے ذریعے
لیری فلائیڈ کی بیوی کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ جب لیری کی بیوی نے بھی
اسے مسترد کر دیا تو اس نے ایک ایسا جال تیار کیا جس میں پھنس کر
اس کے شوہر نے نشے کی حالت میں لیری پر حملہ کر دیا۔
گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اینا بیرس نے
حلفیہ بیان دیا کہ گلیسز ان دونوں میاں بیوی کو ہراساں کرتی رہی
اور اس مقصد کے لیے کئی بار اس نے ان کے دروازے پر
پیغامات بھی چھوڑے۔ گلیسز کے برعکس وہ ایک قابل اعتبار گواہ بھی
تھی اور اس کے بیان کا سنجیدگی سے نوٹس لیا گیا۔
جب میٹ پر فرد جرم عائد کی گئی تو وہ بالکل بھی حیران نہیں
ہوا کیونکہ تمام ثبوت اور شواہد اس کے خلاف تھے۔ البتہ یہ جان کر
اسے خاصی حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ اب بقیہ ساری عمر اسے جیل
میں گزارنا ہوگی۔ کمرۂ عدالت بہت جلدی خالی ہو گیا اس
لیے کہ حاضرین کے لیے اس مقدمے میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ
تھا۔ اگر لیری فلائیڈ بھی کوئی مشہور شخصیت ہوتی تو اس کے
ساتھ ساتھ میٹ کو بھی خاصی شہرت مل جاتی۔
اس مرحلے پر کچھ تاخیر سے ہی سہی میٹ کو احساس ہوا کہ قتل
کرنے کے لیے بھی کسی نامی گرامی شخصیت کا انتخاب کرنا چاہیے۔
اس نے گلیسز کی تلاش میں عدالت کا جائزہ لیا۔ اس امید پر کہ اس
دوسرے درجے کی اداکارہ کی آخری جھلک دیکھ لے جس کی خاطر
اس نے قتل جیسے جرم کا اعتراف کیا۔ وہ آخری قطار میں اینا بیرس
کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گلیسز نے ایک شرمیلی مسکراہٹ سے
لیری فلائیڈ کی بیوہ کی جانب دیکھا۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جو شادی
کے ابتدائی دنوں میں وہ اس پر نچھاور کیا کرتی تھی۔ اس وقت وہ
دونوں ہی اپنی اپنی حیثیت پر فاتح تھے۔ اینا بھی جواب میں
مسکرائی اور ان دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست
ہو گئیں۔ گلیسز نے میٹ کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ میٹ کو
اعتراف کرنا پڑا کہ اس وقت اس کی بیوی نے زندگی کی بہترین
پرفارمنس دی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے داد دیتا ایک گارڈ
نے اس کی ہتھکڑی کی زنجیر تھامی اور اسے اس جانب لے کر چل
دیا جو اس کا مستقل مسکن بننے والی تھی۔

☆

معاہدہ

رضوانہ منظر

چار قرض خواہوں اور ایک قرض دار کے درمیان طے پا جانے والا عجیب معاہدہ۔ وہ ایک ایک کر کے مارے جا رہے تھے۔ زندہ رہ جانے والے شکوک کی زد میں تھے۔ ایسی الجھی ڈور کا سرا تلاش کرنا ایک پولیس افسر کا فن اور ہنر ہوتا ہے

حرص و ہوس کے تانے بانے میں الجھی ایک کاروباری روداد

http://pakiunplace.blogspot.com

جارج ہینسی کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی قتل یا حادثاتی موت
[illegible]
[illegible]
ہو جاتی تھی جس سے تفتیش میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کیس میں بھی وہ
موقع واردات پر پہنچ کر لاش کے پاس کھڑا اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
مرنے والے کے جسم پر واحد لباس کا نیکر تھا اور اس کی لاش باغ میں پڑی
ہوئی تھی۔ اس کے سر کے پاس ہی ایک گملا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ سر سے بہنے
والے خون سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے شدید ضرب لگی ہے۔ اس کے
وجود کے پاس ایک بیلچہ پڑا ہوا تھا جسے یقیناً آلۂ قتل کے طور پر استعمال
کیا گیا تھا۔ اس کی تصدیق بیلچے کے بلیڈ پر لگے خون سے بھی ہو رہی
تھی۔ لاش کے گرد پولیس والوں نے نیلے اور سفید رنگ کا فیتہ باندھ دیا
تھا اور ڈاکٹر لوئس ڈی بکر لاش پر جھکی زخم کا معائنہ کر رہی تھی۔ سفید شرٹس
میں ملبوس پولیس اہلکار لان میں گشت کر رہے تھے اور اس کے عقب
میں سارجنٹ گریگ کسی خاتون سے باتیں کر رہا تھا جو بار بار اپنے آنسو
پونچھ رہی تھی۔ ہینسی وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس لیے ان دونوں
کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے قاصر تھا۔ وہ عورت ایک بنچ پر
بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جس سے وہ اپنی ناک اور
آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ سارجنٹ گریگ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا
اور بیچ بیچ میں اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔
"اس کے سر پر شدید ضرب لگی ہے۔" لوئس نے کھڑے
ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ لاش پارک سٹی لے جانی ہوگی۔ لیکن میں
وثوق سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے سر پر ایک سے زیادہ ضربات لگی ہیں۔
[illegible]
[illegible]
زخم لگا ہو۔ شاید یہ جدوجہد کے دوران ہوا ہو لیکن یہ معلوم کرنا
تمہارا کام ہے۔"
لوئس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا جیسا کہ اس کے پیشے کا تقاضا
تھا۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی اور سر کے بال آہستہ
آہستہ گر رہے تھے۔ "تم جتنی جلدی لاش میرے حوالے کر دو
گے میں اتنی ہی جلدی پوسٹ مارٹم بھی کر دوں گی۔"
"تمہارا کام ختم ہو گیا؟" ہینسی نے ایک کرائم افسر سے پوچھا
جو کیمرا پکڑے اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔
"یس سر!" اس نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔
"ٹھیک ہے۔ ہم یہ لاش روانہ کر رہے ہیں۔" ہینسی نے لوئس
سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
"میں پارک سٹی واپس جا رہی ہوں اور وہاں اس کا انتظار کروں
گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے چل دی۔ اس کے
جانے کے بعد ہینسی نے ماتحتوں کو ہدایت دی کہ وہ لاش کو پارک سٹی
اسپتال لے جائیں اور پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ کے حوالے کر دیں۔ یہ کہنے
کے بعد وہ گریگ کی طرف آیا جو ابھی تک اس عورت کے پاس کھڑا تھا۔
"مسز ولزم سر!" گریگ نے اس عورت کا تعارف کرواتے ہوئے
کہا۔ "اسی نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔"

"آئی سی۔ تمہیں تو بہت عرصہ ہو گیا ہوگا مسز لوزم؟"

"ظاہر ہے۔ تم جانتے ہو میری عمر تریپن سال ہے اور میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی لاش دیکھی ہے۔"

"تم نے یہ لاش کب دیکھی تھی؟"

"جب میں کام پر آئی جیسا کہ میں نے ابھی سارجنٹ کو بتایا کہ میں مسز اسٹریٹ کے یہاں ہفتے میں تین دن یعنی پیر، بدھ اور جمعے کے دن گیارہ بجے آتی تھی اور مسز اسٹریٹ کا لنچ بنانے اور صفائی کرنے کے بعد سہ پہر میں واپس چلی جاتی تھی۔"

"اس گھر میں اور کون رہتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ مسز اسٹریٹ نے شادی نہیں کی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کے مالی حالات خاصے بہتر تھے پھر شادی نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" جیمسی نے مکان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس کا اچھا خاصا بزنس تھا۔"

"کیا تم نے اس کی لاش گیارہ بجے کے قریب دیکھی؟"

"تقریباً بارہ بجے۔" مسز لوزم نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "میں سیدھی کچن میں چلی گئی اور اس کے لیے لنچ بنانا شروع کر دیا تھا ابھی سلاد باقی تھی کہ مجھے کسی کام سے باہر آنا پڑا لیکن وہ مجھے گھر میں نظر نہیں آئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے باغ میں چلی آئی۔ اسے باغبانی کا بہت شوق تھا جس کا اندازہ تم اس باغ کو دیکھ کر لگا سکتے ہو۔ اس نے کوئی مالی نہیں رکھا تھا بلکہ سارا کام وہ خود ہی کرتی تھی۔ اسے باغ سے بہت محبت تھی۔ اس کا کوئی خاندان نہیں تھا اس لیے وہ اسی باغ میں لگے پودوں سے دل بہلاتی اور ان کو ہی اپنی فیملی سمجھتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ میں نے پیچھے ہی اس کی لاش دیکھی اور فوراً ہی پولیس کو فون کر دیا۔"

"تم کتنے عرصے سے یہاں کام کر رہی ہو؟"

"دس سال سے اور میں سمجھتی ہوں کہ کسی کو جاننے کے لیے اتنا عرصہ کافی ہے۔"

"اس کے ملنے جلنے والے تھے؟"

"چند لوگ ہی اس سے ملنے آتے تھے۔ وہ گھر پر ہی کام کیا کرتی تھی۔ مجھے اس کے بزنس کی نوعیت معلوم نہیں۔ اس کی کوئی فیکٹری یا دفتر نہیں تھا لیکن وہ دن بھر کمپیوٹر اور فون پر مصروف رہتی۔ اس کی ڈاک بھی خاصی آتی تھی۔ ان میں زیادہ تر کاروباری خطوط ہوتے تھے۔ میں نے کبھی کوئی ایسا نہیں دیکھا جو ذاتی نوعیت کا ہو۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الگ تھلگ زندگی گزارنے کی عادی تھی۔"

"ہاں، میں نے کبھی اسے کسی دوست سے ملتے نہیں دیکھا۔ اس کا واسطہ صرف کاروباری دوستوں سے ہی تھا۔"

"ان میں سے کسی خاص دوست کو جانتی ہو؟"

"الفریڈ نوبل۔" اس نے جواب دیا۔

"الفریڈ نوبل۔" جیمسی نے اس نام کو دہرایا تا کہ گریج اسے اپنی نوٹ بک میں لکھ سکے۔

"میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔" مسز لوزم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "لیکن مسز اسٹریٹ ہمیشہ اس سے گرم جوشی سے بات کیا کرتی تھیں اور جب اس کا نام لیتے تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی۔ ان کے پاس اس کے لیے بہت وقت تھا۔"

"تمہیں اس کا پتا معلوم ہے؟"

"نہیں لیکن مسز اسٹریٹ کی اسٹڈی میں ایڈریس بک ہے اس میں یقیناً اس کا پتا ہوگا۔"

☆☆☆

الفریڈ نوبل چھوٹے قد کا خوش لباس شخص تھا۔ اس نے جیمسی اور گریج کا استقبال اپنی فیکٹری کے دفتر میں کیا جو بارک برنس پارک میں واقع تھی۔ جب اسے ان دونوں کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے صدمے کی حالت میں کہا۔

"کیا کہا! قتل ... تام کا قتل ہو گیا؟"

"ہمیں امید ہے کہ تم اس سلسلے میں ہماری مدد کرو گے۔"

"ممکن ہے کہ کام کے حوالے سے کچھ حریف بھی ہوں۔ کاروبار میں تو رقابت چلتی رہتی ہے لیکن اس کے لیے کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟"

"اس کے سر پر پیچھے سے وار کیا گیا جب وہ اپنے باغ میں تھا۔"

"لگتا ہے کہ یہ کسی چور کی کارستانی ہے۔" نوبل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"گھر کی حالت سے تو ایسا نہیں لگتا کہ وہاں سے کوئی چیز چرائی گئی ہو اور نہ ہی کسی مزاحمت کے آثار ملے ہیں۔ دراصل مسز اسٹریٹ اس وقت بھی ایک گملا اٹھائے ہوئے تھے جب ان پر حملہ ہوا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ حملہ آور کو جانتے تھے اور انہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔"

اسی دوران نوبل کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف سے بات سننے کے بعد بولا۔ "میں اس سے بعد میں بات کروں گا۔ اس وقت میں مصروف ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ جیمسی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ "مسٹر نوبل! کیا کوئی مسئلہ ہے؟"

"ہاں تین ہفتے پہلے قلب ایروا سمتھ ایک حادثے میں چل بسا تھا لیکن وہاں موجود ایک عینی شاہد کا کہنا ہے کہ وہ گاڑی رکی اور پیچھے کی جانب چلتی ہوئی اس کے جسم پر سے گزر گئی۔"

"مجھے وہ واقعہ یاد ہے۔" گریج بولا۔ "میں اس شام ڈیوٹی پر تھا اور جیسا کہ تم نے کہا مسٹر نوبل... وہاں ایک شخص اپنی دوست کے انتظار میں دروازے پر کھڑا تھا اور اس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک بڑی کار نے مسٹر ایروا سمتھ کو ٹکر ماری۔ ٹکر مارنے کے بعد پیچھے آئی اور ان کے جسم پر سے گزر گئی پھر دوبارہ آگے بڑھی اور ایک بار پھر ان کے جسم کو کچلتی ہوئی تیز رفتاری سے چلی گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی مرسڈیز بینز

تھی۔"

"پولیس اب تک اس کار کو تلاش نہیں کر سکی۔" نوبل نے کہا۔ "اس کا نام ایرک ہے کہ قلب ایروا سمتھ تام کا دوست اور بزنس پارٹنر تھا۔"

"کیا واقعی؟" جیمسی نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا اسٹیشنری کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ تم نے ہر بڑے شہر کی دکانوں، دفتروں اور لائبریریوں میں اس کی اسٹیشنری دیکھی ہوگی۔"

"ہاں۔" جیمسی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب یہ سارا کاروبار اس کی بیوی کی ملکیت ہے۔ وہ بے چاری صدمے کی کیفیت میں ہے۔ میں الیکٹرانک کے کاروبار سے وابستہ ہوں۔ ہم کمپیوٹر انڈسٹری کے لیے چپس تیار کرتے ہیں جبکہ تام سرمایہ کاری کرتا تھا۔ وہ کمپنیوں کے حصص خریدتا اور اگر ان کی مالیت میں ایک پوائنٹ کی بھی کمی ہوتی تو وہ فوراً انہیں بیچ دیتا۔ ہم چاروں میں کاروباری مراسم تھے یعنی قلب ایروا سمتھ، تام اسٹریٹ، میں اور ہیری موس... ہم چاروں گولف کلب میں اکٹھے ڈرنک کرتے اور وہیں ہمارے بیشتر کاروباری معاملات طے ہوتے تھے۔ تام کو ایک نئی کمپنی کے بارے میں معلوم ہوا جس کی پروڈکٹ کی کامیابی یقینی تھی۔ وہ اس میں سرمایہ لگانا چاہتا تھا اور اس نے ہمیں بھی رغبت دی کہ ہم بھی اس میں پانچ سال کے لیے ایک لاکھ پاؤنڈز کی سرمایہ کاری کریں جس پر اسے 25 فیصد منافع ملتا۔ بظاہر اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور تام کے خیال میں یہ ایک محفوظ سرمایہ کاری تھی لیکن ہیری موس نے بینک سے قرضہ لیا تاکہ وہ اس میں حصہ لے سکے [illegible] اسی لیے کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بات کی گارنٹی ہے کہ ہم لوگ پیسہ واپس لینے کے لیے زندہ رہیں گے۔ یہ ایک طرح کا قرض تھا۔ ہم شیئرز نہیں خرید رہے تھے جو وصیت کے مطابق ہمارے وارثوں کو مل جائیں۔ ہمارے مرنے کی صورت میں یہ رقم ڈوب جاتی کیونکہ جس شخص کو ہم قرض دے رہے تھے وہ صرف ہمیں ہی واپس کرنے کا پابند تھا۔ قانون اور مروجہ طریقہ کار کے مطابق اس پر لازم نہیں تھا کہ وہ ہمارے وارثوں کو یہ رقم واپس کرے۔"

"اس کے باوجود تم نے یہ قرض دے دیا؟"

"ہم میں سے ہر ایک نے ایک لاکھ پاؤنڈز کی سرمایہ کاری کی تھی۔ تاہم ہیری نے تجویز پیش کی کہ ہم اپنی رقم کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے مشترکہ قرض کا منصوبہ بنائیں۔ یہ ایک طرح کا کنسورشیم ہوتا ہے جس میں لوگ مل کر پیسہ اکٹھے کرتے ہیں اور دوسری پارٹی کو قرض دیتے ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی ممبر وفات پا جائے تو اس کے حصے کی رقم زندہ رہ جانے والے ممبران کو مل جائے گی۔ جب ہم نے اپنے وکیل کو یہ آئیڈیا دیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے اس نے بھی ایسی دستاویز تیار نہیں کی تھی تاہم قرض لینے والے ہمارے کلائنٹ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پانچ سال بعد چار لاکھ پاؤنڈز واپس کرنے کا پابند ہے۔ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہ رقم چاروں ممبران کو واپس کرے یا کسی ایک شخص کو۔"

"اس قرض کے حوالے سے اب تمہاری کیا پوزیشن ہے؟" جیمسی نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

"تام اسٹریٹ اور قلب ایروا سمتھ کے مرنے کے بعد ان کا حصہ بھی مجھے اور ہیری کو مل جائے گا لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ اس وقت تو ہم سب کو یہ آئیڈیا بہت اچھا لگا تھا لیکن اب یہ رقم میرے لیے حرام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہیری کے بھی یہی احساسات ہوں گے۔"

"کسی کو قتل کرنے کے لیے یہ ایک مضبوط محرک ہو سکتا ہے۔" جیمسی نے اس کے جذباتی انداز بیان سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

الفریڈ نوبل کی بھنویں تن گئیں اور اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔

"تام اسٹریٹ اور قلب ایروا سمتھ دونوں ہی میرے دوست تھے۔ جس دن تام اسٹریٹ کا قتل ہوا میں اپنے دفتر میں موجود تھا۔ میری سیکریٹری اس کی گواہی دے سکتی ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ جب قلب کو مارا گیا تو اس وقت میں کہاں تھا... لیکن کوئی بات نہیں اس کا پتا بھی چل جائے گا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ پیسوں کی خاطر ان دونوں کو قتل کیا گیا تو تمہیں فوراً ہیری کلوم کے پاس جانا چاہیے۔ اگر وہ ایک ایک کر کے چاروں لوگوں کو ختم کرے تو اسے چار لاکھ پاؤنڈز کے ساتھ ساتھ 25 فیصد منافع یعنی تقریباً نصف ملین کی بچت ہو جائے گی۔ تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ اتنی بڑی رقم کے لیے آدمی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ وہ تمہیں لانگ مارش برنس پارک میں ملے گا۔"

☆☆☆

الفریڈ نوبل سے ملنے کے بعد جیمسی اور گریج پولیس اسٹیشن گئے تو جیمسی کی میز پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پیغام موجود تھا۔ ڈاکٹر لوئس نے پارک سائیڈ اسپتال سے فون کر کے بتایا تھا۔ "مرنے والا تام اسٹریٹ سر پر شدید ضرب لگنے کے سبب ہلاک ہوا ہے۔ اس کے خون میں زہر یا کسی دوسرے کی علامات نہیں ملیں۔ مکمل رپورٹ جلد فیکس کر دی جائے گی۔"

جیمسی نے وہ نوٹ گریج کے حوالے کیا تا کہ وہ اسے فائل میں لگا لے پھر وہ گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چائے پی اور پھر لان میں ٹہلنے لگا۔ یہ باغ اس کی بیوی نے لگایا تھا جو اب تک زندہ ہوتی تو اسے دیکھ کر خوش ہوتی۔ وہ بیٹے کی پیدائش کے صرف تین ماہ بعد ہی چل بسی تھی۔ اس باغ سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اور وہ ہر روز وہاں ٹہلتا تھا۔ اپنی بیوی سے خیالوں میں باتیں کرتا، اسے دن بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا لیکن اس نے کبھی مشکل حالات کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ جب وہ زندہ تھی تب بھی وہ اسے اپنے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اس نے درخت سے ایک سیب توڑا اور اسے کھاتے ہوئے ٹونٹائن کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اصطلاح اس کنسورشیم کے لیے استعمال کی گئی تھی جو ان چاروں نے اپنے قرض کی رقم کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے استعمال کی تھی۔ جیمسی کو یقین تھا کہ تام اور ایروا سمتھ کی موت کا محرک یہی ٹونٹائن تھا۔ اب اسے اسی نکتے کو لے کر اپنی تفتیش کو آگے بڑھانا

http://pakfunplace.blogspot.com

تھا۔

☆☆☆

گرینج نے اپنی تفتیش کا آغاز اس شخص سے کیا جو بروا استھ کے حادثے کا گواہ تھا۔ اس نے گرینج کے مختلف سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک اندھیری رات تھی اور میں اپنی دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شادی شدہ عورت ہے اور اس کے شوہر کو شک ہو گیا ہے کہ وہ دوسرے مردوں سے ملتی ہے۔ وہ بہت ہوشیار شخص ہے۔ اپنے منہ سے بھی کچھ نہیں کہے گا لیکن اپنی بیوی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کر سکتا ہے تاکہ اس کی کچھ تصویریں حاصل کر کے طلاق کا مقدمہ دائر کر سکے۔ اسی لیے میں اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی وجہ سے میں حادثے کا منظر کچھ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔“

”میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے کیا دیکھا؟“ گرینج نے بڑے سکون سے پوچھا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی بات رہ گئی ہے جو میں نے پولیس کو نہ بتائی ہو۔“ اس شخص نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”وہ شخص سڑک کے کنارے جا رہا تھا کہ وہاں پہلے سے موجود ایک کار اس کی جانب بڑھی اور اس شخص کو ٹکر ماردی۔ پھر واپس پیچھے کی جانب آئی اور اس شخص کو کچلتی ہوئی [illegible] کے جسم پر سے ہوتی ہوئی تیزی سے [illegible] کی طرف بھاگ گئی۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ وہاں میرے سوا کوئی شخص نہ تھا کیونکہ رات کے وقت عام طور پر اس سڑک پر سناٹا ہوتا ہے۔ وہاں زیادہ تر دفاتر اور شوروم ہیں جو رات میں بند ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں اور میری دوست نے ملاقات کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ یہاں ہم پکڑے نہیں جا سکتے تھے۔ کوئی بھی شخص آپ کی جاسوسی کر سکتا ہے لیکن سنسان سڑکوں پر ایسا ممکن نہیں۔“

اسے بولنے کا مرض تھا لیکن گرینج صبر سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

”میں اسے سڑک پر نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن پولیس کو اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔ جانتا ہوں کہ آپ کسی زخمی شخص کو اپنے طور پر اسپتال نہیں لے جا سکتے لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بعض حالات میں قانون کی خلاف ورزی کس حد تک مناسب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے اسے گھسیٹ کر سڑک کے ایک جانب کیا۔ وہ اس وقت تک زندہ تھا لیکن اگر میں اسے سڑک کے درمیان میں ہی چھوڑ دیتا تو کوئی دوسری کار اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔ پھر میں فون کی تلاش میں گیا۔ راستے میں میری دوست بھی مل گئی۔ میں نے اسے واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ اس شخص کی جانب بھاگی جبکہ میں فون کرنے کے لیے بوتھ میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو میری دوست نے بتایا کہ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی اس شخص کی موت واقع ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی ایمبولینس بھی آ گئی۔ اس کے عملے کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ تم دونوں وہاں سے اپنے ساتھ لے گئے۔“

”غالباً وہ مرسڈیز بینز کار تھی جس سے یہ حادثہ ہوا؟“ گرینج نے پوچھا۔

”ہاں، میں اسکول کے زمانے سے ہی اس کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ اب کچھ امید ہو چلی ہے۔ گو کہ میں ان دنوں کوئی کام نہیں کر رہا لیکن میری دوست کا شوہر بہت دولت مند ہے۔۔۔“

گرینج کو اس کی بے تکی باتوں پر غصہ آنے لگا۔ اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ہینگ، کیا ہم اصل موضوع پر بات نہیں کر سکتے یعنی تمہارا مرسڈیز۔“

”ہاں لیکن میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کس ماڈل کی تھی۔“

”یہ تو بتا سکتے ہو کہ کیا وہ کار لیموزین جیسی بڑی تھی یا پھر کوئی اسپورٹس کار تھی؟“

”وہ اسپورٹس کار تو نہیں تھی اور نہ ہی بہت بڑی۔ اسے ہم درمیانے سائز کی کہہ سکتے ہیں۔“

”اس کار کی کوئی خاص بات جو نمایاں ہو؟“

”اس گاڑی پر ایک خراش تھی جو ایک طرف سے ہوتی ہوئی پچھلے حصے تک چلی گئی تھی لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں نے کئی مرسڈیز کاروں پر ایسے نشانات دیکھے ہیں۔ اس لیے اس بنیاد پر اس کار کو شناخت کرنا مشکل ہے۔“

”تمہارے بیان سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض ایک حادثہ نہیں تھا اور اس شخص کو جان بوجھ کر مارنے کی کوشش کی گئی۔“

”بالکل، میں اسے ارادی قتل سمجھتا ہوں۔ ڈرائیور اس پیدل چلنے والے [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] کا کام ہے۔“

”کیا تم نے اس پر غور کیا کہ پیدل چلنے والا کس طرف سے آ رہا تھا؟“

”میں نہیں دیکھ سکا لیکن میں نے ایک دروازہ کھلنے اور اس میں تالا لگنے کی آواز سنی تھی۔ وہاں بہت سے کاروباری مراکز ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ شخص اپنا کام دیر سے ختم کر کے اٹھا ہو۔ پھر میں نے گاڑی کی روشنیاں دیکھیں اور اس کے انجن کی آواز سنی۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ کار میں کتنے افراد سوار تھے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لگتا یہی ہے کہ اس میں ایک ہی شخص تھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک ہی دیکھی ہوگی کیونکہ کار تیزی سے دور ہو گئی تھی۔ کاش میں تمہاری اس سے زیادہ مدد کر سکتا۔“

”اس تعاون کے لیے تمہارا شکریہ۔“ گرینج اپنی نوٹ بک بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہینگ نے بھی اس کا ساتھ دیا اور اسے چھوڑنے دروازے تک چلا آیا۔

☆☆☆

”مجھے تو ابھی تک اس حادثے کا یقین نہیں آ رہا۔“ گریس ایرو استھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس نے مجھے دفتر سے اٹھتے وقت فون کر کے بتایا تھا کہ وہ گھر کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ وہ اکثر دیر تک کام کرنے کا عادی تھا اور جب بھی میں نے شکایت کی تو اس نے یہی کہا کہ

اگر میں اس گھر میں رہنا چاہتی ہوں تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں نے گھر کے باہر گاڑی رکنے کی آواز سنی اور اس کے بعد کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی جس پر مجھے تعجب ہوا کیونکہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ دروازے پر جا کر دیکھا تو وہاں فلپ نہیں بلکہ پولیس کھڑی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے مسز ایرو استھ۔“ ہیلسی نے اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا لیکن ہمیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔“

”بالکل، میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ یہ محض ایک حادثہ نہیں تھا جس کے نتیجے میں تمہارے شوہر کی جان چلی گئی۔ اس قتل کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہے اور ہمارے پاس یقین کرنے کی معقول وجوہات ہیں کہ اس قتل کا تعلق ٹام اسٹریٹ کے قتل سے ہو سکتا ہے۔ تم نے اس بارے میں خبر ضرور پڑھی ہوگی۔“

”میں نے ٹی وی پر خبروں میں دیکھا تھا۔ میں اس نام سے واقف نہیں ہوں کیونکہ میرا شوہر اپنے کاروباری معاملات کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔“

”تم الفریڈ نوبل، بیری موس یا ہینری کولم کے ناموں سے واقف ہو؟“

”نہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں سنا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ہیلسی نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارے علاوہ [illegible]“

”شاید [illegible] وہ ہڈرز فیلڈ میں ایک نئی دکان کھولنا چاہ رہا تھا اور اسی کی تیاریوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے اسے گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔“

”تم اس کے کسی دشمن کو جانتی ہو؟“

”نہیں، ممکن ہے کہ اس کے کچھ کاروباری حریف ہوں لیکن میں اس کے کسی دشمن کو نہیں جانتی۔ شاید اس کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں اور نہ ہی اسے کسی سے کوئی خطرہ تھا۔“

☆☆☆

گرینج نے بیری موس کے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اسے وہاں ایک مرسڈیز بینز کھڑی نظر آئی۔ ”یہ کار تمہاری ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ گرینج اس کے لہجے میں چھپی ہوئی ناگواری کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”میرا خیال ہے کہ تم الفریڈ نوبل، فلپ ایرو استھ اور ٹام اسٹریٹ کو تو جانتے ہو گے؟“

”ہاں، میں نے فلپ اور ٹام کے بارے میں سنا ہے۔ واقعی یہ شاکنگ نیوز ہے۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی اس کنسورشیم کا حصہ تھے جو قرض کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے بنایا گیا تھا؟“

”ہاں، یہ آئیڈیا میرا ہی تھا۔ ٹام نے کولم کو قرض دینے کی تجویز پیش کی تو میں نے کہا کہ ہمیں ایک لون ہاؤس بنانا چاہیے تاکہ پوری رقم واپس مل سکے۔ اس عمر میں پہنچنے کے بعد زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ سارجنٹ۔۔۔ سوری، کیا نام بتایا تم نے۔۔۔ گرینج؟“

”مسٹر، مجھے گرینج ہی کہتے ہیں۔“

”شاید تم سمجھتے ہو کہ اب یہ رقم ہم دونوں کو مل جائے گی۔“

”ہاں اور تم دونوں ٹام اور استھ کا حصہ بھی وصول کرو گے۔“

”معاہدے کی رو سے تو یہی ہونا چاہیے لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے کولم قرض کی ادائیگی سے گریز کرے گا۔ اس طرح تو ہم اور نوبل بھی گھاٹے میں رہیں گے۔“

”کیوں؟“

”صاف ظاہر ہے۔ کولم ایک ایک کر کے اپنے قرض خواہوں کو ختم کر رہا ہے۔ اس طرح وہ قرض کی ساری رقم ہضم کر جائے گا۔ لگتا ہے کہ اس نے معاہدے پر دستخط تو ضرور کیے تھے لیکن قرض واپس کرنے کی نیت نہیں کی تھی۔“

”ہم اس سے بھی بات کریں گے لیکن کیا تم بتا سکتے ہو کہ کل شام تم کہاں تھے؟“

”کیوں؟ کیا مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے؟“

”ہاں۔ فی الحال ہمارے نزدیک ہر شخص مشتبہ ہے۔“ گرینج نے سرد لہجے میں کہا۔

بیری کے چہرے پر ناگواری کے آثار آ گئے اور اس کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا۔ [illegible]

”کل شام کہاں تھے؟“

”میں گھر پر ہی تھا۔“

”کام پر کیوں نہیں گئے؟“

”میں سہ پہر میں گھر واپس آ گیا تھا۔ کبھی کبھی گھر پر بھی کام کر لیتا ہوں۔“

”تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا جو موقع واردات سے تمہاری غیر موجودگی کی گواہی دے سکے؟“

”نہیں۔ میں گھر پر اکیلا ہی ہوتا ہوں۔ بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔“

گرینج کی اگلی منزل لانگ مارش برنس پارک تھی جہاں اسے ہینری کولم سے ملنا تھا۔ وہ نوجوان اور خوش پوش شخص تھا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال لمبے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ہیلسی نے ملاقات کا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم دو ایسے لوگوں کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں جن سے تم نے قرض لیا تھا۔“

”ہاں۔ میں نے بھی ان دونوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ کیا تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”میرے پاس انہیں قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انہوں

http://pakfunplace.blogspot.com

نے مجھ سے ایک ایسا معاہدہ کر رکھا تھا جس کے تحت اگر ان چاروں
میں سے ایک بھی زندہ رہا تو مجھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کی رقم واپس کرنا
ہوگی۔ میں ان چاروں کو قتل کرکے ہی یہ رقم ہڑپ کر سکتا ہوں لیکن اس
صورت میں میرے بچنے کے امکانات بہت کم ہوں گے۔ میں ابھی
جوان ہوں اور بقیہ ساری زندگی جیل میں نہیں گزار سکتا۔ ایسی صورت
میں جبکہ میری ایک اچھی فیکٹری ہو اور میں قرض ادا کرنے کی اہلیت رکھتا
ہوں۔" اس نے دیوار پر لگی تصویر کی جانب دیکھا جس میں وہ اپنی
بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے
نیچے دیکھا اور بولا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں کتنا مصروف ہوں۔ ہم
ہزاروں کی تعداد میں کیمیز چپس تیار کرتے ہیں۔ میں نے اسی قرض کی
رقم سے اپنے کاروبار کو آگے بڑھایا اور اب اتنی پیداواری گنجائش ہے
کہ تمام آرڈرز پورے کر سکتا ہوں۔ اس طرح قرض کی ادائیگی میرے
لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی میرے قرض خواہوں کو قتل کر رہا
ہے تو اس کا تعلق اس معاہدے سے بنتا ہے جسے ٹونٹائن کا نام دیا گیا
ہے اور جس کے تحت میں زندہ بچ جانے والوں کو رقم کی ادائیگی کا پابند
ہوں۔"

"کل صبح تم کہاں تھے؟"

"یہیں، اسی فیکٹری میں۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام
...ک۔"

"اس کا کوئی گواہ ہے؟"

کولم مسکرایا اور فیکٹری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"تقریباً پینتالیس افراد اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

☆☆☆

وہ دونوں دفتر میں بیٹھے کافی پی رہے تھے اور اب تک کی
ہونے والی تفتیش کے بارے میں تبادلہ خیال جاری تھا۔ یکایک گرینج
بولا۔ "بیری کے پاس بھی مرسیڈیز بینز کار ہے۔"

یہ سنتے ہی ایمسی نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ "تم
نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"کیونکہ ہمارے لیے وہ کار غیر اہم ہے۔ اس کا رنگ پیلا
ہے۔"

"رات کی تاریکی میں رنگ کا پتا نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ اس
نے غلطی سے پیلے رنگ کو سیاہ سمجھا ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ڈائریکٹری کے زرد صفحات میں کار ڈیلرز کے
نمبر دیکھنے لگا۔ جلد ہی اسے مرسیڈیز بینز کے ایجنٹ کا نمبر مل گیا اور اس
نے فون کر کے اپنا تعارف کروایا۔ کچھ دیر تک ان کی گفتگو جاری رہی
پھر اس نے فون رکھ دیا اور بولا۔

"صرف SLK ماڈل ہی پیلے رنگ میں دستیاب ہے۔ یہ
دو سیٹوں والی اسپورٹس کار ہے جبکہ عینی شاہد کا کہنا ہے کہ جس کار
سے ... کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ سیلون ٹاپ تھی اور اس پر ایک
... بھی پڑی ہوئی تھی۔"

"بیری کی کار پر بھی ایسا ہی ایک نشان ہے۔" گرینج چہکتے
ہوئے بولا۔

"کنسورشیم بنانے کا آئیڈیا بھی بیری نے ہی دیا تھا تاکہ
دوسرے قرض خواہوں کے مرنے کی صورت میں قرض کی ساری رقم
اسے مل جائے۔"

"ایک لاکھ کے بدلے پانچ لاکھ۔ سودا برا نہیں ہے۔" گرینج
نے تلخی سے کہا۔

"یہی قتل کا اصل محرک ہے۔" ایمسی فون اٹھاتے ہوئے
بولا۔ اس نے ایک بار پھر کار ڈیلر کا نمبر ملایا اور بولا۔ "سوری! دوبارہ
زحمت دے رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ شہر میں کتنے لوگ ایسے
ہیں جو مرسیڈیز بینز پر دوبارہ رنگ کرائیں۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر جواب کا انتظار کرتا رہا اور پھر اس نے سامنے
رکھے ہوئے پیڈ پر ایک نمبر لکھ لیا۔

"اس شہر میں صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں مرسیڈیز کے
معیار اور تصریحات کے مطابق گاڑیوں پر دوبارہ رنگ کیا جاتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے وہ نمبر ڈائل کیا جو ڈیلر نے اسے دیا تھا۔
گرینج نے کان لگا کر اس گفتگو کا خلاصہ جاننے کی کوشش کی۔ کچھ دیر
بعد ایمسی نے فون رکھ دیا اور بولا۔ "مسٹر بیری نے دو ہفتے پہلے اپنی
سیاہ مرسیڈیز پر پیلا رنگ کروایا تھا۔ اس کے سامنے والے مڈگارڈ اور
بونٹ پر بھی ڈینٹ تھے۔"

اسی دوران پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ایمسی نے فون اٹھایا اور
دوسری طرف ...
رہے تھے۔" پھر اس نے گرینج کو بتایا۔ "فرنٹ ڈیسک سے فون آیا
ہے۔ مسز ادھم کو کوئی بات یاد آگئی ہے جو وہ گزشتہ روز بتانا بھول گئی
تھی۔"

☆☆☆

مسز ادھم پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتا رہی تھی۔ "وہ
بہت تیزی میں میرے پاس سے گزرا تھا۔ دراصل میں اسے مسز
اسٹریٹ کے ڈرائیو وے سے نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکی۔ وہ بہت تیز
ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ پیلے رنگ کی بڑی سی کار میں سوار تھا۔ میں اس
شخص کو پہلے بھی مسز اسٹریٹ کے یہاں دیکھ چکی تھی۔ میرا خیال
ہے کہ وہ ان کے دوستوں میں سے ایک تھا۔"

☆☆☆

اس بیان کی روشنی میں بیری کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے
اوپر لگائے گئے الزامات پر کوئی تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرحال،
ایمسی کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے گھر آکر کھانا کھایا اور ایک بیگ میں
کپڑے رکھ کر ... کی جانب روانہ ہو گیا جہاں ... اس کا
انتظار کر رہی تھی۔

ایلن گھٹنوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر
پسینے کے قطرے نمایاں تھے اور پریشانی صاف جھلک رہی
تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں چیختے ہوئے صرف ایک
لفظ کہا۔

"چورا گیری۔"

اس کی آواز بہت زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن پھر بھی یہ
سوئے ہوئے اینڈی لوک ہارٹ کو جگانے کے لیے کافی تھی۔

اینڈی تھکن سے چور ہونے کے سبب سو رہا تھا لیکن جب اس کے کان
کے پردوں سے بیوی کی آواز ٹکرائی تو اس کا دماغ ایک دم
بیدار ہو گیا۔ اینڈی نیند سے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ ایلن کا
جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے۔ اس کے پٹھے گٹار کے تاروں
کی طرح اکڑے ہوئے تھے۔ انگلیاں سرد ہو رہی تھیں۔ گرم
رات میں بھی اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اینڈی کے لیے ایلن
کی یہ حالت حیرت کا سبب تھی۔

ایک شبِ ناتمام کے گرد گھومتی سنسنی خیز اور ناقابلِ فراموش شاہکار پارہ

شبِ صد ہزار

وہ ظالم بھی تھا اور فنکار بھی۔ خود تو خاک ہوا مگر اس کا
فن پارہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ زندہ رہا۔
ظلمتِ شب میں تراشی گئی ایک خونی فن پارے کی ملون کن
داستان، جس کا قہر ہزاروں تاریک راتوں پر محیط تھا
لیکن ہر شب کے مقدر میں ایک سحر ضرور ہوتی ہے۔

مختار آزاد

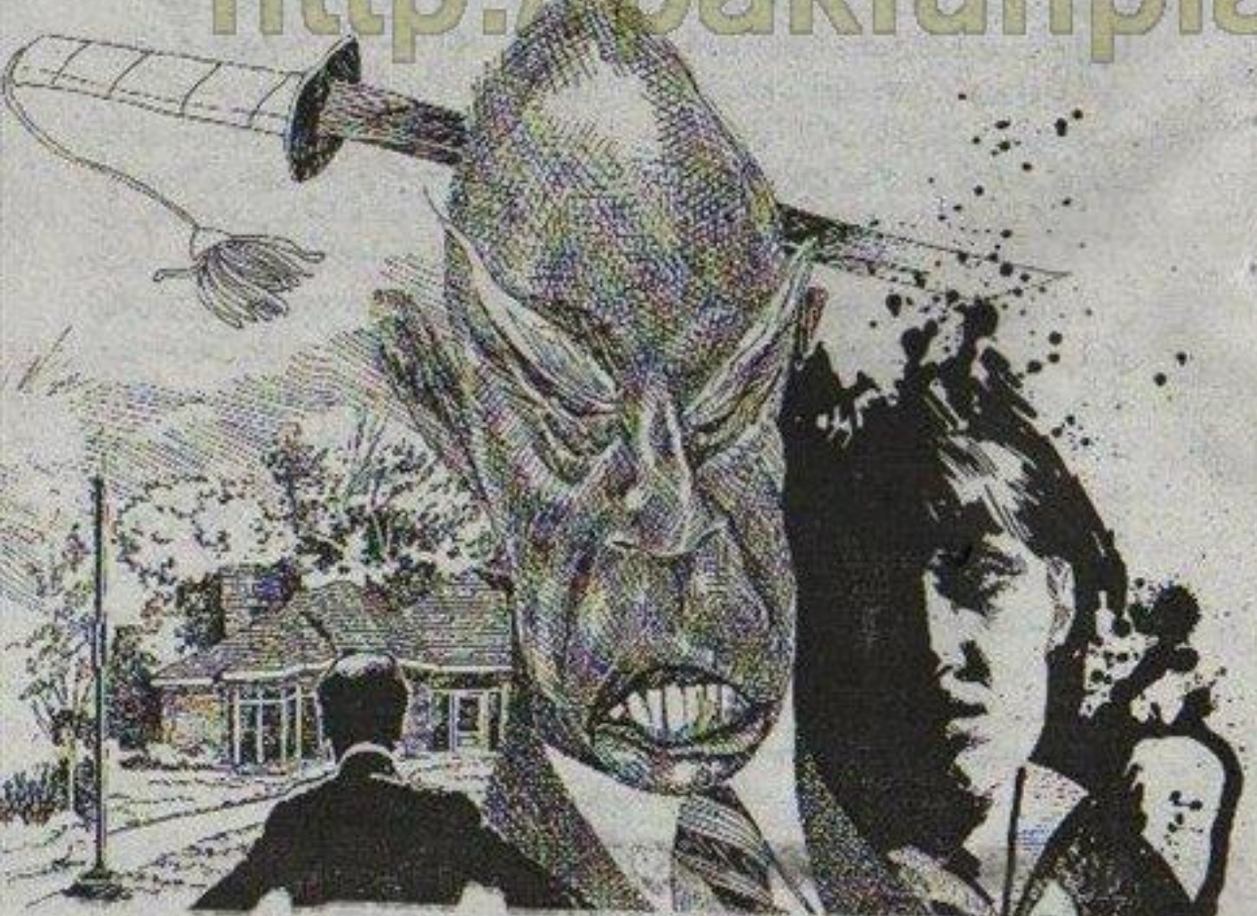

http://pakfunplace.blogspot.com

"ایلن... کیا ہوا؟" اینڈی نے نرم لیکن تعجب خیز لہجے میں کہا۔

شوہر کی آواز سن کر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر نظریں گھما کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی سانسیں بدستور بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے گہری سانس لی۔

"او میرے خدا... کتنا بھیانک خواب تھا۔" اس کی آواز میں اب بھی خوف کی واضح جھلک محسوس ہو رہی تھی۔

"اوہ تو تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔" اینڈی نے بیوی کی بات سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے چہرے سے تناؤ کے آثار کچھ کم ہوئے۔ "خیر چھوڑو، اب تم سو جاؤ۔" اس نے جماہی لیتے ہوئے بیوی کو مشورہ دیا۔

"کیا کہا... سو جاؤں؟" ایلن نے شوہر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تم اسے خواب کہہ رہے ہو۔ وہ بالکل حقیقت جیسا تھا۔ مجھے اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔" اس کی آواز بدستور کسی انجانے خوف کے باعث لرز رہی تھی۔

"تم نے خواب میں ایسا کیا دیکھ لیا جو اب سونے سے بھی ڈر رہی ہو؟" اینڈی کی آنکھوں سے نیند دور بھاگ چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیوی سے پوچھنے لگا۔

"بہت بھیانک خواب تھا۔"

"دیکھا کیا ہے تم نے؟" اینڈی نے پوچھا۔

"میں نے دیکھا کہ ایک پہاڑ کے کنارے پر بہت ہی گھنا، تاریک اور خوفناک جنگل ہے اور میں اس جنگل میں آگے کی جانب بڑھتی جا رہی ہوں۔" ایلن نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنے شوہر کو خواب سنانا شروع کیا۔ "میں جس زمین پر چل رہی ہوں، وہ گیلی ہے جس کی وجہ سے مٹی کیچڑ بن چکی ہے اور میں اس کیچڑ میں لڑکھڑاتے ہوئے چل رہی ہوں۔ جنگل میں اتنی گہری دھند چھائی ہوئی ہے کہ چند فٹ کی دوری پر بھی کچھ دیکھنا محال ہے۔ میری سانسیں اس طرح پھول رہی ہیں جیسے میں کہیں بہت دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہوں۔ اس کے بعد..." یہ کہہ کر ایلن خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے گہرے سائے چھانے لگے۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" اینڈی دلچسپی سے ایلن کا خواب سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو کچھ دیر تک وہ اس کے چہرے کو تکتا رہا مگر جب وہ کچھ نہیں بولی تو اس نے ٹوکا۔ "اس کے بعد..."

ایلن نے خلا میں ایسے تکنا شروع کر دیا جیسے کسی نادیدہ شے کو گھور رہی ہو۔ اس کا چہرہ بدستور خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پھر میں نے وہ چہرہ دیکھا۔ اف میرے خدا!" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ "کتنا بھیانک چہرہ تھا وہ۔" یہ کہتے ہوئے ایلن کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اینڈی بھی بیوی کو خوف زدہ دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔

"اینڈی..." ایلن اچانک شوہر سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی اور روتے ہوئے بولی۔ "اس کا چہرہ اتنا خوفناک تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بالکل شیطان کا سا چہرہ تھا۔ وہ بالکل کالا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے ابھی کسی ڈرم میں ڈبو کر باہر نکالا گیا ہے اور چہرے پر ایسی دہشت تھی جیسے وہ مجھے ابھی کچا چبا جائے گا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بتا رہی تھی اور اینڈی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے اوسان قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ وہ آنکھیں... وہ تو ایسی تھیں جیسے کسی ذبح کیے ہوئے سانڈ کی آنکھیں ہوں۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ یقین جانو... اس وقت میرے پاؤں زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئے ہوں۔ میں چاہنے کے باوجود جنبش تک نہیں کر پا رہی تھی۔ جس طرح ہاتھ پھیلائے وہ میری جانب بڑھ رہا تھا، اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا گلا دبانا چاہتا ہو۔ اس نے میرے گلے کی طرف جب ہاتھ بڑھائے تو میں نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم کی پوری قوت کسی نے سلب کر لی ہو۔ میرا جسم شل ہو چکا تھا۔" ایلن نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنا خواب شوہر کو سنایا۔ "جب وہ میرا گلا دبا رہا تھا تو میرے حلق سے چیخ نکلی اور میں جاگ گئی۔" وہ بدستور شوہر کی بانہوں میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"ایلن... ہوش کرو۔ یہ تو صرف ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ تم اب تک اس کے خوف میں مبتلا ہو۔ اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو۔" ایلن اپنا خواب سنا چکی تو اینڈی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ وہ بیوی کی توجہ اس خواب کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔ "چلو ذرا آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔" اس نے بیڈ پر بیوی کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ "پانی پی کر طبیعت سنبھل جائے گی۔ ابھی تو آدھی رات ہی ہوئی ہے۔ ہم پھر سو جائیں گے۔" وہ پانی لانے کے لیے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"جاتی ہوں۔" ایلن نے جواب دیا۔ اس کی آواز سے اب بھی خوف جھلک رہا تھا لیکن اس کا لہجہ پہلے کی نسبت اب کچھ پرسکون تھا۔

ابھی اینڈی نے آدھا گلاس ہی پانی سے بھرا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے گلاس میز پر رکھا اور لپک کر فون اٹھا لیا اور ہیلو کہنے کے فوراً بعد خاموش ہو کر دوسری طرف سے مخاطب شخص کی بات سننے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے فون رکھ دیا اور دوبارہ جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔

جب وہ پانی لے کر واپس بیڈ روم میں پہنچا تو ایلن اب بھی خوف زدہ، سہمی سمٹائی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اسے گلاس تھمایا۔

"لو، پانی پی لو۔" ایلن نے پانی پی کر گلاس واپس کیا تو اینڈی کہنے لگا۔ "مجھے ذرا جانا ہے۔ تم ایسا کرو کہ آرام سے سو جاؤ۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" ایلن نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

"شہر کے مضافات میں دہرے قتل کی واردات ہوگئی ہے۔ ابھی ایرکسن نے مجھے فون پر بتایا ہے۔ میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ غسل خانے کے شیشے سے اس نے کمرے کی طرف جھانکا اور بیڈ کی طرف دیکھا۔ ایلن سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ ایلن بہت ڈری ہوئی تھی۔

ڈراؤنا خواب... آدھی رات... شوہر گھر سے باہر جا رہا ہے اور اندر مکمل تنہائی... ایلن نے سر کو جھٹکا دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ اسے یہ طویل رات تنہا ہی بسر کرنا تھی۔ اس نے چادر پاؤں سے سر تک تان لی اور آنکھیں موند کر نیند کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

اینڈی بطور سراغ رساں محکمۂ پولیس میں ملازم تھا۔ جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچا تو اس وقت ٹی وی کیمروں پر کئی لائٹوں سے پورا منظر واضح تھا۔ پولیس نے پٹیاں لگا کر جائے وقوعہ کو محفوظ کر دیا تھا۔ جب اینڈی وہاں پہنچا تو اس وقت چند پولیس اہلکار لان کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ خوبصورت لان تھا۔ گھاس تازہ تازہ تراشی گئی تھی اور اس پر اوس کے باعث کافی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ اینڈی اپنے ساتھی پولیس افسر ایرکسن کے ساتھ ہی جائے وقوعہ پر ایک کنارے کی جانب کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے پہلے ہی موقع واردات پر پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں کو پولیس کی تلاشی کے بعد ملنے والے شواہدات کی روشنی میں اس جگہ کا تفصیلی تجزیہ کرنا تھا اس لیے وہ دونوں پولیس کا

کام ختم ہونے کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے اور وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں اینڈی نے ایرکسن کو اپنی بیوی کے خواب کے بارے میں بھی بتا دیا۔ بس... پھر کیا تھا، وہ شروع ہو گیا نئے فلسفے بگھارنے کے لیے۔ اس کی باتیں سن سن کر اب بے چارہ اینڈی خود کو دل ہی دل میں کوسنے لگا کہ اس کی کیوں مت ماری گئی تھی جو اس نے ایلن کا خواب اسے سنا دیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لیے وہ خاموش بیٹھا اس کا فلسفہ سن رہا تھا۔

"اینڈی... میں نے یہ نہیں کہا کہ بھوت نہیں ہوتے مگر میرا خیال ہے کہ یہ حقیقت کے باوجود ہمارے دماغ کا خلل ہے۔ مثال کے طور پر کرسمس کو ہی لے لو۔ یہ حقیقت ہے مگر ہمارے دماغ کا تخیل بھی... کیسے؟"

"مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ نہیں آ رہیں۔" اینڈی نے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہت آسان ہے۔ بس ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو، کبھی کسی کے دماغ میں خیال آیا کہ پچیس دسمبر ہمارے مذہبی سربراہ کی پیدائش کا دن ہے تو اس نے اس دن کو منانے کا سوچا۔ یوں یہ حقیقت ہے مگر اس کو دیکھ کر کسی کو خیال آیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے... تو پھر تحفے، جوتے وغیرہ کی خریداری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ تخیل ہے۔ تو اس طرح حقیقت تو ہوتی ہے لیکن اس میں ہمارا تصور یا تخیل بھی شامل ہوتا ہے۔"

"اس بحث کو چھوڑو۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ اب تک کیا کچھ پتا چل سکا ہے۔" اینڈی نے لان کے آخری سرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

لان سے گھر کا اندرونی منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ شیشے والی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور اندر روشنی تھی جس کی وجہ سے اندر کا منظر واضح تھا۔ تفتیشی عملہ جائے واردات کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ وہ دونوں بھی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کے اندر پہنچ گئے۔

کمرے کا فرش خون آلود تھا اور تفتیش کرنے والے پولیس عملے نے جگہ جگہ کاغذ رکھ کر شواہد کی نشاندہی کی ہوئی تھی تاکہ بعد میں انہیں محفوظ کیا جا سکے۔ سنہری بالوں والی اس عورت کی لاش صوفے پر موجود تھی۔ وہ جس انداز میں بیٹھی تھی مرنے کے بعد صرف اس کا دھڑ ہلکا سا ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا اور جسم خون آلود تھا۔ اس کی

http://pakfunplace.blogspot.com

عمر بیس کوئی بتیس، چونتیس سال ہوگی۔ نیچے فرش پر اس عورت کے فربہ بھائی کی لاش پڑی تھی۔ اس موٹے آدمی کی لاش دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پیٹ پر کئی کاری وار کیے گئے تھے جو جان لیوا ثابت ہوئے۔ کمرے میں خون کی بو پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اینڈی کا جی متلانے لگا۔ ایرکسن بھی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"میرا خیال ہے کہ قاتل ڈور وے سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔" ایرکسن نے اینڈی سے سرگوشی میں کہا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔" اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"ارے وہ... وہ کیا ہے؟" اچانک ایرکسن کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا؟" اینڈی نے جلدی سے پوچھا۔

"اُدھر دیوار کی طرف دیکھو۔" ایرکسن نے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اینڈی نے جو کچھ دیوار پر دیکھا، اُسے دیکھ کر چونک گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ایرکسن سے پوچھا۔

"کسی نے دیوار پر کچھ لکھا ہے مگر خون سے۔" ایرکسن نے دیوار کے سامنے پہنچ کر کہا۔ وہ دونوں دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر خون سے لکھے گئے اس نشان کا جائزہ لے رہے تھے۔

دیوار پر جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ جلی حروف میں کسی غیر ملکی رسم الخط میں تھا جس کے بارے میں ان دونوں کو یقین سے کچھ علم نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ہی، عین خونی نشان کے نیچے، عورت کا خون آلود سر پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور پتلیاں اوپر کو چڑھ چکی تھیں۔ اس کے سر کے بال کافی بڑے اور چٹیا کی شکل میں گندھے ہوئے تھے جس کے آخری سرے کو سفاک قاتل نے مقتولہ کے ہی خون میں ڈبو کر برش کی طرح استعمال کیا تھا اور اس سے دیوار پر وہ عبارت تحریر کی تھی جو ان دونوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ اگرچہ خون خشک ہو چکا تھا۔ کمرے میں پھیلی بو اور کٹا ہوا سر دیکھنے کے باعث اینڈی کا جی بُری طرح متلا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ قے کر دیتا، اس نے ایک پولیس اہلکار سے غسل خانے کی سمت معلوم کی اور اس میں گھس گیا۔

کافی دیر بعد جب وہ غسل خانے سے باہر نکلا تو اس وقت تک لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال منتقل کیا جا چکا تھا۔ پولیس فوٹوگرافر نے جائے وقوعہ کی ویڈیو فلم بنائی تھی اور فوٹو بھی کھینچ لیے تھے۔ اب صرف اینڈی اور ایرکسن کو جائے واردات کا تفصیلی جائزہ لینا تھا۔ اس کے بعد انہیں مردہ خانے پہنچنا تھا۔ دونوں تن دہی سے اپنے کام میں جت گئے۔

☆☆☆

"میرے خیال میں ایک بڑے تیز دھار چاقو، بغدے یا ممکن ہے کہ تلوار سے اس عورت کا سر قلم کیا گیا ہے۔" ڈاکٹر گیرے نے عورت کی لاش کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو بھی ہتھیار استعمال کیا گیا ہو، پر ایک بات طے ہے کہ وار بھرپور قوت کے ساتھ کیا گیا تھا اور وار کرنے والا بھی خاصی جسمانی طاقت رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر... اینڈی نے تھوک نگلا۔ اس وقت وہ مقامی اسپتال کے مردہ خانے میں تھے۔ دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔ لاشوں پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں جن پر خون کے دھبے لگے تھے۔ اینڈی حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی قتل کی تفتیش جبر کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ جبراً یہاں موجود تھا۔ اگر تفتیش اس کے ذمے نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی مردہ خانے کا رخ نہ کرتا...

"ڈاکٹر... کٹانا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" [illegible] چہرے پر لاعلمی کے تاثرات اُبھر آئے۔

"ان کا مطلب ہے سمورائی تلوار؟" اینڈی نے ڈاکٹر کی وضاحت کے لیے مداخلت کی۔

"جی ہاں۔" ایرکسن نے یہ سن کر جلدی سے کہا۔ "یہ وہ روایتی تلوار ہے جو سمورائی قبیلے کے قدیم لوگ بطور ہتھیار استعمال کیا کرتے تھے۔" ایرکسن کی بات سن کر ڈاکٹر کے تنے ہوئے جبڑے پُرسکون ہو گئے۔

"اچھا... تو تمہارا خیال ہے کہ کٹانا..."

"جی ہاں۔" ایرکسن نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی۔ "جائے واردات پر چینی طرز کی... بلکہ، میرا خیال ہے کہ یقیناً وہ چینی عبارت ہی ہے اس لیے مجھے یہ خیال آیا ہے۔ ممکن ہے کہ قاتل ایشیائی نسل سے ہو یا پھر ایشیائی نہ ہو مگر مارشل آرٹ سے آگاہ ہو اور اس نے یہ تربیت چین میں یا کسی چینی باشندے سے حاصل کی ہو۔ اسی وجہ سے وہ چینی رسم الخط اور زبان سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔" ایرکسن نے تفصیل سے مفروضوں پر مبنی اپنے خدشات بیان کر ڈالے۔

"ہوسکتا ہے جس شخص نے یہ واردات کی ہے، وہ اس

http://paktunplace.blogspot.com

طرح کے آلاتِ قتل سے واقفیت رکھتا ہو اور اس نے جان بوجھ کر واردات کو پیچیدہ کرنے کے لیے ایسی کوشش کی ہو۔" اینڈی نے آہستہ سے کہا۔ ایرکسن یہ سن کر خاموش رہا۔

"زخموں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جس نے یہ وار کیے ہیں، اس آدمی کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہے۔ ویسے ضروری نہیں کہ قاتل مرد ہی ہو۔ یہ کوئی طویل القامت عورت بھی ہوسکتی ہے۔" ڈاکٹر نے ہاتھوں سے دستانے اتارتے ہوئے اینڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں اینڈی کا موبائل فون بج اٹھا اور اسے اس وحشت ناک کمرے سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔

"اینڈی بول رہا ہوں۔" اس نے فون کان سے لگا کر کہا اور خاموشی سے بات سننے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے "شکریہ" کہہ کر فون بند کر دیا۔ ان دو لفظوں کے سوا اس کے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکلی تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ فون کرنے والا اینڈی سے کیا کہہ رہا تھا۔

"چلو... چلتے ہیں۔" اینڈی نے فون جیب میں رکھتے ہوئے ایرکسن سے کہا۔ "ویسے کٹانا والی بات بھی اب مجھے بعید از قیاس لگتی ہے۔" یہ سنتے ہی ایرکسن کا چہرہ اتر گیا۔ "ہاں مسٹر ایرکسن! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مقتولین کے کمرے کی دیوار پر خون سے لکھی جو عبارت پائی گئی ہے، وہ چینی نہیں بلکہ جاپانی زبان ہے... اور وہ تحریر نہیں بلکہ علامتی نشان ہے۔" اینڈی کے منہ سے نت نئے انکشافات سن کر ایرکسن کی ذہانت پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی۔

"تو میرا خیال درست تھا، وہ ایشیائی باشندے والا..."

"شاید... یا شاید نہیں۔ ابھی اس بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔" اینڈی کی بات سن کر اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا اس کے پیچھے نیم دلی سے قدم اٹھاتا ہوا مردہ خانے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

وہ پستہ قامت بوڑھا شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایشیائی باشندہ تھا۔ اس چھوٹے قد والے آدمی کی عمر ساٹھ سال کے آس پاس ہوگی۔ اس نے پرانی وضع قطع کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی آستین کے آخر پر فوجی سپاہی کی طرح تین چمکتی پٹیاں سلی ہوئی تھیں۔ اس نے کوٹ کے نیچے گہرے سرخ رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر دھاتی فریم کی گول شیشوں والی عینک تھی جس کے سفید شیشوں سے اس کی آنکھیں گول گول گھومتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ جیسے ہی اینڈی پولیس

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی ﷺ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہیڈ کوارٹر میں واقع اپنے دفتر میں داخل ہوا، اس کا منتظر شخص اٹھ کر کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے داہنا ہاتھ آگے بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا۔ کارڈ پر ایک جانب جاپانی اور دوسری طرف انگلش میں عبارت لکھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر اوداما ساتو پی ایچ ڈی۔

کلچرل اتاشی قونصلیٹ آف جاپان، متحدہ ریاست امریکا۔

"تشریف رکھیے ڈاکٹر ماساتو۔" اینڈی نے کارڈ پڑھ کر اسے بیٹھنے کو کہا اور خود اس کے مقابل رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے سراغ رساں اینڈی۔" ڈاکٹر ماساتو نے خوش دلی سے رسمی کلمات کہے۔

"میرا خیال ہے کہ آپ ہماری مدد کرسکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح...؟ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ ہمیں خود آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" اینڈی نے سوالیہ انداز میں جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے جائے وقوعہ پر لکھی ہوئی اس جاپانی علامت کے بارے میں تھوڑا بہت تو ہمیں بتا ہی دیا ہے۔"

"جی ہاں..." ڈاکٹر ماساتو نے جواب دیا۔ "مگر یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ نشان مجھے زندگی میں پھر کبھی دوبارہ دیکھنے کو ملے گا۔"

"تو کیا اس طرح کا نشان آپ پہلے بھی کہیں اور دیکھ چکے ہیں؟" اینڈی نے حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تو بہت سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو میں امید بھی چھوڑ بیٹھا تھا۔"

"امید... کیسی امید؟" اب اینڈی کے چہرے پر پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔ ڈاکٹر صاف صاف بات کرنے کے بجائے پہیلیاں بجھوانے لگا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" ڈاکٹر ماساتو نے اینڈی کے لب و لہجے میں چھپی حیرت کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں یہ نشان دوسری بار دیکھا ہے۔ پہلی بار جاپان میں اسے دیکھا تھا۔

"یہ 1956ء کی بات ہے۔ اس وقت میں گریجویشن کررہا تھا جب میں نے یہ نشان پولیس فائل کے ریکارڈ میں دیکھا۔ اس کے بعد یہ نشان میں نے 1983ء میں دیکھا جس کے بعد اب تیسری بار یہ نشان دیکھ رہا ہوں مگر یہاں امریکا میں... یہ پہلا موقع ہے کہ جب میں نے یہ نشان دیکھا ہے۔"

ڈاکٹر کی باتیں سن کر اینڈی ایک بار پھر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سیدھی طرح مافی الضمیر بیان کرنے کے بجائے بات کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے وقت ضائع کررہا ہے۔ "ویسے ڈاکٹر ماساتو! کیا ہی بہتر ہو کہ آپ پہیلیاں بجھوانے کے بجائے سیدھے سادے لفظوں میں سارا ماجرا بیان کریں۔" اینڈی نے زبردستی اپنے لہجے کو شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر ماساتو نے کہا۔ "ہم سیدھے سیدھے مطلب کی بات پر آجاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس میں تہ کیا ہوا ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ یہ اس نشان کی فوٹو کاپی تھی جو جائے وقوعہ پر پایا گیا تھا۔ اس نے یہ کاغذ میز پر پھیلایا اور نشان کے اوپر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ وہ نشان ہے جو دیوار پر پایا گیا۔ یہ علامتی نشان بدنام زمانہ ہے۔" ڈاکٹر ماساتو نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ جو دوہرے قتل کی واردات ہوئی ہے، وہ قتل کی سادہ سی واردات ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اس کے پیچھے کوئی بڑی وجہ ہوگی۔ یقیناً کوئی نہایت غیر معمولی وجہ..." اینڈی نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہوچکے تھے۔ ڈاکٹر کی باتیں سن کر اس کا ذہن بھی الجھ گیا تھا۔

"ہاں... ممکن ہے۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "ویسے اینڈی، یہ آپ پر منحصر ہے کہ جو قیاس آرائی کررہے ہیں، اس کا حقیقی مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ البتہ میں ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں..."

"وہ کیا؟" اینڈی نے جلدی سے کہا۔

"دیوار پر جو علامتی نشان پایا گیا ہے، دراصل وہ جاپانی زبان کا ایک لفظ ہے مورا ماسا ہنزو... ایک نام جو جاپان میں بہت ہی بدنام ہے۔" یہ سنتے ہی اینڈی کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"ارے... نہیں نہیں۔ اب ایسی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں، وہ تو پانچ سو سال پہلے ہی مرچکا ہے۔" ڈاکٹر ماساتو نے اینڈی کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ کہا، اسے سن کر اینڈی جھلا کر رہ گیا۔ وہ دانت کچکچاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر ڈاکٹر بھی کھڑا ہوگیا۔ اینڈی غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو... ذرا مجھے وضاحت تو کرنے دو۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو... پلیز۔" ڈاکٹر نے اینڈی کو غصے میں دیکھا تو وہ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اینڈی نے کوشش کرکے خود کو نارمل کرلیا اور تحمل سے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"...تو آپ کہہ رہے ہیں کہ جائے واردات پر خون سے دیوار پر جو نشان بنا ہوا ملا ہے، وہ نام یا نشان جس شخص کی پہچان ہے... وہ پانچ سو سال پہلے جاپان میں مرچکا ہے؟"

"جی ہاں، میں یہی کہہ رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر اینڈی میز پر جھک کر اس نشان کو دیکھنے لگا جو اب ایک معمّا بنتا جارہا تھا۔

"یہ مورا ماسا نام لکھا ہوا ہے؟" اینڈی نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"آپ ٹھیک سمجھے۔ [illegible] ایک علامت بھی جانی جاتی ہے۔"

"مورا ماسا ہنزو کے متعلق آپ کیا کچھ جانتے ہیں؟" اینڈی نے کافی دیر تک نشان والے کاغذ کو دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"یہ پندرھویں صدی عیسوی کا ایک لوہار تھا مگر اس کا فن تلوار سازی تھی جس کے باعث اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تلوار سازی اور تلوار سازوں کا یہ سنہرا دور تھا۔" ڈاکٹر نے مورا ماسا کی کہانی سنانا شروع کی۔ اینڈی غور سے ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اب یہ جھکی ڈاکٹر کام کی بات پر بالآخر آہی گیا۔

"اس دور میں جاپان کے اندر تلوار سازوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جاپانی معاشرے میں ان کی بہت اہمیت تھی۔ تلوار سازوں کو لوہار کے بجائے فنکار مانا جاتا تھا۔ مصوروں، شاعروں اور ادیبوں کی طرح ان کی بھی جاپانی سماج میں بڑی قدرو منزلت تھی۔ اس دور میں تلوار سازی میں ہنرو کوسائی، یاماشرو جیسے لوگوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ یہ لوگ لوہے کے ٹکڑے سے ہی تلوار کو فن کا ایک نادر نمونہ بنادیتے تھے مگر مورا ماسا ان سے مختلف تھا... وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ وہ خون کا پیاسا تھا۔ یعنی خوفناک شیطان تھا۔" ڈاکٹر نے یہ کہہ کر ایک لمحے کو توقف کیا۔ اینڈی کو بھی اب ڈاکٹر کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے ڈاکٹر کو خاموش پاکر سوال کیا۔ "ویسے اس کی بنائی ہوئی تلواریں کیا بددعائی ہوتی تھیں؟"

"نہیں، صرف بددعائی ہی نہیں، وہ اس سے بھی بڑھ کر تھیں۔" ڈاکٹر بھی دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ جو شخص کچھ دیر پہلے اس پر برسنے کو تیار تھا، اب اس کی باتوں میں اپنی دلچسپی ظاہر کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "ویسے تم نے انگلش معاشرے کی ادبی تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ ان کے ہاں بددعائیں صرف اسی پر اثر انداز ہوتی ہیں جو ان پر یقین کرتا ہے۔" ڈاکٹر نے ایک استاد کی طرح کہنا شروع کیا۔

اینڈی بھی بغور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔ "ویسے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"کبھی کبھی تاریخ میں محض خیال آرائی بھی شامل ہوجاتی ہے جس کے باعث تاریخ میں شامل وہ واقعہ [illegible] حقیقت [illegible] قتل جیسے بھیانک جرم کی تفتیش کررہے ہو اور میں وہ شخص ہوں جو جائے واردات سے ملنے والے ایک اہم ثبوت کے بارے میں جانتا ہوں اور ایک ہی جیسی دو وارداتوں سے آگاہ ہوں۔ اس لیے ہم اپنی بات کا دائرہ صرف اس واردات تک ہی محدود رکھتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا تو اینڈی نے بھی مسکرا کر سر ہلادیا۔

"ہاں تو ہم بات کررہے تھے مورا ماسا ہنزو کی۔ تو بات یہ ہے کہ اس نوعیت کی پہلی واردات 1956ء میں ٹوکیو میں ہوئی جس میں ایک حبشی عورت قتل اس نشان کا شکار ہوئی تھی۔"

"حبشی عورت؟" ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں... دراصل وہ ایک جسم فروش عورت تھی۔ اس کے زیادہ تر گاہک امریکی سپاہی ہوتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں مردہ پائی گئی۔ اس کا سرتن سے جدا تھا اور لاش خون میں نہائی ہوئی تھی۔ جیسا کہ تمہارے کیس میں ہوا ہے، اسی طرح اس عورت کا کٹا ہوا سر بھی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ملا تھا۔ قاتل نے اس کے بالوں کی لٹ کو خون میں ڈبو کر دیوار پر مورا ماسا کا نشان بنادیا تھا۔"

"حیرت انگیز... ویسے اس عورت کے قتل کا شبہ کس پر کیا گیا تھا؟" اینڈی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ امریکی ریاست اوہائیو کے علاقے کلیو لینڈ کا رہائشی، فوج کا ایک معمولی افسر رابرٹ گلک کارڈی تھا۔" ڈاکٹر نے مبینہ قاتل کی کہانی سنانا شروع کی۔ "کارڈی کو جاپانی نوادرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس متعدد روایتی جاپانی ہتھیار موجود تھے۔ ان میں کئی بیش قیمت تلواریں بھی شامل تھیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے ایک ایسی تلوار بھی جس کے بارے میں شبہ پایا جاتا تھا کہ وہ بدنام زمانہ مورا ماسا کی تلوار ہے۔ خیر... جو لوگ اس بارے میں نہیں جانتے، ان کے لیے تو یہ نوادرات ہی تھے۔"

"تو اس مبینہ قاتل کا کیا ہوا؟" اینڈی نے دوبارہ گفتگو کا رخ موضوع کی طرف موڑا۔

"اس پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا۔ ویسے تو اسے قتل کے جرم میں موت کی سزا ہونی چاہیے تھی لیکن وہ بری ہوگیا۔"

"کیوں؟"

"سوال یہ اٹھایا گیا تھا کہ دیوار پر جو جاپانی تحریر یا علامت لکھی ہوئی تھی، وہ خاص جاپانی رسم الخط 'کانجی' میں تھی اور کسی غیر ملکی کے لیے اس تحریر پر جلدی عبور پانا ممکن نہیں تھا۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔

"لیکن نشان یا تحریر نقل کرکے بھی تو لکھی جاسکتی ہے؟" اینڈی نے پھر سوال کیا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر مسٹر اینڈی... جاپانی خطاطی ایک اعلیٰ فن ہے۔ جسم فروش عورت کے قتل کی واردات میں دیوار پر مورا ماسا کا نام جس طرز تحریر کیا گیا، وہ فن تحریر کے کسی ماہر کا انداز تھا، ایک نوآموز غیر ملکی کا نہیں، اسی لیے یہ شبہ تقویت پاگیا کہ قاتل غیر ملکی نہیں بلکہ کوئی جاپانی تھا۔ اور امریکی سپاہی کو بری کردیا گیا۔"

"تو وہ بے گناہ تھا؟" اینڈی نے پھر سوال داغ دیا۔

"ہاں... مگر اس کے خلاف ایک اور ثبوت تھا۔" ڈاکٹر نے اینڈی کا سوال سن کر مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "چونکہ وہ نوادرات جمع کرنے کا شوقین تھا۔ اس کے پاس موجود نوادرات میں ایک ایسی تلوار بھی موجود تھی جس کی قیمت کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ یہ تلوار بہت تیز دھار تھی۔ خیال ہے کہ اسی تلوار سے ناگا تاکی نے 1600ء میں ہونے والی مشہور زمانہ جنگ سیکی گھارا میں توکوگاوا ماسا کو قتل کیا تھا۔ یہ تلوار اتنی تیز تھی کہ اس نے لوہے کے بنے خود کو کاٹتے ہوئے گردن تک

http://pakfunplace.blogspot.com

ں کے سرکو دو حصوں میں تقسیم کر ڈالا تھا۔ بلاشبہ بیش قیمت تلوار تھی۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے کہانی بیان کی۔ "اس کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد اس تلوار سے کئی جاپانی ر ماؤں کا قتل ہوا جس پر سب کو یقین ہو گیا کہ یہ تلوار یقیناً مورا ماسا سنیرو کی ہی تلوار ہے۔ خیال تھا کہ جسم فروش عورت کا قتل بھی اسی تلوار سے کیا گیا ہے مگر اسے ثابت کرنے کا موقع نہیں آیا اور فوجی عدالت نے صرف خطاطی کے ٹکٹے پر اسے بری کر دیا۔"

"کہانی دلچسپ ہے لیکن میں قتل کی جس واردات کی تفتیش کر رہا ہوں، اس سے قطعی غیر متعلق لگتی ہے۔" اینڈی نے بظاہر جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"تم غلطی پر ہو۔ یہ قطعی طور پر اس قتل سے متعلق داستان ہے جس کی تم تفتیش کر رہے ہو۔" ڈاکٹر نے برا سا منہ بناتے ہوئے اینڈی کے خیال کی تردید کی تو وہ ایک دم سے چونکتا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بری ہونے کے بعد کلارڈی کا کیا ہوا؟" اینڈی نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ کلارڈی فوج میں کیشیئر تھا۔ وہ قتل کے الزام سے تو بری ہو گیا لیکن اس نے فوج میں کئی گھپلے کیے تھے۔ آخر ایک دن اس کی چوری پکڑی گئی اور اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ بعد میں وہ امریکا واپس چلا آیا۔ وہ اپنے نوادرات اور وہ تلوار بھی ساتھ ہی لے آیا تھا۔ 1959ء میں وہ ایک بینک لوٹتے ہوئے پولیس کی گولی کا نشانہ بنا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو بڑی تعداد میں جاپانی نوادرات وہاں موجود تھے لیکن وہ بیش قیمت مورا ماسا تلوار غائب تھی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر ایک لمحے کو رکا۔ اب اینڈی کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کلارڈی کی مورا ماسا تلوار اور اس قتل کے بارے میں ڈاکٹر کیوں کہہ رہا تھا کہ ان کے درمیان ربط موجود ہے۔ "پھر یوں ہوا۔" ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی بات شروع کی۔

"یہ 1983ء کی بات ہے۔ شکاگو میں بالکل اسی قسم کا ایک قتل ہوا جیسا کہ جاپان میں ہوا تھا اور اسی نوعیت کے ایک کیس کی تفتیش اب تم کر رہے ہو۔ بس یہی بات ہے جس نے جاپانی حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کر دی تھی۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ کلارڈی کے بعد سے اب تک وہ تلوار نہیں ملی اور نہ ہی قاتل پکڑا گیا؟"

"تمہاری آدھی بات درست ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"شکاگو والے واقعے کے بعد پولیس کو ایک مقتول کی کار سے وہ تلوار ملی۔ اس کے بعد سے جاپان وہ تلوار واپس لینے کے لیے مسلسل سفارتی کوششیں کرتا رہا۔ 1987ء میں پہلی بار امریکا آمادہ ہوا تھا وہ تلوار واپس لینے۔ یہ تلوار چونکہ جاپان کا ثقافتی ورثہ ہے، اس لیے امریکی حکومت نے اسے واپس لوٹانے کی ہامی بھری اور جب میں اسے اپنی تحویل میں لینے کے لیا یہاں پہنچا تو اس سے کچھ گھنٹے پہلے یہ تلوار پولیس کی تحویل سے چوری ہو چکی تھی۔ اس لیے اب تم تلوار کو ڈھونڈو، قاتل خود بخود مل جائے گا۔ بس... میں یہی سب کچھ تم سے کہنا چاہتا تھا۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لے کر اپنی بات مکمل کی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے یقین ہے کہ اب تمہیں قاتل اور تلوار کے درمیان موجود تعلق بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا ہوگا۔" ڈاکٹر نے اینڈی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بس تلوار ڈھونڈ لو... سمجھے؟" ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جب اینڈی گھر سے روانہ ہوا تھا، اس وقت آدھی رات تھی مگر جب گھر میں داخل ہوا تو وہ رات ہی نہیں، پورا ایک دن بیت چکا تھا اور دوسری رات آ چکی تھی۔ گھر میں کھانے کی مہک پھیلی ہوئی تھی جس نے اس کی بھوک کو جگا دیا۔ وہ سیدھا کچن کی طرف گیا۔ ایلن نے اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ بھوکا ہوگا۔ اس لیے اس نے فوراً ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانا شروع کر دیا۔ اینڈی نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا پکڑا ہوا تھا جس میں جاپان کے روایتی ہتھیاروں کی تاریخ کے بارے میں ایک کتاب تھی جو اس نے گھر آتے ہوئے ایک قریبی دکان سے خریدی تھی۔

"ہیلو ایلن۔"

"ہیلو... لگتا ہے بہت پیچیدہ کیس ہے، تبھی اتنی دیر لگا دی ورنہ تم تو جلدی آنے والے تھے۔" ایلن نے شکایتی انداز میں برتن لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... بہت ہی پیچیدہ کیس ہے۔ خیر، چھوڑو اسے... بس کھانا لگاؤ۔"

"جاؤ... پہلے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ اور کپڑے بدل لو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کھانا شروع کرتے، ایرکسن بھی آ گیا۔ ایرکسن بہت باتونی تھا۔ کھانا تیار دیکھ کر اس نے بھی فوراً بھوکا ہونے کا اعلان کیا اور کرسی کھینچ کر میز پر بیٹھتے ہوئے

برتنوں کو تکنے لگا۔ ایرکسن کا اینڈی کے گھر آنا جانا تھا۔ ایلن بھی اس کو پسند کرتی تھی اس لیے تینوں بڑے سکون سے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔

کھانے کے بعد وہ تینوں لیونگ روم میں آ گئے۔ اینڈی اپنی بیوی کو قتل کی واردات اور جاپانی ڈاکٹر سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اپنی عادت سے مجبور ایرکسن نئے نئے فلسفے بگھارتا رہا۔ ایلن بھی اس کی یہ عادت جانتی تھی اس لیے وہ بھی برا منائے بغیر اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ کافی دیر بعد ایرکسن نے جماہی لی۔ "بھئی میں تو چلتا ہوں۔ اب نیند آ رہی ہے۔ ویسے بھی آدھی رات ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اینڈی نے کہا۔ "تمہارا شکریہ کہ تم آئے۔"

"نہیں... ایلن کا شکریہ کہ اتنا لذیذ کھانا کھانے کو ملا... بائے۔" ایرکسن ان دونوں کو الوداع کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اینڈی کو یاد تھا کہ کل رات کے بھیانک خواب کے بعد ایلن کی بہت بری حالت ہوئی تھی۔ وہ اس کی دل جوئی کرتا رہا تاکہ اس کے ذہن سے کل رات کے خواب کے اثرات دور ہو جائیں۔

"تو اسی لیے تم یہ کتاب خرید کر لائے ہو؟" باتوں کے دوران میں ایلن نے سائڈ ٹیبل پر رکھی جاپانی ہتھیاروں کے بارے میں لکھی کتاب کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈاکٹر کی اس بات میں وزن محسوس ہوا ہے کہ تلوار کو ڈھونڈ لو، قاتل خود بخود مل جائے گا۔" اینڈی نے ایلن سے کہا۔

اس کے بعد بھی دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن ہفتہ تھا اور اینڈی کی ہفتہ وار تعطیل بھی اس لیے وہ دونوں ویک اینڈ کے باعث کافی سکون محسوس کر رہے تھے۔ رات بارہ بجے کا وقت ہوگا، جب اینڈی نے ٹی وی کھولا تو ایک فلم شروع ہو رہی تھی۔ فلم بہت دلچسپ تھی۔ دونوں فلم دیکھتے رہے۔ فلم ختم ہوئی تو اینڈی نے کافی کی فرمائش کر دی۔ ایلن کافی بنا کر لائی اور دونوں کافی پیتے رہے۔ کافی پینے کے بعد ایلن بستر پر لیٹ گئی اور وہ کتاب پڑھنے لگا۔ ایلن آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک اس کا جسم اکڑنے لگا۔ آنکھیں خوف سے ابلنے لگیں اور جسم پسینے میں نہا گیا۔ اچانک اینڈی نے کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے سر گھما کر ایلن کو دیکھا تو اس کی غیر معمولی حالت دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا یا سمجھتا، اچانک ایلن کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ زور دار آواز میں چلائی۔ "دیورا گیری۔"

یہ لفظ جب ایلن کے منہ سے نکلے اس وقت وہ نیند میں تھی اور نہ ہی کوئی سپنا دیکھ رہی تھی۔ اینڈی فوری طور پر کچھ نہیں سمجھ سکا مگر اس چیخ کے بعد ایلن پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور جب اینڈی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ ہوش میں آئی تو اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

اینڈی دفتر میں بیٹھا شکاگو میں 1983ء میں ہونے والی اس قتل کی فائل پڑھ رہا تھا جس کی مماثلت اس کے کیس سے تھی۔ فور اسٹار ہوٹل میں ہونے والی اس واردات میں مرنے والے دونوں افراد عام لوگ تھے۔ ایک ہوٹل کا ملازم اور ایک گاہک تھا۔ دونوں افراد قطعی غیر اہم تھے۔ پولیس کوشش میں نہ تو قاتل کا پتا چلا اور نہ ہی قتل کا سبب معلوم ہو سکا اس لیے کئی سال بعد کیس کو داخل دفتر کر دیا گیا۔

اسی دوران میں اینڈی کو کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ ایرکسن تھا۔ "کبھی مجھے تو شوہر بیچارہ لگنے لگا ہے۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"ارے میں مینڈی کے شوہر کی بات کر رہا ہوں۔"

"کون مینڈی؟"

"اتنی جلدی بھول گئے۔ ارے وہی مینڈی جس کا تن سے جدا سر دیکھ کر تم باتھ روم میں دوڑ گئے تھے۔" ایرکسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار تم بھی نا..." اینڈی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ویسے اس کا شوہر... کہاں ہے وہ؟"

"خیال ہے کہ وہ میکسیکو بھاگ گیا ہے جہاں اس کا پورا خاندان رہائش پذیر ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"گستیر یز البرکون۔"

"تو تم ساری معلومات لے آئے ہو؟"

"ہاں... بات یہ ہے کہ مینڈی اور اس کے شوہر میں کافی عرصے سے ان بن چل رہی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ مینڈی بدچلن ہے اسی لیے وہ اس سے الگ رہ رہا تھا۔ اطلاع ہے کہ

http://pakfunplace.blogspot.com

جب مینڈی کا قتل ہوا تو اس کے بعد وہ ڈر کر میکسیکو چلا گیا۔ ویسے بھی وہ نسلاً ہسپانوی ہے اور اس کا آبائی تعلق میکسیکو سے ہے۔ ایک اور کام کی بات پتا چلی ہے۔" یہ کہہ کر ایرکسن خاموش ہو گیا۔

"وہ کیا؟" اینڈی نے پوچھا۔

"ایلرکون مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔" ایرکسن نے اینڈی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ایرکسن نے جب یہ کہا تو اس وقت بھی وہ تلوار کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن وہ یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اسے قاتل سے زیادہ اب تلوار کی تلاش ہے۔ خاص کر وہ ایرکسن کو تو یہ بات بتانا ہی نہیں چاہتا تھا اس لیے جب اس نے مارشل آرٹ کا تذکرہ کیا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی؟"

"مینڈی کی بہن سے۔ میں اسی سے مل کر آرہا ہوں۔ بڑی شریف عورت ہے وہ۔ کہہ رہی تھی کہ ایلرکون شریف آدمی ہے۔ اصل میں ساری غلطی اس کی بہن کی ہے۔ اسے ہی نت نئے دوست بنا کر بیڈ روم میں لانے کا شوق تھا۔ ایلرکون کب تک برداشت کرتا۔ آخر ایک دن وہ اسے چھوڑ گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں [illegible] کیس کی فائل ختم کر لوں تو پھر دیکھتے ہیں [illegible]۔" یہ کہہ کر اینڈی دوبارہ فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

کافی دیر بعد اس نے فائل بند کر کے رکھی اور ایرکسن کے پاس گیا۔ "مجھے اس سراغ رساں سے ملنا ہے جس نے ڈاکا کیس کی تحقیقات کی تھیں۔ اس کا نام ویزرک ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس کے بارے میں پتا کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ایرکسن نے ہیومن ریسورس ڈپارٹمنٹ کا نمبر ملانا شروع کر دیا اور اینڈی واپس اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا۔" تھوڑی دیر بعد ایرکسن نے اس کے پاس آ کر کہا۔ "بہت عرصے پہلے اسے پولیس کی ملازمت سے اس کے خراب رویے کے باعث برطرف کر دیا گیا تھا، جس کے بعد اسے دل کا دورہ پڑا... اس کے بعد پتا نہیں کہ اس کا کیا بنا۔"

"ٹھیک ہے۔" اینڈی نے مختصر سا جواب دیا۔ ایرکسن بھی اسے خاموش دیکھ کر واپس اپنی میز پر چلا گیا۔

امریکی قوانین کے تحت بینک ڈکیتی وفاقی جرائم میں شامل ہوتے ہیں اس لیے اس کا ریکارڈ بھی واشنگٹن پولیس کے پاس تھا۔ ایرکسن کے جانے کے بعد اینڈی نے اس ڈکیتی کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ اپنے کمپیوٹر پر پڑھنا شروع کر دیا۔

ریکارڈ کے مطابق 1959ء میں بینک ڈکیتی کے دوران میں کلارڈی جس پولیس والے کی گولی سے ہلاک ہوا تھا، اس کا نام ٹائیگر کرزن اور عمر تیس سال تھی۔ ریکارڈ کے مطابق وہ پولیس والا ڈکیتی کے وقت گشت پر تھا اور جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ ہاتھ میں بڑا سا تھیلا لے کر کار کی طرف بھاگنے والا ڈاکو ہے، اس نے اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔ اسی دوران میں بینک سے بھی لوگ بھاگ بھاگ کر باہر آنے لگے۔ اس صورت حال میں شاید کلارڈی بدحواس ہوا اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب کرزن نے گولی چلائی اسی وقت کلارڈی کو ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گرا اور گولی اس کے سر میں جا لگی۔ یوں وہ ہلاک ہو گیا۔

اینڈی نے کمپیوٹر بند کیا اور میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تلوار کی تلاش کا ایک تسلسل بنتا جا رہا تھا۔ کلارڈی، کرزن اور ویزرک... اصل قاتل کون ہو سکتا ہے؟ کیا مینڈی کا شوہر ایلرکون؟ مگر سوال یہ ہے کہ ویزرک اور ایلرکون کے درمیان کیا تعلق بنتا ہے؟ اینڈی کے دماغ میں سوالوں کی کھچڑی پک رہی تھی لیکن وہ کسی پر بھی شک کی انگلی اٹھانے کے مقام تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

"یہاں آؤ۔" کافی دیر بعد اس نے اپنے معاون سراغ رساں ایرکسن کو آواز دی۔

"کیا بات ہے؟"

"قتل والی شام مینڈی کی مصروفیات کا ریکارڈ چاہیے۔ وہ کہاں گئی، کس سے ملی اور کیا کچھ کرتی رہی۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کا بھائی تو بن موت مارا گیا، اصل شکار مینڈی تھی۔ ویسے بھی تمہارا کہنا ہے کہ وہ شوقین مزاج تھی۔" اینڈی نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"میں نے ساری تفصیلات جمع کر لی ہیں، بس ایک منٹ رکو۔" یہ کہہ کر ایرکسن اپنی میز کی طرف بڑھا اور کچھ دیر میں اس نے ایک پرچہ لا کر اینڈی کو تھما دیا۔ "تمہارے حکم کے مطابق تمام معلومات اس پرچے میں درج ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اینڈی کاغذ پر درج معلومات کو غور سے پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"تو تم مینڈی کے دوست ہو؟" اینڈی شہر کے باہر ایک عمارت کے دفتر میں موجود تھا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے طویل قامت آدمی سے اپنا تعارف کروانے کے بعد پوچھا۔ ایرکسن کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق مقتول مینڈی قتل والی رات جن لوگوں سے ملی تھی، ان میں یہ شخص واحد مرد تھا۔

"جی نہیں... ہم دوست نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے کو صرف جانتے تھے۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملا تھا۔"

یہ سن کر اینڈی نے ایرکسن کا دیا ہوا کاغذ کھول کر دیکھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ "ڈینیل آرزولا، عمر چھتیس سال، پیشہ ٹھیکے داری۔ مقامی چرچ کی سرگرمیوں اور خیراتی اداروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔"

"تو تم اس کے دوست نہیں بلکہ شناسا تھے؟"

"جی ہاں۔ ہمارا تعلق کوئی خاص قسم کا نہیں تھا۔" آرزولا نے جواب دیا۔

"جس رات قتل ہوا، اس رات تمہاری مصروفیات کیا تھیں؟" اینڈی نے پوچھا۔

"میں چرچ کے تحت کمیونٹی ہال میں ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھا۔ آپ ڈراما ڈائریکٹر سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"قتل رات دو بجے کے بعد ہوا ہے تب تک ڈراما ریہرسل تو ختم ہو چکی ہو گی؟" اینڈی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔

"میں ریہرسل کے بعد گھر چلا گیا تھا اور اس بات کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں کس وقت گھر میں داخل ہوا، [illegible] بستر پر لیٹا [illegible] میری آنکھ لگی [illegible] صبح [illegible] اپنے کمرے [illegible] پہنچ چکا تھا۔" اس کے لہجے میں چھپا ہوا طنز اینڈی نے محسوس کر لیا۔

"ٹھیک ہے، اگر ضرورت پڑی تو پھر ملاقات ہو گی۔" اینڈی نے اٹھتے ہوئے کہا اور ہاتھ ملائے بغیر دفتر سے باہر نکل آیا۔ یہاں سے وہ سیدھا پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ ایرکسن اپنی میز پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پکارا۔ "ایرکسن! یہاں آؤ۔"

"جی فرمایئے۔" ایرکسن فوراً اٹھ کر اس کی میز کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے ڈینیل آرزولا کے فلیٹ کا پتا اور اس بلڈنگ کے رات کے چوکیدار کا نام چاہیے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ معلومات بھی میں نے پہلے ہی حاصل کر لی تھیں۔ چند منٹ میں پیش کرتا ہوں۔" ایرکسن نے حسب عادت خوش مزاجی سے کہا۔

"بہت شکریہ۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اینڈی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب چوکیدار سے مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ جس رات مینڈی کا قتل ہوا، اس رات ڈینیل اپنے گھر کب لوٹا۔ یہ بھی جاننے کی کوشش کرو کہ وہ کب سے یہاں رہ رہا ہے اور اس کے قریبی ملنے جلنے والوں میں کون کون لوگ شامل ہیں۔"

"بہت بہتر جناب۔"

ایرکسن واپس اپنی میز پر گیا تو اینڈی نے ڈینیل سے ہونے والی گفتگو کو فائل میں لکھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے لیکن تفتیش آگے نہیں بڑھ سکی۔ بلڈنگ کا چوکیدار بیمار تھا اور ڈیوٹی پر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف ایرکسن کا کہنا تھا کہ وہ از خود ڈینیل کی کاروباری اور سماجی سرگرمیوں کی تفتیش کر رہا ہے۔ جیسے ہی کچھ بات پتا چلی، وہ فوراً اسے آگاہ کر دے گا۔

اس دوران ایلین بھی بظاہر ٹھیک ٹھاک رہی۔ اگرچہ دو دفعہ اینڈی نے ایلین کی جس حالت کا مشاہدہ کیا تھا، اس کے باعث اب وہ اس کی جانب سے مستقل طور پر تشویش میں مبتلا تھا لیکن اس نے یہ بات ایلین پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ مگر اس رات ایک عجیب بات ہوئی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ اینڈی کو اپنے سینے پر دباؤ محسوس ہوا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں لیمپ کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایلین اس کے سینے پر سوار تھی اور اس نے فضا میں اپنا ہاتھ اٹھایا ہوا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے منہ سے مسلسل یوراگیری، یوراگیری جیسے الفاظ نکل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شدید غصے کی حالت میں بڑبڑا رہی ہو۔ یہ دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ ایلین کی کمر کے گرد حائل کر کے اسے بستر پر پٹخ دیا۔ ایلین بے جان وجود کی طرح بستر پر گر گئی۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں لیکن اب اس کے منہ سے کوئی الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔

اینڈی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا۔ پورا کمرا روشنی میں نہا گیا۔ ایلین بدستور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی اور گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے وہ بستر پر لیٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ میدان میں پوری قوت سے دوڑ رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی سانسیں بے ربط ہو رہی ہیں۔ اینڈی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور ایلین کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایلین نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیں۔ ایسا

http://pakfunplace.blogspot.com

لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سے بیدار ہو رہی ہو۔

"کیا ہوا؟" چند لمحوں کے بعد وہ پوری طرح بیدار ہو گئی اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہ پانی کیسے گر گیا؟"

اینڈی سمجھ دار آدمی تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ یہ حقیقت بیان کرنے کا وقت نہیں ہے۔ "وہ... میں نے پانی پینے کے لیے گلاس اٹھایا تھا۔ اسی دوران مجھے چھینک آ گئی اور تھوڑا سا پانی گلاس میں سے چھلک کر تمہارے اوپر گر گیا۔ سوری... تمہاری نیند خراب ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ چلو اب لیٹ جاؤ۔ اب کیا ساری رات یونہی بیٹھے رہو گے؟" ایلین نے چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے کروٹ بدلی اور منہ پھیر کر دوبارہ سو گئی لیکن اینڈی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور جا چکی تھی۔

ایلین تو سو چکی تھی لیکن اینڈی مسلسل جاگ رہا تھا۔ ایک تو اس کے دماغ پر مینڈی قتل کیس چھایا ہوا تھا، ادھر ایلین کی یہ حالت... وہ ساری رات اسی اُدھیڑ بن میں دماغ کھاتا رہا۔ دوسری طرف وہ بار بار ایلین کی طرف بھی دیکھ رہا تھا لیکن وہ بڑے سکون سے سو رہی تھی۔

صبح ہونے والی تھی۔ وہ نتیجے پر پہنچ گیا۔ ہو نہ ہو مینڈی قتل کیس، ایلین کی حالت اور مورا ماسا کی تلوار... تینوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اب اسے ڈاکٹر ماساتو کی بات میں وزن لگ رہا تھا کہ تلوار بددعائی اور مافوق الفطرت قوتوں کی حامل ہے۔ دوسری طرف وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے مینڈی اور اس کے بھائی کے قاتل کا پتا چل جائے تو وہ مورا ماسا تلوار کا معما حل کر سکتا ہے۔

صبح کے سات بجے ایلین حسبِ معمول نیند سے بیدار ہوئی تو اینڈی جاگ رہا تھا۔ رات بھر جاگنے کے سبب اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر ایلین بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ معمول کے مطابق اس نے ناشتا کیا اور دفتر آ گیا۔

"ہیلو ڈاکٹر ماساتو۔" دن کے دس بجے اینڈی نے جاپانی قونصل خانے فون کر کے ڈاکٹر سے گفتگو شروع کی۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں مگر آپ کے یا میرے دفتر میں نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے، شام چھ بجے میرے گھر آ جاؤ۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"ہاں... یہ ٹھیک ہے۔"

"تو پھر میرا پتا نوٹ کر لو۔" اس کے بعد اینڈی نے ڈاکٹر کا پتا نوٹ کیا۔ ابھی وہ نوٹ بک بند کر رہا تھا کہ ایرکسن پہنچ گیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اینڈی کا دل چاہا کہ وہ اسے کل رات والے واقعے کے بارے میں بتائے لیکن اس نے زبردستی خود کو روکا۔ اسے یقین تھا کہ یہ واقعہ سننے کے بعد وہ اُلٹے سیدھے فلسفے سنانا شروع کر دے گا۔

"کچھ نہیں۔ بس ذرا یونہی ایک دو پوائنٹس نوٹ کر رہا تھا۔ تم سناؤ، کوئی نئی تازہ خبر؟"

"ہاں... بالکل ہے۔ نئی بھی اور تازہ بھی۔" ایرکسن حسبِ عادت مسکرا دیا۔

"تو بکو..."

"بات یہ ہے کہ جس رات مینڈی کا قتل ہوا، اس رات ڈینیل رات ساڑھے تین بجے اپنے فلیٹ پر پہنچا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ڈینیل ہی وہ شخص ہے جس کے مینڈی سے نہایت قریبی تعلقات تھے اور اسی کی وجہ سے اس کا شوہر اسے چھوڑ کر علیحدہ رہ رہا تھا۔ اور تیسری سب سے بڑی خبر یہ..." ایرکسن نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"آگے بولو۔"

"ڈینیل ایک ایسے بوڑھے کا بہت ہی قریبی دوست تھا جو اسی بلڈنگ میں رہتا تھا تاہم کچھ مہینے پہلے اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔ وہ بوڑھا پولیس کا ریٹائرڈ افسر کرنن تھا۔" یہ سنتے ہی اینڈی کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرنے لگے۔

"میں نے جو تفتیش کی ہے اس کے مطابق یہ وہی کرنن ہے جس کی گولی سے کلارڈی ہلاک ہوا تھا۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے اس بلڈنگ میں رہ رہا تھا اور پچھلے پانچ سالوں سے اس کے ڈینیل سے بہت قریبی تعلقات تھے۔"

"اوہ میرے خدا..." اینڈی نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ہمیں ڈینیل کے گھر کی تلاشی لینا ہوگی۔ تم سرچ وارنٹ لو۔ ہم کل صبح اس کے گھر پر چھاپا ماریں گے۔"

"ویسے ڈینیل کی شبیہ میں گرفتاری سمجھ میں آتی ہے، پر یہ تلاشی؟"

"وہ بھی بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔"

☆☆☆

"آیئے آیئے، مسٹر اینڈی! کیسے ہیں آپ؟" ڈاکٹر ماساتو نے دروازے پر کھڑے اینڈی کا گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "چلیے! اندر آیئے۔"

اینڈی اندر داخل ہوا تو ماساتو نے جلدی سے کہا۔ "پلیز! مائنڈ مت کیجیے گا۔ برائے مہربانی جوتے یہیں اتار دیں۔" یہ سنتے ہی اینڈی نے ڈاکٹر کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ننگے پاؤں تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اینڈی جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

ڈاکٹر ماساتو کا گھر تین کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ پر مشتمل تھا۔ گھر کی اندرونی آرائش سے یہ بالکل کسی روایتی جاپانی گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ماساتو سینئر سفارت کار تھا اس لیے اینڈی کا خیال تھا کہ اس کا گھر نہایت شاندار ہونا چاہیے۔ اینڈی نے ڈاکٹر کے گھر سے متعلق جو نقشہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا، یہاں پہنچ کر وہ چکنا چور ہو گیا۔ اگرچہ گھر اندر سے نہایت قرینے سے سجا ہوا تھا مگر یہ امریکا میں مقیم کسی سفارت کار کے بجائے جاپان کے کسی عام سے روایتی آدمی کا فلیٹ زیادہ لگ رہا تھا۔

"بہت دلچسپی ہے آپ کو اپنی ثقافت سے؟"

"ہونی بھی چاہیے۔ یہی ہماری پہچان ہے۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا اور اسے دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک نیچی سی میز کے گرد بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود میز کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔ "معاف کیجیے گا۔ میری بیوی بچے جاپان گئے ہوئے ہیں اور میں گھر میں اکیلا ہوں۔ کیا خیال ہے، ہم دونوں جاپانی چائے پئیں اور اسی دوران میں باتیں بھی کرتے جائیں گے۔"

"اچھا خیال ہے۔"

"تو پھر میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔ بس چند منٹ کی اجازت دیجیے۔" یہ کہہ کر وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا اور اینڈی گھر کا جائزہ لینے لگا۔

وہ جب چائے لے کر آیا تو اینڈی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"بہت عمدہ چائے بناتے ہیں آپ۔"

"شکریہ۔"

"ویسے میں نے آج پہلی بار جاپانی انداز کی چائے پی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ روایتی جاپانی چائے کی تیاری کا سب سے بہترین انداز ہوگا۔" اینڈی نے ڈاکٹر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "کیا یوراگیری جاپانی زبان کا لفظ ہے؟"

"یہ لفظ تم نے کہاں سنا؟" اینڈی کے منہ سے یوراگیری سنتے ہی ڈاکٹر کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔

"یہ بات اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کیا یہ جاپانی زبان کا لفظ ہے؟ اور اگر ہے تو پھر اس کے معنی کیا ہیں؟"

"ٹھیک ہے، تو پھر سنو۔ یوراگیری جاپانی زبان کا ہی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں غدار، دھوکے باز، بے وفا۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لے کر خلا میں تکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"اب تم نے یوراگیری کا لفظ سن ہی لیا ہے تو یہ بھی جان لو کہ جنگ سکی گھارا میں جب مورا ماسا کی تلوار خون بہا رہی تھی، تب یہ لفظ استعمال ہوا اور آج تک اس کے معنی اسی تاریخی تناظر میں لیے جاتے ہیں۔"

اس بار چونکنے کی باری اینڈی کی تھی۔ "کچھ بتائیں گے اس بارے میں؟"

"کیوں نہیں... ہوا یہ کہ 1600ء میں جنگ سکی گھارا ہو رہی تھی۔ اس دوران متسوناری کے اتحادیوں نے راتوں رات اپنی وفاداری تبدیل کی اور ایاتوسو قبیلے کے ساتھ مل گئے۔ یہ وہ قبیلہ تھا جن کے جنگجوؤں کے پاس مورا ماسا کی تلوار تھی۔ تب سے آج تک یہ لفظ ایسے غداروں کے لیے استعمال ہو رہا ہے جو عین موقع پر ساتھ چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملیں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے... مگر میرے گھر میں..." ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی بے خودی کی کیفیت میں بڑبڑایا۔

"بات کیا ہے مسٹر اینڈی! کھل کر بتاؤ۔ ممکن ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔" ڈاکٹر، اینڈی کو بڑبڑاتا ہوا دیکھ کر سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اب سب کچھ آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر اینڈی نے مینڈی کے قتل والی رات ایلین کے خواب سے لے کر اسے اپنے پیٹے پر سوار ہاتھ لہراتے ہوئے یوراگیری لفظ دُہرانے تک کے تمام واقعات نہایت تفصیل سے سنا دیے۔ ڈاکٹر اس کی بات پورے دھیان سے سن رہا تھا۔ جب اینڈی نے اپنی بات مکمل کی تو ڈاکٹر نے سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

"تلوار ملے گی اور یہ تمہارے ہاتھوں ہی برآمد ہوگی مگر..."

"مگر کیا؟" اینڈی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ تم مر بھی سکتے ہو لیکن اگر کوشش کرو تو اس حملے سے بچ بھی سکتے ہو... مگر ایک بات طے ہے کہ تلوار کی بازیابی کے فوراً بعد تم پر حملہ ہوگا اور تمہاری جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔" ڈاکٹر خلا میں دیکھتے ہوئے بولے جا رہا تھا اور اینڈی حیرت کے عالم میں دم بخود اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"مگر مجھ پر قاتلانہ حملہ کون کرے گا؟"

http://pakfunplace.blogspot.com

''تمہاری بیوی ایلن۔ وہ مکمل طور پر شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ یہ وہی قوتیں ہیں جو سوراماسا تلوار کی ساتھی ہیں۔'' ڈاکٹر ماساتو مسلسل آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ ''تلوار کی ساتھی شیطانی قوتوں کو علم ہے کہ تم یہ تلوار بازیاب کرو گے اور اسے ایک ایسی جگہ پہنچادو گے جہاں سے یہ پھر بھی خون پینے کے لیے باہر نہیں نکل سکے گی۔ اس لیے وہ تمہیں سزا دینا چاہتی ہیں۔ یہ شیطانی قوتیں خود دھوکے باز ہیں مگر وہ تمہیں غدار کہہ رہی ہیں۔ ان کی نظر میں تم غدار ہو اور جاپانی روایت میں غدار کی سزا موت ہے اس لیے وہ تمہیں مارنے کی کوشش کریں گی... بہت جلد۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہو گیا مگر اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور اینڈی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تلوار ہمیشہ بدکرداروں کے ہاتھوں میں رہی ہے اور بدکردار لوگ ہی اس کے پسندیدہ ساتھی ہیں مگر اس بار یہ تمہیں ملنے والی ہے... جس کا مطلب ہے کہ تلوار جاپان جائے گی اور پھر ہمیشہ کے لیے میوزیم میں قید ہو کر رہ جائے گی۔ بس اس لیے شیطانی قوتیں تمہارے پیچھے پڑ گئی ہیں۔''

''حملے سے بچاؤ کا کوئی تو طریقہ ہو گا؟'' اینڈی نے تجسس سے سوال کیا۔

''حملہ اس رات ہو گا جس دن تلوار تمہارے قبضے میں آئے گی۔ اگر تم [illegible] ہو تو تمہاری جان بھی بچ سکتی ہے اور شیطانی قوتیں ایلن کا بھی پیچھا چھوڑ سکتی ہیں۔'' اتنا کہنے کے بعد ڈاکٹر ماساتو اینڈی کو وہ طریقہ سمجھانے لگا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ نہ صرف اپنی جان بھی بچا سکتا تھا بلکہ ایلن کو بھی شیطانی قوتوں کے اثرات سے نجات مل جاتی۔ یوں وہ ایک بار پھر نارمل زندگی بسر کر سکتی تھی۔

ڈاکٹر ماساتو سے اجازت لے کر اینڈی واپس دفتر آیا۔ ایرکسن اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ''کہاں گئے تھے تم؟ تمہارا موبائل فون بھی بند تھا۔''

''ہاں، ذرا سا کام تھا۔ موبائل اس لیے بند تھا کہ اس کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔''

''میں نے ڈینیل کے گھر کی تلاشی کے لیے وارنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ ساتھ ہی ایک اور بات بھی پتا چلی ہے۔ وہ یہ کہ ڈینیل نوادرات کی اسمگلنگ اور اس کی غیر قانونی خرید و فروخت میں بھی ملوث ہے۔''

''اوہو... تو یہ چکر ہے۔'' اینڈی نے آہستہ سے کہا۔

''خیر، میں اب گھر جا رہا ہوں۔ کل صبح چھ بجے ہم ڈینیل کے گھر پر چھاپا ماریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں رات یہیں ہوں۔ ساری تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔ بس تم وقت پر پہنچ جانا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں... بائے۔'' اینڈی نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب اینڈی نے ڈینیل کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ کافی دیر بعد بوجھل آنکھوں کے ساتھ شب خوابی کے لباس میں ملبوس ڈینیل نے دروازہ کھولا۔ ...اینڈی کو دیکھتے ہی اس کا منہ بن گیا۔ ''میرے خیال میں یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن اینڈی نے دروازے کے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔

''ٹھیک کہتے ہو، پر ہم یہاں ملنے نہیں بلکہ تمہارے فلیٹ کی تلاشی لینے آئے ہیں۔'' اس نے سرچ وارنٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر اوٹ میں کھڑے ہوئے پولیس کے جوان بھی سامنے آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''چلو... اندر چلو۔ پورے فلیٹ کی اچھی طرح تلاشی [illegible]''

تلاشی کا عمل لگ بھگ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں ڈینیل ایک صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ پولیس کو تلاشی کے دوران کوئی بھی قابل اعتراض شے نہیں ملی۔ یہ صورت حال اینڈی اور ایرکسن کے لیے پریشان کن تھی لیکن ڈینیل جو گھنٹا بھر پہلے خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اب اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''میرے خیال میں تم نے اندازہ لگانے میں بہت ہی بے وقوفی کی ہے۔'' ڈینیل نے یہ بات اس وقت کہی جب اینڈی بیڈ روم میں موجود سپاہیوں کو واپس جانے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے ڈینیل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے سے سپاہی نکلنے لگے تو وہ بھی پلٹا لیکن اس کا پاؤں ٹیلی فون کی تار میں آ کر پھنس گیا اور وہ دھڑام سے گر پڑا۔ جس جگہ اینڈی گرا تھا، وہاں فرش پر کارپٹ بچھا ہوا تھا اس لیے اسے چوٹ تو نہیں آئی لیکن ایک دم اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔

''فوراً چلو۔'' اس نے چلا کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ یہ سنتے ہی ڈینیل کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ سپاہی کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے کارپٹ ہٹا کر فرش کا جائزہ لینے کا حکم دیا۔ کارپٹ ہٹنے کی دیر تھی کہ سارا بھید کھل گیا۔ ڈینیل جو کچھ دیر پہلے مسکرا رہا تھا، اب لاش کی طرح صوفے پر ڈھے چکا تھا۔

کارپٹ کے نیچے فرش کو تراش کر کافی بڑا خانہ بنایا گیا تھا جسے لوہے کی چادر سے بنے دروازے سے ایک تجوری کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس خانے سے وہ بے شمار نوادرات برآمد ہوئے جنہیں دنیا کے مختلف ملکوں سے غیر قانونی طور پر اسمگل کر کے امریکا لایا گیا تھا۔ ان نوادرات میں جو سب سے اہم چیز تھی، وہ ایک تلوار تھی جس کے دستے پر سوکھے ہوئے خشک خون کے دھبے موجود تھے۔ یہ تلوار نیام میں تھی۔ جب اینڈی نے رومال سے تلوار کا دستہ پکڑ کر اسے بے نیام کیا تو اندر سے ایک لمبی اور نہایت تیز دھار والی تلوار برآمد ہوئی۔ چمکتی ہوئی اس تلوار پر بھی خون کے ہلکے ہلکے دھبے موجود تھے۔ یہ تلوار بالکل ایسی ہی تھی جس کا نقشہ ڈاکٹر نے اینڈی کو بتایا تھا۔ اینڈی خوش تھا کہ آلۂ قتل کے ساتھ ہی ہینڈی اور اس کے بھائی کا قاتل بھی گرفت میں آ چکا تھا۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے فوراً بعد اینڈی نے ڈاکٹر ماساتو کو فون کیا۔ جیسے ہی اسے پتا چلا کہ اس کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق ایک تلوار برآمد کی گئی ہے تو وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' کچھ ہی دیر بعد وہ اینڈی کے ساتھ بیٹھا ہوا تلوار کا معائنہ کر رہا تھا۔ ''یہی سوراماسا سامورائی تلوار ہے۔'' اس کے لہجے سے خوشی امنڈ رہی تھی۔

''شکر ہے کہ معاملہ حل ہوا۔'' اینڈی نے ڈاکٹر کی بات سن کر کہا۔

''یہ تلوار جاپانی حکومت کے حوالے کب تک کی جائے گی؟''

''میرا خیال ہے کہ ایک مہینا لگ جائے گا۔'' اینڈی کی بات سن کر ڈاکٹر کا چہرہ اتر گیا۔

''اتنے دن... کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ جس شخص کے قبضے سے یہ برآمد ہوئی ہے، وہ ذہرے قتل میں مشتبہ ہے۔'' اینڈی نے ڈاکٹر کو تلوار حوالے کرنے میں تاخیر کی وجوہات تفصیل سے بیان کرنا شروع کیں۔ ''مقتولین کے زخم بھی تلوار کے گھاؤ جیسے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس تلوار پر خون کے دھبے موجود ہیں۔ تلوار پر لگے دھبوں کا ڈی این اے ٹیسٹ ہو گا جس سے پتا چل سکے گا کہ آیا قتل اسی تلوار سے کیے گئے تھے یا نہیں۔

اس کے بعد چالان عدالت میں پیش ہو گا اور ثابت ہو گیا کہ یہ تلوار ہینڈی کیس میں آلۂ قتل ہے تو پھر اسے عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تب تک یہ تلوار پولیس کے سیف روم میں رہے گی... بطور ثبوت۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ چلو، کوئی مسئلہ نہیں۔ تلوار تو مل گئی ہے نا۔ میں آج ہی امریکی حکومت کو اس کی حوالگی کی درخواست دے دوں گا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب میں خطرے میں ہوں۔'' اینڈی نے رازدارانہ انداز میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ''آپ کے کہنے کے مطابق آج رات مجھ پر میری اپنی ہی بیوی جان لیوا حملہ کرنے والی ہے۔''

''یہ بات تو ہے مگر تم فکر نہیں کرو۔ جو میں نے کہا ہے، اس پر عمل کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اینڈی ڈینیل سے تفتیش کرتا رہا۔ تلوار کو سخت حفاظتی پہرے میں ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے بھجوا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ کیس کا ریکارڈ مرتب کرنے لگا۔

شام کے سات بج رہے ہوں گے جب اینڈی اپنے گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں کھانے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ اینڈی کو علم تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات سجائے ہوئے تھے جیسے وہ بہت خوش ہے۔

''ہائے ڈارلنگ... کیا پکا رہی ہو؟'' وہ سیدھا کچن میں چلا گیا جہاں ایلن کھانا بنا رہی تھی۔

''اوہ... آج تو بڑی جلدی فارغ ہو گئے۔''

''نہیں... خود جلدی آیا ہوں تاکہ تمہیں کمپنی دے سکوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بیوی کے طنزیہ شکوے کا جواب دیا۔ ''کئی دن سے تمہیں وقت ہی نہیں دے پا رہا تھا، سوچا کہ آج جلدی گھر چلا جاتا ہوں۔ اس لیے سب کام چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا تمہارے پاس۔'' وہ اپنے انداز سے خود کو رومانٹک ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''چلو اچھا ہی ہوا۔ کم از کم اب مجھے اکیلے کھانا تو نہیں کھانا پڑے گا۔'' ایلن شوہر کی پیار بھری باتیں سن کر مسکراتے ہوئے بولی۔

کھانے سے فراغت کے بعد دونوں لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور ٹی وی دیکھتے رہے۔

''ابھی میں تو سونے جا رہی ہوں۔ سخت نیند آ رہی

http://pakfunplace.blogspot.com

ہے۔" ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ایلن اٹھی اور اینڈی سے کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے، تم جاکر سو جاؤ۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ ابھی ذرا ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ تم جاؤ اور آرام کرو۔" ایلن کے اٹھتے ہی وہ صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔

"شب بخیر۔" ایلن نے کہا اور کمرے کی طرف چل دی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے کی بتیاں بجھ گئیں۔ اگرچہ اینڈی بے فکری کے انداز میں نیم دراز تھا لیکن وہ بہت ہی چوکنا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹے بعد وہ اٹھا اور لیونگ روم میں بنے باتھ روم میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اس نے ایک جیکٹ پہن رکھی تھی جس کی زپ نیچے سے گردن تک بند تھی۔ اب وہ صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کے سوا کمرے کی تمام بتیاں بجھادیں اور ٹی وی بھی بند کردیا۔ اسے اب انتظار تھا اپنے اوپر جان لیوا حملہ ہونے کا۔ تقریباً دو گھنٹے بیت گئے مگر کچھ نہیں ہوا۔ یہ دو گھنٹے اینڈی نے جس کرب میں گزارے، یہ اس کا ہی دل جانتا تھا۔ رات کے تین بجنے والے ہوں گے جب اسے ایلن کے کمرے سے ایک چیخ سنائی دی۔ "یوراگیری۔" اینڈی تیار ہوگیا کہ بس وہ وقت آن پہنچا ہے جس کا وہ منتظر تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایلن کمرے میں آندھی کے تیز جھونکے کی طرح داخل ہوئی۔ اس کا ریشمی گاؤن ہوا میں اڑ رہا تھا حالانکہ اس وقت نہ تو کمرے میں پنکھا چل رہا تھا اور نہ ہی کھڑکیوں سے ہوا اندر آرہی تھی لیکن ایلن کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ تیز آندھی میں دوڑتی ہوئی آرہی ہے۔ اس کے بال پیچھے کی طرف اڑ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی چمک دار تلوار تھی۔ وہ تیزی سے یوراگیری، یوراگیری چلاتی ہوئی آئی اور اس کے سینے پر تلوار سے کئی وار کیے۔ تلوار کے پہلے وار پر ہی اینڈی کے جسم سے خون کا فوارہ نکل پڑا۔ اینڈی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر تلوار کے پہلے وار پر ہی وہ صوفے پر ڈھے گیا۔ کمرے میں ہوا کا شور گونج رہا تھا اور ایلن کے شمشیر بدست ہاتھ اس کے سینے پر وار پہ وار کیے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اچانک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ تلوار ایلن کے ہاتھ سے نکلی اور ہوا میں تیرتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئی اور ایلن فرش پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گئی۔ جیسے ہی ایلن بے سدھ ہو کر فرش پر گری، اینڈی ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا پورا جسم انسانی لہو میں تر بتر تھا مگر اسے اپنے سے زیادہ ایلن کی فکر تھی۔ اس نے فوراً ڈاکٹر ماساتو کو فون کیا اور ساری صورت حال اسے بتائی۔

"خدا کا شکر ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔" اس کی بات سن کر ڈاکٹر ماساتو نے کہا۔ "میں بھی پہنچ رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد اینڈی اور ڈاکٹر کمرے سے خون کے دھبے صاف کر رہے تھے اور ایلن اپنے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔

"اب یہاں ایسا کوئی نشان یا ثبوت موجود نہیں جس سے کسی دوسرے شخص کو یہ پتا چل سکے کہ آدھی رات کو یہاں کیا کچھ ہوا ہے۔" کمرے کی صفائی کے بعد ڈاکٹر ماساتو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے بڑا خون نکلا۔ کتنی بوتلیں جیکٹ میں لگائی تھیں۔ کہاں سے لیا تھا اتنا خون؟"

"کینیڈی اسپتال سے اور چار بوتلیں لگائی تھیں جیکٹ میں۔" اینڈی نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ کل شام چھ بجے تم میری طرف آرہے ہو۔" ڈاکٹر ماساتو نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے... پر ایک شرط ہے۔ جاپانی چائے پیوں گا۔"

"منظور ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اینڈی باتھ روم میں گھس گیا اور [illegible] خون [illegible] جسم سے دور ہو جانے کے بعد وہ کمرے میں گیا تو ایلن بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بھی اس کے برابر میں جا کر لیٹ گیا۔

دوسری صبح حسب معمول ایلن اٹھی۔ اس کے انداز سے قطعی پتا نہیں چلتا تھا کہ گزشتہ شب اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا تھا۔ اینڈی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی جو ایلن کے لیے غیر معمولی ہوتی۔ ہر روز کی طرح اس نے غسل کیا، وردی پہنی، ناشتا کیا اور ایلن کو خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے دفتر کے لیے نکل گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق اینڈی شام چھ بجے ڈاکٹر کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اس کا ہی منتظر تھا۔ اس نے چائے بنائی اور پھر دونوں کیس کے حوالے سے باتیں کرنے لگے۔

"ڈاکٹر... اگر میں نے اس رات جیکٹ کے اندر سینے پر فولادی چادر نہ باندھی ہوتی تو میری موت یقینی تھی۔ بڑے بھرپور وار ہوئے تھے مجھ پر لیکن وہ خون کی بوتلیں کیوں بندھوائی تھیں آپ نے؟" اینڈی اب نہایت احترام سے گفتگو کررہا تھا۔ آخر آج وہ اسی کی وجہ سے زندہ تھا۔

"شیطانی قوتیں خون کی بو محسوس کرتی ہیں، موت کی نہیں۔ اس لیے جب خون کی بو انہیں ملی تو ان کا مقصد پورا ہوگیا۔" ڈاکٹر نے عالمانہ انداز میں جواب دیا۔

"اجازت ہو تو ایک اور سوال کروں؟"

"پوچھو۔"

"سوراماسا تلوار لمبی ہے لیکن اس رات ایلن کے ہاتھ میں جو تلوار تھی وہ چھوٹی تھی، دوسری بات یہ کہ دیوار پر وہ علامت بھی نظر نہیں آئی۔"

"ایک بات تم بھول رہے ہو۔ تمہارا سر بھی تن سے جدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔"

"ارے ہاں... اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔" اینڈی نے ڈاکٹر کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے مسٹر اینڈی... جس تلوار سے تم پر حملہ ہوا وہ سوراماسا نہیں بلکہ اس کے زیر اثر شیطانی قوتوں کی تلوار تھی۔ اس ساخت کی تلوار کو جاپانی تلواروں کی تاریخ میں واکی زاشی کہا جاتا ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی تسلی کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بات کہ تمہارا سر کیوں نہیں کاٹا گیا یا دیوار پر نشان کیوں نہیں بنا... تو بھائی بات یہ ہے کہ گزشتہ کئی سو سالوں سے جب سے سوراماسا تلوار شیطانی قوتوں کے ہاتھ میں آئی ہے، جب سے یہ پراسرار تلوار صرف دس ہزار [illegible] میں ایک [illegible] کرتی ہے۔ یہاں بھی دسویں ہزار رات کی [illegible] کاذب سے کچھ گھنٹے پہلے ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"بات یہ ہے کہ مینڈی کا قتل جس رات ہوا، وہ دسویں ہزار رات کے آخری گھنٹے تھے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر ماساتو نے دوبارہ اپنی گفتگو شروع کی۔ "اسی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ اب اگلے ستائیس سالوں میں سوراماسا کی تلوار سے نہ تو کوئی قتل ہوگا اور نہ ہی وہ علامتی نشان نظر آئے گا۔ البتہ اس کی شیطانی قوتیں حملہ کریں گی اور وہ ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑتیں اور نہ ہی سر قلم کرتی ہیں... تو اس لیے میں نے تمہاری حفاظت کا یہ طریقہ اپنایا۔ اگر بات سوراماسا کی ہوتی تو پھر تمہیں بچانا ناممکن تھا۔ وہ تلوار سر قلم کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھتی۔" ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

"آپ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟"

"اس لیے کہ میں نے پوری زندگی جاپان کی پراسرار قوتوں کو جاننے میں گزاری ہے اور کئی پراسرار علوم سیکھے ورنہ تو پھر میں تمہاری جان بچانے کی کوشش کیسے کرسکتا تھا۔"

"آپ نے پی ایچ ڈی کا مقالہ کس موضوع پر لکھا تھا؟"

"پراسرار جاپانی علوم اور شیطانی قوتیں۔" ڈاکٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ نے یہ بات پہلے کبھی نہیں بتائی۔"

"میں نے تم سے بہت سی باتیں جان بوجھ کر چھپائی تھیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ پراسرار سوراماسا تلوار اور اس سے کیے گئے قتل کا پہلا نشان جاپان میں 1873ء میں سامنے آیا۔ پھر 1900ء میں ایسا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد ہر ستائیس سال کے اختتام پر یہ واقعہ ہوتا رہا۔ آخری بار جب یہ واقعہ ہوا تو کارلوڈی اس میں پھنسا۔ ان تمام واقعات کا تجزیہ کرو تو قتل کے بعد دیوار پر ملنے والا یہ نشان دسویں ہزار رات کے اختتام پر ہی سامنے آیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے ستائیس برس تک ایسا واقعہ نہیں ہوگا۔"

"لیکن اس کے بعد؟"

"یہ تلوار جاپان جائے گی جہاں اس کو شیطانی قوتوں کے اثر سے پاک کیا جائے گا اور یہ کام میں کروں گا۔ اس کے بعد اسے نہ ٹوٹنے والے شیشے کے صندوق میں منتقل کردیا جائے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ یوں دسویں ہزار رات کو ہونے والے قتل کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے جواب دیا۔

"یہ تلوار کارلوڈی سے ایلن تک کیسے پہنچی؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔" اینڈی نے سر کھجاتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تلوار مل گئی... تمہیں مینڈی اور اس کے بھائی کا قاتل۔ جو کیس تمہارا نہیں ہے اس میں دماغ مت کھپاؤ۔" ڈاکٹر نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "ویسے بھی آج کے دور میں جادوئی قوتوں اور شیطانی طاقتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا مگر ان کا وجود ہے اور تم اس کا تجربہ کرچکے ہو اس لیے جو کچھ ہوا، اس کا کسی سے تذکرہ بھی مت کرنا ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ کچھ باتیں ہمیشہ معمّا بنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی باتوں کو کھنگالنا بیکار ہوتا ہے۔"

"ہاں مجھے بھی اس بات کا احساس ہے۔" اینڈی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اگلے چند روز اینڈی کے لیے بہت اہم تھے۔ امریکی دفتر خارجہ نے اینڈی کو خط لکھ کر تلوار کی بازیابی سے متعلق تصدیق چاہی۔ اینڈی نے اثبات میں جواب دیا جس کے جواب میں ڈاکٹر ماساتو کے ساتھ امریکی اور جاپانی ماہرین

http://paktunplace.blogspot.com

نے تلوار کا جائزہ لیا اور چند ٹیسٹ کیے گئے... جس کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ تلوار اصلی ہے اور وہ لگ بھگ پانچ چھ سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد طے پایا کہ جونہی مینڈی قتل کیس میں اس تلوار کی ضرورت ختم ہوجائے گی، اسے جاپان کے حوالے کردیا جائے گا۔

دوسری طرف ڈی این اے ٹیسٹ سے ثابت ہوگیا کہ خون کے دھبے مینڈی اور اس کے بھائی کے ہی ہیں۔ نیز اسی تلوار سے انہیں قتل کیا گیا تھا۔ ڈینیل اس پورے واقعے سے پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد اس نے اعتراف جرم کرلیا۔

ڈینیل کا کہنا تھا کہ اس نے یہ تلوار کئی سال پہلے ریٹائرڈ پولیس افسر نائیگر کرزن کے فلیٹ سے چرائی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کرزن کے مطابق اس نے یہ تلوار پولیس کے سیف روم سے اس لیے چرائی تھی کہ اسے لگا کہ یہ نادر تلوار ہے اور اس کی فروخت سے وہ لمبا مال کما سکتا ہے لیکن وہ اپنے اندر بھی اتنی ہمت پیدا نہیں کرپایا کہ اس کے لیے گاہک ڈھونڈ سکے۔ کرزن نے ایک دن یہ تلوار اسے دکھائی۔ اسے لگا کہ یہ بہت قیمتی ہے اس لیے ڈینیل نے اسے چرانے کا فیصلہ کیا اور آخرکار اسے چرالیا... مگر کئی سال کی کوششوں کے باوجود اسے مناسب گاہک نہیں مل سکا۔

جس رات مینڈی اور اس کے بھائی کا قتل ہوا، اس رات ریہرسل کے بعد اسے ایک گاہک کو یہ تلوار دکھانا تھی۔ وہ شخص نوادرات جمع کرنے کا شوقین اور بہت ہی مال دار تھا۔ ڈینیل کے مطابق اس نے تلوار ایک گٹار کے اندر چھپا رکھی تھی۔ ریہرسل کے بعد وہ گاہک سے ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں مینڈی کا گھر بھی پڑتا تھا۔ اس رات ریہرسل کے دوران مینڈی بھی وہیں موجود تھی، لہٰذا اس نے مینڈی کو اس کے گھر پر چھوڑا۔ جب وہ طے شدہ مقام پر پہنچا تو گاہک نہیں آیا تھا۔ فون کرنے پر پتا چلا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔

ڈینیل کا بیان تھا کہ رات کے ڈیڑھ بجے میں واپس پلٹ رہا تھا تو مینڈی کا فون آگیا۔ اس نے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کا گھر راستے میں ہی پڑتا تھا اس لیے میں اس کے گھر چلا گیا۔ تلوار گٹار کے اندر چھپی ہوئی تھی اس لیے میں نے گٹار بھی اٹھالیا۔ میں اور مینڈی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ اچانک کمرے میں تیز آندھی جیسے ہواؤں کے جھونکے آنے لگے۔ میرے جسم میں اینٹھن ہونے لگی۔ گٹار میرے پاس رکھا تھا۔ ہواؤں کے جھونکے جونہی کمرے میں آئے، ایسا لگا کہ ہم دونوں اچانک کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر آگئے ہوں۔ اچانک میں نے غیر ارادی طور پر تلوار نکالی اور چشم زدن میں مینڈی پر وار کیے۔ اس وقت میری زبان سے پراگیری لفظ بار بار نکل رہا تھا۔ مینڈی کی چیخ سن کر اس کا بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ اس نے مینڈی کو بچانے کی کوشش کی اور میں نے اسے بھی قتل کردیا۔ اس کے بعد میں نے مینڈی کا سر کاٹا اور اس کے بالوں سے دیوار پر کچھ لکھنے لگا۔ میں بظاہر ہوش وحواس میں تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اپنے ہاتھوں اور دماغ پر کوئی قابو نہیں تھا۔ جب سب کچھ ہوگیا تو اچانک مجھے زور سے جھٹکا لگا اور میں نیچے گر پڑا۔ مجھے لگا کہ جیسے میرے جسم میں کوئی اور موجود تھا جو اس واردات کے بعد باہر نکل گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنا جسم ہلکا محسوس ہونے لگا لیکن جو کچھ ہوچکا تھا، اس نے میرے اوسان خطا کردیے۔ میں نے جلدی سے تلوار اٹھائی۔ اسے گٹار کے اندر چھپایا اور اپنے گھر چلا آیا جہاں سے وہ تلوار برآمد ہوئی اور میں گرفتار ہوا۔

ڈینیل کے اعتراف جرم اور ڈی این اے رپورٹ نے اسے قاتل ثابت کردیا تھا۔ اس نے جس انداز میں نادیدہ قوتوں کا ذکر کیا تھا، اس کی وجہ سے اس کے دماغ کا بھی ٹیسٹ کیا گیا مگر ڈاکٹروں نے اسے مکمل صحت مند قرار دیا۔ اس کے بعد کیس مکمل طور پر حل ہوچکا تھا۔ اینڈی بھی ڈینیل سے کسی حد تک ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ اس کی بات کو سچ سمجھتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا اس لیے خاموش رہا۔

مقدمہ حل ہوچکا تھا۔ پولیس نے چالان عدالت میں پیش کردیا۔ ڈینیل کو جیل بھیج دیا گیا اور تلوار کو عدالت کے حکم پر دفتر خارجہ کے حوالے کردیا گیا۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اینڈی کی زندگی معمول پر لوٹ آئی تھی۔ اس کے بعد پھر کبھی ایلین کو ڈراؤنے خواب نظر نہیں آئے۔ ایک دن ڈاکٹر ماساتو نے اسے فون کیا۔

"ہیلو سراغ رساں مسٹر اینڈی!"

"کیسے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب۔" اینڈی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کہو... جاپانی چائے پیتی ہے؟" ڈاکٹر ماساتو نے خوش مزاجی سے اسے دعوت دی۔

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر کل شام ٹھیک چار بجے میرے گھر پر آجاؤ۔"

اینڈی پہلی ملاقات میں تو ڈاکٹر ماساتو سے بہت ہی پریشان ہوا تھا اور اسے سنکی بڈھا سمجھ رہا تھا لیکن اب وہ اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ طے شدہ وقت پر وہ پہنچا تو ڈاکٹر اپنے فلیٹ کے دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ اینڈی جب گھر کے اندر گیا تو وہاں تقریباً تمام سامان غائب تھا۔ "آپ کا سامان کدھر گیا؟ گھر تو بہت خالی خالی لگ رہا ہے۔"

"بتاتا ہوں۔ پہلے چائے تو بنالاؤں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ماساتو پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔

"اب بتائیے... کیا گھر بدل لیا ہے؟"

"ہاں... میں امریکا میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہوچکا ہوں۔ تلوار مل گئی اور میرا کام یہاں ختم ہوا۔ میں کل واپس جاپان جارہا ہوں۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی کو ایسا لگا جیسے اس کا کوئی بہت قریبی عزیز کہیں دور جارہا ہے۔ اسے ڈاکٹر سے کافی انسیت ہوچکی تھی۔ "اور وہ تلوار؟" اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وہ بھی کل میرے ساتھ ہی اپنے وطن جارہی ہے۔ آخر میں نے سوموراماسا کی شیطانی قوت پر قبضہ حاصل کر ہی لیا۔ خون کی پیاسی وہ تلوار اب کبھی کسی انسان کا خون نہیں پی سکے گی۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں... وہ تلوار اب کبھی خون نہیں پی سکے گی اور میں بھی شاید آج کے بعد اس جیسی ذائقہ دار جاپانی چائے نہیں پی سکوں گا۔" اینڈی کی بات سن کر ڈاکٹر ماساتو ہنسنے لگا۔

"کم ازکم ایک دو بار تو ضرور پی سکو گے اور وہ بھی جاپان میں۔" ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی حیران رہ گیا۔ "تلوار کی بازیابی میں سب سے اہم کردار تمہارا ہے۔ اس لیے جاپانی حکومت کی وزارت ثقافت نے تمہیں ایک ہفتے کے لیے سرکاری طور پر جاپان کے دورے کی دعوت دی ہے۔ تم اور ایلین اگلے ہفتے جاپان پہنچ رہے ہو۔ تمہاری الگ، حکومت امریکا اور محکمہ پولیس سے اجازت میں نے حاصل کرلی ہے۔ کل صبح ہمارا ایک افسر تمہیں اجازت نامہ اور دیگر کاغذات پہنچا دے گا۔ جاپان روانگی تک وہ شخص تمہاری ہر قسم کی مدد کرے گا۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر اینڈی خوشی سے اچھل اٹھا۔ "شکریہ ڈاکٹر۔"

"شکریہ وہاں میرے گھر پر چائے پینے کے بعد ادا کرنا۔ فی الحال یہ لو ایک اور پیالی اور مزے سے پیو۔" ڈاکٹر کی بات پر اینڈی ہنسنے لگا۔

○

نئے سال کا پہلا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

ماہنامہ سرگزشت

جنوری 2011ء

اسیر سیاست

لندن میں بیٹھ کر مسلمانوں کے لیے لڑنے والے کی روداد جسے مسلمانوں نے ہی نظرانداز کردیا

پری زاد

اس قلم کار کی داستان جس کی کہانیاں دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہوئیں

جعل ساز محبوب

لوگ کس طرح دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں
ایک دکھ بھری آپ بیتی

ان کے علاوہ...... بلند عمارتوں کی دوڑ کا قصہ...... بلند خیال...... نامور مہم جو زنگ ہی کا تعارف...... ابھرتے سورج کے دیس کا سفرنامہ...... علم و ادب کی کئی ان کہی داستانیں ولولہ انگیز طویل سرگزشت...... سراب اور بہت سی آپ بیتیاں جگ بیتیاں

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں پھر آپ خود گرویدہ ہوجائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

http://pakfunplace.blogspot.com

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دعوی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

بارہویں قسط

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر
کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ... مگر آج عشق
کی اقدار میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور
حالات کا تقاضا ہے ... جس نے عشق کا منظر
نامہ بدل ڈالا ہے ... کردار و روپ میں بھی تبدیلی
آچکی ہے ... سر پھرے عاشق نے اب ایسے
شخص کا روپ دھار لیا جو اپنے جذبے اور
شدت کام لے کر محبت اور محبت
کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب
کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت
جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ... عشق
میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے ... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح
نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے
اس کے قلب و نظر ... عقل و شعور اور جذب عشق
میں کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ
اس کے پیش نظر ... ایک للکار ہے۔

http://freakunplace.blogspot.com

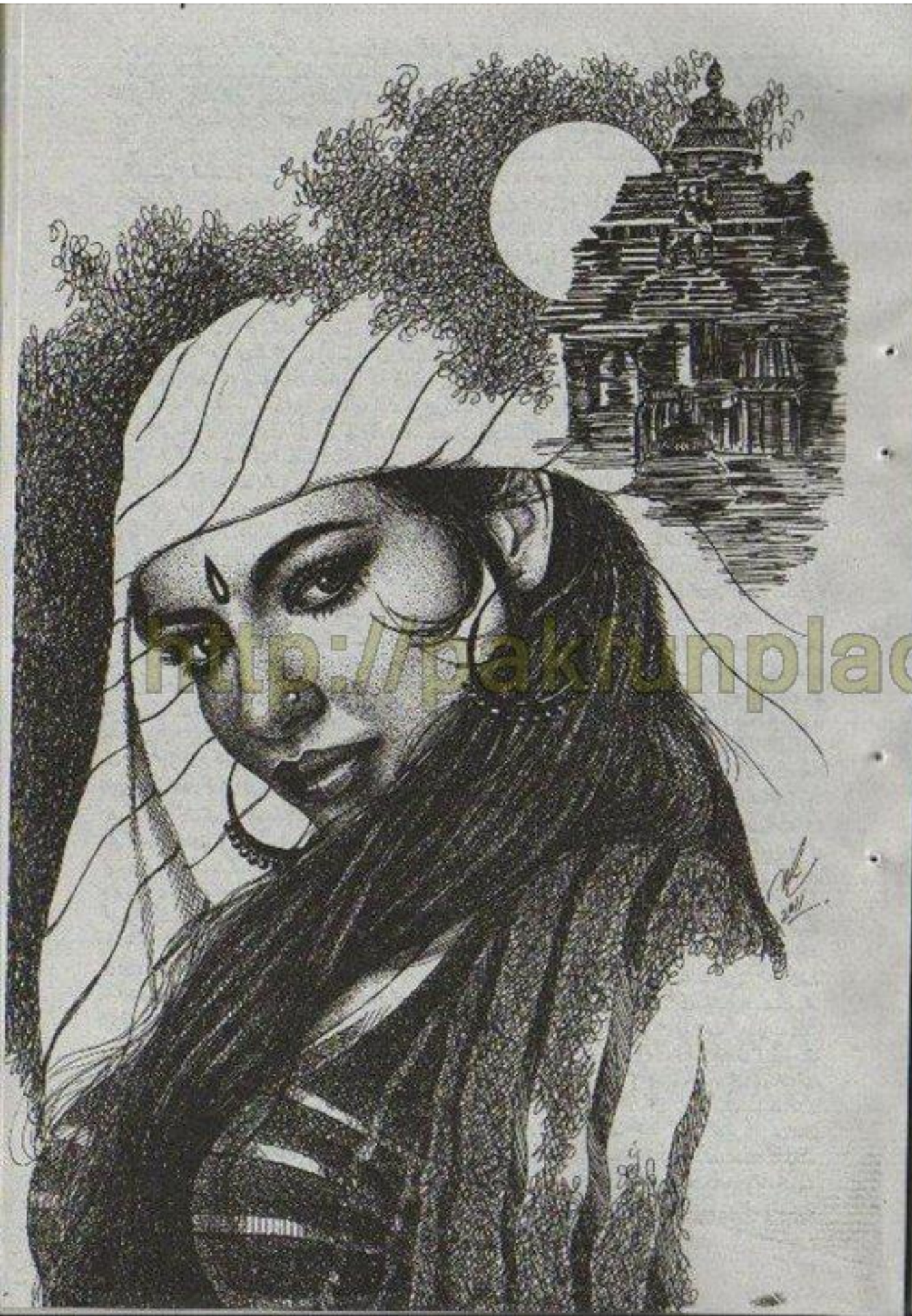

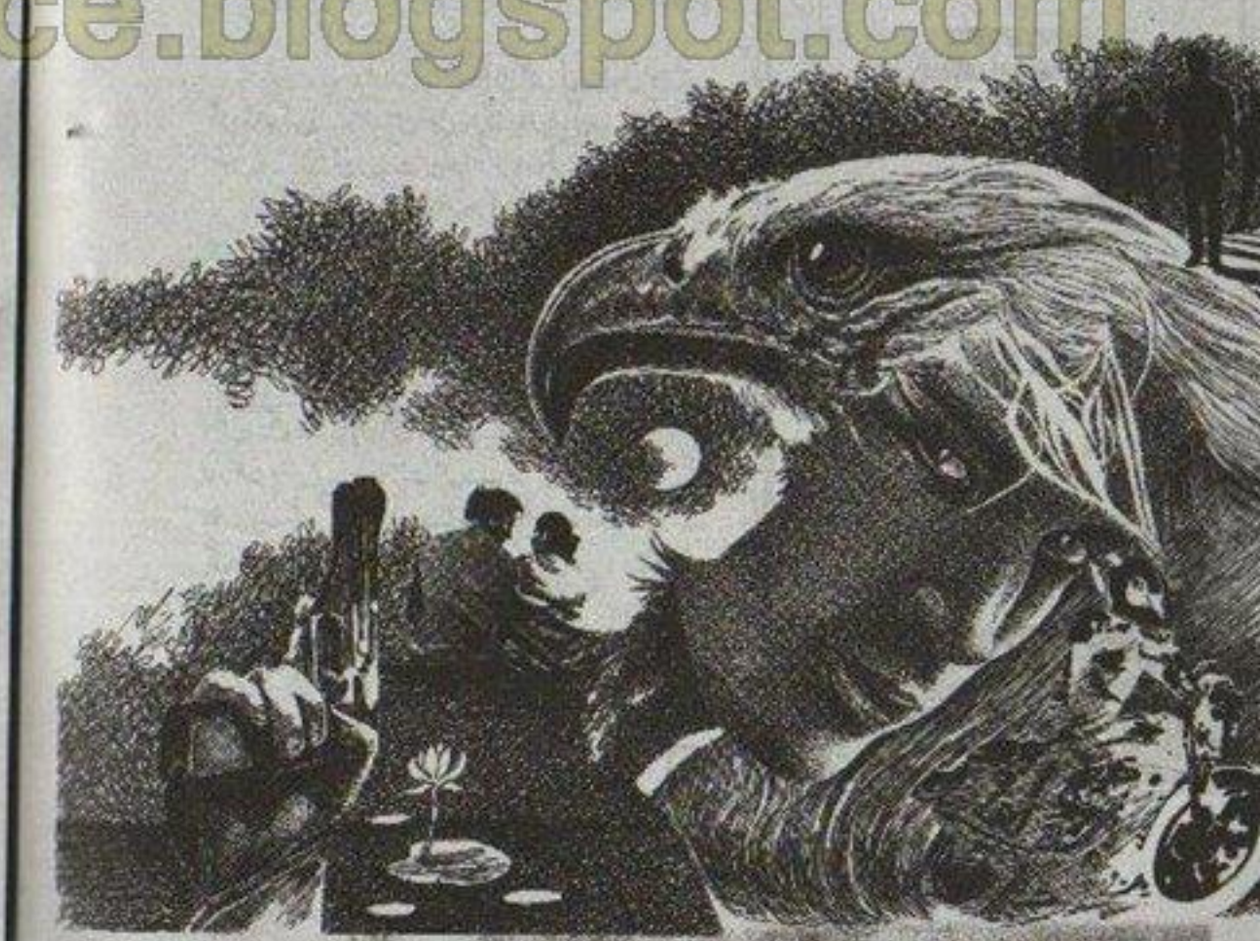

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت بلکہ عشق تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے آوارہ بیٹے واجد عرف وجی نے ایک چھوٹی سی بات سے [illegible] ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت خیریت سے گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے اندر کی جان نکال دی بلکہ اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ [illegible]

[illegible]

انڈین اسپیشل فورسز کا سابقہ افسر [illegible]

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

شگفتلا نے اسے خود سے جدا کیا۔ تر بتر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھنے لگا۔ بالکل خالی خالی نگاہوں سے..... [illegible] چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے اور پھیلتے چلے گئے۔ شگفتلا نے ایک بار پھر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ "جیکی! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیا سے کیا بن گئے..... جیکی! یہ سب میرے کارن ہوا ہے نا؟ میں ہی تمہاری دوشی ہوں نا؟ جیکی! مجھے بتاؤ، میں ہی دوشی ہوں نا؟"

جیکی خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ لگتا تھا جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک حقیقی منظر دیکھ رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ حسن و عشق کی جو ملاقات آج میں نے دیکھی تھی، وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔ یہ بات سمجھنا اب میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کہ مضطرب شگفتلا رات کو ان در و دیوار میں چکراتی رہی تھی اور آخر جیکی کے کمرے تک جا پہنچی تھی۔

..... قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ جا کر کھڑکی سے آنکھ لگائی۔ وہ اسی طرح اس کے بدبودار جسم کو اپنی خوشبودار ریشمی آغوش میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کے لیے وقت کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ جیکی کا اکلوتا ہاتھ شگفتلا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ منظر دیگر لوگ بھی دیکھیں۔ میں نے اس پورشن کی طرف آنے والے تمام دروازے مقفل کر دیے۔

صبح کے وقت میں نے محسوس کیا کہ جیکی کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔ درحقیقت اس کی طبیعت کل رات سے ہی مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور جاپانی ڈاکٹر کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچنا تھا۔

میں ڈاکٹر چوہان کے پاس پہنچا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ وہ بھی تفصیل جان کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ آیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے اور جیکی کو بہ مشکل شگفتلا سے علیحدہ کیا۔ پھر بھی وہ مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہوئی۔ اس نے جیکی کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چوہان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کیے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا اور نبض ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

جیکی کی حالت کے پیش نظر جاپانی ڈاکٹر لی وان نو بجے ہی دیوان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسسٹنٹ اور ایک بڑا میڈیکل باکس بھی لایا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک جاپانی ڈاکٹر لی وان، جیکی کی حالت کے ساتھ نبرد آزما رہا..... اس کی مسیحائی سے جیکی

http://pakfunplace.blogspot.com

کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس میں بھی روانی آ گئی لیکن ڈاکٹر لی وان ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ مریض ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ خاص طور سے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم تھے۔

رات بارہ ایک بجے کے قریب جیکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ شگفتہ نے اسے مسلسل اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر شگفتہ کی گود میں تھا۔ وہی اسے دوا وغیرہ بھی کھلا رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ جیکی شراب کے سوا کسی اور شے کے لیے منہ کھول ہی نہیں سکتا اور دوا کے لیے منہ کھولنا تو اچھے بھلے لوگوں کے لیے کافی مشکل ہوتا ہے۔ شگفتہ کے کہنے پر جیکی نہ صرف دوا کے لیے منہ کھول رہا تھا بلکہ دوا کو نگل بھی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر شگفتہ اس کے منہ میں جلتا ہوا انگارہ بھی رکھ دے گی تو وہ بغیر آہ کیے اسے گلے میں اتار لے گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی مگر جیکی کی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ چوہان ہی کی ہدایت پر دو تین بار شگفتہ نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی جیکی کو پلائی مگر لگتا تھا کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ یا تو دوا اتنی کم مقدار میں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یا پھر اس کی طبیعت ابتر تھی۔

دوپہر کو چوہان اور میں نے شگفتہ کی بہت منت سماجت کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لے اور کچھ کھا پی لے لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ شام کو جاپانی ڈاکٹر لی وان نے جیکی کو گلوکوز کی ڈرپ لگائی اور ڈرپ میں کچھ دوائیں بھی انجیکٹ کیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جیکی غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی سانس بھی کچھ ہموار ہو گئی۔ رات کو ہم نے پھر زور لگایا اور شگفتہ کو ایک دو گھنٹے آرام کے لیے آمادہ کر لیا لیکن وہ کہیں گئی نہیں۔ وہیں جیکی کے کمرے میں ایک گوشے میں سمٹ کر بیٹھی رہی۔

میں نے جیکی کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔ آج سردی خاصی زیادہ تھی۔ کھڑکیوں کی درزوں میں سے سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ جیکی حسب معمول ایک لنگوٹ میں تھا۔ میں نے اس پر ایک کمبل ڈالنا چاہا۔ اس نے اضطراب کا اظہار کیا اور کمبل پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ میں اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی سرگوشی میں بولا۔

"تم...... بھی...... اپنا کمبل اتار پھینکو۔"

میں نے کمبل نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جیکی علامتی پیرائے میں بات کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بھی جسمانی راحتوں کے حوالے سے اپنا وطیرہ بدلوں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا رہا تھا۔ آج پھر اس نے اسی موضوع پر چند سرگوشیاں کیں۔ اس نے اٹک اٹک کر بے حد لڑکھڑاتی آواز میں جو کچھ کہا، وہ اس طرح تھا۔ "...... تن آسانی ہمیں کمزور کرتی ہے۔ ہم جتنی زیادہ جسمانی سختیاں جھیلتے ہیں، اتنے ہی مضبوط اور زور آور ہوتے ہیں۔ افریقہ کے ریگستانوں میں جہاں دوپہر کے وقت ریت انگاروں کی طرح دہکتی ہے، جان دار زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح جمی ہوئی برف کے اندر بھی آبی مخلوق سانس لیتی ہے...... تو پھر ہم کیوں موسموں کا جبر نہیں جھیل سکتے؟ ہم کیوں...... بھوک پیاس...... تھکن اور درد سے نہیں لڑ سکتے...... ایسا ہو سکتا ہے...... اور جو لوگ ایسا کرنا سیکھ جاتے ہیں...... کوئی ان سے جیت نہیں سکتا۔"

بات کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے جاننا چاہتا ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اس کی پیشانی سہلائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی سرگوشی جاری رہی۔ "جو درد، تکلیف اور سختی کا سامنا کرتے ہیں، وہی راحت، خوشی اور فتح کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ بڑا سادہ فارمولا ہے...... جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی...... جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ کامیابی......"

وہ دھیرے دھیرے بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں میرے دل کے اندرونی تاروں کو چھیڑتی تھیں۔

"کچھ" تھا اس میں جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا...... اور جو کچھ وہ دینا چاہتا تھا اس کے لیے میرے اندر ایک خلا موجود تھا۔

صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ شگفتہ پھر بے چین ہو کر اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اس نے اس کا سر پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

شگفتہ کا لمس پاتے ہی جیکی جیسے پھر سے جی اٹھتا تھا۔ امید پیدا ہونے لگی تھی کہ وہ بے شمار دیگر مقابلوں کی طرح موت سے یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔

صبح سویرے ڈاکٹر لی وان بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ

کچھ خاص انجکشن لایا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ انجکشن جیکی کی طبیعت سنبھالنے میں بہت مدد دیں گے۔ اپنی دواؤں میں سے ان انجکشنز کو لی جاپانی وان ایک کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

یہ انجکشنز بھی گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے ہی جیکی کی ورید میں انجیکٹ کیے جانے تھے۔ ڈاکٹر لی وان ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ شگفتہ کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے جیکی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کسی صورت جدا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ابھی ڈاکٹر نے جیکی کو ڈرپ لگائی نہیں تھی کہ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا مدقوق چہرہ بالکل زرد پڑ گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ ڈاکٹر لی وان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کیے اور وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "ٹمپریچر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ فی الحال ڈرپ نہیں لگائی جا سکتی۔"

"بلڈ پریشر کیا ہے؟" ڈاکٹر چوہان نے پوچھا۔

"وہ بھی بڑھا ہوا ہے۔" ڈاکٹر لی وان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔ آپ لوگ گاڑی کا انتظام کریں۔ [illegible]"

چوہان بھاگتا ہوا باہر گیا اور دو چار منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کار تو نہیں ملی لیکن گھوڑا گاڑی آ گئی ہے۔

ہم نے ہلکے پھلکے [illegible] جیکی کو احتیاط سے اٹھایا اور گاڑی میں پہنچا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ادھورے جسم کا وزن [illegible] سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک آرام دہ نوری گاڑی تھی۔ چار نہایت توانا گھوڑے اسے کھینچ رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے ڈاکٹر لی وان کے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کے خوب صورت چوبارے اور عبادت گاہوں کے گنبد و کلس اس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آرام دہ گاڑی حتی الامکان رفتار سے جا رہی تھی۔ جیکی کا سر شگفتہ کے زانو پر تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح جیکی پر جھکا رکھا تھا۔ یکایک جیکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ دہل کر رہ گیا۔ ڈاکٹر چوہان اور شگفتہ نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔ شگفتہ نے بہ مشکل

بولر کے سامنے ایک ایسا بیٹسمین تھا جو بیٹ ہلانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اس کی ہر بال یا تو سائٹ بیٹ سے ٹکراتی، یا دائیں بائیں سے کوئی نقصان پہنچائے گزر جاتی۔ تنگ آ کر وہ ایمپائر کی طرف مڑا۔ "جناب! یہ تو بیٹ استعمال ہی نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت میں کیا یہ آؤٹ نہیں؟"

"نہیں۔" ایمپائر نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بیٹ استعمال کرے گا تو آؤٹ ہو جائے گا۔"

■■■■■■■■■■■■■■

نوجوان بیٹسمین بہت زیادہ نروس تھا۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب بھی کریز پر موجود تھا۔ وہ خفت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے پلٹ کر وکٹ کیپر کو دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھ سے زیادہ خراب کھیلنے والے بھی دیکھے ہوں گے؟"

وکٹ کیپر خاموش رہا۔

بیٹسمین نے اپنی بات دہرائی۔

"میں نے تمہاری بات سن لی تھی۔" وکٹ کیپر نے جواب دیا۔ "لیکن میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

اسے ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس نے جیکی کو اپنے سہارے بٹھایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے گھوڑا گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر تل پانی کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ہم اب آبادی کے مضافات میں تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جیکی کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر شگفتہ کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر شگفتہ نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شگفتہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر شگفتہ نے ڈاکٹر چوہان سے مخاطب ہو کر دل فگار آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر! گاڑی رکوایئے۔"

چوہان چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے شاہی کوچبان سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے۔ گاڑی رک گئی۔ جہاں گاڑی رکی، وہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان دور تک شفاف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس پانی پر عجیب سی نیلاہٹ تھی۔ یہ نیلاہٹ دراصل کنول کے بے شمار

http://pakfunplace.blogspot.com

پھولوں کی تھی۔ جیکی نے شاید اس خوب صورت منظر کو
یکھ کر ہی گاڑی رکوائی تھی۔ شگفتا اب سسکیوں سے
رو رہی تھی۔ اس نے کوچبان کو بلایا اور اس سے پوچھا
کہ کیا گاڑی اس پانی میں جا سکتی ہے؟
کوچبان نے آگے جا کر پانی کا جائزہ لیا پھر اثبات
میں سر ہلا دیا۔ اب وہ روتے ہوئے بولی۔ ”گاڑی کو پانی
میں لے جاؤ۔“
ہم سب جان گئے تھے کہ یہ جیکی کی خواہش ہے اور
شاید یہ خواہش آخری خواہش کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ
بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا اور لگتا تھا کہ جاپانی ڈاکٹر کی
طرح ان نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے جیکی
کی اس آخری خواہش کے راستے میں رکاوٹ نہیں
ڈالی۔
ہم گھوڑا گاڑی سے اتر گئے۔ صرف جیکی اور شگفتا
موجود رہے۔ وہاں زمین پر پانی دو تین فٹ سے زیادہ
نہیں تھا۔ کوچبان گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا
آگے تک لے گیا۔ وہاں چاروں طرف سنہری دھوپ
تھی اور کنول کے ہزار ہا پھول سر ہلا کے اولین بھر گھوں
ہولے ہولے رقص کر رہے تھے۔ کہیں کہیں
کسی سفید بگلے یا مرغابی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔
گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کوچبان گھٹنوں گھٹنوں پانی
میں چلتا ہوا واپس آ گیا۔
سب کی آنکھیں نم تھیں۔ چمکیلی منقش گاڑی
کنول کے ان گنت پھولوں کے درمیان ساکت کھڑی
تھی اور اس گاڑی میں شگفتا اور جیکی کے ہیولے نظر
آ رہے تھے..... جیکی کو وہ کشتی اور وہ جھیل تو نہیں مل
سکی تھی جو اس کی سنہری یادوں کا حصہ تھی لیکن اس سے
ملتا جلتا منظر ضرور مل گیا تھا..... اور پھر اس سے بڑی
بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ شگفتا کی بانہوں میں تھا۔
تو شاید کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔
وہ ایک عظیم نیپالی فائٹر تھا لیکن اس کے چٹانی جسم
کے اندر ایک شاعر کا سا گداز بھی موجود تھا اور یہ شاعر
ایک آئیڈیل موت چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت
داغی منظر..... اور یہ سب کچھ اسے مل گیا۔
ہونی ہو کر رہتی ہے اور قدرت کے اصول آسانی
سے نہیں بدلتے۔ سورج نصف النہار کے قریب تھا جب
وہ مر گیا۔ چمکیلے پانی کے درمیان اور ہزار ہا پھولوں کے
اس کی آخری ہچکی شگفتا کی ریشمی گود میں جذب
ہو گئی۔ شگفتا کے رونے کی آوازوں سے ہمیں پتا چلا کہ

کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم کنارے سے پانی میں چلے گئے۔
وہ گھوڑا گاڑی کی ایک آرام دہ نشست پر ساکت لیٹا
تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی اور نقوش گواہی
دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہموار طریقے سے زندگی کی
سرحد پار کر گیا ہے۔ چوہان نے اس کا جسم ایک کمبل
سے ڈھانپ دیا۔ گاڑی کے اندر سے بھی لگ رہا تھا کہ یہ
کوئی جھیل ہے اور ہم کشتی میں بیٹھے ہیں۔
ہم گھوڑا گاڑی کو اس پانی سے باہر لائے۔ شگفتا
اب بھی جیکی کے ساتھ پیوست تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ
اس نے اپنے جھمکے اتار دیے۔ تیکی ہار بھی اتار پھینکا۔ اس
کے بعد اس نے کسی بیوہ کی طرح اپنی چوڑیاں کھڑکی
کے چوکھٹ پر مار کر توڑ ڈالیں اور ایک سفید چادر سے
اپنا سراپا ڈھانپ لیا۔
دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہُو

☆☆☆

جیکی کی موت نے مجھے گہری افسردگی کا شکار کر
دیا۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا جہاں میں اور جیکی
مشق کیا کرتے تھے..... میں چھت سے جھولتے ہوئے
سینڈ بیگ کو دیکھتا رہتا اور وہ سارے مناظر میری نگاہوں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ سٹیپ چو بیس گھنٹوں میں ایک
دو بار مشکل اس کو تھوڑا بہت کھلا دیتی تھی۔ اسے دیکھ
کر یقین ہی لگتا تھا کہ وہ ایک جوان بیوہ ہے۔
ایک دن چوہان میرے پاس آن بیٹھا۔ وہ اسحاق کے
ساتھ مل کر سلطانہ کی تلاش سرگرمی سے جاری رکھے
ہوئے تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی تک کوئی خاص پیش
رفت نہیں ہو سکی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سلطانہ کے
بارے میں بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حسب
معمول جیکی اور شگفتا کی طرف مڑ گیا۔
میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”کاش، ہم
کسی طرح جیکی کو بچا سکتے۔“
چوہان بولا۔ ”ہم نے اپنی سی کوشش تو کی ہے
جینسن! اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو
بڑی تیزی سے خرچ کیا..... شاید وہ خود بھی زندہ رہنا
نہیں چاہتا تھا۔“
”لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ وقت ایک بار پھر اسے
شگفتا کے روبرو لائے گا تو وہ موت کے بارے میں سوچنا

بھی گناہ سمجھتا۔“ میں نے کہا۔
”مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم آنے والے حالات سے
بے خبر ہوتے ہیں اور یہی نظامِ قدرت ہے۔
بہرحال..... اس بات کا تو اطمینان ہے کہ جیکی کا
آخری وقت نسبتاً آسان ہو گیا۔ اس نے اس ہستی کی
بانہوں میں جان دی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز
تھی۔“
میں تصور کی نگاہ سے جیکی کا وقتِ رخصت دیکھنے
لگا۔ آخری لمحوں میں جیکی کی خواہش پر ہم نے گھوڑا
گاڑی کنول کے پھولوں کے درمیان کھڑی کر دی
تھی۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔
معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیسے جان دی۔ مگر میرا خیال
تھا کہ شگفتا آخری وقت تک اسے چومتی رہی ہو گی۔
اسے اپنی بانہوں کا گداز دیتی رہی ہو گی۔
چوہان بولا۔ ”چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔ آج کئی دن
بعد دھوپ نکلی ہے۔ ذرا گھومیں پھریں گے۔“
”اس سے کیا ہو گا؟“
”تمہارا غم ذرا ہلکا ہو گا۔ جیکی کی طرف سے دھیان
بٹے گا۔“
”لیکن میں دھیان ہٹانا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد
کرنا چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ یاد کرنا چاہتا ہوں جو وہ
[illegible] اور وہ سب بھی جو وہ نہیں
کہہ سکا۔“
”کیا کہہ نہیں سکا؟“
”وہ جو اس کی جسمانی حالت کہتی تھی۔ اس کی اجاڑ
آنکھیں کہتی تھیں..... وہ بھی ہماری طرح عمر جی اور
جارج کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ زبان سے نہیں کہتا تھا لیکن جارج
کی بے رحمی کے لگائے ہوئے چرکے اس کے سینے میں تو
تھے نا۔“
”ہاں یہ تو ہے۔“ چوہان نے سرد آہ بھری۔
”میں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا ہوں چوہان۔“
میں نے گمشدہ لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب؟“
”میں جارج گورا سے روبرو ہونا چاہتا ہوں۔ اس
کے بہت سارے قرض ہیں مجھ پر۔“
”تم جذباتی باتیں کر رہے ہو تابش! جارج کوئی
پہلوان نہیں ہے جسے تم للکارو گے تو وہ کشتی لڑنے کے
لیے تمہارے سامنے آ جائے گا۔“
”وہ بے پہلوان..... چوہان! تمہیں ماننا پڑے گا کہ

وہ قصوں کا کوئی روایتی ولن نہیں ہے جو اندر سے
کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف اپنے چمچوں کے زور پر
دادا گیری کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر یورپین کی طرح خود
کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے اور اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ
بھی ہے۔ میں اس کے اس گھمنڈ کا سامنا کرنا چاہتا
ہوں۔ اس نے میرے سامنے پستول پھینکا تھا اور مجھے
دعوت دی تھی کہ میں یہ پستول اٹھا کر اس پر
چلاؤں..... تب میں ایسا نہیں کر سکا تھا لیکن اب میرا دل
کہتا ہے کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں
کہ میرا دل سچ کہہ رہا ہے یا پھر اب بھی مجھے دھوکا دے
رہا ہے۔“
”جلد بازی نہ کرو تابش! تمہیں خود کو آزمانے
کے بڑے مواقع ملنے والے ہیں۔“ چوہان نے معنی خیز لہجے
میں کہا۔
”کیا مطلب؟“
”لڑائی ختم نہیں ہوئی، صرف ٹلی ہے۔ کوئی بھی نیا
واقعہ کسی بھی وقت اس آگ کو بھڑکا سکتا ہے۔ تمہیں
پرسوں رات والی خبر ملی ہے؟“
میں نے نفی میں سر ہلایا۔
وہ بولا۔ ”ابھی یہ خبر پوری طرح پھیلی نہیں لیکن چند
گھنٹوں میں [illegible] زبان پر [illegible]۔ کل رات
زرگاں میں تین [illegible] ہوئے ہیں۔ یہ تینوں زرگاں
کی جیل کے افسر تھے اور جارج کے ماتحت۔ ان تینوں کو
علیحدہ علیحدہ جگہوں پر قتل کیا گیا ہے۔ دو کو گھر میں اور
ایک کو عیاشی کے اڈے پر۔ ان تینوں بندوں کو بڑی
بے دردی سے تیز دھار آلے کے وار کر کے مارا گیا
ہے۔ شہر میں سخت خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔“
”کس کا کام ہو سکتا ہے؟“
”زرگاں میں تو عام خیال یہ ہے کہ قاتل وہی ہیں
جنہوں نے کچھ دن پہلے جارج کی بہن ماریا کو اغوا کیا اور
پھر اپنے مطالبے منوانے کی کوشش کی..... لیکن ہم
جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ماریا کو اغوا کرنے والوں
میں تمہارے اور اسحاق کے علاوہ فیروز اور احمد تھے۔ وہ
دونوں تو ختم ہو چکے ہیں اور تم دونوں یہاں عل پانی میں
ہو۔“
”تو پھر کون ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
چوہان خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔
اچانک میرے ذہن میں برق سی کوند گئی۔ دھیان
سیدھا سلطانہ اور اس کی دو فٹ لمبی تلوار کی طرف گیا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

...ن کے ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھیں یاد آگئیں..... اور ...ن آنکھوں میں خاموشی سے کوندتی ہوئی وہ بجلی جو خون کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”تم صاف کیوں ...ں بتاتے..... یہ کس نے کیا ہے؟“

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”ابھی وثوق سے ...ں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو شک تمہارے ذہن ...ں آیا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ہے اور دوسرے ...ت سے لوگوں کے ذہن میں بھی آئے گا۔ ابھی تک جو ...طلاع پہنچی ہے، اس کے مطابق ان تینوں وارداتوں کا ...وئی چشم دید گواہ تو نہیں لیکن شہادتوں سے اندازہ ہوتا ...ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے..... اور انہوں نے خاص ...م کی کلہاڑی استعمال کی ہیں۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سلطانہ واقعی وہاں پہنچ چکی ...و؟“

”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔“ چوہان نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ...ہے.....“

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے یقین تھا ...کہ میری طرح چوہان کا دماغ بھی گھڑدوڑ کا میدان بن ...چکا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گا چوہان؟ ...اگر وہ واقعی زرگاں میں ہے تو پھر وہ لوگ اسے اور ...طلال کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔“

”ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے ...تابش! ابھی تو ان لوگوں کو اپنی پڑی ہو گی..... تین ...اہم ترین بندے قتل ہوئے ہیں۔ وشواناتھ نام کا جو ...مسلمان اپنے گھر کے کمرے میں مارا گیا ہے، وہ پرلے ...درجے کا عیاش مشہور تھا۔ زرگاں کے بازارِ حسن میں جو ...بھی خوب صورت طوائف پیشہ شروع کرتی تھی، اسے ...پہلے وشواناتھ کے پاس حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ اس ...اصول کی خلاف ورزی کرنے والی طوائف اور اس کے ...وارثوں پر سخت مصیبت نازل ہوتی تھی۔ کل رات بھی ...وشواناتھ اپنے بیڈ روم میں ایک نئی لڑکی کو پیشے کا ...”اجازت نامہ“ دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ...اتفاقاً اس کے دونوں ملازم نشے میں مدہوش پڑے تھے، ...اٹھ نہیں سکے۔ وشواناتھ نے پہلے ملازموں کو گالیاں دیں ...پھر دستک دینے والے کی ایسی کی تیسی کرتا ہوا باہر نکلا۔ ...نوجوان طوائف زادی کمرے میں انتظار کرتی رہی۔

جب کافی دیر گزر گئی تو وہ ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ اسے گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ہی وشواناتھ منہ کے بل پڑا نظر آ گیا۔ اس کے فربہ جسم پر درجنوں زخم تھے۔ لگتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی تیز دھار آلے کے وار کیے گئے ہیں۔ اس کا پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا ملا ہے۔ شاید آخری وقت میں اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دوسری واردات جارج گورا کے گھر کے بالکل پاس ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیل کے ایک بڑے افسر اروِن لال کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ غسل خانے میں قتل ہوا ہے۔ اس کا گلا پہلے اس کے ازاربند سے گھونٹا گیا پھر تیز دھار آلے کے پے در پے وار کیے گئے۔ اروِن کی بیٹی ساتھ والے کمرے میں بے خبر سوتی رہی۔ تیسرے قتل کے بارے میں ابھی تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔“

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اگر ہمارا شک درست تھا اور ان واقعات کے پیچھے واقعی سلطانہ اور طلال تھے تو پھر آنے والے دنوں میں حالات کوئی بھی سنگین رخ اختیار کر سکتے تھے۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح زرگاں چلا جاؤں؟“

”...... تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ تم جارج تک پہنچنا چاہتے ہو۔“

”اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے چوہان..... سلطانہ زرگاں میں ہے۔ وہ جارج کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس کوشش میں اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تو کیا مجھے اس کی مدد نہیں کرنی چاہیے؟ یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ اپنی جان گنوائے یا کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے؟“

چوہان مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ابھی تو یہ سب مفروضے ہی ہیں تابش! ہم ابھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ زرگاں میں درحقیقت کیا ہوا ہے..... اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں سچ مچ سلطانہ اور طلال ملوث ہیں بھی یا نہیں۔“ اس نے دو لمحے توقف کر کے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”تابش! میرے خیال میں فی الوقت سوچنے والی جو سب سے اہم بات ہے، وہ کچھ اور ہے۔“

”کھل کر بات کرو۔“

”ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس نظر نہ آنے والی زنجیر کو کیسے کھول سکتے ہیں جو شمیم اور جارج نے تمہارے پاؤں میں ڈال رکھی ہے..... میرا مطلب اس مائیکرو چپ سے ہے جو تمہارے جسم میں رکھی گئی ہے۔“

میرے اندر ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کسی وقت میں واقعی اس اہم ترین نکتے کو بھول جاتا تھا کہ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، کچھ نادیدہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں گی اور میری ہر جدوجہد کو ناکام کر دیں گی۔

”تم چاہتے ہو کہ میں آپریشن کے ذریعے وہ چپ اپنے جسم سے نکلواؤں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یہ بے حد ضروری ہے۔ آئندہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے تابش، اس کی بنیاد اس بات پر ہو گی کہ تم واقعی آزاد ہو یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اس اسٹیٹ سے نکلنا ہی چاہو تو بھی تمہارے اندر کی یہی چپ تمہارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنے گی..... تم ہمیشہ کی طرح لاچار ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”لیکن اب تو صورت حال بدل چکی ہے۔ میں یہاں ...... ہوں۔ چھوٹے سرکار اور ...... تم ہی کی طرح مجھ پہ ...... چکی ہے۔ اگر میں چھوٹے سرکار سے یہ درخواست کروں کہ وہ مجھے یہاں سے نکلنے دیں تو کیا وہ میری درخواست کو رد کر دیں گے؟“

”بات درخواست کی نہیں ہے تابش! شاید تمہیں اس بات کی جانکاری نہیں کہ اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستوں پر چھوٹے سرکار اور شمیم کی مشترکہ نگرانی ہے اور یہ بڑی سخت نگرانی ہے۔ نکاسی کے راستوں پر موجود ان ساری چوکیوں پر تل پانی کے ساتھ ساتھ زرگاں کی سیکیورٹی فورس بھی موجود رہتی ہے۔ دونوں طرف کے اہلکاروں کی مکمل اجازت اور تسلی کے بغیر کوئی شخص سرحد پار نہیں کر سکتا.....“

چوہان نے اس حوالے سے مجھے مزید تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ جنگل میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران میں، میں جا بجا پرانی حفاظتی چوکیاں اور چوکیاں وغیرہ دیکھ چکا تھا۔ انور خان نے بھی مجھے اس راجواڑے کی سرحدی نگرانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر چوہان نے کہا۔ ”میری رائے تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ڈاکٹر لی وان سے رابطہ کریں اور انہیں اس بارے میں پوری تفصیل بتائیں۔ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ تمہارا آپریشن کریں تو وہ کامیاب رہے گا۔“

..... ہم اسی روز رات کو ڈاکٹر لی وان سے ملے۔ اس کا چھوٹا سا اسپتال تل پانی کے مضافات میں ایک خوش گوار آب و ہوا والی جگہ پر تھا۔ لی وان کو چھوٹے سرکار اور دیوان کے خصوصی معالج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ بہت کم لیکن کارآمد بات کرتا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے باروندا جنگی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ درحقیقت اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ ہاں..... اگر وہ چار چھ مہینے پہلے ہمارے پاس آ جاتا تو شاید ہم کچھ کر سکتے۔“

”آپ کو پتا ہے کہ وہ اصل میں کون تھا؟“ چوہان نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے چھوٹے سرکار اجیت رائے نے بتایا ہے۔ اور یہ سب جان کر میرے دکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپان میں مارشل آرٹ کی قدر دیگر ملکوں سے زیادہ ہے۔ نیپالی فائٹر جنگی کا نام وہاں بھی بہت سنا جاتا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نامور ہیرو بھی ...... مریض ...... میرے سامنے آئے گا اور ...... کی نظر ...... ڈالنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کیا جا سکے گا۔“

ہم نے کچھ دیر تک جنگی کو یاد کیا..... پھر چوہان اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے ڈاکٹر لی وان کو میرے انوکھے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ حسبِ توقع ڈاکٹر لی وان بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ چوہان کے کہنے پر اس نے میرے سر کے عقبی حصے کو ٹٹول کر دیکھا اور ان ٹانکوں کا معائنہ بھی کیا جو میری گدی پر موجود تھے۔ ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر لی وان انگریزی میں بات کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں میڈیکل کی مشکل اصطلاحات بھی آ رہی تھیں۔

ابتدائی معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹی ایکسرے مشین اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر نے میرے دو تین ٹیسٹ لیے..... اس نے فوری طور پر تو کچھ نہیں بتایا تاہم ہمیں ایک دن بعد دوبارہ آنے کے لیے کہا۔

..... میں اور چوہان تیسرے روز دوپہر کے وقت

http://paktunplace.blogspot.com

پھر لی وان کے شفاخانے پہنچے۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر چوہان کو الٹرا ساؤنڈ کے پرنٹس دکھائے۔ ایکسرے پر غور و خوض ہوا۔ ایکسرے میں چمکتی ہوئی مائیکرو چپ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے دو چار سوال پوچھنے کے بعد چوہان اور لی وان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد وہ باہر آئے اور ڈاکٹر چوہان نے مجھے چلنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر لی وان نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔“

راستے میں گھوڑا گاڑی کے اندر چوہان نے مجھے بتایا۔ ”لی وان کا خیال ہے کہ یہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بہتر سہولتوں کی ضرورت ہے۔“

”کیوں؟“

”وہی بات جس کا ہمیں بھی ڈر تھا۔ تم نے بھی ایکسرے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسکل وغیرہ نے چپ پلانٹ کرتے ہوئے پوری خباثت دکھائی ہے۔ یہ چپ تمہاری ریڑھ کے بالائی حصے سے بالکل اٹیچ ہے..... اور تمہیں پتا ہی ہو گا کہ ریڑھ میں ”اسپائنل میرو“ ہوتا ہے جو جسم کا بہت نازک حصہ ہے۔“

”تو پھر؟“

”لی وان کا کہنا ہے کہ چپ کو نکالنا ناممکن نہیں ہے مگر اس کے لیے ایک اچھے نیورو سرجن اور جدید آپریشن تھیٹر کی ضرورت ہے۔“

میں نے لمبی سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ڈھاک کے وہی تین پات۔ چپ نکلوانے کے لیے ضروری ہے کہ میں اسٹیٹ سے باہر جاؤں اور باہر جانے کے لیے ضروری ہے کہ میں چپ نکلواؤں۔“

”فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لی وان رسک لینا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ اگر اس کام میں خطرہ محسوس کر رہا ہے تو پھر یقیناً خطرہ ہو گا۔“

”لیکن اگر میں خطرہ مول لینا چاہوں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں لی وان سے ہی آپریشن کرانا چاہوں تو؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ لی وان مانے گا۔ ایسے لوگ اپنے پروفیشن سے بڑے کمٹڈ ہوتے ہیں۔ انہیں ایسے معاملوں میں گائیڈ نہیں کیا جا سکتا۔“

گھوڑا گاڑی اب شہر کی گنجان آبادی میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ جنگلوں جھیل پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کنارے کے لاتعداد مکانوں میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں اور ان روشنیوں کے عکس پانی میں جھلملا رہے تھے۔ کنارے کے سبزہ زاروں میں بچے چہک رہے تھے اور خوش پوش لوگ ہنس کھیل رہے تھے..... یہ دلکش مناظر تھے لیکن میرے سینے میں عجیب سی یاسیت بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اترپردیش کے جنگلات میں واقع جاہنزل اسٹیٹ نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی جیل ہے اور میں اس جیل کی بلند و بالا دیواروں کو کبھی پار نہیں کر سکوں گا۔

یہ بڑے عجیب دن تھے۔ مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن میرے جسم پر اب بھی گرمیوں والا لباس ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں رات کو کمبل یا لحاف بھی نہ لیتا۔ اسی طرح پڑا رہتا۔ یوں لگتا کہ میں جان بوجھ کر اپنے جسم کو اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اذیت کا حصول میرے لیے ایک مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور خود کو سخت ترین ورزش میں غرق [illegible] پاؤں سوج جاتے [illegible] ناخنوں سے خون [illegible] ہونے والا ہوں لیکن میں رکا نہیں۔ میرے کانوں میں جنگی کی سرگوشیاں گونجتیں۔ اس نے کہا تھا۔ ”..... جہاں برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے کچھ حاصل کرنے کی حد شروع ہوتی ہے۔“ میں دیوانوں کی طرح اپنا کام جاری رکھتا پھر نیم جان ہو کر یا چکرا کر گر جاتا۔

میرے جسم پر کوئی زخم لگ جاتا تو میں دوا لگانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ اگر چوہان زبردستی اس پر کچھ باندھ دیتا تو میں موقع ملتے ہی اتار پھینکتا۔ اپنے زخم کو مزید زخمی کرنا بھی مجھے اب اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کچھ زبردست تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ میرا جسم بتدریج تکلیف سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اب چوٹ میری ہمت کو توڑتی نہیں تھی، میرے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کسی دشمن کا سامنا کروں۔ کوئی ہو جو اپنی تمام تر نفرت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مار دے۔ کوئی

بھی ہو۔ انگلینڈ کا جارج گورا ہو جس نے مجھے خود میری نظروں میں گرا دیا تھا اور رگوں کا عکس جی ہو جو ایک آسیب کی طرح اسٹیٹ کے باشندوں کے ذہنوں پر سوار تھا یا پاکستان کا سیٹھ سراج ہو جس کے ہاتھوں پر میری مقتول ماں کا خون تھا..... ہاں، کوئی بھی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس کو جواب دوں۔ اسے پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور مجھے پتا چلے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

سلطانہ کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ ایک ہی رات میں قتل کی تین وارداتوں کے بعد کوئی نیا واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں ایک پُراسرار سی خاموشی تھی۔

ایک دن سردی زیادہ تھی۔ بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کمروں میں انگیٹھیاں روشن تھیں اور مرد و زن گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کے لیے کھلی جگہ پر چلا آیا۔ بارش کی سرد بوچھاڑوں نے مجھے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ میں نے بالائی جسم پر فقط ایک پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ میرے جسم سے چپک گئی۔ میں چلتا ہوا دیوان کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر بھی میں رکا نہیں اور جھیل کی طرف [illegible] کا وقت تھا۔ سخت سردی اور بارش کے سبب ہر طرف سناٹا تھا۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یوں، پانی کی یخ بستہ بوچھاڑوں میں بھاگنا مجھے اچھا لگا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنی برداشت کو آزمانا چاہتا تھا، اپنا دم خم پرکھنا چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت میں جھیل کے کنارے کنارے تین چار میل تک بھاگتا تھا لیکن آج کا بھاگنا مجھے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیکھا، حیرت سے دیکھا۔ میں بھاگتا بھاگتا درختوں کی طرف نکل آیا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی اور یہی کیفیت میرے دل کو بھاتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ چند گھڑسوار میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ کوئی اور نہیں دیوان کے ہی محافظ تھے۔ جب میں باہر نکلتا تھا یہ حفاظت کی غرض سے اکثر میرے آس پاس رہتے تھے اور آج تو میں کچھ زیادہ آگے نکل آیا تھا۔

میں گھنے درختوں میں داخل ہوا تو گھڑسوار میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ کپتان اجے کے ہی ماتحت تھے۔ ایک حوالدار نے آگے آ کر کہا۔ ”جناب! آپ زیادہ آگے نہ جائیں۔ موسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”لیکن آپ کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی یہ خفتی ذمے داری پوری کرتے رہو۔“ میں نے کہا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ گیلا جوتا میرے پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا۔ اب میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے تلوے راہوں کی سختی سے آشنا ہو رہے تھے۔ میں انہیں مزید آشنا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر خواہش جاگتی تھی کہ میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹیں اور میں دوڑتا رہوں۔

دوڑتے دوڑتے میری سانس ٹوٹ گئی اور ٹانگیں یکسر جواب دے گئیں۔ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ میں نے اپنا رخ تیز تر پانی برساتے آسمان کی طرف کر لیا۔ اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیے۔ کڑکتی سردی میں برفیلے پانی کی ساری سختی اپنے سراپا پر جھیلنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میرے نگراں گھڑسوار مجھ سے کچھ فاصلے پر رکے ہوں گے اور وہیں میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن مجھے اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں وہیں [illegible] بارود اور آگ کے فلسفے کے مطابق درد میں ڈوب کر درد کی حقیقت معلوم کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے درد، اذیت اور بے سکونی کا احساس کم ہوتا گیا..... یخ بستہ پانی میرے جسم پر اپنا اثر کھونے لگا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزری۔ جب اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں وہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس کے باوردی حوالدار رب نواز نے اس کے اوپر ایک بڑی چھتری تان رکھی تھی۔ چوہان بولا۔ ”شاباش! یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمن آپ بنے ہوئے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے، ایسے موسم میں اس طرح باہر نکلنے کا؟“

”کیا ہو گا؟ مر ہی جاؤں گا نا؟“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”اپنا نہیں تو ان لوگوں کا خیال ہی کرو جو تم سے وابستہ ہیں۔“

”کون لوگ؟“

http://pakfunplace.blogspot.com

کرنے کا سوچا لیکن اس کی سانپ جیسی نظریں ایک ساتھ اس پورے کمرے اور کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھر پھنکارا۔ ”ناہیں پو صاحب! آپ حرکت کریں گے تو گولی چلانا پڑے گی اور آپ کی بدقسمتی یہ ہووے گی کہ میرا نشانہ کبھی کھتا (خطا) ناہیں جاتا۔“

میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت ہے اور وہ مجھے ویسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے پستول اپنی پتلون میں سامنے کی طرف اڑسا ہوا تھا۔ یہ اس کا بے پناہ اعتماد تھا کہ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ درجنوں پہرے داروں کی موجودگی میں نہ صرف دیوان کی عمارت کے اندر پہنچا بلکہ میرے کمرے تک بھی پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میں نے اسے نگاہوں میں تولا۔ میرے جسم میں عجیب میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگا۔ ایک لہر سی سر کی طرف سے چلی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میرا سینہ ہلکے ہلکے جوش سے دھڑکنے لگا۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت جاگ اٹھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”آپ کے گھر مہمان آیا ہے یہ کمین بندہ۔ کوئی کھاطر تواضع ناہیں کریں گے؟“

”کس قسم کی خاطر تواضع چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”اجی کوئی شراب یا لونڈیا تو ناہیں مانگ رہا۔ بس ہنس کر بات کر دیجیے۔ یہی مری کھاطر ہو جاوے گی۔“

”سیدھی بات کرو۔ چاہتے کیا ہو؟“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے میری سنجیدگی محسوس کر کے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور دھوئیں کے گاڑھے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”پو صاحب! یہ کھاکسار آپ کو لینے آیا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہووے گا۔“

”کہاں؟“

”زرگاں۔ حکم جی کے پاس۔“

”کیوں؟“

”اس کیوں کے دو تین جواب ہیں پو جی..... لیکن سب سے کھاص جواب یہ ہے کہ آپ کی پتنی کی ناک میں کوئی بہت زہریلا مچھر گھس گیا ہے۔ اس نے ڈنک مار مار کر اس کے بھیجے میں آگ لگا دی ہے۔ اب وہ ہر ایک پر جھپٹے مارتی پھرتی ہے۔ اس جھانسی کی رانی کے گلے میں پٹا ڈالنے کا بس ایک ہی طریقہ مجھ میں آوت ہے۔ آپ جناب کو اپنا مہمان بنا لیا جاوے اور ہم جیسے کمینے دن رات آپ کی سیوا میں مصروف ہو جاویں۔ جب اسے آپ کی سیوا کی سماچار ملے گی تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہو جاوے گی۔“

اس کی بک بک اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جوشیلی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

”اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے نا پو صاحب..... کہ میں بہت کھاص قسم کا حرامی ہوں۔ بھگوان نے میری آنکھ میں ایک بہت پلید جانور کا بال رکھا ہوا ہے۔ یہ کبھی ہوا ناہیں کہ میں نے آپ جیسے کسی پو کو مہمان بنانا چاہا ہو اور وہ بن نہ سکا ہو۔ ہاں جی، یہ کبھی ہوا ناہیں۔“ اس نے حیرت انگیز سکون سے دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں اور بے پروائی سے رانیں کھجانے لگا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ایک مسئلہ ہو تو آپ جناب کو بتاؤں بھی۔ یہاں تو اب مسئلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور سب سے کٹھن مسئلہ تو تمہارے مراد شاہ صاحب ہی ہے۔ خبر ناہیں یہ کس لاپتا بندے کا نطفہ ہے۔ میں تو اس کی حرام کاریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہووت ہوں۔ یہ کچھ برس پہلے اسٹیٹ کی فوج میں ایک معمولی کپتان تھا۔ آج سیاہ سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس کی ہوس کسی طرح ختم ہونے میں ناہیں آتی۔ آج یہ راج گدی پر بیٹھنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ سپنے بس اسی صورت میں پورے ہو سکت ہیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کھون کے پیاسے بن جاویں اور پھر لڑ لڑ کر سورگ باشی ہو جاویں..... اور وہ حرامی جو کچھ کر رہا ہے اسی کارن کر رہا ہے۔“

”تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں مراد شاہ صاحب کے خلاف اب ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔“

”اوہو، غلطی ہو گئی پو صاحب! مجھے شما کر دیجیے۔ مجھے ایسا ناہیں کہنا چاہیے تھا۔ بے شک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ مراد شاہ کی شان بیان کرنے کے لیے بالکل بھی کافی ناہیں ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے، وہ آپ کا مہان ہے۔ آپ کی دُم پر تو پاؤں آئے گا ہی۔“ آخری الفاظ

اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہے تھے تاہم میرے کانوں تک پہنچ گئے۔

”کیا کہا تم نے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ ناہیں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ شاہ صاحب نے تل پانی کی راج گدی حاصل کرنے کے لیے جو راستہ چنا ہے، وہ کچھ جیادہ ٹھیک ناہیں۔ شاید وہ اپنا دیمرج کھو بیٹھے ہیں اور دونوں بھائیوں کو لڑانے پر تل گئے ہیں۔ لڑائی ہوئی تو بہت جیادہ کھون بہے گا۔ بہت سارے لوگ مریں گے۔ بس چند ایک ہی جندہ بچیں گے۔ چند ایک پر حکومت کرنے کا کیا کھاک مجا آوے گا اپنے شاہ صاحب کو..... وہ جس راستے پر پہلے چل رہے تھے، وہ جیادہ اچھا تھا۔“

”تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

”شاہ صاحب کا راستہ آپ کو ناہیں پتا پو صاحب! یہ تو بڑا سیدھا سادہ راستہ ہے۔ ایک دم فنٹاسٹک..... جو بھی نجر آوے اس کو پکڑ کر مسلمان بنا دو..... نہ بنے تو لالچ اور دھونس سے کام لو..... پھر بھی نہ مانے تو اس کا جینا حرام کر دو۔ یہاں تل پانی میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مسلا بنایا جا رہا ہے۔ اور تو اور سنا ہے کہ اپنے چھوٹے سرکار بھی اپنے دھرم کو دگا دینے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہو سکت ہے کہ ان سے یہ راج گدی چھن جاوے۔ پھر اس گدی پر اپنی تشریف کا ٹوکرا رکھیں گے اپنے یہی شاہ صاحب..... اور پھر اس کے بعد پتا ہے کیا ہو گا.....؟“

میں سوالیہ نظروں سے پانڈے کا سانولا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”اس کے بعد شاہ صاحب کی نجریں جمیں گی زرگاں پر۔ وہ زرگاں کو سومنات سمجھ لیوے گا اور محمود گجنوی بن کر بار بار اس کو ڈھانے کی کوشش فرماوے گا۔ بڑا فتور ہے سالے کی نیت میں..... بڑا فتور ہے.....“

میں پانڈے کی صورت دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ وہ کش لے کر بولا۔ ”باہر برکھا ہو رہی ہے۔ کھاصی سردی ہے۔ تم کوئی چادر وغیرہ لے لو۔ ہم کو کافی لمبا سفر کرنا ہے۔“

میرے اندر کی جلن میں گھلا ہوا میٹھا درد فزوں تر ہو گیا۔ کہیں گہرائی میں ایک انگڑائی سی بیدار ہونے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پانڈے! میں جانتا ہوں کہ تو کمزور شخص نہیں ہے..... اور ناکام بھی نہیں ہے لیکن آج کی رات تو بڑا بدقسمت ثابت ہوا ہے۔“

”کیا مطلب پو صاحب؟“

”آج تو ایک غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط شخص کے سامنے ہے۔ کاش تیرے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوتا۔“

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسی بات سنے گا۔

سگریٹ کی راکھ کباب والی پلیٹ میں جھاڑ کر اس نے طویل کش لیا۔ ”پو صاحب! آپ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نشہ وشہ تو ناہیں کیا ہوا..... یا پھر آپ اس کھاکسار کے بارے میں جیادہ جانت ناہیں ہیں۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں نیلا زہر اتر آیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے پتلون کی بیلٹ میں سے اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ وہ کسی ناگ کی طرح پھنکارا۔ ”میں صرف دھمکاتا ناہیں ہوں پو..... گولی مارتا ہوں اور میرا نشانہ کھتا ناہیں جاتا۔“

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ میرے اندر کا سرکش ریلا اچھل گیا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ میرے پاؤں کی ضرب بالکل نشانے پر لگی۔ میرے پاؤں کی ”اپر ہام“ نے پانڈے کے پسٹل اور پسٹل والے ہاتھ کو ایک ساتھ نشانہ بنایا۔ کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور ایک الماری کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میں اندھادھند پانڈے پر جا پڑا۔ میرا سر پوری شدت کے ساتھ اس کے سینے پر لگا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرا مدمقابل کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے سیاہ جسم میں گوشت پوست کے بجائے جیسے فولاد بھرا ہوا تھا۔ میرے سر کی ضرب سے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گیا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ یقیناً یہی محسوس ہوا کہ دیوار میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے ٹکرایا تھا، اس سے کئی گنا تیزی سے واپس میری طرف آیا۔ اس کا فولادی ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا اور آنکھوں میں ستارے سے رقص کرنے لگے۔ یکایک وہ کسی مشتعل جانور

http://pakfunplace.blogspot.com

کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے ہتھوڑے پکڑے ہوئے ہیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے درجنوں مہلک تیز ضربیں اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ میں کئی بار سنگ سرخ کی دیواروں سے ٹکرایا، گرا اور اٹھا......

اور پھر میرا داؤ چل گیا۔ میں نے اسے ایک ایسی چوٹ لگائی جو کسی فائٹنگ مقابلے میں تو سراسر فاؤل ہوتی لیکن اس دوبدو لڑائی میں بالکل برمحل تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کی رانوں کے عین درمیان ٹھوکر ماری۔ وہ تڑپ کر پیچھے کی طرف گیا۔ مجھے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

اگلے تین چار منٹ تک ہم دونوں کے درمیان ایک اندھا کر دینے والا معرکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے، فرنیچر الٹ گیا اور [illegible] کمروں کے [illegible]

[illegible]

"[illegible]" [illegible]

چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں سے چمک دار پھل کا چاقو نکال لیا۔ اس کے چاقو کے دو جان لیوا وار میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے۔ اس کے بعد اس کرسی سے اسے اندھا دھند دھکیلتا ہوا برآمدے میں جا گرا۔ میں دہاڑ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے پانڈے کو پھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن فولاد کو ہاتھوں سے پھاڑنا بھی تو ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک سخت جان فائٹر تھا۔ میری ضربیں سہہ رہا تھا اور ان سے بچنے کی کامیاب کوشش بھی کر رہا تھا۔ اچانک پانڈے کا داؤ چل گیا۔ اپنے سینے پر میری ٹانگ کھا کر وہ برآمدے کی ایک دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہاں دیوار پر بجلی کا "ڈی بی" لگا ہوا تھا۔ مین سوئچ بھی موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

"دیکھو...... پکڑو۔" ایک دم بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کوئی پہرے دار کربناک انداز میں چلایا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی نے ہوائی فائر کیے۔ کوئی ٹارچ لینے کے لیے بھاگا۔ "تم کہاں ہو تابش؟" چوہان کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ٹٹولتا ہوا مین سوئچ کی طرف گیا اور اسے آن کر دیا۔ ایک دم قرب و جوار روشن ہو گئے۔ بیرونی دروازے کے پاس ایک پہرے دار تڑپ رہا تھا۔ چاقو کے وار نے اس کے پیٹ کو اس طرح چاک کیا تھا کہ انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس شخص نے بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اور تاریکی میں اندازے سے پانڈے پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ پانڈے کی تلاش میں پہرے دار ہر طرف دوڑے پھر رہے تھے۔ دیوان کے بیرونی گیٹ کے پاس ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ رکھوالی کے کتوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

اسے کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب تھا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی اندر ہی ہو۔ باہر نکلنے کے رستے "سیل" کر دو۔"

انور خاں بولا۔ "بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر جائے گا۔"

اسے کی ہدایت پر دو پہرے گھڑ سوار دستے تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف گئے۔ انھیں آس پاس کی آبادی کا محاصرہ کرنا تھا۔ یہ احساس ہر چہرے کو دہشت زدہ کر رہا تھا کہ پانڈے جیسا خطرناک بندہ اس وقت دیوان کے آس پاس یا دیوان کے اندر موجود ہے۔

میرے منہ سے خون رس رہا تھا۔ ایک پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماری کے پیچھے گرا ہوا رنجیت پانڈے کا سرکاری پستول نکال لیا۔ اور پھر وہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ پانڈے موقع سے غائب ہو گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سفاکی کا انمٹ ثبوت دے گیا تھا۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ چوہان اور میں لڑکھڑا کر رہ گئے۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو اڑ کر برآمدے میں گرتے دیکھا۔ بارود کی بو ناقابل برداشت تھی۔ ہر طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور یقیناً شگفتلا اور ملازمہ صفیہ کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔

"یہ کیا ہوا چوہان؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں بم بلاسٹ ہے۔" چوہان کی آواز جیسے کہیں دور سے میرے سیٹیاں بجاتے کانوں میں پڑی۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ یہاں دل دوز مناظر تھے۔ اسے کے کم از کم پانچ ماتحت لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی کا بازو غائب تھا، کسی کی ٹانگ۔ کئی افراد شدید زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ آہ و بکا کر رہے تھے۔ لاشوں میں مجھے اسے کا ماتحت حوالدار رب نواز بھی نظر آیا۔ اس کے سر کا ایک حصہ صاف اڑ چکا تھا۔

"اوہ خدایا...... یہ کیا ہو گیا؟" چوہان نے لرزاں آواز میں کہا۔

"یہ اسی حرامزادے کا کارنامہ ہے۔ وہ جاتے جاتے یہاں کوئی ٹائم ڈیوائس رکھ گیا ہے۔" اسے پھنکارا۔

"اگر یہاں ایک ڈیوائس ہے تو اور بھی ہو سکتی ہے۔" چوہان نے کہا۔

چوہان کے اس فقرے نے سراسیمگی میں اضافہ کر دیا۔ اہل کار خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ زخمیوں کو نکال کر سب اس جگہ سے دور ہٹ گئے۔ میرے جسم میں آگ روشن تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ علم اور جارج کے سفاک اہل کار پانڈے نے ان تین عہدے داروں کی موت کا انتقام لیا ہے جنھیں چند روز قبل زرگاں میں قتل کیا گیا تھا...... تو کیا آگ، خون اور بدلے کا کھیل شروع ہو چکا تھا؟

☆☆☆

اگلے تین چار گھنٹے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس بات کا شبہ تو ہر ذہن میں موجود تھا کہ تل پانی میں اور دیوان کی عمارت کے اندر بھی زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ آج یہ بات پوری طرح ثابت ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے نہ صرف دیوان میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک سنگین واردات کے بعد صاف نکلنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ پانڈے کے ساتھ ہی دیوان کے دو اہم ترین پہرے دار بھی غائب تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پانڈے انھی دو افراد کی مدد سے دیوان میں داخل ہوا اور بعدازاں صاف بچنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

میرے رہائشی پورشن کے اسٹور میں سے ایک دراز قد عورت کا سیاہ برقع بھی ملا۔ معلوم ہوا کہ دیوان میں داخل ہوتے وقت پانڈے اسی برقعے میں تھا۔ اس کے علاوہ اسٹور میں ہی پلاسٹک کی ایک دستی ٹوکری بھی ملی جس میں چند کیلے اور سیب وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پانڈے، دھماکا خیز مواد اس ٹوکری میں رکھ کر اندر لایا تھا۔ صورت حال واضح ہونے کے بعد دیوان میں فوری طور پر کئی گرفتاریاں ہوئیں اور بہت سے لوگوں کو شامل تفتیش کیا گیا۔ عام لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر کا تاثر یہی تھا کہ جارج گورا اور علم نے ان تین ہلاکتوں کا جواب دیا ہے جو زرگاں میں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سیکیورٹی انتظامات کو ناکام بنا کر دیوان میں گھس سکتے ہیں اور لوگوں کو مار سکتے ہیں۔

میری اور پانڈے کی لڑائی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں نے ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ سے کولٹ پسٹل چھڑایا تھا۔ یہ بڑا زوردار وار تھا اور اس وار کا بہت سا صدمہ میرے پاؤں کو جھیلنا پڑا تھا۔ پسٹل اور پاؤں کے تصادم سے پاؤں کا بالائی حصہ سوج گیا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔

اگلے روز صبح تک پورا پاؤں سوج گیا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ صبح سویرے چوہان اور انور خاں میرے پاس آئے۔ انور خاں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ "برادر! تم تو راتوں رات مشہور ہو گئے ہو۔ ہر زبان پر تمہارا نام ہے۔ پانڈے اس اسٹیٹ میں دہشت کی علامت ہے۔ تم نے نہ صرف اس سے دوبدو مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے بھگانے میں بھی کامیاب رہے ہو۔"

"لیکن وہ جاتے جاتے ایک زبردست چوٹ تو ہمیں دے گیا نا۔ چھ بے گناہ لوگوں کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

انور بولا۔ "اس کا صدمہ تو ہر ایک کو ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ پانڈے جیسا شخص جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں سے چوٹیں کھا کر گیا ہے اور یہ چوٹیں ایسے بندے نے لگائی ہیں جو چند مہینے پہلے تک کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ پانڈے کو لگنے والی ان چوٹوں کا اثر آئندہ حالات پر پڑے گا۔ چھوٹے سرکار بھی تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کل رات مجھے بلایا تھا اور تمہارے سارے کوائف معلوم کیے تھے......"

http://pakfunplace.blogspot.com

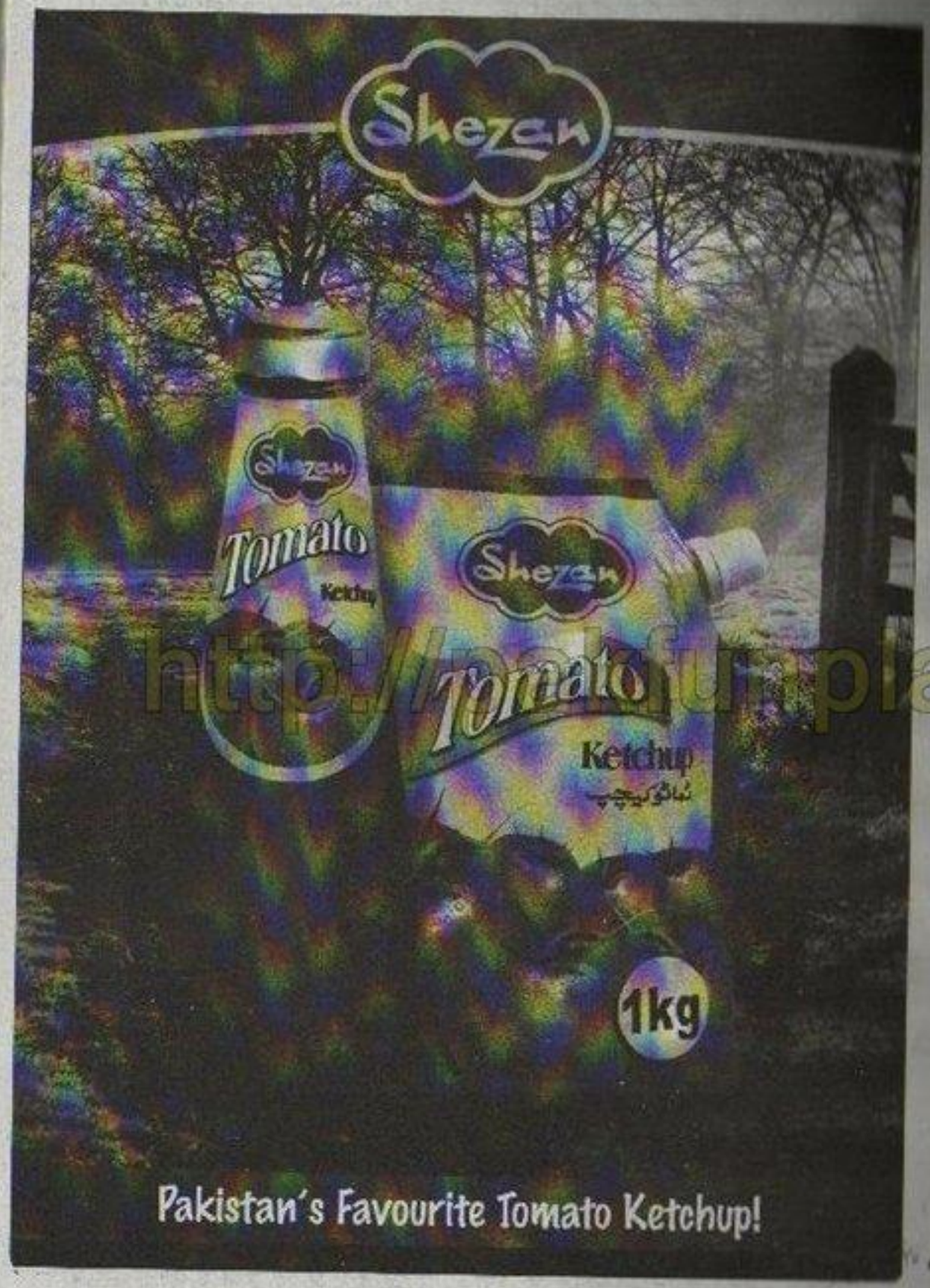

"سلطانہ..... تمہارا بچہ....."

"سلطانہ جاچکی ہے..... اور جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بھی تو پل جاتے ہیں۔"

"سلطانہ جا تو چکی ہے..... لیکن زندہ ہے۔ اسے کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں تازہ اطلاع شاید تم نے نہیں سنی۔"

"کیسی اطلاع؟" میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند ذرا کم ہوئی۔

"زرگاں والوں نے کھوج لگایا ہے کہ جارج کے تین ماتحتوں کو قتل کرنے والی سلطانہ ہی ہے۔"

"کیسا کھوج؟"

"ایک مقتول کی ہاتھوں کی انگلیوں سے کچھ لمبے بال ملے ہیں۔ اس کے علاوہ زرگاں کے ایک بیل گاڑی والے نے گواہی دی ہے کہ واردات کی شام ایک عورت اور ایک لڑکے نے اس کی گاڑی میں سفر کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ عورت، مختار راجپوت کی بیٹی ہی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"اس سے یہ فرق پڑے گا کہ سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں اس کی حفاظت کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"اب تک سوچ ہی تو رہے ہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

چوہان نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس دیوان میں آ گیا۔ راستے میں وہ مجھے مسلسل سمجھاتا رہا۔ میرے طرز زندگی کو حماقت قرار دیتا رہا اور میانہ روی کے مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی باتیں مجھ پر بے اثر تھیں۔ میں کسی اور ہی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ قریب المرگ بارو دہا جیکی کچھ بیج بو گیا تھا میرے اندر اور یہ بیج اب لہلہاتے پودے بن رہے تھے۔

قیام گاہ پر واپس پہنچ کر میں نے چوہان کے بے حد اصرار پر کپڑے بدلے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے چائے پی اور لکھنوی طرز کے کباب کھائے۔ رات نو دس بجے کے قریب چوہان واپس چلا گیا۔ میں نے آتش دان بجھا دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر تک کھڑکی میں بیٹھ کر رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے چینی کے اس احساس کو کوئی نام تو نہیں دے سکا تاہم بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹا بلب روشن رہنے دیا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی روشنی آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔

اچانک وہ بندہ اسٹور روم کے دروازے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کا سیاہی مائل چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے سگریٹ سلگایا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ میرا پستول ہولسٹر میں تھا اور یہ ہولسٹر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس کی سرسراتی سرگوشی نے میرے قدم روک دیے۔ "ناہیں، میرے پو صاحب! جیادہ پھرتی دکھانے کی جرورت ناہیں۔ پستول بہت دور ہے۔ اس سے بہت پہلے آپ کی کھوپڑیا اڑ جائے گی۔" وہ پھنکارا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ رنجیت پانڈے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔ اس سے پہلے سرنگ کے دہانے پر میں نے اس کی ادھوری سی جھلک دیکھی تھی۔ آج وہ پورے کا پورا میرے سامنے تھا۔ وہ کسی گینڈے کی طرح [illegible] تھا۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں براؤن تھیں اور ان میں دنیا بھر کی خباثت جمع تھی۔ یہ ایک نہایت عیار و سفاک شخص کی آنکھیں تھیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "تو تم ہو پانڈے؟"

"جی پو صاحب! مجھ کھاکسار (خاکسار) کو ہی پانڈے کہوت ہیں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر زہریلے انداز میں کہا۔

"تم یہاں کیسے آئے؟"

اس نے آنکھیں پھیلا کر اطمینان سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ "آپ جناب نے بڑا پیچ دار سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب تو کئی میٹر لمبا ہے..... مختصر یہ کہوں گا کہ ایسا کبھی ہوا ناہیں ہے کہ آپ کے اس کھاکسار نے کہیں پہنچنا ہو..... اور پہنچ نہ سکا ہو۔ بس یہ دروازے اور دیواریں اسے کھد بہ کھد رستہ دیتے چلے جاتے ہیں۔"

اس کے کالے ماتھے پر ایک چھوٹا قشقہ تھا جو اس کے کٹر ہندو ہونے کی نشانی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کچھ

http://pakfunplace.blogspot.com

مجھ پر عجیب سی بیزاری طاری تھی۔ میں انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن مجھے ان میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں جلد یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید میں آدم بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

چوہان میرے پاؤں کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھا۔ اس نے کوئی وینٹو جین قسم کی دوا میرے پاؤں پر لگائی اور بڑی احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ اس نے مجھے گرم پانی کی ٹکور کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ میں پاؤں لٹکا کر نہ بیٹھوں۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے چند گولیاں دیں اور بتایا کہ یہ پین کلر ہیں۔

چوہان کے جانے کے بعد میں نے پین کلر گولیوں کو ہتھیلی پر رکھا..... یہ گولیاں درد کو افاقہ دیتی تھیں لیکن "بتانے والا" مجھے بتا گیا تھا کہ درد سے افاقہ گولیاں کھانے سے نہیں ملتا، درد کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے گولیاں پھینک دیں اور تھوڑی دیر بعد وہ پٹی بھی اتار پھینکی جو چوہان باندھ گیا تھا۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرا سینڈ بیگ جھول رہا تھا۔ مضروب پاؤں جیسے مٹوں بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے درد کا علاج درد سے ہی کرنا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ دانتوں پر دانت جمائے۔ پھر مضروب پاؤں سے ایک ضرب سینڈ بیگ پر لگائی۔ بے ساختہ ایک دردناک کراہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ پورا جسم اذیت سے جھنجھنا اٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار، زخمی پاؤں سے سینڈ بیگ پر ضربیں لگاتا چلا گیا۔

.....رات کو چوہان میرے پاؤں پر پھر پٹی باندھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "اپنے دیوانے پن میں تم خود کو تباہ کر لو گے۔"

"تباہ تو ہونا ہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی مرضی سے تباہ بھی نہیں ہونے دو گے؟" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے بھی مرنے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا تھا، اب بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"بہر حال، ایک بات میں تمہیں پھر بتا دینا چاہتا ہوں۔ دوبارہ اس قسم کی حماقت کرو گے تو پاؤں کی ہڈی میں کوئی فریکچر بھی ہو سکتا ہے..... اور ممکن ہے کہ پہلے سے کوئی ہیئر لائن فریکچر موجود ہو جو مزید خراب ہو جائے۔"

اس دفعہ اس نے پٹی باندھتے ہوئے بہت ساری کاٹن بھی پاؤں پر رکھی تھی۔ پٹی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بلاسٹ میں مرنے والے ایک اور شخص کی آخری رسوم آج ادا کی گئی ہیں۔ لوگوں میں بہت طیش پایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں..... کیونکہ مرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس نے کہا کہ نئی آبادی میں لوگوں نے آج ایک ٹھاکر کی حویلی کو آگ لگا دی ہے۔ ٹھاکر اور اس کے گھر والے غائب ہیں۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ دیوان میں گھسنے سے پہلے رنجیت پانڈے نے اس ٹھاکر کی حویلی میں چند گھنٹے گزارے تھے۔

چوہان پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب انور خاں اور اسحاق تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لائے ہیں۔

انور خاں نے آتے ہی کہا۔ "حکم کا دست راست موہن کمار قتل ہو گیا۔ رات کو کسی نے اسے سوتے میں ذبح کر دیا۔"

"کب..... کیسے؟" چوہان نے پوچھا۔

"پرسوں رات..... لیکن یہاں آج خبر پہنچی ہے۔ قتل کرنے والے نے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا اور اس کے پاؤں کی طرف رکھ دیا۔ زرگاں میں سخت خوف پایا جاتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی سلطانہ اور اس کے بھتیجے کا کام ہے۔ اس بار واردات کی جگہ پر لوگوں نے انہیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تین چار بندے سخت زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔"

"اوہ خدایا! اب کیا ہو گا؟" چوہان نے کہا۔

"حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کہا جا رہا ہے کہ وہ اس خونی واردات کے بعد قریبی جنگل میں گھسی ہے۔ حکم کے سیکڑوں سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ سلطانہ جس انداز میں یہاں سے غائب ہوئی تھی، اس سے کوئی اور مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اب نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔ موہن کمار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص حکم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ یہی شخص تھا جو مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں کی حویلی میں لے گیا تھا۔

اسحاق نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج ہمارے ساتھی فیروز کی روح کو سکون ملا ہو گا۔ وہ زندہ ہوتا تو آج اپنے دوست ہارون کے قاتل کا انجام جان کر ضرور جشن مناتا۔"

یہ مکافاتِ عمل کی ایک جھلک تھی۔ چند ماہ پہلے چوڑے جبڑوں والے کرخت چہرہ موہن کمار نے اپنے ایک وفادار ماتحت کو قتل کر کے ڈرامہ رچایا تھا۔ مقتول ہارون کی موت کا الزام سلطانہ پر دھر کر وہ اسے زرگاں واپس لے گیا تھا اور سمجھا تھا کہ اس کارنامے کے بدلے حکم جی اس پر ترقی اور منزلت کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن اس سے پہلے ہی اس پر موت کا دروازہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے ادھورے ایجنڈے سمیت اس میں داخل ہو گیا تھا۔

.....اسی دوران میں ایک باوردی سپاہی اندر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد انور خاں کو بتایا کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ انور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی خاص قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔"

یہ واقعی خاص گفتگو تھی۔ اس کے موضوع کا پتا مجھے شام کے بعد چلا۔ شگفتا کو ہلکا بخار تھا۔ میں اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے رہائشی پورشن میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک سفید ساڑی میں غم اور الم کی تصویر بنی لیٹی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے، وہ کسی وقت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن اس کے اندر جو چوٹ آئی تھی، وہ دکھ بن کر اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھی کہ جیکی اس کی وجہ سے برباد ہوا۔ چند دن کی خوشیوں کے عوض وہ جاں گسل مصائب کا شکار ہوا اور پھر جواں عمری میں ہی خاک کے نیچے جا سویا۔

میں شگفتا کا دل بہلانے کے لیے اس سے باتیں کر رہا تھا جب چوہان اندر داخل ہوا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حکم اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ طلال بھی سلطانہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہیں۔"

یہ پریشان کن خبر تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

چوہان کو جو کچھ پتا تھا، اس نے بتا دیا۔ وہ بولا۔ "موہن کمار کے قتل کے بعد جب سلطانہ اور طلال نے بھاگنا چاہا تو پہرے داروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ طلال نے فائرنگ کی۔ اس میں دو بندے زخمی ہوئے۔ ایک کو معمولی اور دوسرے کو شدید زخم آیا۔ پھر طلال کے پستول میں گولی پھنس گئی۔ سلطانہ اور طلال نے اپنی چھوٹی تلواریں نکال لیں اور خود کو گھیرنے والوں کو بے دریغ زخم لگائے۔ اس افراتفری میں وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے۔ موہن کمار کے پہرے داروں اور عام لوگوں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے جنگل میں سلطانہ اور طلال کا کھرا ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قریباً آٹھ گھنٹے کے تعاقب کے بعد ان دونوں کو انگریزوں کے زمانے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا گیا ہے....."

چوہان کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ سلطانہ اور طلال سخت مصیبت میں ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ اسی دوران میں اسحاق، انور خاں اور اجے بھی آ گئے۔ یہ کمرا ایک کانفرنس روم کی شکل اختیار کر گیا۔

اجے نے بتایا۔ "چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب پل پل کی صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سلطانہ اور طلال کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ایک بڑا قدم ہو گا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے وہ اپنے مشیروں اور ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل چھوٹے سرکار ایک بڑی میٹنگ بلائیں جس میں طریقہ طے کیا جاوے۔"

"لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ کل یا پرسوں تک حکم کے درجنوں لوگوں کو خود سے دور رکھ سکے گی؟"

"ہاں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔" اجے نے کہا۔ "لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ایک بڑا قدم ہو گا۔

http://pakistanplace.blogspot.com

اس کے بعد یقیناً نل پانی اور زرگاں میں لڑائی چھڑ سکت ہے۔ یہ چھوٹے سرکار کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی سے پہلے ذمے دار لوگن کو اعتماد میں لیں۔"

انور خاں نے اجے سے پوچھا۔ "برادر! تمہارے خیال میں چھوٹے سرکار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے .... وہ کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟"

"ان کے ذہن میں دو تین تجویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بڑے دستے کے ساتھ ان لوگن پر حملہ کیا جاوے جنھوں نے ریسٹ ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں تتر بتر کر دیا جاوے اور یوں سلطانہ اور طلال کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاوے۔ سلطانہ اور طلال کے پاس وہی سات ایم ایم کی طاقتور رائفل ہے جو طلال نے مدن لال کے اسلحہ اسٹور سے لوٹی تھی۔ یہ رائفل ان کے بہت کام آسکتی ہے....."

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میرا دل اور دماغ گواہی دے رہے تھے کہ سلطانہ کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر قاعدے ضابطے کی کارروائیوں میں وقت ضائع کر دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میٹنگ برخاست ہوئی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ ٹھنڈ پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ بلندی پر سے نل پانی کی روشنیاں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ جھیل میں ان روشنیوں کا جھلملاتا ہوا عکس یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چمکیلے پیراہن والی جل پریاں رقص کر رہی ہوں۔ جھیل کی تاریک سطح پر کہیں کہیں روشنی کے ہنڈولے سے متحرک تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے وغیرہ تھے۔ سرِ شام تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اب بھی یہ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

میں دیوان سے نکل آیا۔ اپنے اندر کی بے قراری کو کم کرنے کے لیے میں حسبِ معمول جھیل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ شروع میں ہوا سرد لگی لیکن پھر جسم گرم ہوتا چلا گیا اور پسینا آنے لگا۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ یہ مشقت مجھے لطف دینے لگی۔ دیوان سے نکلتے ہی کچھ لوگ میرے پیچھے ہو لیے تھے۔ یہ چھ عدد گھڑ سواروں کا وہی نگران دستہ تھا جو دیوان خانے سے باہر میرے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ پہلے اس دستے کا سالار حوالدار رب نواز ہوتا تھا۔ اب وہ تو دیوان میں ہونے والے بم دھماکے کا شکار ہو چکا تھا، لمبے قد کے ایک اور حوالدار نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

یہ نگرانی مجھے ہمیشہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تھی اور آج یہ جھنجلاہٹ ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میرے دماغ میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نل پانی سے نکلنا چاہتا ہوں اور کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے مجھے سب سے پہلے ایک صحت مند و توانا گھوڑے کی ضرورت ہے۔ دیوان کے اندر بے شمار گھوڑے تھے۔ اصطبل ہر قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا مگر میں دیوان کے اندر سے گھوڑا لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہتا تو فوراً چھوٹے سرکار یا مراد شاہ صاحب کو خبر کر دی جاتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں دیوان سے باہر آنے کے بعد کسی گھڑ سوار کا گھوڑا چھینوں..... یا پھر کسی گھوڑا فروش یا سائیس سے گھوڑا خریدوں۔ یہاں اسٹیٹ میں انڈین کرنسی ہی چلتی تھی۔ میرے پاس معقول رقم موجود تھی۔ یہ چھوٹے سرکار نے بذریعہ اجے مجھے جیپ خرچ کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ رقم میرے لیے کوئی بھی اچھا جانور فوری طور پر خریدنے کے کام آسکتی تھی۔

مجھے اسحاق سے معلوم ہوا تھا کہ پرانے اور نئے شہر کے سنگم پر "فیروزہ دروازے" کے سامنے ایک بڑا مویشی خانہ ہے جو دن رات کھلا رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص کسی بھی وقت رقم دے کر جانور حاصل کر سکتا ہے۔

میں فیروزہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نگران دستہ کرماً کاتبین کی طرح میرے ساتھ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے قریباً 100 میٹر کا فاصلہ رکھتے تھے۔ تاہم ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی وقت مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ آج میں ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے فیروزہ دروازے کی طرف جانا تھا اور کسی بھی نگران کے بغیر جانا تھا۔

جھیل کے ایک نواحی راستے پر بھاگتا بھاگتا میں دفعتاً گنجان آبادی کی طرف مڑ گیا۔ بازار ابھی کھلے تھے۔ بیشتر دکانیں گیس لیمپس اور جنریٹرز کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں..... آج ہندو برادری کا کوئی تہوار بھی تھا۔ اکثر جگہوں پر دیے روشن تھے اور پرشاد وغیرہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی تھیں۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دستے نے مجھ سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کر دیا تھا۔ جب میں زیادہ بارونق

علاقے میں داخل ہوا تو حوالدار اور اس کے دو ساتھی گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل ہی میرے پیچھے چل دیے۔ مجھے ان کے اس طرح پیچھے آنے سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ واپس پلٹوں اور ان کے منہ توڑ دوں۔ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ وہ اپنی منحوس نظریں مجھ پر جمائے رکھیں۔ مگر یہ اضطراری سوچ تھی۔ وہ حکم کے بندے تھے اور انہیں وہی کرنا تھا جو انہیں کہا گیا تھا۔

سیدھا چلتے چلتے میں تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور اپنے نگرانوں کو چکمہ دینے میں کامیاب رہا۔ یہ کپڑے کی دکانوں کا ایک تنگ سا بازار تھا۔ کچھ دکانیں بند ہو رہی تھیں، کچھ ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ خوش لباس مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ میں اس تنگ بازار سے گزر کر دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مٹھائی اور کھلونوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف گھوڑا گاڑیاں کھڑی کرنے کا بہت بڑا احاطہ تھا۔ سو دو سو قدم چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی "نگرانی" سے واقعی پیچھا چھڑا لیا ہے۔

میں نے ایک ادھیڑ عمر عطر فروش سے مقامی لب و لہجے میں پوچھا۔ "جناب! آپ مجھے فیروزہ دروازے جانے کا راستہ بتا سکتے ہیں؟"

عطر فروش نے جو اپنے لباس سے مسلمان نظر آتا تھا، گال دان میں پان کی پیک تھوکی اور رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا۔ "آجی سیدھا چلتے جایئے۔ پہلے چوراہے سے دائیں طرف مڑ جایئے۔ آگے دو مینار والی مسجد آوے گی۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا، وہ بتا دیوے گا۔"

میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ بازار بارونق تھا۔ کہیں پاس سے کبابوں کی زبردست خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ انڈیا کے کئی علاقوں کی طرح اس راجواڑے کے لوگ بھی چٹ پٹے پکوانوں اور تہواروں میلوں کے شوقین ہیں۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے اپنے سامنے صرف بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اپنے نگران حوالدار کو دیکھا۔ اپنے دراز قد کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ایک مندر کے ادھ کھلے دروازے میں گھس گیا۔

یہ ایک بڑا مندر تھا۔ تہوار کی وجہ سے اندر کافی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں، خوشبوئیں سلگ رہی تھیں اور پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔ میں ہجوم میں چلا گیا۔

"یہ تم کیا کرت ہو بھائی؟" ایک خشک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ مندر کا ایک چاکر خشمگیں نظروں سے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں، میں جوتوں سمیت اندر آ گیا تھا۔

"اوہو..... شما چاہتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا اور احاطے کے کنارے پر جوتے اتار دیے۔

چاکر بدستور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ سر پر رومال رکھا اور پرارتھنا کرنے والے انداز میں دُرگا دیوی کی مورتی کے سامنے جا بیٹھا۔ جونہی میں نے پرارتھنا کا انداز اختیار کیا، میری دائیں جانب بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص بُری طرح چونک گیا۔ وہ اپنے حلیے سے سکہ بند کٹر ہندو نظر آتا تھا۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور سر پر بالوں کی ایک بڑی ہوئی لٹ بھی تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے چونکنے اور دیکھنے کے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شاید وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت، ایک بڑھیا اور ایک جوان سال عورت بھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے پرارتھنا کا صحیح طور طریقہ تو معلوم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک دو بار ماتھا ٹیکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اٹھتے ہی ادھیڑ عمر شخص اور اس کے گھر والے بھی اٹھ گئے۔ بس بڑھیا اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے۔ اگر وہ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پہچانتا تھا تو اس بھرے پُرے مندر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "تمہارا شبھ نام بینا؟"

"گو..... گوپال۔" میں نے جلدی سے کہا۔

ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ بدستور میرے کندھے پر دھرا رہا۔ وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمری ماتا جی ہیں اور یہ ہمری دھرم پتنی ہیں شانتی اور

http://pakfunplace.blogspot.com

یہ بھوپے والا۔''

دونوں عورتوں نے بڑی عقیدت سے مجھے پرنام کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔

ادھیڑ عمر شخص بولا۔ ''میرا نام رام پرشاد ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''کیا ہم کہیں دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکت ہیں؟''

''در..... دراصل میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ..... کیا کہنا چاہت ہیں۔''

اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ میرا کندھا دبایا اور بولا۔ ''اگر بھگوان نے ہمیں یہاں، اس پوجا کے کمرے میں ملایا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے..... بہت خاص وجہ ہے۔''

رام پرشاد کی پتنی بولی۔ ''ہاں بیٹا! یہ بڑی شبھ گھڑی ہے کہ تم ہمیں یہاں ملے ہو۔ بھگوان نے چاہا تو اس میل کے کارن بہت بھلائی کا کام ہووے گا۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ فرش پر بیٹھی بوڑھی عورت بھی اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مسلسل دیکھے چلی جارہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے پاس جھکا تو اس نے میرا سر چوما اور کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ تشکر کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

''تمرے ساتھ کوئی اور تو ناہیں ہے؟'' رام پرشاد نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ''چلو پھر آؤ ہمرے ساتھ۔ گھر جا کر سکون سے بات کرت ہیں۔''

وہ مجھے لے کر مندر کے بغلی دروازے کی طرف آ گیا۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اسی پچاسی سال کی بڑھیا کو رام پرشاد کی بہو سہارا دے کر لارہی تھی۔ بغلی دروازے کے سامنے ہی ایک بڑی شان دار گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ سفید وردی والا کوچبان گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ رام پرشاد اور اس کی فیملی کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدب ہو گیا۔

میں نے سوچا، یہاں آس پاس حوالدار اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ مجھے کم از کم یہاں سے تو نکلنا چاہیے۔ میں رام پرشاد اور اس کی فیملی کے ساتھ اس شان دار گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے اور نشستیں کسی مرسیڈیز کی طرح آرام دہ تھیں۔

''پریشان ہونے کی ضرورت ناہیں۔'' رام پرشاد نے کہا۔ ''واپسی پر تم جہاں کہوگے، یہ گاڑی بان تم کو چھوڑ آوے گا۔''

گاڑی کے اندر بھی ایک سنہری طاق میں لکشمی دیوی، دُرگا دیوی اور رام کرشن وغیرہ کی مورتیاں موجود تھیں۔ رام پرشاد کی پتنی نے پرارتھنا کے انداز میں کئی بار مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بیٹا! ہم کو پوری آشا تھی کہ تم آؤ گے۔ جو کام صرف تم کر سکت ہو، وہ کوئی اور بھلا کیسے کرتا۔ بھگوان کے ہر کام میں کوئی بھید ہووت ہے۔''

اب مجھے اس معاملے میں کچھ دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے خود کو پرانی کہانیوں کے اس کردار کی طرح محسوس کیا جو اتفاقاً صبح سویرے سب سے پہلے کسی شہر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ اسے پکڑ کر کوئی خاص ذمے داری سونپ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہی طے کر رکھا ہوتا ہے۔

گاڑی دھیمی رفتار سے شہر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ ایک گھڑ سوار فوجی نظر آیا۔ میں نے پہچان لیا، یہ حوالدار کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بالکل سامنے سے گزرنے والی شان دار گاڑی کے اندر اس کا ''مطلوب'' موجود ہے۔ جلد ہی گاڑی کھلے راستوں پر آ گئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

''زیادہ دور ناہیں۔ ہمرا گھر پاس ہی ہے۔''

''لیکن..... میں آپ کے کیا کام آسکت ہوں؟'' میں نے مقامی لہجے میں پوچھا۔

رام پرشاد کے بجائے اس کی پتنی شانتی بولی۔ ''تم ہمرا ناہیں بھگوان کا کام کروگے۔ اس کام کے لیے بھگوان نے ہی تمھیں چنا ہے۔''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لہجے میں مذہبی جوش و خروش تھا۔ اور بات صرف شانتی ہی کی نہیں تھی، لگتا تھا کہ یہ پوری فیملی ہی کٹر قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑا گاڑی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک حویلی کے اندر چلی گئی۔ کوچبان نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نیچے اتر آیا۔ رام پرشاد کی والدہ کو سہارا دے کر نیچے اتارا گیا۔ وہ اپنی بہو اور پوتے کی بیوی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں اور رام پرشاد حویلی کی نشست گاہ میں آبیٹھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو ہندی فلموں میں ہوتا ہے اور خالص ہندووانہ رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں اور دیے روشن تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز میں بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ ہندومت میں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں۔ کسی وقت تو ایسا لگتا ہے کہ ہر جان دار و بے جان چیز کو دیوی دیوتا کا روپ دے دیا گیا ہے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک پنڈت جی آموجود ہوئے۔ ان کی عمر ساٹھ ستر کے قریب تھی۔ ایک چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بھی مجھے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرا شانہ تھپکا۔ میرا نام، تاریخ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا۔ یہ سب کچھ ایک کاغذ پر لکھا اور باہر چلے گئے۔

میری الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ میں جلد از جلد اس صورت حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر رام پرشاد صورت حال پر کوئی بات کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ پہلے پھلوں اور مربہ جات سے تواضع کی گئی پھر بھوجن پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں نے ... اشتہا نہیں رہ ... پایا۔ میں نے کہا۔ ''انکل! سب سے پہلے میری الجھن دور کیجیے۔ آپ مجھے اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں؟''

رام پرشاد نے کہا۔ ''میں تمھیں سب کچھ بتاوت ہوں لیکن اس سے پہلے ایک دو میرے سوال بھی ہیں۔''

''جی پوچھیے۔''

اس نے میرے کوائف دریافت کیے۔ یعنی میں کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ بیاہتا ہوں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سوالوں کے جواب ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنی رہائش چاچا عبدالغنی والے محلے میں بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ فیروزہ دروازے کے پاس میری کپڑے کی دکان ہے۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔

وہ میرے جوابات سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''گوپال پتر! اس سنسار میں دھرم سے بڑی کوئی شے ناہیں اور دھرم کا پالن ہم سب کا فرض ہے۔ جب دھرم ورودھی لوگ کوئی غلط کام کرت ہیں تو پھر یہ دھرم پریمیوں کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ ان کا سامنا کریں اور دھرم کی رکھشا کریں۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھنا ناہیں چاہت ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہمرے راجواڑے میں کچھ لوگ دھرم کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل بھگوان سے یدھ چھیڑنے جیسا ہے۔ یہ لوگ ایک ایسے اپرادھی کو جیون دے رہے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ ہم تو دھرم کے ادنیٰ چاکر ہیں۔ ہمری سمجھ بوجھ معمولی ہے لیکن بڑے پنڈت مہاراج تو جوتش سمجھتے ہیں، ٹھیک ہی دیکھتے ہیں نا..... انہوں نے جو کنڈلیاں نکالی ہیں، اس کے مطابق اگر اس اپرادھی کو شما کر کے اسے جیون دیا گیا تو یہ پوری ہندو جاتی پر ایک بڑا ظلم ہووے گا۔ اور اس کی سزا ہر اس منش کو بھگتنا ہووے گی جو اس ظلم کو روکنے کی شکتی رکھتا تھا۔''

''آپ کس اپرادھ کی بات کر رہے ہیں، انکل پرشاد؟'' میں نے اپنایت سے پوچھا۔

''ایک ناری نے ایک برہمن کی ہتھیا کی ہے۔ اس کو بے دردی سے مارا ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ پرارتھنا میں مصروف تھا۔ یہ برہمن اس راجواڑے کے سب سے بڑے پجاری پریوار کا فرد تھا۔ اوتاروں کی لڑی میں سے تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس پلید ناری کو وہیں ٹکڑے کر دیا جاتا اور اس کا ماس کتوں کو کھلا دیا جاتا لیکن اب کچھ لوگ اسے جیون دینے کا سوچ رہے ہیں۔ اسے زندہ رکھنا چاہت ہیں تاکہ وہ اس دھرتی پر چلے، اس ہوا میں سانس لے اور کھائے پیے۔''

میرے ذہن میں کھدبد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''انکل! آپ کس ناری کی بات کر رہے ہیں؟''

''ہے ایک نیچ ذات کی ہتھیارن۔'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

''وہ مسلمان تو ناہیں؟''

''ہاں..... مسلمان ہی ہے۔'' رام پرشاد کے چہرے پر بہت سی نفرت یلغار کر آئی۔

ایک دم میرے ذہن میں دروازہ سا کھل گیا۔ لہو کی گردش رگوں میں تیز ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''انکل پرشاد! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کی بات کر رہے ہیں۔''

http://pakfunplace.blogspot.com

رام پرشاد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”ہاں گوپال! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے...... یہ وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے موہن کمار جی کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ اس کتیا نے ان کا سر کاٹ کر شریر سے علیحدہ کر دیا اور ان کے چرنوں میں رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب کس کے ساتھ کر رہی ہے۔ تم جانت ہو کہ موہن کمار کون تھے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ناہیں، مجھے ٹھیک سے پتا ناہیں۔“

رام پرشاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”موہن کمار اوتاروں کی لڑی میں سے ہیں۔ یہ زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج کے داماد بھی تھے۔ کہاوت ہے کہ دو ہزار سالوں سے اس لڑی (نسل) کے لوگن کا سر بھگوان کے سوا کسی کے سامنے ناہیں جھکا لیکن اس پلید عورت نے یہ سر موہن کمار کے شریر سے کاٹ کر علیحدہ کرلیا اور پھر انہی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ ایک طرح سے اس [illegible] ناری نے یہ بتایا کہ جو سر جھکتا ناہیں تھا، وہ اپنے ہی چرنوں میں گرا پڑا ہے۔“ بولتے ہوئے رام پرشاد کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ میں جو آج دیوان کی عمارت سے اس لیے نکلا تھا کہ کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچ سکوں، ایک ایسے کٹر ہندو سے آن ملا تھا جس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا اور جو پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھ سے مسلسل سلطانہ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”انکل! میں نے تو سنا ہے کہ موہن کمار جی کی ہتھیا کے بعد سلطانہ کو جنگل میں گھیر لیا گیا ہے اور اب وہ اور اس کا بھتیجا بچ ناہیں سکیں گے۔“

رام پرشاد کے چہرے پر پھر عجیب سا رنگ لہرا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھنے کے بعد بولا۔ ”پرنتو ابھی تو بھید ہے اس میں۔ وہ حرامزادی مرے گی ناہیں۔ بالکل ناہیں مرے گی۔ اسے زندہ پکڑا جاوے گا۔“

”آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

”اس لیے کہ ہم کو اندر خانے کی جانکاری ہے۔ ہم سب جانت ہیں۔ کچھ لوگن ہیں جو سلطانہ کو زندہ حالت میں زرگاں لے جانا چاہت ہیں۔ ان لوگن کا دھرم سے کوئی واسطہ ناہیں اور نہ ہی ان کو بھگوان کا کوئی خوف ہے۔ ان کو جانکاری ناہیں کہ ان کی یہ من مرضی راجواڑے کے باشندوں پر کتنی بھاری پڑے گی۔ کنڈلیاں سب کچھ بتا رہی ہیں مگر یہ گوری چمڑی والے کنڈلیوں وغیرہ کو مانتے ہی کب ہیں......“

ایک دم میرا دھیان جارج گورا اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے رام پرشاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انکل! کہیں آپ جارج گورا صاحب کی بات تو ناہیں کر رہے؟“

”اس کا نام اتنی عزت سے مت لو۔ وہ اس قابل ناہیں ہے۔ وہ اپنے مطلب کا بندہ ہے۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا ہے اور اسے بس اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی فکر ہے۔ اگر وہ حکم جی کا سچا دوست ہوتا تو کبھی ایسا سوچتا بھی ناہیں۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہت ہیں کہ جارج گورا، سلطانہ اور اس کے پریوار سے بدلہ لینے کے لیے اسے زندہ اپنے پاس منگوانا چاہت ہے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سلطانہ کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے...... وہ کوئی ایسا چکر چلائے گا کہ عام لوگن [illegible] سمجھیں کہ وہ مر گئی یا جنگل سے بھاگ نکلی مگر وہ درحقیقت جارج گورے کے پاس ہی...... جارج گورا کی طرح کے بندے کسی کو آسانی سے شما ناہیں کرتے ہیں۔“

”کنڈلیاں کیا کہتی ہیں؟“ میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

”اس ناری کا مرنا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی بہت سخت آفت آوے گی۔ کوئی ایسی بیماری جس میں راجواڑے کے بہت زیادہ لوگن مر جاویں یا پھر کوئی باڑھ...... یا آپس کی لڑائی جس میں بے شمار بے گناہوں کی ہتھیا ہو جاوے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہووے گا ضرور۔ یہی پنڈت مہاراج کا وچار ہے اور ان کا وچار کبھی غلط ناہیں ہوتا۔“

”پنڈت مہاراج کیا چاہت ہیں؟“

”ان کی خواہش ہے کہ اس ناری کو زندہ ناہیں رہنا چاہیے۔ اور اگر اسے ایک خاص منش (بندہ) خاص ڈھنگ سے مارے گا تو ٹھیک پراشچت ہووے گا اور بلا ٹل جاوے گی۔“

”میں سمجھا ناہیں، خاص منش کون؟“

رام پرشاد نے پھر منہ میں کوئی اشلوک پڑھا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ”ہمرا اندازہ ہے کہ وہ منش تم ہو۔ بہرحال، ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ کھل کر سامنے آ جاوے گا۔ پنڈت بھگوان داس تمہاری کنڈلی بنا رہے ہیں۔“

”کنڈلی بنا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کنڈلی سے پتا چل جاوے گا کہ وہ منش تم ہی ہو جس کی طرف ایشور نے پنڈت مہاراج کو اشارہ دیا ہے، یا کوئی اور ہے۔“

”کیا پنڈت مہاراج نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناہیں، انہوں نے بس نشانی بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم چوتھی تاریخ کو چاند ڈوبنے کے فوراً بعد کالی کے مندر میں پوجا شروع کر دیں۔ پوجا کے دوران میں جو پجاری ہمارے پریوار کے دائیں طرف آ کر بیٹھے گا، وہی اصل منش ہووے گا۔ اسی کے ہاتھوں وہ اپرادھن قتل ہووے گی تو ایشور خوش ہوں گے اور ٹھیک پراشچت بھی ہو جاوے گا۔“

”میں...... میرا مطلب ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کسی کے پران لوں گا؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

رام پرشاد نے تسلی بخش انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بلغم زدہ کھانسی کی آواز سنائی دی اور پنڈت بھگوان داس ایک لمبا چوڑا کاغذ لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”گوپال سنہا! تمہاری کنڈلی میں کچھ گڑبڑ نظر آوت ہے۔ کیا تمہارا پورا نام یہی ہے؟“

میں نے تصدیق کی۔ وہ کچھ دیر لفظوں اور ہندسوں میں الجھتا رہا۔ آخر بولا۔ ”پھر ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنا جنم دن ٹھیک نہ بتایا ہو کیونکہ اس کنڈلی میں بہت سے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی گنتی کر رہے ہیں...... بلکہ ایک دو لوگ تو ایسے ہیں جو تمہاری کنڈلی میں ہو ہی ناہیں سکتے۔ اس کے علاوہ......“

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس پنڈت کو نہیں مانتا تھا اور نہ اس کی کنڈلی کو...... لیکن اس کا یوں گم میں پڑ جانا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”اپنے جنم دن کے بارے میں مجھے پورا وشواس ناہیں ہے۔ میری ماتا ایک تاریخ بتاوت ہیں اور پتا کو دوسری تاریخ پر بھروسا ہے۔“

پنڈت کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ میری کنڈلی کے حساب سے بھی تمہارا جنم دن منگل وار کے بجائے بدھ وار بنتا ہے اور چاند کی اٹھائیس تاریخ۔“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پنڈت بھگوان داس نے جلدی جلدی کنڈلی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور مطمئن لہجے میں رام پرشاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”دیکھیں، سب کچھ ٹھیک بیٹھ گیا جی...... یہی وہ منش ہے جس کی طرف پنڈت مہاراج نے اشارہ کیا تھا۔ بھگوان نے چاہا تو وہ اپرادھن مرے گی اور اسی کے ہاتھوں مرے گی۔“ پھر وہ میری طرف گھوم کر بولا۔ ”تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں ایشور نے ایک بڑے کام کے لیے چنا ہے۔“

”میں کچھ سمجھ ناہیں رہا۔“ میں نے پھر گھبراہٹ ظاہر کی۔

سوکھے سڑے پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر رام پرشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مجھ سے کہا۔ ”گوپال پتر! گھبرانے کی کوئی بات ناہیں ہے۔ ہم تمہیں کسی مصیبت میں ناہیں ڈالیں گے۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔“

پنڈت اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھرانے کے باقی افراد کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے گیا ہے کہ وہ کالی کے مندر سے مطلوبہ بندے کو ہی لے کر آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے رونے گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ ہی تھی۔ وہ شاید کسی مورتی کے سامنے پرارتھنا کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بہو اور بہو کی بہو کے سہارے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے میرا سر چوما اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی حویلی کے پورچ میں آ کر رکی۔ رام پرشاد نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسرور لہجے میں بولا۔ ”ستیش آیا ہے میرا بیٹا۔ تم سے مل کر بہت خوش ہووے گا۔“

ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ جسم نہایت ورزشی اور چہرے سے سختی ٹپکتی تھی۔ عام برہمن زادوں کی طرح اس کے ماتھے پر بھی سفید قشقہ تھا۔ وہ بگولے کی طرح

http://pakfunplace.blogspot.com

اندر آیا۔ سب کو پرنام کیا۔ اس نے اپنی دادی کے چرن چھوئے اور ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے پرنام کیا اور مؤدب کھڑا رہا۔ رام پرشاد اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور چند باتیں کیں۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے تعارف کے سلسلے میں ہی تھیں۔ نوجوان واپس پلٹا اور دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے نظروں نظروں میں مجھے اور میرے قد کاٹھ کو تول رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھامے اور انہیں ہلکے ہلکے جوش سے ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ”اب تم نے یہیں رہنا ہے۔ ہاں، جب تک کام نا ہیں ہو جاتا، تم یہیں رہو گے ہمارے مہمان بن کر۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو اطلاع دے سکت ہو بلکہ چاہو تو انہیں بھی یہیں بلا سکت ہو۔“

”ناہیں جی! مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسی خاص پریشانی ناہیں۔ میں کام کے سلسلے میں نکلا تھا اور مجھے ایک دو دن گھر سے باہر ہی رہنا تھا۔“

”بہت خوب۔“ ستیش نے اپنا بڑا سر اوپر نیچے ہلایا۔

..... میرے اگلے چوبیس گھنٹے اس حویلی کے شان دار مہمان خانے میں گزرے۔ میری ہر طرح خاطر مدارات کی جارہی تھی۔ ایک ملازم نندلال ہر وقت میری خدمت کے لیے موجود تھا۔ نندلال سے میری تھوڑی بہت بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ حویلی کی ساری صورتِ حال بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے جو نتیجے اخذ کیے، وہ اس طرح تھے۔

یہ تل پانی کے کٹر ہندو گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ رام پرشاد تھا تاہم اس کی بوڑھی ماتا کی بھی بہت مانی جاتی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی ماتا، پتنی، بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ تل پانی میں ان لوگوں کا ایک کارخانہ تھا جہاں کشتیاں اور تفریحی بجرے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں پورے راجواڑے میں سپلائی ہوتی تھیں لیکن دس بارہ سال پہلے رام پرشاد کی فیملی نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ان کی توہم پرستی اور مذہبی جنونیت کی وجہ سے تھا۔ رام پرشاد کی فیملی میں ایک موت ہو گئی جس کے بعد رام پرشاد کی بوڑھی ماتا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا ہمارے کاروبار کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ منحوس کاروبار ہے۔

دراصل پرانے خیال کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ بہت پایا تھا کہ پانی کا سفر پاپ ہے۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ کشتیاں وغیرہ بنانے کا کام دراصل پانی کے سفر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے گھریلو فرنیچر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کاروبار رام پرشاد ہی سنبھالتا تھا۔ اس کے بیٹے ستیش کی مصروفیات کچھ اور طرح کی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب بھی وہ دس پندرہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ برسوں اسے پھر چلے جانا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ستیش کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شاید کسی تشدد پسند ہندو تنظیم کا رکن تھا۔ اس کے جو ایک دو دوست اس سے ملنے گھر آئے، وہ بھی خطرناک صورتوں والے ہی تھے۔ یہ کچھ اس قسم کے لوگ تھے جن سے چند دن پہلے میری اندرون شہر کے ایک ڈیرے پر مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ورزشی جسم، کڑے تیور اور سانولی پیشانیوں پر سفید قشقے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں کوئی نقص تھا اور آواز بہت بھدی تھی۔

دوسری رات نو بجے کے قریب میں نے گھر کے ایک کمرے میں ستیش اور اس کے دو دوستوں کی تھوڑی سی بات چیت سنی۔ وہ بڑے پُرجوش تھے اس لیے بلند آوازوں میں بول رہے تھے۔ شاید انہوں نے کسی طرح کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ ان کی یہ گفتگو سلطانہ کے بارے میں تھی۔

میں نے ایک مالا توڑی اور پھر اس کے باریک دانے اکٹھے کرنے کے بہانے دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ستیش کہہ رہا تھا۔

”آج چوتھا دن ہے۔ میرا وشواس ہے کہ وہ دو تین بس ایک دو دن اور نکالیں گے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں کھانے کو اناج کا ایک دانہ ناہیں۔ پانی بھی بند ہے۔ مٹی کھا کر تو گزارہ ناہیں کیا جاسکتا۔“

”ہاں، میرا وچار بھی یہی ہے۔“ ایک دوسری آواز آئی۔ ”حکم جی کے اہل کار کچھ نہ بھی کریں، صرف اپنا گھیرا ہی قائم رکھیں تو ایک دو دن کے اندر اس حرامزادی کو زندہ پکڑا جاسکت ہے۔ جب بھوجن ہی ناہیں ہووے گا تو کتنے روز اکڑے رہیں گے پچی بھتیجا؟

”مگر بلرام رائے کی اپنی سوچ ہے۔ آخر وہ اس آپریشن کا انچارج ہے۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانا چاہت ہے۔ ہوسکت ہے کہ اسے یہ ڈر بھی ہو کہ لاچار ہو کر سلطانہ اور اس کا بھتیجا آتما ہتھیا کی کوشش نہ

کریں۔“

”تو پھر کیا..... وہ اندر گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

”ناہیں۔ مجھے ایک اور طرح کی جانکاری ملی ہے اور میرا وچار ہے کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ تل پانی کا ایک مُسلا ہے چاچا عبدالغنی۔ سلطانہ اس کے گھر میں بھی رہتی رہی ہے اور اس پر بڑا وشواس کرت ہے۔ وہ اس کے لیے بھوجن لے کر اندر ریسٹ ہاؤس میں جاوے گا۔ اس بھوجن میں بے ہوشی کی دوا ملی ہووے گی۔“

”لیکن وہ غنی ہو گا تو مُسلا۔ اندر جا کر اس نے بھوجن کا بھید کھول دیا تو؟“ ستیش نے پوچھا۔

”وہ ناہیں کھولے گا یار۔“ اس کے دوست کی آواز آئی۔ ”وہ خود بھی یہ چاہے گا کہ کہیں سلطانہ بالکل نراش ہو کر آتما ہتھیا وغیرہ کی کوشش نہ کرے۔ پر نتو عارضی طور پر ہی سہی لیکن اس کا جیون بچ جائے..... مجھے وشواس ہے کہ عبدالغنی وہی کرے گا جو بلرام وغیرہ اس سے کہہ رہے ہیں۔“

ستیش کے ایک دوست نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”یار! ویسے ایک بات ہے۔ یہ جارج گورا صاحب بڑی اونچی شے۔ چوئیشن جو بھی ہو، یہ اپنی دل پشوری کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ ڈھونڈ ہی لیوت ہے۔ اب دیکھو، کیسے ہاتھ دھو کر اس سلطانہ راجپوت کے پیچھے پڑا ہے۔“

”ناری بھی تو زوردار ہے۔“ دوسرے دوست نے لوفر لہجے میں کہا۔

پہلا بولا۔ ”ہاں، ناری گورا صاحب کی کمزوری ہے۔ خاص طور سے مسلمان ناریاں۔“

”میں تمہاری اس بات سے اتفاق ناہیں کرتا۔“ ستیش نے کہا۔ ”ناری اس کے لیے ناری ہی ہے۔ ہندو ہو، چاہے مسلم ہو..... یا کوئی اور..... تم یہ کہہ سکت ہو کہ وہ مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ اگر وہ ایک حد تک رہا تو ٹھیک ہے، اگر اس نے حد پار کی تو پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ حکم جی کو بھی اپنی آشیرباد بس اس حد تک اس کے ساتھ رکھنی چاہیے جب تک وہ اپنی سیما (حد) کو پار ناہیں کرتا۔“

آہٹ ہوئی اور میں دروازے کے سامنے سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آکر میں دیر تک سوچتا رہا۔ سلطانہ مصیبت میں تھی..... تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ریسٹ ہاؤس کو پوری طرح گھیر لیا گیا تھا مگر فوجی افسر بلرام چاہتا تھا کہ سلطانہ اور طلال کو زندہ پکڑ کر جارج کے پاس لے جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگ ہر حربہ آزما رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ سلطانہ اپنے سابقہ میزبان عبدالغنی پر بھروسا کرے گی۔ وہ اس کے ذریعے اسے بے بس کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔

صبح سویرے ہی بھجن کی آواز حویلی میں گونجنا شروع کر دیتی تھی اور پوجا کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ مہمان خانے کے اندر بھی پوجا کا کمرا موجود تھا۔ میں اکیلے پوجا پاٹ کا ڈھونگ رچا لیتا تھا۔ اگر مجھے یہ ڈھونگ سب کے سامنے رچانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔ مجھے پوجا کے ابتدائی طور طریقے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھے۔ میں نے ہندووانہ رہن سہن میں ایک دو غلطیاں بھی کیں تاہم وہ خوش قسمتی سے کسی کی نظر میں نہیں آسکیں۔

اگلے روز رات کو ستیش واپس چلا گیا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے کمرے میں ملاقات کی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لمبی ناک والا درمیانی عمر کا شخص بھی تھا۔ وہ بالکل کلین شیو تھا۔ سر بھی منڈا ہوا تھا۔ ستیش نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کچھ باتیں بتائیں۔ یہ باتیں سلطانہ سے ہی متعلق تھیں۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ”ہم اس اپرادھن کو زندہ سلامت زرگاں میں ناہیں جانے دیں گے۔ اس سلسلے میں پوری پلاننگ ہو چکی ہے۔ جب بلرام اور اس کے ساتھی سلطانہ کو ریسٹ ہاؤس سے پکڑ لیں گے اور واپس زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کو راستے میں روکیں گے اور بھگوان نے چاہا تو کامیابی سے روکیں گے۔“

”کیا ان کے قافلے پر ہلّا بولا جاوے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ ایسا ہی سمجھ لو.....“ اس نے گول مول بات کی۔

شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر ستیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا حساس تو نہیں تھا کہ میری خاموشی اسے پریشان کرتی لیکن شاید جو کچھ وہ مجھ سے کرانا چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ میری باخبری اور پوری رضامندی اس میں شامل ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جیب

http://pakurdu.blogspot.com

سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر کچھ لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''یہ دیکھو گوپال! یہ ہے وہ ریسٹ ہاؤس جہاں سلطانہ اور اس کا بھتیجا سپاہیوں کے گھیرے میں ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ اس راستے سے زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے..... یہ دیکھو..... یہ ریکھا جو نیچے کی طرف جارہی ہے، اس راستے کو ظاہر کرت ہے..... یہاں دیکھو، یہ ریکھا اس ٹیلے کے درختوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ ٹیلے کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے.....'' اس نے ایک قوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک دبی دبی سی زہریلی ہنسی اس کے سانولے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اس نے معنی خیز انداز میں لمبی ناک والے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس موڑ پر ہم سلطانہ اور اس کے بھتیجے کو باقی قافلے سے علیحدہ کر لیویں گے اور بھگوان نے چاہا تو یہ کام بڑی صفائی سے ہووے گا۔''

''الگ کر لیویں گے؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

ایک دفعہ پھر ایک غیر محسوس لیکن زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ وہ بولا۔ ''جب گاڑیوں اور گھوڑوں کا قافلہ اس موڑ پر سے تیزی سے مڑ رہا ہو گا..... سلطانہ والی گاڑی سیدھی نکلتی چلی جاوے گی..... قریباً سو گز دور ٹیلوں کے اندر یہ تنگ درّہ سا ہے۔ گاڑی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی جاوے گی..... اور پھر یہ درّہ بند کر دیا جاوے گا۔''

''یہ کیسے ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے بندے اس درّے کا راستہ روک لیویں گے۔ جو اس راستے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، چھلنی ہو جاوے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ستیش کی آنکھوں میں پھر چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

''بات سمجھ میں آرہی ہے جی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جناب! سلطانہ والی گھوڑا گاڑی باقی قافلے سے الگ کیسے ہووے گی؟''

''پر تو! یہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس سوال کا جواب تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔'' ستیش نے معنی خیز انداز میں کہا اور لمبی ناک والے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی بھید بھری آنکھوں کے ساتھ بالکل خاموش تھا۔

''میں اب بھی سمجھ نہیں سکا۔'' میں نے کہا۔

ستیش اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''یہ اس سرکاری گاڑی کا گاڑی بان ہے جس میں سلطانہ اور طلال کو لے جایا جائے گا۔ یہ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے کیونکہ یہ دھرم کی رکھشا کا مطلب سمجھت ہے۔ اسے پتا ہے کہ اس شبھ کام میں اگر اس کے پران بھی چلے گئے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

لمبی ناک والے کی لمبوتری آنکھوں میں وہی جنونیت نظر آئی جو ستیش کی آنکھوں کا جزوِ خاص تھی۔ ستیش نے بتایا کہ لمبی ناک والے کا نام بھولا ناتھ ہے۔ جو نقشہ ستیش دکھا رہا تھا اور جس طرح کی پلاننگ کی بات کر رہا تھا، وہ سب کچھ واقعی متاثر کن تھا۔ ٹیلوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا درّہ نما تھا۔ اس کی دونوں جانب چھپنے اور گھات لگانے کے لیے بہت سی جگہیں تھیں۔ اگر کوئی اس درّے میں سے گزرنے کی کوشش کرتا تو اسے بہ آسانی روکا جاسکتا تھا اور نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ ستیش اس ساری صورتِ حال کے بارے میں بہت پُرامید اور پُرجوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ مختار راجپوت کی اپراوھن بیٹی مرے گی اور اسی طرح مرے گی جس طرح بڑے پنڈت مہاراج کی خواہش ہے۔

ستیش کے جانے کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں اس حویلی میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ رام پرشاد ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہونے تک میں حویلی سے باہر قدم نکالوں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حوالے سے ہر گھڑی میری نگرانی بھی کی جارہی ہے۔ مجھے باہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی دیوان کی عمارت سے نکلا تھا اور اب مجھے دیوان سے لاپتا ہوئے کم و بیش تین روز ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی نے وہاں کھلبلی مچائی ہو گی۔ خاص طور سے چوہان اور انور خان تو بہت پریشان ہوں گے۔ چند دن پہلے رنجیت پانڈے سے میری زبردست ٹکر ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے کی خطرناکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ انور خان اور چوہان یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میری گمشدگی کی وجہ رنجیت پانڈے ہی ہو۔ اس غلط فہمی سے دیگر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

سلطانہ اور طلال کے موجودہ حالات کا علم بھی مجھے

نہیں ہو رہا تھا..... میرے ایک دو بار پوچھنے پر رام پرشاد نے بس یہی کہا تھا کہ بڑی جلدی اچھی سماچار سننے کو ملے گی۔ وہ جس اچھی سماچار یعنی خبر کی بات کر رہا تھا، اس کی تفصیل مجھے ستیش بتا ہی چکا تھا۔ وہ لوگ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے لیکن کسی اچھی نیت سے نہیں بلکہ بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لیے۔ خطرہ اس بات کا بھی تھا کہ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں سے چھیننے کی کوشش میں ہی کوئی المیہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں سلطانہ اور طلال کو شدید نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں حویلی کے گراسی لان میں بیٹھا تھا جب برآمدے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا، پندرہ سولہ سال کی ایک بالکل دبلی پتلی لڑکی دو موٹی تازی ملازماؤں کی گرفت میں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بال کاٹنا چاہ رہی ہیں۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ لڑکی کے شہد رنگ بال گھنے اور خوب صورت تھے۔

لڑکی رو رہی تھی۔ اس کے تاثرات برملا کہہ رہے تھے کہ وہ بال کٹوانا نہیں چاہتی۔ رام پرشاد کی بوڑھی ماتا بھی پاس بیٹھی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی۔ ''ملوکی! ہم تیرے فائدے کی بات کرت ہیں۔ تجھے پاپ سے بچانا چاہت ہیں۔ نرک کی اگنی بڑی سخت ہے۔ تجھے اس پر وشواس ہو تو کبھی اس طرح کی بات نہ کرے۔''

رام پرشاد کی نوجوان بہو بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ بولی۔ ''بڑی ماتا! آپ زبردستی نہ کریں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ اس بے چاری کو تھوڑا سا سمے دیں۔''

''تو بیچ میں مت بول۔'' بوڑھی عورت چلا کر بولی۔ ''تو ہمیشہ دھرم وِرودھی بات کرت ہے۔ یہ میرا گھر ہے..... میرا پریوار ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہاں میرا ادھیکار رہے گا اور میرا حکم چلے گا۔''

''لیکن ماتا جی! یہ ہماری زرخرید داسی نہیں ہے۔ یہ ملازمہ ہے۔ اس کی بھی اپنی مرضی ہے۔ اور دھرم ''مرضی'' کا نام ہے، جور زبردستی کا نام نہیں..... بھگوان کے لیے ماتا جی..... آپ دھرم کے نام پر اپنی مرضی نہ چلائیں۔''

کتب فروش: یہ جیب سائز کتاب تمہارا آدھا جاب ورک کر دے گی۔

آج کا طالب علم: دو کتابیں دے دو۔

★

''محترمہ آپ کی گود کا بچہ اتنا اچھا ہے کہ میں نے پہلے کبھی اتنا اچھا بچہ نہیں دیکھا۔''

''ہماری شادی کو ابھی دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔''

★

امریکی اور روسی ٹی وی ڈراموں میں صرف اتنا فرق ہے کہ امریکہ میں ہم ٹی وی ڈرامے دیکھتے ہیں اور روس میں ٹی وی ڈرامے ہمیں دیکھتا ہے۔

★

''مجھے واپسی کا ٹکٹ چاہیے۔''

''کہاں کے لیے؟''

''یہیں واپس آنے کے لیے۔''

''تو اپنی زبان کو لگام دے مالا۔'' بڑھیا تیکھی آواز میں بولی۔ ''بھگوان کا خوف کر۔ یہ وہ جوا ہے..... اگر [illegible] رہی تو یہ کلنک ہووے گا۔ اس کی نحوست ہم سب کو لے ڈوبے گی..... اور سب سے پہلے یہ نحوست پڑے گی تجھ پر..... دفع ہو جا یہاں سے..... میں جو کرتی ہوں، مجھے کرنے دے۔'' آخری الفاظ بڑھیا نے بہت زور دے کر کہے۔

نوجوان لڑکی مالا نے ایک دم رخ بدلا اور پاؤں پٹختی ہوئی لان کی طرف آگئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور طیش بھرے انداز میں کسی بچے کا سوئیٹر بننے لگی۔ وہ اچھی صورت کی تھی اور اپنی بول چال سے پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ ایک امیر کبیر گھرانے کی برہمن بہو ہونے کے باوجود اس میں تکلف اور بناوٹ نہیں تھی۔ ایک دو بار وہ مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

برآمدے میں، دیکھتے ہی دیکھتے ملازماؤں نے نوعمر لڑکی کے بال قینچی سے کاٹ دیے۔ وہ اتنے بے ڈھنگے طریقے سے کاٹے گئے تھے کہ ترس آنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس کے کمزور چہرے کا

http://paktunplace.blogspot.com

رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بعد ازاں وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کے کٹے ہوئے بالوں کو غالباً جلانے کے لیے یا کسی اور رسم کی ادائیگی کے لیے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ لیا گیا۔

مالا چپ بیٹھی رہی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے سلائیوں پر حرکت کرتی رہیں۔ اردگرد کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”مالا بہن! یہ کیا جھگڑا تھا؟“

وہ جیسے ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”تم لوگن کو کبھی سمجھ ناہیں آئے گی کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ دھرم تو شانتی اور پریم کا نام ہے، تم لوگن نے اسے یدھ بنا رکھا ہے۔ ایک ڈراؤنا تماشا بنا رکھا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی، ہم اب بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں..... شوہروں کے ساتھ ان کی پتنیوں کو زندہ جلانا چاہت ہیں۔ ذات پات پر مر رہے ہیں۔ کالی رسموں کی آڑ میں ایک دوجے کا جیون تباہ کر رہے ہیں.....“ وہ طیش میں بولتی چلی گئی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے بھی رام پرشاد اور ستیش وغیرہ کے مذہبی جنون کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”بہن! لیکن یہاں ہوا کیا ہے؟“

”ہونا کیا ہے..... ماتاجی اپنے لیے سورگ کا ٹکٹ پکا کر رہی ہیں۔ یہ لڑکی [illegible] گی۔ مشکل سے سترہ سال عمر ہے اس کی۔ یہ حویلی کی یکی ملازمہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی ناہیں ہوئی تھی۔ اس کا پتی چھوٹے سرکار کی سینا میں سپاہی تھا۔ پچھلے دنوں زرگاں والوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئی ہیں، ان میں وہ گھائل ہوا اور تین دن بعد اس کا دیہانت ہو گیا۔ اب یہ لڑکی ودھوا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ماتاجی نے اسے ایک علیحدہ کوٹھری میں بند کر چھوڑا ہے۔ اسے دن میں بس ایک بار روکھا سوکھا بھوجن دیا جاوت ہے۔ یہ کھدر کے سفید کپڑے پہنت ہے اور زمین پر سووت ہے۔ اس کا جیون شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ جتنا عرصہ جیئے گی، اسی طرح جیئے گی۔ یہ ہے ہمارے ”دھرم پریمیوں“ کی بدھی (سمجھ بوجھ) اور ان کا چلن۔ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم بھی سب جانت ہو جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔“

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ مالا ٹھٹک گئی۔

کوئی پچاس قدم دور حویلی کے مین گیٹ سے ایک گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کالے رنگ کی یہ وہی گھوڑا گاڑی تھی جس پر کچھ دن پہلے تند مزاج ستیش حویلی میں آیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دیکھتے ہی مالا مجھ سے بے تعلق ہو گئی اور اپنی ساری توجہ سویٹر بننے پر مرکوز کر دی۔ گھوڑا گاڑی سے ستیش برآمد ہوا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی نظر آنے لگی تھی۔ ان لمحوں میں اس نے اپنی پتنی کو بھی یکسر نظرانداز کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستے کیا۔ مالا نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھوئے۔ ستیش نے مالا کی طرف توجہ دیے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ستیش کی بائیں کلائی پر چھوٹا سا تازہ زخم نظر آ رہا ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ستیش نے جوش سے میرے کندھے دبائے اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ”گوپال! ہم سپھل (کامیاب) رہے۔ ہم نے وہ حاصل کر لیا جو چاہت تھے۔ مختار راجپوت کی بٹی اب ہمارے پاس ہے.....“

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوئی۔ تاہم اپنے اندرونی تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے بھی ستیش کے سامنے مسرت کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا کہ سلطانہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ”میں تمھیں اس کے پاس لے جانے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔“

”اور اس کا بھتیجا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ حرامی بھی ساتھ ہے۔“

”کیا سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“ وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ”اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ تھم جی کے بندے زیادہ زور ناہیں مار سکے۔ انھوں نے سلطانہ والی گاڑی کے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر ہم نے درّے پر روک لیا۔ بس تین چار منٹ کی فائرنگ کے بعد ہی وہ لوگن بھاگ گئے۔ کچھ ایسا جانی نقصان بھی ناہیں ہوا۔ دو بندے ان کی طرف سے مرے، تین چار گھائل ہوئے۔ ہماری طرف سے صرف دو بندے گھائل ہوئے ہیں.....“ اس نے جلدی جلدی مجھے صورتِ حال

سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا ہاتھ کیسے گھائل ہوا؟“

وہ بےپروائی سے بولا۔ ”جتنی بڑی سپھلتا (کامیابی) ملی ہے اس کے سامنے ایسے چھوٹے زخم کچھ بھی ناہیں ہیں۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا لگا ہے۔ گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھوڑا سا گھائل ہوا ہے۔“

اسی دوران میں رام پرشاد بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کی سفید دھوتی بھی جیسے شادمانی سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پیٹ پہلے سے زیادہ چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے سے لگایا اور ماتھا چوما۔ ”شاباش! تم لوگن نے وہ کر دکھایا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ میں بھاگوان ہوں کہ تم میرے پتر ہو۔“

بڑھیا بھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آ گئی اور پوتے کی بلائیں لینے لگی۔ پھر یہ سارا گھرانا پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک پرارتھنا کرنے اور آرتی اتارنے کے بعد یہ لوگ باہر نکلے تو فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ رام پرشاد نے چاکروں کو آوازیں دیں۔

”ساجن، مہندر، امری..... جلدی آؤ یہاں۔“

کئی نوکر دوڑتے ہوئے پہنچ گئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ”بہت سا پرشاد بنواؤ اور تقسیم کرو..... جل پانی کے سارے بڑے مندروں اور استھانوں کے لیے چڑھاوے تیار کرو۔“

بڑھیا نے گنگا جل منگوایا۔ پوتے کو پلوایا اور بیٹے کو بھی۔ پھر وہ ایک لمبی مالا لے کر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئی اور کوئی جاپ کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ پچھلی دروازہ بند کر دیا جائے اور کوئی فرد بھی اس دروازے سے پوجا کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس شبھ گھڑی میں پچھلی دروازے سے پوجا کے کمرے میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ سال خوردہ بوڑھی عورت پتا نہیں کون کون سے توہمات اپنے دماغ میں بسائے بیٹھی تھی اور دوسروں کو بھی ان توہمات میں شریک دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہو مالا کو مخاطب کر کے بولی۔ ”دیکھ رہی ہے مورکھ! ہم پاپ کے ایک کام سے بچے ہیں تو ایشور نے کتنی کامیابی دی ہے تیرے پتی کو۔ وہ کلموہی اب اپنے کرموں کا پھل پاوے گی۔ اس نے ایک دھرم اوتار کی ہتیا کی تھی۔ اوتار کی آتما کو شانتی دینے کے لیے اس کلموہی کا مرنا ضروری تھا۔“

بیچاری بہو لاجواب سا منہ بنا کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دادی ساس کس پاپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ بیوہ ملازمہ کا سر مونڈ کر اور اسے بےچارگی کی تصویر بنا کر انہوں نے دھرم کا پالن کیا ہے اس لیے ایشور نے انھیں فوری طور پر ایک اچھی خبر سنائی ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ستیش مجھے حویلی سے لے کر جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وقتِ رخصت رام پرشاد کی توہم پرست والدہ ایک چودہ پندرہ سال کے خوبرو لڑکے کے ساتھ آئی۔ لڑکے نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا۔ حلیہ سادھو سنتوں جیسا تھا۔ بڑھیا کی ہدایت پر لڑکے نے میرے سر پر ایک نامعلوم خوشبودار تیل ڈالا اور مجھے گنگا جل کے چند گھونٹ پلائے۔ اس کے بعد نیلگوں پتھروں کی ایک مالا سی میرے گلے میں ڈال دی۔ بڑھیا نے میرے اور ستیش کے ماتھوں پر تلک لگائے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ستیش کے ساتھ اس کی شان دار گھوڑا گاڑی میں حویلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی تیزی کے ساتھ نل پانی کے مختلف بازاروں سے گزرتی رہی اور مضافات میں آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سلطانہ کے پاس ہی جا رہا ہوں لیکن سلطانہ کو میں کس حال میں دیکھوں گا اور مجھے سلطانہ کے ساتھ کس طرح کا رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی بات ضرور سمجھ میں آ رہی تھی کہ کچھ انوکھا اور خطرناک ہونے والا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ستیش کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ”گوپال! میں تم سے شما چاہت ہوں لیکن یہ امری مجبوری ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ پٹی تمہاری آنکھوں پر باندھنا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا۔

ستیش نے پٹی باندھ دی..... گاڑی قریباً ایک گھنٹے تک مزید ہچکولے کھاتی رہی۔ وہ ایک نیم پختہ

http://pakfunplace.blogspot.com

راستے پر چلنے کے بعد کچے راستے پر آ گئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ جنگلی گلاب اور دیگر نباتات کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک طویل چڑھائی چڑھنے کے بعد گھوڑا گاڑی رک گئی۔ ستیش نے مجھے اسی حالت میں گاڑی سے اتارا اور سہارا دے کر کسی چار دیواری میں لے گیا۔ میری پٹی کھول دی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں جس جگہ پر موجود تھا وہ کسی کھنڈر سے مشابہ تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی پرانے استھان کی باقیات ہیں۔ ایک طرف کسی قدیم تالاب کے آثار تھے، دوسری طرف چند پختہ روشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس جگہ خوشبو بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی تھی اس لیے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ گھوڑا گاڑی خوشبو کے ایک بڑے ڈھیر میں سے گزر کر یہاں پہنچی ہے اور وہ جس خوشبودار جگہ سے گزری تھی، وہاں شاید بہت سے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ غالباً یہ کوئی بڑی پھلواری تھی۔

ستیش اور گاڑی کا کوچبان مجھے لے کر آگے بڑھے۔ ہم ایک تنگ سے سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاستر جھڑ چکا تھا، جابجا اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ جا کر یوں لگا کہ سرنگ ختم ہو گئی ہے۔ یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ سرخ پتھر کی چند ٹوٹی پھوٹی سلیں بھی یہاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سلیں استھان کے کھنڈر کا حصہ ہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ایسی ہی دو سلوں کے درمیان چھوٹا سا راستہ موجود ہے جسے جھاڑ جھنکاڑ سے چھپا دیا گیا ہے۔ کوچبان نے اس جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹایا اور ہم چارپائی کے سائز کی سلوں کے درمیان سے گزر کر اندر داخل ہو گئے۔ جھاڑ جھنکاڑ کو پھر اسی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ ستیش اور کوچبان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ستیش نے بیگ میں سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ دائیں طرف اس سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ سے تھے جن سے مدھم ہوا اور روشنی اندر آتی تھی۔

مجھے اپنے سامنے لامتناہی سیڑھیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھریلے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔

”ابھی ہمیں کتنا جانا ہے؟“ میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بس پانچ دس منٹ۔“ ستیش نے جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے بھی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ تین بندے نظر آئے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ستیش کو پرنام کیا۔ ستیش نے جواب دیا۔ آنے والے دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں نے پہچان لیا۔ حویلی میں جو دوست ستیش سے ملنے آئے تھے ان میں یہ بھی شامل تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور ہونٹ بہت موٹے تھے۔ یہ چیک دار شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

ستیش نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں مہندر! کدھر جا رہے ہو؟“

”بس ذرا نالے تک..... ابھی آجاوت ہیں۔“

اس کے ہاتھ میں ایک جال تھا۔ لگتا تھا کہ شاید یہ افراد کہیں مچھلی وغیرہ پکڑنے جا رہے ہیں۔

”حالات ٹھیک نا ہیں..... ذرا خیال رکھنا۔“ ستیش نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

ستیش اور مہندر کے درمیان دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا پھر ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ گئے۔

کہیں قریب ہی پانی کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پانی کسی اونچی جگہ سے نشیب میں پتھریلی جگہ پر گر رہا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، یہ شور نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک جگہ ہمیں اس پانی کی جھلک نظر آ گئی۔ یہ پانی کسی نامعلوم سمت سے آ کر ایک چھوٹے آبشار کی صورت میں پتھروں پر گرتا تھا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ایک تالاب کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتے اس پانی کے اندر ایک بہت بڑا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ اوندھی حالت میں تھا۔ اس کی لمبائی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کا ایک بازو ندارد تھا۔ چونکہ وہ اوندھی حالت میں تھا اس لیے صورت نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ وہ ہندو دھرم کے کسی دیوی دیوتا کا بت ہے جو استبداد زمانہ کے سبب بلندی سے اس پانی میں گرا ہے اور نامعلوم عرصے سے یہیں پڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے یہ بت گرا تھا وہ آبشار کے قریب تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ہم پتھر میں کھدی ہوئی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ سرنگ پھر تنگ ہونے لگی۔ اب دائیں دیوار پر نظر آنے والے

روزن نما سوراخ بھی نہیں تھے اس لیے قدرے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے جا کر مجھے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ میں اس شور کو کوئی واضح معنی نہیں دے سکا، بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ آس پاس کچھ لوگ موجود ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں..... چل پھر رہے ہیں۔

ایک جگہ پہنچ کر کوچبان نے ہاتھ بڑھایا اور ایک زنگ آلود آہنی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میں چکرا سا گیا۔ میں جیسے ایک دم ایک تنگ و تاریک کوٹھری سے نکل کر ایک وسیع و عریض اسٹیڈیم میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا زمین دوز ہال تھا۔ یہاں ستونوں کی دو قطاریں تھیں جنہوں نے بہت بڑی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور نانک چندی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ستون اور ستونوں کے نیچے پتھریلا فرش بھی خستہ حال تھے۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی کندہ شبیہیں دھندلی پڑ چکی تھیں یا بالکل مٹ چکی تھیں۔ چند ایک..... شکستہ مورتیاں بھی نظر آتی تھیں۔ شاید کسی وقت یہ وسیع ہال اس استھان کا ایک اہم حصہ رہا ہو گا لیکن اب یہ ایک کھنڈر تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ کھنڈر بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اسے ایک آباد جگہ کی شکل دے رکھی تھی۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص نظر آیا۔ عام ہندوؤں [illegible] اس کی داڑھی تھی اور [illegible] وہ پنڈت کے بجائے کوئی [illegible] نظر آتا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرختگی تھی۔ اس شخص کے علاوہ یہاں پندرہ بیس جوان لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب ہٹے کٹے اور ورزشی جسموں والے تھے۔ ان میں سے دو چار کے کندھوں پر رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سات آٹھ لڑکے اوندھے لیٹے تھے اور ایک شخص سے رائفل چلانے اور نشانہ باندھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دیواروں پر کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور خنجر وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تربیتی اکھاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستیش کو دیکھ کر سب نے اپنی مصروفیات روک دیں اور ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے خاص دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔ ستیش ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند نوجوان بھی ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ یقیناً یہ گفتگو میرے بارے میں ہی ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے مجھ پر ناقدانہ نظر بھی ڈال لی جاتی تھی۔

میں گاڑی کے کوچبان کے ساتھ ایک ہموار پتھریلے فرش پر کھڑا تھا اور آٹھ دس فٹ نیچے ہال کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے۔ یہ کسی تشدد پسند گروہ کا ٹھکانا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹھکانا (جو کافی چھوٹا تھا) میں نے تل پانی کی اندرونی آبادی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں فائرنگ میں کپتان اجے کے ہاتھوں سے آنند نامی بندہ ہلاک ہوا تھا اور کئی لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی ایک اس جگہ موجود ہوتا تو کیا ہوتا؟ مجھے فوراً پہچان لیا جاتا اور ستیش کو بھی پتا چل جاتا کہ میں گوپال نہیں ہوں..... ایک مسلا ہوں اور اس سے پہلے آنند جیسے شخص کے قتل میں ملوث رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ستیش میری طرف مڑا اور مجھے لے کر ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں خستہ حال دیواروں میں پرانی لکڑی کے تین چار دروازے موجود تھے۔ ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے اور ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک کوٹھری نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بستر موجود تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اور دو کرسیاں بھی تھیں جن کے آگے تین ٹانگوں والی گول میز رکھی تھی۔ یہاں بھی رادھا، کرشن، لکشمی اور کالی ماتا وغیرہ کی چھوٹی بڑی مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا سا ترشول پڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہندو دیومالا کے کسی قدیم منظر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے ستیش سے پوچھا۔ ”مختار راجپوت کی بیٹی یہیں پر ہے؟“

”ہاں..... بہت جلد تم اسے دیکھ سکو گے۔“

”کب تک؟“

”اس کا اصل سے تو مہا گرو ہی بتاویں گے۔ لیکن میرا وچار ہے کہ یہ ملاقات آج رات یا کل شام تک ہو جاوے گی۔“

”یہ مہا گرو کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے ابھی ان کو دیکھا تو ہے۔ وہ داڑھی والے جٹا دھاری، جنہوں نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ اسی سادھو نما شخص کی بات کر رہا ہے جس نے یہاں آتے ہی ستیش سے سوال جواب کیے تھے۔

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے ستیش سے کہا۔ ”میں بہت

http://pakfunplace.blogspot.com

الجھن میں ہوں جی۔ بتاتا ہیں کہ آپ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہت ہیں.... اور اس میں میرا کیا پارٹ ہووے گا؟"

"شاید تم ڈر رہے ہو کہ تمھیں اس اپرادھن کا خون کرنا پڑے گا۔ ایسی کوئی بات ناہیں ہے۔ ماتاجی نے کہا تھا نا کہ تمھیں اپنے ہاتھ سے کچھ ناہیں کرنا۔ اگر کچھ کرنا ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہووے گا کہ تمھیں ایک اگنی جلانا ہووے گی.... بس۔"

"میں چاہت ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جاوے تاکہ میں واپس جا سکوں۔" میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

"بالکل ایسا ہی ہووے گا۔ اب تم کچھ کھا پی کر سفر کی تھکاوٹ اتار لو۔ جب سمے آوے گا، میں تمھیں خود بلا لوں گا۔"

"نہیں، مجھے کوئی ایسی تھکاوٹ ناہیں اور نہ ہی بھوک ہے۔" میں نے کہا۔

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "میں تم میں کئی انوکھی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ اتنی سردی میں بھی تم نے عام سے کپڑے [illegible] اور تم سردی کو کچھ زیادہ محسوس بھی ناہیں [illegible] بھوجن بھی ناہیں لیتے ہو۔ [illegible] میں نے ایک [illegible] نقصان کرتے دیکھا ہے۔ کسی وقت تو لگت ہے کہ تم نے اپنے شریر کو تکلیف اور دکھ میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے......"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات ناہیں۔ بس میرا رہن سہن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔"

"ایسا کب سے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں سمجھا ناہیں ستیش صاحب!"

"کسی وقت تو لگتا ہے جیسے تم کوئی چلہ کاٹ رہے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میں چلہ ہی کاٹ رہا ہوں۔ ایک ایسا چلہ جو اب شاید میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ مجھے کوئی ایسا ملا تھا جو درد کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا گیا تھا۔ وہ مجھے بتا گیا تھا کہ درد کے ساتھ زندہ رہنا کیا ہوتا ہے اور درد کے پانیوں میں ڈوب کر راحت کے موتی کیسے نکالے جاتے ہیں۔ میں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ اس راہ پر کانٹے تھے جو میرے پاؤں میں ٹوٹتے تھے لیکن اب ان کانٹوں کے ٹوٹنے میں ایک مزہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بدل رہا تھا۔ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص بڑا سا طشت لے آیا۔ اس میں مٹھائی، خشک میوہ جات اور گرم دودھ وغیرہ تھے۔ موسم اب سرد ہو چلا تھا۔ میں نے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی۔ ساتھ ساتھ میں خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرتا جا رہا تھا.... میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت سنگین صورت حال میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہاں سلطانہ راجپوت موجود تھی.... اور وہ میری بیوی تھی۔ وہ بے رحم حالات کی زد میں تھی اور خود بھی بے رحم ہو چکی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی ہے، یکایک زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں سے اتنی دور جا سکتی ہے۔ وہ زرگاں میں تھی۔ اس نے پے در پے قتل کیے تھے اور آسیب بن کر لوگوں کے حواس پر چھا گئی تھی۔ صرف چند ہفتوں میں ہی اس کا نام راجواڑے کے ہر باشندے کی زبان پر آ گیا تھا.... خاص طور پر موہن کمار کے قتل کے بعد تو اس کے نام کے حوالے سے تہلکہ مچ گیا تھا.... لیکن وہ چھلکے اور سنسنی کا یہ سلسلہ تادیر برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ بے شک کچھ لوگ توقع کرنے لگے تھے کہ وہ کسی [illegible] بچ کر نکل پایا تھا۔ موہن کمار کے قتل کے بعد وہ گھیرے میں آ گئی تھی اور اب اپنے نوعمر بھتیجے طلال راجپوت سمیت ان انتہا پسند کٹر لوگوں کے قبضے میں تھی۔ وہ اسے اپنے کسی نامعلوم عقیدے کے مطابق قرار واقعی سزا دینے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک حیرت ناک اتفاق یہ تھا کہ اس قرار واقعی سزا میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے میں خود بھی گوپال کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

میں پچھلے تین چار روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سلطانہ کے لیے کیا کرنا ہے؟ اسے کس طرح بچانا ہے؟ کیسے اس کی اور طلال کی زندگی کو محفوظ کرنا ہے اور پھر کسی سلامتی والی جگہ تک رسائی حاصل کرنی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تو تب ہی طے کیا جا سکتا تھا جب مجھے اصل حالات کا علم ہوتا۔ مجھے ابھی تک تاریکی میں رکھا گیا تھا۔ کچھ بھی کھل کر نہیں بتایا گیا تھا۔ اور اب جبکہ ڈراپ سین ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا، میں بدستور اندھیرے میں تھا۔

تو کیا اس اندھیرے کا مطلب یہ تھا کہ میں کچھ نہ کروں گا اور سلطانہ و طلال کو کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے دوں گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم آسانی سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہاں موجود تھا اور اب ایسا لاچار بھی نہیں تھا کہ بھرپور تگ و دو نہ کر سکتا۔ میں اب اپنے اندر مرنے اور مار دینے کی ہمت رکھتا تھا اور اس ہمت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کچھ اور بھی موجود تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بارو غدا جنگی نے دیا تھا.... اس کی باتوں نے، اس کے فن نے، اس کے فلسفے نے۔ وہ راہِ عشق کا نیپالی مسافر، وہ صبح کا تارا، وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ.... وہ اپنی بجھتی ہوئی لو سے میرے سینے میں ایک دیا روشن کر چکا تھا۔ اس دیے کی روشنی دھیرے دھیرے میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہاں، ان لوگوں کے لیے اب سلطانہ راجپوت کو مارنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہاں سلطانہ کی لاش گرتی تو پھر اور بھی بہت سی لاشیں گرتیں۔

شام کا وقت تھا جب سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد میرے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی فربہ اندام سادھو اندر آ گیا جسے میں نے باہر اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی اور [illegible] تھی۔ [illegible] پر بھبھوت اور [illegible] کیا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پرنام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی آگیا دی۔ وہ بولا۔ "تم خوش قسمت ہو.... تمھیں ایشور نے ایک پوتر کام کے لیے چنا ہے۔ تم نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی بڑا پن کیا ہووے گا۔"

میں نے مودب انداز میں سر جھکائے رکھا۔

وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارا دھرم آشتی اور پریم کا دھرم ہے.... لیکن کبھی کبھی کچھ مورکھ اس آشتی کو تباہ کر دینے پر کمر باندھ لیوت ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن ناہیں رہتا کہ آشتی اور پریم کا دامن تھام کر رکھا جاوے۔ پھر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ لڑکی سلطانہ ہے۔ ناری ذات کمزور ہووت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کٹھور فیصلہ کرتے ہوئے دکھ بھی ہووت ہے۔ لیکن اب یہ مجبوری ہے کہ اسے اس کے کیے کی سزا دیویں اور فوراً دیویں۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب پر سختی آوے گی۔"

"کیا ایسا ہو سکت ہے گروجی کہ اس لڑکی کو

کرکٹ کا ایک شوقین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔
"کیا بات ہے؟" اس کے دوست نے پوچھا۔
"بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ نہ چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ جائے گی۔"

"اوہ، واقعی بری خبر ہے۔"
"ہاں.... یقین کرو، میں اپنی بیوی کو بہت مس کروں گا۔"

□□□□□□□□□□□□□

جارج ہر وقت کرکٹ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے عاجز آ کر کہا۔ "تم ہر وقت صرف کرکٹ کے بارے میں سوچتے ہو۔ مجھے یقین ہے، تمھیں وہ دن بھی یاد نہیں ہو گا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔"
"مجھے خوب یاد ہے۔" جارج نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "اس روز کاؤڈرے نے سرے کے خلاف ۱۰۰ رن ناٹ آؤٹ بنائے تھے۔"

موت کے علاوہ کوئی اور کڑی سزا دے دی جاوے؟"

"ناہیں۔" گرو نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلایا اور اس کی آنکھوں سے نفرت چھلکنے لگی۔ وہ بولا۔ "یہ لڑکی ابھاگی ہے۔ اس سے پے در پے اپرادھ ہوئے ہیں اور ہر اپرادھ ایسا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی جا سکت تھی۔ اس کا سب سے پہلا اپرادھ یہ تھا کہ اس نے مقامی رواج کے مطابق ٹھکر جی کی پری بننے سے انکار کیا۔ اس کے باپو نے چالاکی دکھائی اور اس کا بیاہ راتوں رات ایک ایسے شخص سے کر دیا جو اپنے ہوش حواس میں ہی ناہیں تھا.... بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ پری بننے سے رہ گئی۔ اس کا دوسرا بڑا دوش یہ تھا کہ اس نے ہاتھاپائی کرکے ٹھکر جی کی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کا جبڑا توڑا اور پناہ کے لیے بھاگ کر یہاں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے پاس آ گئی۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دھیرے دھیرے حالات خراب تر ہو گئے ہیں اور اب زرگاں اور تل پانی میں یدھ کی نوبت آ گئی ہے۔ اس یدھ میں جانا ناہیں کتنی لاشیں گریں گی۔ اس لڑکی کا آخری اپرادھ تو کسی صورت معافی کے قابل ناہیں ہے۔ اس نے مہاتما جی کی

http://pakfunplace.blogspot.com

کے ایک دھرم اوتار کو بیدردی سے قتل کیا ہے اور ان کا سر کاٹا ہے...... زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج نے اس کے لیے جو سزا تجویز کی ہے، وہ دھرم کا پالن تو کرے گی ہی...... اس اپرادھی کے لیے بھی وہ سزا چھٹکارے کا سبب بنے گی۔ اس کے سارے پاپ اس سزا سے دُھل جائیں گے۔ اس کی آتما کو شانتی ملے گی......

"وہ سزا کیا ہے مہا گرو؟" میں نے دریافت کیا۔

"آگ بھی کی خشک لکڑی سے چِتا تیار کی جاوے گی اور اس میں اسے جلایا جاوے گا۔"

"زندہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہوگی تو زندہ ہی لیکن اپنے ہوش حواس میں ناہیں ہوگی۔ اسے ایلم کا ست پلایا جاوے گا پھر اگنی میں رکھا جاوے گا۔"

میں اندر سے لرز گیا۔ اندھے عقیدے انسان کو کیسے کیسے کاموں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ توہم پرستی دھرم کا لبادہ اوڑھ کر کسی آسیب کی طرح انسان سے چمٹتی ہے اور اسے کائنات کی سب سے ناقص العقل شے بنا دیتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ "مہا گرو! اس سارے عمل میں میرا کردار کیا ہووے گا؟"

"وہی جو بڑے پنڈت مہاراج نے تمہارے لیے چنا ہے۔ چاند کی چوتھی رات کو تم کالی کے مندر میں داخل ہوئے اور وہ پہلے منش بنے جو رام پرشاد کے پریوار کے ساتھ پوجا کے لیے بیٹھا۔ تم اب اگارش ہوگے۔"

"یہ اگارش کیا ہووت ہے مہا گرو؟"

"جو کسی بری آتما کو پاپوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے اس کی مدد کرت ہے۔ تم سلطانہ کی چِتا کو اگنی دکھاؤ گے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں سلطانہ کو زندہ جلایا جانے والا تھا۔ یہ کام ایک خاص شخص کے ہاتھوں ہونا ضروری تھا...... اور جانے کیسے وہ خاص آدمی میں بن گیا تھا۔ جب کالی کے مندر کے پاس بھرے بازار میں اجے کے حوالدار کی نظر سے بچنے کے لیے میں مندر میں گھسا تھا، مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ میرا یہ اقدام مجھے لے کر کس راستے پر چل نکلے گا۔

مہا گرو نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پر تو! کیا تم اس کام کے لیے تیار ناہیں ہو؟"

"اگر یہ بڑے پنڈت مہاراج کا حکم ہے تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی ناہیں ہے گرو جی لیکن......"

"لیکن...... کیا؟" گرو نے پوچھا۔

"میں سلطانہ کے بھتیجے کے بارے میں جاننا چاہت ہوں۔ اس کا کیا کیا جاوے گا؟"

"وہ ابھی یہاں ہمرے پاس ہی رہے گا۔ اس کے بارے میں پنڈت مہاراج بعد میں فیصلہ کریں گے۔"

میرے اور مہا گرو کے درمیان چند منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ پھر وہ مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر واپس چلا گیا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو زندہ جلانے کی بات کرنا اور چیز ہے لیکن سچ مچ ایک جیتے جاگتے سانس لیتے وجود کو رسیوں سے باندھ کر آگ میں بھسم کر دینا اور بات۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس زمین دوز ہال میں اور اس سے ملحقہ کوٹھڑیوں اور راہداریوں میں کم و بیش ایک سو افراد موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک ان میں کوئی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ یہ اپنے چہروں مہروں سے ہی شدت پسند لوگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے چہروں پر بھبوت مل رکھا تھا اور گیروے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں کا کرتا دھرتا تو ایک جگ جیت نامی شخص تھا جو مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا تاہم ستیش کو بھی یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

میں سلطانہ اور طلال کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان لیتے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی یہ پہچان ظاہر بھی کر دیتا۔ ایسی صورت میں میرا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر آ گیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ یہ بھدی آواز والا وہی شخص تھا جو ذرا لنگڑا کر چلتا تھا اور جسے میں حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عیار آنکھوں والا یہ شخص بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھا۔ اس نے سب سے پہلی اطلاع تو مجھے یہ دی کہ مختار راجپوت کی اپرادھی بیٹی کو پنڈت مہاراج کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل آج نہیں ہوگا۔ اس میں تھوڑی سی تاخیر ہے۔

اس کی یہ اطلاع میرے لیے سکون کا باعث تھی۔ تاہم ابھی مجھے اس اطلاع پر پوری طرح یقین نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ستیش یا مہا گرو مجھے خود آ کر بتائیں گے مگر [illegible] نہ جانے کن مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں بھدی آواز والا یہ ارجن نامی شخص مجھ سے مزید بے تکلف ہو گیا۔ وہ انتہا پسندی کی ہر تعریف پر پورا اترتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا، خاص طور سے مراد شاہ اور ان کے حواریوں کے لیے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ گھوسلے سرکار کو اپنا دھرم تبدیل کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور دھیرے دھیرے تل پانی کی راج گدی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے جیسے چنگاریاں چھوٹتی تھیں۔

وہ بولا۔ "ہم نے بہت سہہ لیا ہے۔ اب ہم اینٹ کا جواب پتھر سے بلکہ گولی سے دیویں گے۔ اپنے ایک بالک کے بدلے میں ان کے دس بالکوں کی ہتھیا کریں گے۔ اپنی ایک عورت کے بدلے میں ان کی دس عورتوں سے بلادکار کریں گے۔ اب ہمارے ہاتھ کوئی ناہیں روک سکتا۔ اب ہمیں چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ میں تو تم کو [illegible] ناہیں ہے وہ پاپ کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو کسی جتھے میں شامل کر لو۔ ضروری ناہیں کہ یہ ہمارا جتھا ہی ہو۔ بھگوان کی کرپا سے اب اور بھی بہت سے [illegible] کام کر رہے ہیں......" وہ جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارجن نے گفتگو کا رخ ایک اور جانب موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمکنے لگی اور مسکراتے لہجے میں زہر سرایت کر گیا۔ اس نے مجھے ایک اور مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا جو یہاں موجود تھی اور جسے اس کے کرموں کی قرار واقعی سزا مل رہی تھی۔ میں یہ سن کر لرز گیا کہ اس بے بس لڑکی کو یہاں ہر روز انتہا پسند [illegible] کئی روز سے زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

ارجن نے ایک آنکھ میچ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ "اگر چاہو تو تم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکت ہو۔"

"میں سمجھا ناہیں۔"

وہ اسی لہجے میں بولا۔ "سیانے کہتے ہیں جو چیز بے کار جا رہی ہو، اسے بے کار جانے سے پہلے استعمال کر لینا چاہیے۔ اس چھوکری کو بھی ایک دو دن میں مُکت (ختم) ہو جانا ہے تو پھر کیوں نہ یہ کسی کے کام آ جاوے۔"

"تمہارا...... مطلب...... بلادکار سے ہے؟"

"بلادکار ناہیں...... انصاف...... انصاف......"

بتائے" ارجن کے لہجے میں پھر بے پناہ زہر اتر آیا۔ "اس حرامزادی کے بھائی نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ زیادتی کی۔ بیاہ کا جھانسا دے کر اسے اغوا کیا۔ کئی روز تک ایک کرائے کے مکان میں بند رکھا۔ خود اس کے ساتھ سوتا رہا، اپنے دوستوں کو بھی سلاتا رہا۔ اس "نیچ کام" میں اس حرامزادے کی بہن بھی پوری طرح شریک تھی۔ وہی ملی ہوئی تھی...... ملاقاتیں کراتی تھی۔"

میں حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ "اب کہاں ہے وہ لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"بھاگ گیا کتا، احمد آباد کی طرف...... لیکن ہمارے بندے پیچھے ہیں۔ ایک نہ ایک روز دھر لیں گے اسے۔"

"اور یہ لڑکی وہی ہے [illegible] اس کی بہن...... ملاقاتیں [illegible]؟"

"ناہیں، یہ وہ ناہیں۔ اس بدذات کو تو ہمرے جتھے کے جوانوں نے وہیں مار ڈالا تھا اس کے گھر میں۔ مار مار کر بھرتا بنا دیا تھا اس حرامزادی کے تھوبڑے کا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ زندہ ہاتھ آ گئی تھی۔ گھر کے پچھلے کمرے سے۔ وہاں ایک بڑے آہنی صندوق میں چھپ گئی تھی۔"

میری نگاہوں میں اس لاش کا منظر گھوم گیا جو چند دن پہلے ہم نے شہر کے ایک اندرونی محلے میں دیکھی تھی۔ تھانے دار محمود اور کپتان اجے وغیرہ کو شک ہوا تھا کہ یہ شاید سلطانہ کی لاش ہے۔ مجھے لاش کا مسخ چہرہ یاد آیا اور جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ارجن نامی غنڈا اسی بدقسمت لڑکی کا ذکر کر رہا ہے......

اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔ "میں رات کو دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔ ستیش بابو سے ان باتوں کا ذکر ناہیں کرنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ابنِ آدم جب پستی میں گرتا ہے تو کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگ انتہا پسندی کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن یہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ توہم پرستی کے خمیر سے جنم لینے والے انتہا پسند ہر مذہب، ہر قوم میں پائے جاتے ہیں..... اس کی ایک ناقابلِ تردید کرب ناک مثال میرے سامنے تھی۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو انتہا پسندوں سے بھی آگے کی شے نظر آرہے تھے۔ وہ بداخلاقی اور سفاکی کی ہر حد سے گزرے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر ارجن میرے کمرے میں آگیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے کسی شے کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تاڑی تھی۔ وہ ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سات آٹھ بندے موجود تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ لحافوں میں لیٹے سگریٹ پھونک رہے تھے اور گپ شپ کررہے تھے۔ ان سب نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چپکے چپکے مسکرائے بھی۔

شیشے کی ایک لمبی بوتل تاڑی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ارجن نے مجھے پینے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ ہم گپ شپ میں مصروف ہوگئے۔ ارجن کوشش کررہا تھا کہ میں باقی افراد سے بھی بے تکلف ہوجاؤں۔ وہ سب صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ کئی ایک کے چہرے پر نئے پرانے زخموں کے نشان موجود تھے۔ وہ مراد شاہ کے بارے میں اور اس کے ایک ہم زلف کے بارے میں نہایت نازیبا گفتگو کررہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ننگی گالیاں ہی بک رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بیسن کے پکوڑے کھاتے جارہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص تاڑی کے نشے میں ڈولتا اور اپنی قمیص درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ گنگنا رہا تھا..... رام تیری گنگا میلی ہوگئی..... ہو رام تیری گنگا میلی ہوگئی.....

اس نے دو تین پکوڑے کھائے اور پھر دھپ سے ایک چارپائی پر گر گیا۔ ارجن نے چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھا پھر ایک آنکھ بھینچی اور مجھے اُدھ کھلے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس صورتِ حال کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ سجائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ارجن نے مسرور لہجے میں کہا۔ "بجرنگ بلی کی ہے..... ہر شیر لگتے ہو بھئی۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "کچھ اور نا ہیں تو یہی لے جاؤ۔"

میں نے پیکٹ ہوا میں دبوچ لیا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر لالٹین کی مدھم سی زرد روشنی تھی۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ ایک پلنگ پر بوسیدہ سے لحاف کے نیچے مجھے بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ یہ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے روکھے پھیکے بال منتشر اور چہرہ لالٹین کی روشنی ہی کی طرح زرد اور بیمار تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں چیپی ہو چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اپنے ارد گرد سے لاتعلق پڑی تھی۔ رخسار پر ایک دو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شرم نہ خوف، نہ غصہ نہ بیزاری۔ وہ بس اسی طرح پھول دار لحاف کے نیچے بے لباس پڑی رہی۔ روندی ہوئی، مسلی ہوئی، کچلی ہوئی اجاڑی ہوئی..... وہ جیسے صدیوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ آدم کے بیٹوں سے پوچھ رہی تھی۔ میں کائنات کا حسن ہوں۔ میں نازک ترین جذبوں کی کہکشاں ہوں۔ میں محبت کی خوشبو اور زندگی کی روح ہوں۔ میرے بے لوث جذبوں نے زندگی کو زندگی بنایا ہے۔ تو پھر..... میں زندگی کو زندگی بنانے والی..... زندگی سے اس قدر دور کیوں کردی جاتی ہوں؟ کیوں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے؟ کیوں ہر ظلم و ستم کا رخ کسی نہ کسی طور میری طرف موڑ دیا جاتا ہے؟ مجھے کچل مسل کر ناقابلِ شناخت بنا دیا جاتا ہے؟ جیسے میں اب تمہارے سامنے پڑی ہوں۔ شاید تم بھول رہے ہو، میرے گرم ہونٹوں پر گلاب کھلا کرتے ہیں۔ میرے دل آویز جسم میں خوشبو اور محبت کے چشمے بہا کرتے ہیں۔ میری باہوں میں سما کر تم مرد و زن کی محبت کا ناقابلِ فراموش لمس حاصل کرسکتے تھے..... لیکن اب تم کیا حاصل کرو گے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پانے سے پہلے ہی تم مجھے کھو چکے ہو۔ تم ایک سرد باسی گوشت پر جھپٹ مارو گے۔ بالآخر تمہارے حصے میں کراہت، ندامت اور پچھتاوے کے سوا

کچھ نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں۔

میں لحاف کے نیچے پڑی اس لڑکی کی خاموش آواز [illegible] آواز میرے رگ و پے میں سمائی رہی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں ہولے سے اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں بستر کے بجائے کرسی کی طرف بڑھوں گا۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہر [illegible] کے لیے تیار تھی لیکن اس سلوک کے لیے تیار نہیں تھی جو میں اس کے ساتھ کررہا تھا۔ میں نے لحاف کا کونا اوپر کی طرف کھینچا اور لڑکی کا عریاں کندھا اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے لباس پہنا دوں لیکن میرے ایسا کرنے سے ارجن اور اس کے ساتھی چونک سکتے تھے..... اور مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا۔

میں نے اس کے بوسیدہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہلکے بخار میں تھی۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ "کب سے ہو یہاں؟"

"[illegible]" وہ سسکی۔

"[illegible] تمہارے بھائی نے کسی لڑکی کو اٹھایا [illegible] کیا تھا؟"

"نہیں..... اس بارے میں کچھ نا ہیں کہنا چاہتی..... اور یہ سب کچھ بتانے سے..... کچھ حاصل نا ہیں ہے..... ہونا وہی ہے جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ تم بھی وہی کرو گے اور چلے جاؤ گے۔" اس نے بیزاری سے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

"نا ہیں..... میں وہ نا ہیں کروں گا جو ہوتا آیا ہے..... میں تمہیں سوگند دیتا ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی طرح پھول دار لحاف میں سمٹی لپٹی رہی۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بے قصور تھا۔ وہ برہمن لڑکی خود ہی اس کے بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر صورت اس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ جب کوئی راستہ باقی نہ رہا تو وہ دونوں گھر چھوڑ گئے۔ بعد میں انہیں پکڑ لیا گیا اور اس کے بھائی پر بے شمار جھوٹے الزامات لگا دیے گئے۔ اس کی بڑی بہن کو اس الزام میں مار دیا گیا کہ وہ اس برہمن لڑکی کی ملاقاتیں بھائی سے کرواتی تھی۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر یہاں لے آئے اور اب وہ آٹھ دس دن سے یہیں پر بند تھی۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔

یہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بدمست خطرناک غنڈوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گی۔ اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ خودکشی کرسکتی ورنہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

کمرے کے ایک کونے میں اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ طاق دان میں لالٹین کے ساتھ کھانسی اور بخار وغیرہ کی دوا رکھی تھی۔ یہیں پر ایک کونے میں، میں نے ایک بیلچہ پڑا دیکھا جس کے دستے پر گھنگرو بندھے ہوئے تھے..... اور کسی دیوی غالباً کالی ماتا کی شبیہ کھدی ہوئی تھی۔ بیلچے کے پھل کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور زرد لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے بیلچے کی طرف اشارہ کیا۔

"کالی ماتا کا بیلچہ ہے۔" وہ خفیف آواز میں بولی۔

"کالی ماتا کا بیلچہ؟ تو یہاں کیوں رکھا ہے؟"

"میں اس سے مٹی کھودتی ہوں۔" وہ منمنائی۔ "وہ کہوت ہیں کہ میں تلسی کے پودے کے نیچے سے مٹی کھودوں گی تو مجھے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر ملے گی اور اگر چار دن کے اندر مجھے یہ مہر مل گئی تو پھر وہ مجھے چھوڑ دیویں گے..... لیکن..... میں اب جینا نا ہیں چاہتی۔ تم لوگ مجھے مار ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ واقعی زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف تو تھا مگر زندگی کا خوف شاید اس سے زیادہ تھا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنا ہاتھ لحاف سے باہر نکالا تو مجھے اس کی ہتھیلی پر چھالے نظر آئے۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ چھالے بیلچہ چلانے کی وجہ سے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "شکیلہ! اگر تم زندگی سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہو تو پھر ان لوگن کے کہنے پر بیلچہ کیوں چلاوت ہو؟"

"یہاں کچھ بھی میری مرضی سے نا ہیں ہوتا۔" وہ سسکی۔ "کل میں نے مٹی کھودنے سے انکار کیا تھا،

http://pakfunplace.blogspot.com

میری قمیص پھاڑ دی گئی اور مجھے مارا گیا۔“

میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف ایک الماری پر تہ شدہ جائے نماز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کس کی جائے نماز ہے؟“

”میری ..... میں اس پر نماز پڑھتی ہوں۔“

”کیا یہ لوگ تمہیں پڑھنے دیتے ہیں؟“

”ہاں، ان کو اعتراض نا ہیں۔ رات ہونے سے پہلے میں جو کچھ چاہوں کر سکتی ہوں۔“ وہ دردناک لہجے میں بولی۔

میں اس صورت حال پر ششدر تھا۔ شیواجی کی مہر والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ بھی کسی کنڈلی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا؟

میں نے اس شکیلہ نامی بدحال لڑکی سے سلطانہ کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں کیونکہ اسے بہت کم اس کمرے سے باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ہاں دو دن پہلے رات کے وقت بجر نگ بلی اور ہنومان کی جے کے زوردار نعرے سنائی دیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ خوشی میں ہوائی فائر نگ بھی کی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس وقت اس نے گروجی کی دھرم [illegible] کو ایک ملازم سے [illegible] کہتے سنا تھا۔ ملازم [illegible] لڑکی کو اٹھا کر [illegible] رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو برے ناموں سے پکار رہی ہے اس لیے اس کے منہ میں مٹی بھر کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا گیا ہے۔

”کیا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ یہاں آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید کسی لڑکے کی بات بھی ہو رہی تھی۔“ شکیلہ نے تصدیق کی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شکیلہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں، میں نے دو تین سگریٹ بھی پھونکے۔ میں شکیلہ سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ وہ بچ نہیں سکتی اس لیے مرنے کے لیے تیار ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر مزاحمت کا حق ادا کر چکی تھی اور اب اس نے خود کو کلی طور پر بدترین حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے رخصت ہو کر باہر آ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

میں اپنے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ لے کر اس کمرے سے نکلا۔ ارجن اور اس کے ساتھیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے باہر آتے ہی ارجن کے ایک اور ساتھی نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور لڑکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرے اندر آگ سی روشن تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کڑاکے کی سردی میں تیز بارش ہو۔ میں برہنہ جسم کسی منجمد جھیل کے کنارے، سرد ہواؤں کو چیرتا ہوا بھاگتا چلا جاؤں۔ میرا سینہ اتنا ہانپ جائے کہ پھٹنے لگے، میرے پاؤں خون اگلنے لگیں۔ پھر میرے سامنے میرا کوئی بچھڑا ہوا دشمن آ جائے۔ اس کی آنکھوں میں قاتل سرخی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس پر ٹوٹ پڑوں۔

میری سانس تیزی سے چلنے لگی۔ رگ پٹھے تن گئے۔ میں اٹھ کر اس مختصر کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ باہر ہال کمرے میں شور تھا۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ہلا گلا کر رہے ہیں۔ میں نے ایک میز پر چڑھ کر ایک روزن میں سے ہال کمرے میں جھانکا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ ایک طرف فرش پر دری بچھی تھی۔ اس پر تین چار افراد بیٹھے کچھ گھوٹ رہے تھے۔ لکڑی کے رنگین ڈنڈوں پر منتر وچڑھے ہوئے تھے۔ پیالوں میں بھر بھر کر کچھ پیا بھی جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھنگ کا دور چل رہا ہے۔ ایک ہٹا کٹا شخص جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا ہوا تھا، مجمعے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین نوک والا نیزہ تھا جسے ترشول کہا جاتا ہے۔ وہ شیوجی کے نام کے نعرے لگا رہا تھا اور کچھ افراد اس کے گرد رقص کر رہے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد کی ہر شے گردش میں آ گئی ہے اور میں زمین سے اٹھ کر فضائے بسیط میں معلق ہو گیا ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ تصور یا تخیل نہیں تھا..... ایک جیتا جاگتا منظر تھا..... مجھے عمران دکھائی دیا۔ ہال کی دھواں دھواں فضا میں چہروں کے ہجوم میں، میں نے اس کا روشن چہرہ صاف اور

http://pakfunplace.blogspot.com

واضح دیکھا۔ اس کے گلے میں ایک گلابی رومال تھا، وہ کچھ [illegible] کر رہا تھا۔ بس ایک یا دو سیکنڈ کے لیے۔ [illegible] وہ چہروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

”عمران ..... عمران!“ میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

تب میں جست لگا کر میز سے اترا۔ ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور راہداری میں آ گیا۔ اندھا دھند بھاگتا ہوا میں ہال کمرے میں دھواں دھواں فضا میں داخل ہوا اور اس مقام کی طرف لپکا جہاں میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں خاکستری رنگ کے گول ستون کے پاس وہ موجود نہیں تھا۔ ”عمران ..... عمران .....!“ میں ایک بار پھر چلایا۔

کئی لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ تب مجھے پتھریلی سیڑھیوں کے پاس جہاں ہاتھی کا ایک شکستہ مجسمہ موجود تھا، پھر گلابی رومال کی جھلک نظر آئی۔ میں لوگوں کو چیرتا اور مختلف اشیا سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھا۔ تاہم میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے گلابی رومال او جھل ہو چکا تھا۔

”کیا بات ہے ..... کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟“ ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں [illegible] آواز کو نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا [illegible] دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور [illegible] کوٹھڑیوں کی قطاریں تھیں۔ یہاں بہت سی کوٹھڑیاں بھی موجود تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح مختلف کوٹھڑیوں میں جھانکتا رہا ..... لیکن کچھ نہیں ملا۔

میں وہیں ایک سیڑھی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا میری نظر دھوکا کھا رہی تھی؟ کیا میرا تصور مجھے فریب دے رہا تھا؟ اس کا تصور اکثر و بیشتر میرے حواس پر چھایا رہتا تھا اور میں اسے اپنے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ کیا [illegible] تصور اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ تصور اور حقیقت میں تمیز مشکل ہو گئی تھی .....؟

”کیا ہوا گوپال؟“ ستیش کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔

ستیش میرے سر پر کھڑا تھا۔ چند دیگر افراد آٹھ دس قدم دور کھڑے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا کسی جان پہچان والے کو دیکھا ہے تم نے؟“ ستیش نے پوچھا۔

تعلق

میرے ایک دوست کو اس کے بیٹے کے سلسلے میں اسکول طلب کیا گیا۔ ہیڈ ماسٹر کو لڑکے کے اسکول ورک کی طرف سے بڑی تشویش تھی۔

”دیکھیے انصاری صاحب!“ اس نے میرے دوست سے کہا۔ ”آپ کا بیٹا عاصم آج کل پڑھنے لکھنے پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ اس کی کلاس ٹیچر نے پوچھا کہ پانی پت کی لڑائی کس کس نے لڑی تھی تو عاصم نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔“

میرے دوست نے کہا۔ ”ہیڈ ماسٹر صاحب! اگر میرا لڑکا یہ کہتا ہے کہ اسے لڑائی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو یقین کیجیے وہ بالکل معصوم ہے اور یہ بھی کہ کسی لڑائی جھگڑے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔“

ہیڈ ماسٹر کی زبان اچانک گنگ ہو گئی۔ وہ تعجب سے میرے دوست کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

میرا دوست اپنے بیٹے کو اسکول سے لے کر گھر واپس ہو رہا تھا کہ ایک جگہ سرخ روشنی پا کر اسے کار روکنی پڑی۔ وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”عاصم ایک بات تو ہے، ہیڈ ماسٹر کے سامنے تو میں نے تمھیں بچا لیا ہے لیکن اگر آئندہ کبھی مجھے پتا چلا کہ پانی پت کی لڑائی سے تمھارا کوئی تعلق رہا ہے تو تمھاری کھال ادھیڑ دوں گا۔“

http://pakfunplace.blogspot.com

”ہاں [illegible] مجھے شبہ ہوا تھا۔“ میں نے مبہم جواب دیا۔

”کون تھا؟“

”بس ..... تھا ایک پرانا دوست لیکن ..... وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ وہم ہی ہوا ہے۔“

کچھ دیر بعد میں اس ہنگامے سے نکل کر پھر اپنے کمرے میں تھا۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو شدت سے چاہا جاتا ہے، وہ جدائی کے بعد بھی ہیولوں کی صورت میں ہمارے ارد گرد موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چہروں میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور آوازوں پر ان کی آواز کا شبہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بارہا ندا جی کی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے اس کے چہرے میں عمران کی جھلک ڈھونڈلی تھی ..... حالانکہ یہ جھلک کچھ ایسی نمایاں بھی نہیں تھی۔

تو کیا اب مجھے کسی اور چہرے میں اپنے بچھڑے یار کی صورت دکھائی دی تھی؟ میں سوچتا رہا اور سر میں

ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ نہ جانے میں کب تک اس عجیب ذہنی کیفیت میں رہا۔ ہال کمرے سے دھیما شور اب بھی ابھر رہا تھا۔ میں اس شور کو سنتے سنتے سو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز شام تک بے چینی کی کیفیت رہی۔ اس بے چینی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ جھلک جو میں نے کل رات دھواں دھواں ہال کمرے میں دیکھی تھی۔ یہ میرا تصور ہرگز نہیں تھا اور اگر یہ چہروں کی مشابہت تھی تو بھی حیرت انگیز تھی۔ پریشانی کی دوسری وجہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تھے جو میں نے کل شب لٹی پٹی شکیلہ کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کھنڈر میں رانگلوں کے سائے تلے اور بارود کے گھیرے میں وہ بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ اگر میں سلطانہ کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر ضروری تھا کہ شکیلہ کے لیے بھی ایسا ہی ارادہ رکھوں۔

میری مہمان نوازی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کٹر ہندو ہونے کے باوجود ارجن نے مجھے چپکے چپکے یہ آفر بھی کر دی کہ اگر میں ماس یعنی گوشت کھانا چاہوں تو وہ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ سہ پہر کے وقت مجھے راہداری میں گرو جی کی چیلی کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ گرو سے خاصی کم عمر تھی اور خوب صورت بھی تھی۔ اس کی مانگ میں سیندور تھا اور وہ نہایت چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دو داسیاں مؤدب انداز میں اس کے ارد گرد موجود تھیں۔ تاہم مجھے گرو کی یہ جوان سال دھرم پتنی کچھ بجھی بجھی سی نظر آئی۔

شام کے فوراً بعد ہال کمرے میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج رات یہاں کچھ اور کیا ہونے والا ہے۔ بھجن مسلسل پڑھے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے سنکھ کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر ایک نقارہ سا پیٹا جانے لگتا تھا۔ لگتا تھا کہ ہال کمرے میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر روزن میں سے دیکھنا چاہتا تھا مگر میں تپائی روزن تک پہنچنے کے لیے استعمال کی تھی، وہ کسی ضرورت کے تحت باہر لے جائی جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا.... چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ سے عنقریب میری ملاقات ہونے والی ہے اور نہایت سنگین حالات میں ہونے والی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے فضا میں تھوڑی سی حدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

رات نو بجے کا وقت ہو گا جب شور وغل میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ نقارہ اور زور سے پیٹا جانے لگا اور اس کی آواز سے در و دیوار گونجنے لگے۔ اچانک دروازہ کھلا اور مجھے ستیش کی صورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ اندر آتے ساتھ ہی اس نے میرے گلے میں جھولنے والی نیلگوں پتھروں کی مالا کا معائنہ کیا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بعد میرے سر میں وہی عجیب خوشبو والا تیل ڈالا گیا جو حویلی میں ڈالا گیا تھا۔

ستیش اور اس کے ساتھی مجھے لے کر راہداری میں آئے تو ہال کمرے کا شور وغل زیادہ واضح سنائی دینے لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں وسیع و عریض ہال میں تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک اور چھوٹا ہال نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا شاید کسی بڑے پردے کے ذریعے سے اس چھوٹے ہال یا چیمبر کو چھپایا گیا تھا۔ اس گول ہال کا فرش بڑے ہال کے فرش سے قدرے نیچا تھا۔ گنبد نما چھت میں ایک بڑا سوراخ چمنی کی طرح موجود تھا۔ میں نے اس گول ہال یا چیمبر کا منظر دیکھا اور خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ یہاں ایک بڑی چتا تیار تھی۔ شاید یہ آگ چمنی کی لکڑی ہی تھی۔ قریب ہی بڑے بڑے دو روشن مشعلوں میں چتا کا تیل [illegible] کھا تھا۔ چتا کے قریب [illegible] کو زرد پھولوں اور چمکیلے کاغذوں کی مدد سے سجایا گیا تھا۔ چتا کے اندر لکڑی کے مستطیل تختے پر جو لڑکی بے سدھ پڑی تھی، وہ سلطانہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ نیم بے ہوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک سرخی مائل چادر تھی جس کے نیچے سے اس کے جسمانی نشیب و فراز دکھائی دیتے تھے۔ اس کے بالوں کو ایک طرف سمیٹ کر کنپٹی کے قریب جوڑا سا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ سانس لے رہی ہے۔ اس کی رگوں میں زندگی رواں ہے..... لیکن اس زندگی کو بھڑکتے شعلوں میں بھسم کرنے کی پوری تیاری کی جا چکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ نشان ان سختیوں کو ظاہر کر رہے تھے جو پچھلے چند دنوں میں اس نے جھیلی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر پہلی بار میرے سینے میں عجیب سی ٹیسیں اٹھیں۔ میں نے خود کو اس کے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ میری زندگی کا ایک جزو ہے۔ میں نے

اس لمحے میں ان سارے احسانات کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کیا جو وہ ایک بیوی کی حیثیت سے مجھ پر کرتی رہی تھی..... اور ان ساری قربانیوں کا بوجھ بھی جو وہ میری بے خبری میں میرے لیے دیتی رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ دیوانہ وار بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسی تھی اور اپنی جان پر کھیل کر مجھے باہر لائی تھی اور پھر اس کے بعد میری سلامتی کے لیے اس کی جدوجہد کا طویل دور شروع ہوا تھا۔ آج وہ خود شعلوں کی زد میں تھی۔ میں تو پھر بھی بچوڑا میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا، وہ تو آج ہوش و خرد سے بیگانہ بالکل لاچار پڑی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے عجیب سی چاہت محسوس کی۔

چتا کے ارد گرد برپا شور و غل عروج پر پہنچ گیا۔ بہت سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھ میں ترشول تھے۔ ان میں سے کچھ نے بھبوت رما رکھا تھا یا اپنے چہروں پر رنگوں سے مختلف نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایک خاص رسم کی ادائیگی کے لیے بالکل تیار ہیں.....

چتا کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک اونچی چوکی پر مہا گرو فقط ایک دھوتی پہنے، آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے بالجہر مالا جپ رہا تھا اور کچھ اشلوک بھی پڑھ رہا تھا۔ ایک پجاری آگے بڑھا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک مشعل نما چیز تھما دی۔ میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی..... تو بدترین لمحے پہنچ گئے؟ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں چتا پر تیل انڈیلا جانے والا ہے اور اس منحوس لکڑی کو روشن کیا جانے والا ہے تاکہ میں چتا کو اگنی دکھانے کا اعزاز حاصل کر سکوں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ اپنے ارد گرد موجود درجنوں رائفل برداروں میں سے میں کسی ایک کی رائفل چھین لوں اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ مار دوں..... مر جاؤں یا پھر کسی طرح سلطانہ کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کامیابی کا امکان معدوم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ "بہت کچھ" ختم ہونے والا ہے اور اس "بہت کچھ" میں سلطانہ اور میں بھی شامل ہیں۔ ایک نوجوان جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، آنکھوں میں رنگ لگایا ہوا تھا اور فقط ایک دھوتی پہن رکھی تھی، وہ میرے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس بوتل میں سے اس نے میرے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی پر تھوڑا سا تیل ڈالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پرتو! تم تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ "مجھ کو لگت ہے کہ تم کچھ کھوئے کھوئے ہو۔ کیا کسی کو ڈھونڈت ہو؟" شور میں اس کی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس لیے وہ زور سے بول رہا تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہت ہو؟"

جواب میں اس نے رازدارانہ انداز میں جو کچھ کہا، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولا۔ "پرتو! میں جانت ہوں..... تم اپنے کسی بچھڑے سنگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمھارے من میں آشا ہے کہ شاید ان کٹھن گھڑیوں میں وہ تمھیں کہیں آس پاس مل جائے۔"

"تت..... تم..... کس کی بات کرت ہو؟"

"عمران کی۔" اس نے دوسرا دھماکا کیا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے جیسے ایک دم مل گئے۔ میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔

"تت..... تم..... اس کو کیسے جانت ہو؟" میں نے دھندلائی نظروں سے اسے سر تا پا دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ مجھے اس کے ہموار دانت کی قطار نظر آئی۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا نظر آیا۔ اس کے ابھرے ہوئے رخسار دکھائی دیے۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔ وہ میری زندگی کے سب سے حیرت ناک لمحے تھے۔ مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا۔ وہ اپنی اصل آواز میں بولا۔ "اتنی جلدی بھول گئے جگر! تمھاری یادداشت میں واقعی کوئی گڑبڑ گوٹالا ہو چکا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میری والدہ میرے کانوں میں بلکہ جسم کے دیگر سوراخوں میں بھی بادام روغن ڈال دیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے میرا حافظہ اب تک بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمھاری نگہداشت اس طرح سے نہیں ہوئی....."

میں ارد گرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا۔

خطرات کے ارگ... میں سفر کرتے ان بازوؤں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

http://paktunplace.blogspot.com

یہ ہماری پہلی واردات نہیں تھی لیکن ذینی ہمیشہ کی طرح بھول گیا کہ ڈاکا ڈالنے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں تبھی تو اس نے بار کی چھت کا نشانہ لے کر فائر کر دیا جس سے چھت کا تھوڑا سا پلاستر فرش پر آن گرا جبکہ ہمارا پہلا اصول ہی یہ تھا کہ ہتھیار صرف دکھانے کے لیے ہوتے ہیں اور ان کا استعمال انتہائی ضرورت کے وقت کرنا چاہیے۔ فائر کی آواز سنتے ہی میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

"کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔" ذینی کی آواز گونجی جس میں تھوڑا سا خوف بھی جھلک رہا تھا۔ "اپنے ہاتھ اوپر رکھو تاکہ ہمیں نظر آتے رہیں۔"

شطرنج کی بساط پر بچھے مہروں کی ایک چال نے اچانک ہی بازی پلٹ دی

لاحاصل

تنویر ریاض

کچھ پالیتی کے لیے خواہشمندوں کو قدرت ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ ان دوستوں کا فسانہ جنہیں موقع کی تلاش تھی اور قدرت نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ نہایت کامیابی سے ناکامی کی جانب گامزن مجرموں کا تیز رفتار سفر۔

دوسرا اصول تھا کہ صرف میں بات کروں گا ویسے بھی اس کی ڈیوٹی دروازے پر تھی اور اس کے بولنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن اس نے دوسرے اصول کی بھی دھجیاں بکھیر دیں۔ کمرے کے وسط میں نصف درجن افراد اوور آل اور کام کے کپڑوں میں ملبوس ایک میز کے گرد بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ بار کاؤنٹر تھا جہاں ایک خوف زدہ سا بارٹینڈر الو کی طرح اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ میز کے وسط میں تاش کے پتے اور نقد رقم موجود تھی اور اس کے چاروں طرف خالی بوتلیں اور ایش ٹرے رکھی ہوئی تھیں۔ ڈینی نے آگے بڑھ کر دیوار میں لگا ہوا سوئچ آف کر دیا اور ہال میں گونجتی موسیقی کی آواز یکا یک تھم گئی۔ اب وہاں مکمل خاموشی تھی۔

میں نے میز کے وسط میں کینوس کا تھیلا رکھتے ہوئے کہا۔ ”ساری نقد رقم اس تھیلے میں ڈال دو۔“

میز کی دوسری جانب کھڑے شخص نے مجھے گھورا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بے خوفی کی جھلک نظر آئی۔ اس کی عمر تقریباً ستر برس ہوگی لیکن اس کے چہرے کی سختی بتا رہی تھی کہ اس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ محنت مشقت کرتے گزارا ہے۔ اس نے تیز آواز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”لڑکے! تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔“

”باتیں کم اور پیسے زیادہ“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور ایک فائر داغ دیا جس سے دیوار میں لگی جان وین کی تصویر زمیں بوس ہوگئی۔ اس طرح مجھے اپنے ہی بنائے ہوئے اصول کو توڑنا پڑا لیکن مجبوری تھی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، ہمیں جلد از جلد سارا کیش سمیٹ کر یہاں سے نکلنا تھا۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے چھ میں سے پانچ افراد فوراً ہی نیچے کی جانب جھک گئے لیکن اس بوڑھے نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نہ ہی اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ وہ اب بھی بے خوفی سے مسکرا رہا تھا۔

ڈینی لنگڑاتا ہوا میز کی جانب بڑھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گھسٹ رہا ہو۔ شاید جوتے کی وجہ سے اسے تکلیف ہو رہی تھی، اس نے بوڑھے شخص کے سامنے سے نوٹوں کی گڈی اور ایک لفافہ اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ بوڑھے شخص کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہوئے۔ یقیناً اسے ایک بڑی رقم کے ہاتھ سے جانے کا دکھ ہوا ہوگا۔

”باقی لوگ بھی اپنی رقم ہمارے حوالے کر دیں۔“ میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

دوسرے لوگوں نے بھی اپنا کیش ڈینی کے حوالے کر دیا۔ بوڑھا کچھ اور مضطرب نظر آنے لگا۔ وہ ڈینی سے بولا۔

”تم جانتے ہو کہ یہ گیم کس کا ہے؟“

”اپنی زبان بند رکھو۔“ ڈینی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی۔ ”اب یہ ہمارا گیم ہے۔“

”تم مجھے نروس معلوم ہوتے ہو۔“ بوڑھے نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”وہی لوگ اٹک اٹک کر بولتے ہیں جو گھبرائے ہوئے ہوں۔“

ڈینی کا ہاتھ لمحہ بھر کو کپکپایا۔ وہ دباؤ برداشت کرنے کا عادی نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کے مواقع پر اپنے آپ کو پُرسکون رکھ سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ کہیں وہ اشتعال میں آکر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جو ہمارے لیے مصیبت کا باعث بن جائے۔ میں کسی خون خرابے کے بغیر ہی وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا۔

بوڑھے شخص نے کندھے اچکائے اور مجھ پر نظریں گاڑ دیں جیسے وہ نقاب کے پار دیکھنا چاہ رہا ہو۔ ڈینی نے ایک ہاتھ سے ساری رقم سمیٹی اور تھیلے میں ڈال لی۔ میرے دماغ میں چلتی ہوئی اسٹاپ واچ نے بتایا کہ اب ہمارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ اس دوران میں سب کچھ سمیٹ کر باہر نکلنا تھا جہاں ایک سروقد پک اپ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ڈینی رقم کا تھیلا لیے دروازے کی جانب بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

”کوئی احمقانہ حرکت نہیں ہوگی۔“ میں نے پستول کی نال کا رخ بوڑھے شخص کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

ڈینی ابھی داخلی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ہال کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے ڈینم کا منی اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

ہال میں موجود سب لوگ اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا اور زور سے چلائی۔ اس کے منہ سے سگریٹ نکل کر زمین پر گر پڑی۔ ڈینی اس کی چیخ سن کر بوکھلا گیا اور بلا سبب وجہ کے فائر کر دیا۔ گولی فرش پر لگی۔ میز پر بیٹھے ہوئے لوگ اچھل پڑے اور بارٹینڈر کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گیا۔

بوڑھا شخص ان سب میں تیز ثابت ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک گن نظر آرہی تھی۔ اس کی نال سے ایک زرد شعلہ نکلا اور گولی میرے سر سے ایک فٹ اوپر گزرتی ہوئی دیوار میں جا لگی۔ اسی لمحے میری گن سے بھی دو فائر ہوئے اور میں

دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر میز کا نشانہ لیا۔ میرا مقصد کسی کو مارنا نہیں بلکہ اس بوڑھے کو مزید فائر کرنے سے باز رکھنا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہیں رکا۔ دوسری گولی میرے چہرے کے پاس سے ہوتی ہوئی دیوار میں لگی۔ میں نے ڈینی کو دروازے کے باہر دھکیل دیا اور خود بھی باہر آگیا۔

سڑک کا وہ حصہ بالکل سنسان تھا اور وہاں ٹریفک یا لوگوں کی آمد و رفت برائے نام تھی۔ اس علاقے کی دکانیں بھی کھانے کے وقفے کے دوران میں بند رہتی تھیں۔ میں نے اپنا ماسک اتارا پھر بڑی احتیاط سے اس باکس کو اپنی طرف کھینچا جو ہم بار میں داخل ہوتے وقت دروازے کے باہر چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اس میں سے بیٹری سے چلنے والی ہتھوڑی نکالی اور اس کی مدد سے دروازے میں تین کیلیں ٹھونک دیں۔ اب اندر سے کوئی کتنا بھی زور لگاتا.... دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔

ڈینی نے بھی اپنا ماسک اتار دیا اور ماتھے پر سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ ”جو کچھ ہوا، اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔“

”گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔

”کرس کو مت بھول جانا۔“ ڈینی نے اپنی دانست میں بہت اہم بات یاد دلانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں اس کو لینے کے لیے رینڈی زیوس کی طرف جانا ہوگا۔“

اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈینی نے بھی سوار ہونے میں بہت پھرتی دکھائی۔ اب تک کی ساری کارروائی بڑی صفائی سے ہوئی تھی اور ہم اس علاقے سے نکل آئے تھے۔ میں نے ایک نظر کینوس کے تھیلے پر ڈالی جو خاصا پھولا ہوا نظر آرہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں ٹھیک ٹھاک رقم تھی جس سے نہ صرف یہ کہ ہمارا اُدھار نمٹ جاتا بلکہ میں کچھ پیسے اپنے بیٹے اور سابقہ بیوی کو بھی بھیج سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک شیرف کی کار ہمارے برابر سے گزری

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
معظم علی 325/-
انسان اور دیوتا 280/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
گمشدہ قافلے 350/-
خاک اور خون 350/-
پاکستان سے دیار حرم تک 160/-
ثقافت کی تلاش 150/-
داستان مجاہد 200/-
کلیسا اور آگ 300/-
آخری چٹان 325/-
قیصر و کسریٰ 380/-
قافلۂ حجاز 350/-
سو سال بعد 150/-
پردیسی کی درخت 325/-
محمد بن قاسم 300/-
سفید جزیرہ 225/-
یوسف بن تاشفین 325/-
پورس کے ہاتھی 180/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
042-37220879 051-35539609 061-4781781
041-2627568 021-2765086 022-2780128

http://pakistanipoint.blogspot.com

لیکن اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ ڈرائیور کی طرف کا شیشہ اترا ہوا تھا اور اس گاڑی کو ایک باوردی شخص چلا رہا تھا لیکن اس نے ہم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے بھی اس کی جانب دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں سڑک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ دور چل کر میں نے گاڑی رینڈی زیوس پوائنٹ کی جانب موڑ دی اور اب ہمارا رخ چرچ کی پارکنگ لاٹ کی جانب تھا۔ چند لمحوں بعد ہم چرچ کی کھڑکی کے قریب رک گئے۔ تقریباً تیس سیکنڈ بعد ایک کونے سے کرس بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ اس لڑکی کو ہمارے پہنچنے سے پہلے بار میں ہونا چاہیے تھا تاکہ وہاں کی صورت حال کے بارے میں ہمیں مطلع کرتی رہے لیکن وہ بعد میں پہنچی اور اس کی ایک چیخ نے فساد کھڑا کردیا۔

"سوری! مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی۔" وہ میرے اور ڈینی کے درمیان جگہ بناتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں نے پچھلے دروازے سے چابی باہر پھینک دی تھی۔ اس کے بعد میرے انچارج نے مجھے بلا لیا۔ میں نے اسی لیے چیخ ماری تھی تاکہ لوگوں کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ جائے۔"

"کوئی بات نہیں کرس!" ڈینی مسکراتے ہوئے بولا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر حماقت برس رہی تھی۔

"وہ بوڑھا شخص زخمی ہو گیا ہے۔" کرس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اطلاع دی۔ "تمہاری ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "ان لوگوں کا دماغ درست کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔"

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" ڈینی ہکلاتے ہوئے بولا۔ "اس شخص نے کہا تھا کہ وہاں ہونے والے جوئے کا تعلق کسی اور سے ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس سارے عمل پر غور کرنے لگا۔ اس بوڑھے نے جس کسی کی جانب اشارہ کیا تھا، وہ اتنی آسانی سے خاموش رہنے والا نہیں تھا۔ اس کی نظریں آخری وقت تک اپنی دولت پر رہی ہوں گی۔ میرے ذہن میں ایک نام گونجا۔ سنکلر جو اپنے مسئلے حل کرنے کے لیے بلوٹارچ کا سہارا لیتا تھا۔ اس کے خیال میں کسی مجرم کو سزا دینے کا وہ انتہائی محفوظ اور موثر طریقہ تھا۔

"اوہ میرے خدا!" کرس نے اپنا سگریٹ باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اس شخص کو جانتی ہوں اور اس سے پہلے بھی مل چکی ہوں واکو میں۔"

گاڑی چلاتے ہوئے بھی میرا دھیان ریڈیو کی جانب تھا لیکن ابھی تک ڈاکے کی کوئی خبر نشر نہیں ہوئی تھی۔ ہم شہر کی حدود سے نکل کر ایک تنگ دو رویہ سڑک پر آگئے جو مغرب کی طرف جاتی تھی۔

"واکو!" ڈینی نے اب باقاعدہ بلنا شروع کردیا۔

واکو، سنکلر کا اڈا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے جس جگہ ڈاکا ڈالا وہاں اسی کا گیم چل رہا تھا اور وہ آدمی بھی اسی کا تھا جسے میں نے گولی ماری تھی۔

ہم تینوں کا تعلق ریاست ٹیکساس سے ہے جہاں بھانت بھانت کے لوگ رہتے ہیں۔ ہوسٹن یہاں کا دارالخلافہ ہے۔

ہم تینوں کا تعلق بھی ایک ہی قصبے سے تھا۔ ہم ایک ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ اگر اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل کی ہوتی تو ایک ہی کلاس میں ہوتے اور ایک ساتھ ہی گریجویشن کرتے۔ ہم تینوں مختلف نوعیت کے چھوٹے موٹے کام کرکے اپنی گزر اوقات کیا کرتے لیکن اس وقت اپنے گھر سے بہت دور تھے اور پناہ کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ کرس نے دونوں ہتھیلیاں ڈیش بورڈ پر ماریں۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہو رہی تھی۔

"اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اس کا اشارہ واضح طور پر سنکلر کی جانب تھا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر اس وکیل کا نمبر آرہا تھا جسے میری سابقہ بیوی نے بچوں کی کفالت کا مقدمہ لڑنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی اور فون بند کردیا۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ وہ اس کا گیم تھا۔" میں نے ایک پتھریلی سڑک پر گاڑی موڑ دی جو شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتی تھی۔ "ہمیں مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔"

"تم فکر کیوں کرتی ہو کرس!" ڈینی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

"تمہیں کیا ہو رہا ہے، کچھ بڑے بڑے سے لگ رہے ہو؟" وہ اس کی پسلی میں اپنی کہنی چبھوتے ہوئے بولی۔ اسے مردوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ ڈینی جھینپتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔

درختوں کی دوسری جانب چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ہموار زمین تھی اور اس کھلے میدان کے وسط میں ایک ٹریلر کھڑا ہوا تھا جس کی آدھی سے زیادہ کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

"عمدہ جگہ ہے۔" میں نے اس کے قریب ہی گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں چھپنے کے لیے جگہ چاہیے تھی نا!" کرس اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ "اگلی بار ہم کسی موٹیل میں کمرے بک کروائیں گے۔"

ہم تیز تیز قدموں سے ٹریلر کی جانب بڑھے اور اندر داخل ہوگئے۔ اندرونی فرش پر نارنجی رنگ کا موٹا سا قالین پڑا ہوا تھا جس میں سے ایک ناگوار قسم کی بو آرہی تھی۔ ایک صوفہ بھی رکھا ہوا تھا جبکہ کچن ایریا میں سبز رنگ کے ٹائل لگائے گئے تھے۔ میں نے عقبی کھڑکی سے جھانکا، وہاں ایک شیڈ بنا ہوا تھا اور ایک پگڈنڈی پہاڑی تک جا رہی تھی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کینوس کے تھیلے کا سارا سامان کافی ٹیبل پر الٹ دیا جس میں نوٹوں کی گڈیاں، تھوڑے سے چپس، ردی کاغذ اور ایک لفافہ شامل تھا۔ ڈینی آگے بڑھا۔ شاید اسے نوٹ گننے کی جلدی تھی۔

"باہر جاؤ۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خیال رکھنا کوئی اس طرف نہ آنے پائے۔"

"مجھے بھی گنتی آتی ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"میں کوئی احمق نہیں ہوں۔" وہ مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں نے سارے نوٹ ترتیب سے رکھے اور انہیں گننے لگا۔ ان میں بیس، پچاس اور سو ڈالر والے نوٹ بھی تھے البتہ دس والے نوٹوں کی اکثریت تھی۔ اس کے بعد میں نے لفافہ کھولا جو ہم نے بوڑھے کے سامنے سے اٹھایا تھا۔ میں نے گنتی مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "ساٹھ ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔"

"اور یہ؟" کرس نے اپنے ہاتھ میں چابی پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل ایسی چابی تھی جو کسی بس اسٹیشن کے اسٹور کو کھولنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ چابی اس لفافے میں سے برآمد ہوئی تھی۔

"تمہیں کتنی رقم ملنے کی امید تھی؟" کرس اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔

"میں پانچ ہزار سے زیادہ کی امید نہیں کر رہا تھا۔"

کرس نے وہ چابی نوٹوں کے ڈھیر پر رکھ دی اور لفافے کے ساتھ ردی کاغذ اور چپس لے کر کچن میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بیئر کی دو بوتلیں تھیں۔

"ہم یہاں نہیں رک سکتے۔" میں بیئر کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت زیادہ رقم ہے اور وہ ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔"

"یہ جگہ میرے کزن کی ہے۔" کرس اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آجائے۔"

"ہمیں مغرب کی طرف جانا چاہیے۔" میں نے اپنے پستول کا میگزین چیک کرتے ہوئے کہا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس میں زیادہ گولیاں نہیں تھیں۔

"تم بھی اس طرف گئے ہو؟" کرس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرس اور ڈینی میں سے کوئی بھی ٹیکساس سے باہر نہیں گیا تھا جبکہ مجھے دور دراز کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں دو مرتبہ گیلوے اسٹون کے ساحل اور ایک مرتبہ نیو اورلینز جا چکا تھا۔

"ہمارے لیے اس وقت کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "دیکھو... ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔"

ہم کیلی فورنیا کی طرف بھی جا سکتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ وہاں کہاں ٹھہرتے اور کیا کرتے؟

"وہ ہمیں کبھی نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ کرس مجھ سے اتنے قریب تھی کہ میری سرگوشی بھی سن سکتی تھی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں اپنے [illegible] کو فون کرتی ہوں، شاید وہ دفتر میں میری موجودگی کی گواہی دے سکے۔"

مجھے ٹریلر کے عقبی حصے کی جانب جانا پڑا۔ میرے سیل پر ایک پیغام آرہا تھا اور جس نمبر سے پیغام بھیجا جا رہا تھا وہ واکو کا کوڈ تھا۔ میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جب وہ لوگ میرا فون نمبر ٹریس کرسکتے تھے تو مجھ تک پہنچنا ان کے لیے کون سا مشکل تھا۔ "وہ لفافہ اور اپنے ساتھی میرے حوالے کردو۔ رقم تم رکھ سکتے ہو۔ سنکلر۔"

میں مرے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا واپس آگیا۔ کرس ابھی تک کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون گرم دودھ کے کسی گلاس کی طرح پکڑا ہوا تھا۔ وہ سامنے والے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر صدمے کی کیفیت تھی۔ عین اسی وقت ڈینی بھی داخلی دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیل فون اور دوسرے میں پستول تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تم بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ جاؤ۔"

"آرام سے پارٹنر۔" میں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں پرسکون رہنا چاہیے۔"

"یہ رقم میری ہے۔" اس نے میرے سامنے فون

http://pakfunplace.blogspot.com

لہراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے عوض میں تم دونوں کو سنکلر کے حوالے کردوں گا۔“

☆☆☆

میں اس وقت بارہ سال کا تھا جب ڈینی کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی گھر سے غائب ہوگیا۔ میرے باپ نے اسے ڈھونڈنے کی ذمے داری مجھے سونپی کیونکہ اس کے خیال میں ڈینی کو ہماری مدد کی ضرورت تھی۔ ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر ایک ہفتے بعد میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک چھوٹی سی سرائے میں چھپا ہوا تھا کیونکہ اس وقت اس کا ذہن اس سے آگے سوچنے کے قابل نہ تھا۔ سب لوگوں کی نظروں میں وہ احمق تھا اس لیے میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ اسے کسی بڑی حماقت سے بچا سکوں۔

لیکن اس وقت وہ ہمیشہ سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات دیکھ کر کوئی بھی اسے احمق نہیں کہہ سکتا تھا البتہ وہ کچھ غصے میں نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کرچکا ہے۔

”تم دونوں کچن میں چلے جاؤ۔“ اس نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

”ڈینی، تم ... مجھے ... بے وقوف ... “ میں نے سونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کرس نے بھی سر ہلا کر میری تائید کی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ ڈینی کی تیوری چڑھ گئی لیکن میں اور کرس اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ڈینی کے چہرے کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بدلتی جارہی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہورہا ہے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ کوئی چلانے کی حماقت نہ کر بیٹھے۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

”مجھے بھی سنکلر کی طرف سے ایسا ہی پیغام ملا ہے۔ تم چاہو تو اسے پڑھ سکتے ہو۔“ میں نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمیں آپس میں لڑوانا چاہ رہا ہے۔“

ڈینی کی آنکھیں مزید چھوٹی ہوگئیں اور پستول کے ٹریگر پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہوگئی۔

”کم آن ڈینی۔“ کرس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں مت مارو۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔“

”دو... دوست۔“ ڈینی ایک بار پھر ہکلایا۔ ”تم نے ہمیشہ میرے ساتھ برا سلوک کیا۔ اب موت کو سامنے دیکھ کر تمہیں دوستی یاد آرہی ہے۔“

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈینی نے نوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کتنے ہیں؟“

”بہت زیادہ۔“ میں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رقم ہم لوگوں کو یہاں سے لے جانے کے لیے کافی ہے۔“

ڈینی میز کے پاس جاکر رک گیا۔ ”لفافہ کہاں ہے؟“

”ڈسٹ بن میں۔“ کرس نے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جان بوجھ کر اس چابی کا کوئی ذکر نہیں کیا جو نوٹوں سے چند انچ کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔

ڈینی نے کچن کی طرف رخ کیا۔ وہ آگے بڑھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔

”اپنی تمام چیزیں میز پر رکھ دو۔“ اس نے اپنے پستول کا رخ میری کمر کے گرد بندھی پیٹی کی جانب کیا۔ ”اور لفافہ لے کر آؤ۔“

یہ تو میں جان گیا تھا کہ وہ لفافہ سنکلر کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اسی لیے وہ اس کے عوض تمام رقم چھوڑنے کے لیے تیار تھا لیکن ڈینی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس لفافے کی اہمیت چابی کی وجہ سے تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس طرح کے پیغام بھیج کر وہ صرف ہم دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف کرنا چاہتا ہے۔“

”نہیں ...“ ڈینی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ مجھے اپنے گیسٹ ہاؤس پر کل وقتی ملازمت بھی دے گا۔“

سنکلر بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے ڈینی کو وہی پیشکش کی جس کی اسے ضرورت تھی یعنی مستقل ملازمت۔ اب میں ڈینی کو کس طرح سمجھاتا کہ سنکلر جیسے لوگوں کی باتوں پر یقین کرلینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ میرا فون ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ یہ پیغام بھی پہلے والے نمبر سے ہی آیا تھا۔

کرس سمجھ گئی کہ اس پیغام کی عبارت بھی پہلے سے مختلف نہیں ہوگی۔ اس نے ڈینی سے کہا۔ ”اب تو تمہیں یقین ہوجانا چاہیے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”شٹ اپ۔“ ڈینی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کے فون کی گھنٹی بھی بجی۔ کوئی پیغام آیا تھا۔ اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے پستول چھین لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کرس دروازے کی طرف بھاگی اور اسے زور سے بند کردیا۔ اس کا فون بھی بج اٹھا۔ کوئی کال آرہی تھی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور بولی۔ ”میرے کزن کا

فون ہے۔“

ڈینی نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں اور وہ مجھے اس وقت بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔

”تم نے فون کیوں کیا ہے؟“ کرس نے اپنے کزن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ہم دو دن بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہمیں اپنی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

”تم نے اسے کیا بتایا ہے؟“ کرس نے کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے مجھے دیکھا۔ ”جانتی ہوں کہ ایک بلوٹارچ کیا کام کرسکتی ہے۔ ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟“

میں نے اس کے کزن کے جواب کا انتظار کیے بغیر رقم تھیلے میں ڈالنا شروع کردی اور وہ چابی بھی قبضے میں کرلی۔

کرس بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سنکلر کو معلوم ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔“

ڈینی بُری طرح پریشان ہوگیا۔ لگتا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کرس نے سگریٹ سلگایا اور اس کا ایک کش لیتے ہوئے بولی۔ ”اب ہم کیا کریں؟“

”اسے رقم کی پروا نہیں ہے۔ کم از کم اس کے پیغام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ صرف لفافے کا طلب گار ہے۔“

کرس نے سر ہلاتے ہوئے چابی کی جانب اشارہ کیا جو میرے ہاتھ میں تھی۔ ”اسے چابی سمیت لفافہ چاہیے کیونکہ یہ اسی لفافے میں تھی۔“

باہر سے کسی کار کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

”پھر ہم اسے یہ چابی بھی دے دیں گے۔“ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سنکلر...... ایک پرانے ماڈل کی شیوی پک اپ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم طویل قامت شخص تھا اور اس کا وزن کسی طرح بھی تین سو پاؤنڈز سے کم نہیں تھا۔

میں نے ڈینی کا پستول کرس کے حوالے کیا اور اسے وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی۔ رقم کا تھیلا میز پر ہی رکھا ہوا تھا۔

”م... م... میں کیا کروں؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو۔“ میں نے اسے دروازے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔

باہر نکل کر میں نے پلکیں جھپکائیں۔ میری جیب میں چابی اور ایک ہاتھ میں گن تھی۔ سنکلر اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور طویل قامت شخص بھی تھا جو ٹرک کی دوسری جانب

بھوک اور افلاس

”بھوک، گھاس، گوشت، بکری، کارخانہ، قبر، موت، شاید میں اسی بہانے اپنے ادب میں ابدیت اور ادبیت میں ابد ڈھونڈتا ہوں۔ عورت کیا ہے؟ مرد کیوں ہے؟ بکری کہاں ہے؟ دشتِ مجنوں کدھر ہے؟ شبِ فراق کیسے کٹی؟ میں بھوکا ہوں... نہیں... نہیں... بھوک کی بات مت کرو، تیسرے درجے کا ادب مت پیدا کرو۔ تم انسان ہو۔ ارے بھوکا تو کتا بھی رہتا ہے، پھر انسان اور کتے میں کیا فرق ہوا؟ اس لیے بھوک کی بات مت کرو، افلاس کی بات مت کرو، غریبی کا ذکر مت کرو۔ یہ سب گندی اور رذیل باتیں ہیں۔ ان سے ڈرائنگ روم کی فضا گندی ہوتی ہے۔“

کرشن چندر کے الفاظ صوابی سے گل زور کی محنت

کھڑا تھا۔ سنکلر نے ہمیں آتے دیکھا لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ البتہ اس کے جبڑے یوں ہل رہے تھے جیسے وہ تمباکو چبا رہا ہو۔ ٹرک کی چھت پر ایک بلوٹارچ رکھی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارا کزن ہے۔“ میں نے اس سے چند فٹ کے فاصلے پر رک کر کہا۔ ڈینی میرے عقب میں تھا۔ اس لیے اس پر سنکلر کی براہ راست نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

”میں تمہاری اوقات سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ سنکلر نے تمباکو کی پیک زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے باپ کا خیال تھا کہ اس نے تمہیں پیدا کرکے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔“

”میں تمہارے کسی گیم کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ میں نے اپنے پستول کی نال نیچے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ مجھے دے دو۔“ اس نے اپنا موٹا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”اور وہ ساری رقم بھی جو تم نے وہاں سے لوٹی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اتنی بڑی رقم تمہارے حوالے کردوں گا؟“

میں نے اس کی جانب چابی اچھالی اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے چابی پکڑتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گرمی کے باوجود میرا پورا جسم سرد ہورہا تھا۔

”ہے ڈینی!“ وہ میرے کندھے کے پار جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے ساتھ کیا مجھے لیے پھر رہے ہو؟“

http://pakfunplace.blogspot.com

ڈینی ہلکے سے کراہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ وہی چابی ہے جو تمہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

"تم بھی ڈینی ہی کی طرح احمق ہو۔" سنکلر اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایسی کوئی پرانی چابی نہیں چاہیے۔"

ڈینی اس کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔ "تمہیں لفافہ چاہیے؟ وہ اندر ہے۔"

"امید ہے کہ تم وہ لفافہ مجھے دے دو گے۔" سنکلر نے بلوٹارچ اٹھائی اور ٹریلر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "چلو۔"

☆☆☆

ہم اندر پہنچے تو وہاں لفافہ نہیں تھا۔ کرس بھی رقم سمیت غائب ہو چکی تھی۔ ٹریلر کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے شیڈ صاف نظر آ رہا تھا۔ سنکلر نے میری گن لے لی اور ہم دونوں پر اپنی نگاہ جما دی جبکہ اس کا بھاری بھرکم باڈی گارڈ کرس کی تلاش میں نکل گیا۔ چند منٹوں بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"شروع ہو جاؤ۔" سنکلر نے بلوٹارچ کا رخ ہماری طرف کر دیا اور اس کی نال سے ایک نیلے رنگ کا شعلہ نکلا۔

"کرس!" میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم اسے یہیں چھوڑ کر گئے تھے لیکن وہ کیش اور لفافہ لے کر بھاگ گئی۔"

"اچھا مذاق ہے۔" اس نے بلوٹارچ کا شعلہ بجھا دیا۔ "تم دونوں میں سے کون پہلے اوپر جانا چاہے گا؟"

"کرس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔" ڈینی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

واقعی اس نے ہمیں بہت اچھی طرح بے وقوف بنایا تھا۔ وہ جائے واردات پر دیر سے پہنچی اور ہمیں دیکھ کر چلانا شروع کر دیا تاکہ کسی طرح بھی اس ڈاکے سے اس کا تعلق ثابت نہ ہو۔ اس نے ہمارے لیے پھنسنے کی جگہ فراہم کی اور خود اپنے فرار کے لیے پہلے سے شیڈ میں ایک کار چھپا دی۔ اس نے مجھے باور کرایا کہ لفافہ نہیں بلکہ چابی اہم ہے اور خود لفافہ لے کر فرار ہو گئی۔

"وہ کہاں جا سکتی ہے؟" سنکلر میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کے ایک ہاتھ میں میری گن اور دوسرے ہاتھ میں بلوٹارچ تھی۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں گئی ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" اس نے ٹارچ کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ مجھے واقعی اس لفافے کی ضرورت ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں صرف بلوٹارچ سے نکلنے والے شعلے کو دیکھ رہا تھا اور جب اس نے گن میری طرف اچھالی تب بھی میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے ہتھیار پکڑ لیا اب میری نظریں سنکلر اور اس کے محافظ پر جم گئی تھیں۔

باڈی گارڈ نے بھی اپنا پستول نکال لیا تھا لیکن اس کا رخ میری جانب نہیں تھا۔

"تم وہ لفافہ واپس حاصل کرو گے۔" سنکلر نے گویا مجھے حکم دیا۔ میں نے جواب میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"اگر تم ایسا نہیں کرتے..." اس نے اپنی ٹارچ اوپر کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں تمہارے پیروں سے شروع کروں گا اور..."

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن پیغام واضح تھا۔ میں نے اپنی گن کو دیکھا۔ کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال نہ ہو۔ میں نے اس کا میگزین چیک کیا۔ اس میں ابھی دو راؤنڈز موجود تھے۔

سنکلر جانتا تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وہ مجھے ایک احمق انسان سمجھ رہا تھا جس کی کوئی اوقات نہیں تھی اور جسے اس نے زندہ رہنے کا ایک موقع دیا تھا۔ اپنے کیے کی تلافی کرنے کا ایک مبہم سا موقع ملا تھا۔ میرا سارا جسم مچل رہا تھا اور میں پسینے میں شرابور تھا۔ وہ ایسے مسکرایا جیسے تل تین ناٹ کا کتا ہوں۔

اس کے چہرے سے وہ اعتماد جھلک رہا تھا جو کسی کمتر درجے کے انسان سے معاملہ طے کرنے کے بعد آتا ہے۔ میں نے گن مضبوطی سے پکڑ لی اور اسے اوپر کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔" سنکلر اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ چل بھی سکتی ہے۔"

میں نے اپنی گن نیچے کر لی۔ "میں جو بات کہہ رہا ہوں اگر تم اس کا مطلب نہیں سمجھے تو میں ڈینی پر اس کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔" اس نے ڈینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈینی اس کی بات سنتے ہی دروازے کی طرف بھاگا۔ محافظ نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اب اس کا پستول والا ہاتھ میرے سامنے تھا۔ ڈینی بُری طرح چلا رہا تھا۔

"تمہیں اس سے بچھڑنے کا افسوس تو ہو گا۔" سنکلر میرے دوست کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ بلوٹارچ تیار تھی۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں تو اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا؟"

میں ہچکچایا۔ سانس حلق میں ہی اٹک گئی۔ پھر میں نے سر

ہلایا اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد کی بات ہے... دن کی اجلی روشنی کے باوجود مجھے ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا لگ رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ میرا دماغ بھی مسلسل اندھیرے کی لپیٹ میں تھا۔ میری تھکن اتنی بڑھ چکی تھی کہ گہری نیند تو کیا شاید مرنے کے بعد بھی وہ دور نہ ہوتی لیکن میرے پاس ایک مقصد تھا اور میرے لیے وہی سب سے اہم تھا۔ مجھے کرس کو تلاش کرنا تھا۔

میں ایک موٹیل کے باہر کھڑا تھا جو پورٹ سے ایک بلاک کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی بیرونی دیواروں کا رنگ اتر چکا تھا اور کھڑکیاں بھی زنگ آلود تھیں۔ پارکنگ ایریا میں دو پرانی کاریں کھڑی تھیں۔ ایک مدھم سے نیون سائن پر "ویکنسی" کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ یہ دسمبر کا آغاز تھا اور موٹیل میں ایک کے سوا سبھی کمرے خالی تھے کیونکہ ایک مہینا پہلے سیزن ختم ہو چکا تھا اور سبھی سیاح شہر سے جا چکے تھے۔

میں نے شارٹ گن مضبوطی سے پکڑی اور دروازے پر زور سے لات ماری۔ اندھیرے کمرے میں سورج کی روشنی داخل ہوئی اور ایک عورت کی چیخ سنائی دی جس نے فوراً ہی بستر کی چادر کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ میں کرس تک پہنچ چکا تھا۔ میز کے ساتھ ہی ایک چیئر پر ایک چالیس سالہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ مکمل آرام کرنے کے موڈ میں تھا۔ شاید اسی لیے میری مداخلت پر اس نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

"میری رقم کہاں ہے؟" میں نے پستول کی نال اس کی ٹانگ میں چبھوتے ہوئے کہا۔

اس نے چلانا شروع کر دیا۔ وہ بے ربط باتیں کر رہی تھی اور اس کا کہا ہوا کوئی لفظ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چیخنے چلانے اور رونے کی کوئی پروا نہیں کی اور اس کی ٹانگ پر گن کی نال کا دباؤ بڑھا دیا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی حرکت نہیں کی۔ لگتا تھا کہ وہ سانس لینا ہی بھول گیا ہو۔

"خدا کے واسطے مجھے مت مارو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"رقم اور لفافہ کہاں ہے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

وہ بستر سے اتری۔ چادر کو اس نے مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی جانب تھا۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا۔" میں نے گن کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے بیگ میں سے لفافہ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا، وہ خالی تھا۔

"رقم کہاں ہے؟"

اس نے میز پر رکھے پرس کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ خالی تھا البتہ اس میں ایک کارڈ رکھا ہوا تھا جس پر جوئیل میکنٹوش، پیرول آفیسر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کارڈ کو دیکھ کر سارا قصہ میری سمجھ میں آ گیا۔

"اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ٹیکساس سے نکل کر کیلی فورنیا میں اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"کیا تم نے ساری رقم اس کے حوالے کر دی تھی؟" اس احمقانہ سوال پر مجھے خود بھی ندامت ہوئی لیکن یہ جملہ میری زبان سے ادا ہو چکا تھا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ رقم ہوا کے مانند اڑ جائے گی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر لفافے پر نظر ڈالی۔ مجھے یاد آیا کہ سنکلر کے لیے یہ لفافہ پیسوں سے بھی زیادہ اہم تھا لیکن وہ بات اب پرانی ہو چکی تھی۔ اس لفافے پر اٹلانٹا کے ایک بینک کا نام، ایک فون نمبر اور کچھ دوسرے نشانات بنے

خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
اسلام آباد اکیڈمی
1237

http://pakistanipoint.com

ہوئے تھے۔

"پلیز! مجھے مت مارو۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" میں نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم نے مجھے یہ صلہ دیا ہے؟"

"میں وہاں سے نکلنا چاہتی تھی اسی لیے مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔" اس نے ایک کمزور سی دلیل دی۔

"چلو تم نے کم از کم سمندر تو دیکھ لیا۔" میں نے ایک آنکھ بند کر کے اس کے چہرے کا نشانہ لیا۔

"میں اس لفافے کے ذریعے بھی گھر واپس جا سکتی تھی۔ اب میرے پاس یہی بچا ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا اور میرا سارا غصہ کافور بن کر اڑ گیا۔ کرس کو سبق سکھانے اور اذیت دینے کا اس سے اچھا طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے مار کر مجھے کیا ملتا۔ سوائے اس کے کہ ایک قتل میرے کھاتے میں لکھ دیا جاتا جس کا ایک عینی شاہد بھی اس کمرے میں موجود تھا۔

"مجھے ڈینی کا بہت افسوس ہے۔" اس نے مجھے ٹھنڈا کرنے کے لیے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن سنگر نے مجھے بتایا تھا کہ لوگوں کو اوقات پر رکھنے کے لیے ایسی مثال قائم کرنا ضروری ہے۔"

"تمہیں زیب نہیں دیتا کہ ڈینی کا نام اپنی زبان پر لاؤ۔ کاش وہ ڈینی کے بجائے تمہیں نشانِ عبرت بنا دیتا۔" یہ کہہ کر میں نے گن جیب میں رکھی اور میز پر پڑا ہوا لائٹر اٹھا لیا۔

"میں اور تم یہ لفافہ سنگر کو دے کر اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔" اس نے ایک ادا سے کہا۔

میں بچہ نہیں تھا جو اس کی باتوں میں آ جاتا۔ جو عورت کسی کی نہ ہوئی وہ میری کیا ہوتی۔ وہ ابھی تک اسی غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ یہ لفافہ اس کی سلامتی کا ضامن ہے اور اس کے ہوتے ہوئے میں اور سنگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے لائٹر جلایا اور اس کا شعلہ لفافے کے کونے پر رکھ دیا۔

"نہیں۔" وہ زور سے چلائی اور لفافہ جھپٹنے کے لیے میری جانب لپکی...... میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور اس وقت تک لفافے کو پکڑے رہا جب تک وہ جل کر راکھ نہیں ہو گیا۔

"اب ذرا کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔

میری کار موٹیل سے دو بلاک کے فاصلے پر سمندر کی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں پیدل چلتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ ساحل پر سناٹا تھا اور اکا دکا لوگ وہاں ٹہل رہے تھے۔ ڈینی کار کی چھت پر بیٹھا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"کیا وہ تمہیں مل گئی؟" اس نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے کرس کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی تاہم اس کے سوال کے جواب میں اتنا ہی کہہ سکا کہ شاید ہم کیلی فورنیا چلے جائیں۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو زندگی میں ایک موقع ضرور ملتا ہے۔ ایسا ہی ایک موقع اس روز مجھے بھی مل گیا تھا جب سنگر نے مجھے میری اوقات یاد دلائی اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

جی ہاں، سنگر مر چکا تھا اور اس حقیقت سے صرف میں اور ڈینی ہی واقف تھے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ ہر رات میرے خوابوں میں اس کی وہ تصویر ابھرتی ہے جب میں نے اسے اس کے محافظ سمیت گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت کی پرچھائیاں ابھریں اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں کیسے اپنے دوست ڈینی کو بلوٹارچ کا نشانہ بنتے دیکھ سکتا تھا؟ اس سے پہلے کہ سنگر کی بلوٹارچ سے نکلنے والے خوفناک شعلے میرے دوست ڈینی کو سر سے پیر تک جھلسا کر موت کے گھاٹ اتارتے، میں نے اپنے پستول کے میگزین میں موجود دونوں راؤنڈز نہایت پھرتی سے استعمال کر ڈالے۔ یہ میرے یا ڈینی کے مقدر کی یاوری تھی کہ دونوں فائر نشانے پر لگے۔ سنگر اور اس کا محافظ جہنم واصل ہو گئے۔

"ہاں، یہ اچھا خیال ہے۔" ڈینی کیلی فورنیا جانے کا سن کر خوش ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد ہم ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ میں نے مغرب کی طرف جانے والے راستے کو نظر انداز کر کے گاڑی کا رخ سینٹرل ٹیکساس کی جانب موڑ دیا جہاں ہم پیدا ہوئے اور ہمیں وہیں مرنا تھا۔

قبروں کا چور

سیریسا رامش

منفی اندازِ فکر اور زیادہ سے زیادہ اپنے فائدے کا سوچنے والے افراد اپنے لیے ایسی راہیں ڈھونڈ ہی لیتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا... ایک ایسے ہی شخص کی روداد جس نے اپنی لالچی طبیعت کے لیے قبرستان کا رخ کر لیا تھا

ویرانوں میں بسیرا کر لینے والے مردوں کے گرد گھومتی پراسرار کہانی - مغرب سے درآمد تازہ سوغات

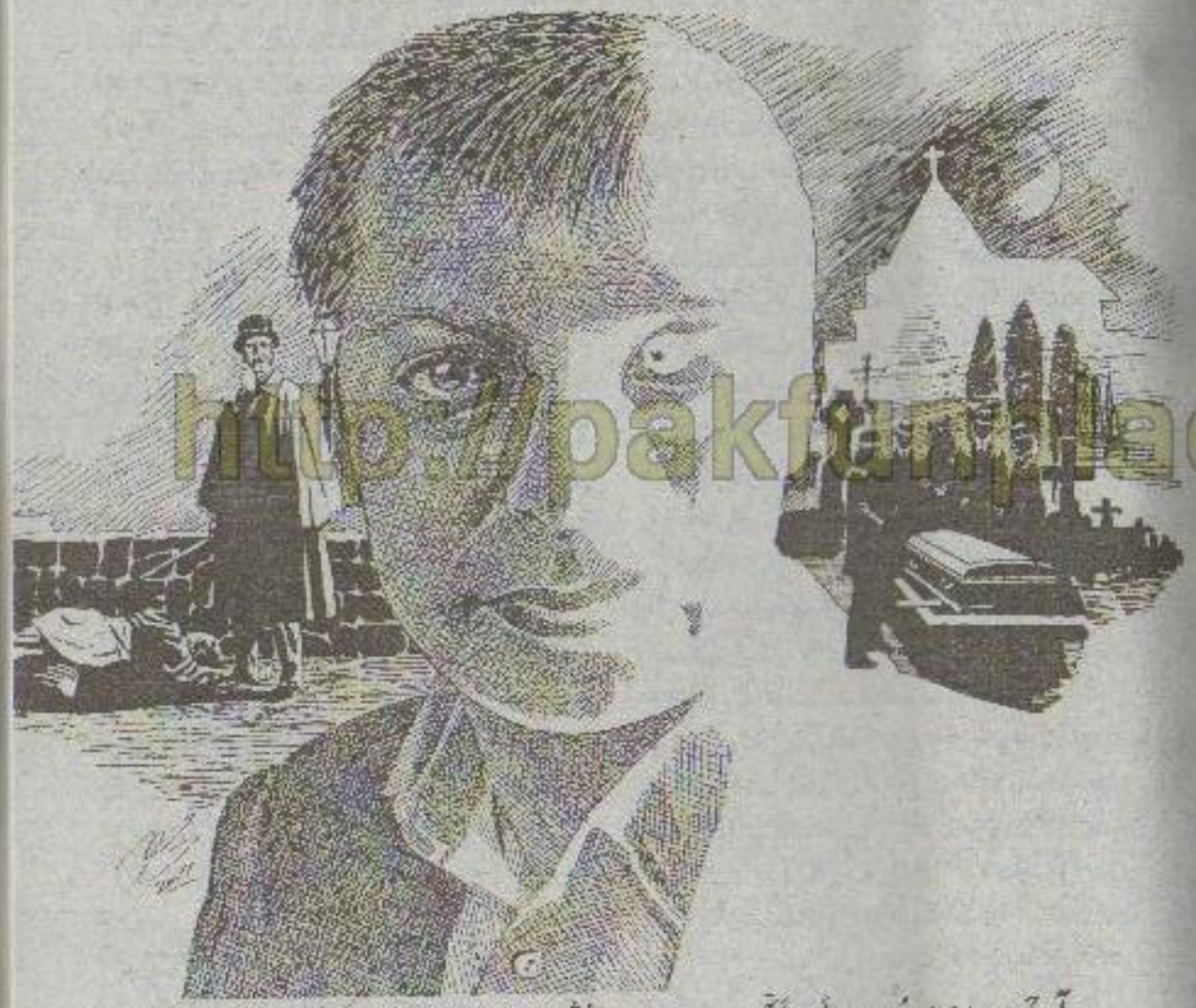

http://pakfunplace.blogspot.com

آج پورے چرچ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پچھلی رات برادر کی موت ہوئی تھی۔ چرچ مشنری کا اہم رکن ہونے کے سبب اس کی میت سب سے مقدس کمرے میں لے جائی گئی جہاں مشنری سے وابستہ تمام لوگ پہنچ چکے تھے۔ وہ کمرا اتنا مقدس تصور کیا جاتا ہے کہ وہاں پر جوتے پہن کر کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے پتھر سے بنے صحن کے فرش پر راہبوں اور راہباؤں کی جوتیاں، جوتے رکھے ہوئے تھے۔ چرچ بالکل سنسان تھا۔ تمام لوگ مقدس کمرے میں تھے، جہاں برادر کی میت والا تابوت رکھا گیا تھا اور سب لوگ ...... خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے جمع تھے۔

برادر کی موت سب کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی۔ تمام لوگ کمرے میں تابوت کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے

تھے۔ کمرے کے اندر خاموشی طاری تھی۔ ماحول نہایت افسردہ تھا، سب کے دل رو رہے تھے لیکن کوئی بھی شخص رو نہیں رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی رو رہا ہو مگر سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور کسی کی نم آنکھیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہا تھا، سب کی نظریں فرش کو تکے جارہی تھیں۔ ویسے اگر برادر کی یاد میں کوئی رو بھی رہا تھا تو اس کی آہوں، سسکیوں یا ہچکیوں کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اتنی خاموشی طاری تھی کہ باہر چلتی ہوا کی ہلکی سی سنسناہٹ بھی اندر کمرے میں سنی جاسکتی تھی۔

کافی دیر تک تمام راہب اور راہبائیں سر جھکائے اسے خراج تحسین پیش کرتے رہے۔ کافی وقت یونہی گزر گیا... پھر ادھیڑ عمر کا پادری برادر لیو زور سے کھنکھارا جس پر سر جھکا کر سوگوار کھڑے سارے لوگ گردن اٹھا کر اسے خاموش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ دکھ کا مقام ہے لیکن اگر ہمیں تابوت کاندھا دینے کا موقع ملے اور اس میں لیٹے ہمارے ساتھی کو گویائی کی طاقت... تو وہ خود کہہ دے گا کہ یہ اس کے لیے خوشی کا مقام ہے۔ وہ جنت کے دروازے پر کھڑا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی جدائی کا ہمیں دکھ ہے لیکن جنت میں داخل ہونے پر اسے جو خوشی حاصل ہوئی ہے، اس پر ہم سب بھی بہت خوش ہیں۔ لیکن ہم انسان ہیں اور وہ اب ایک روح... وہ ہمیں دیکھ سکتا ہے لیکن ہم نہیں۔ ہمیں بس اب اپنے ساتھی کو پھر کبھی نہ دیکھ پانے کا دکھ افسردہ کیے ہوئے ہے۔"

جس وقت کمرے میں یہ سوگوار تقریب ہو رہی تھی، اس وقت ایبٹ جان اپنے مزدوروں کے ساتھ قبرستان میں کھڑا ہوا مرمت کا کام کروا رہا تھا۔ یہ قبرستان پہاڑی چوٹی پر بنے چرچ کے نیچے واقع تھا جہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے چند سیڑھیاں اترنا پڑتیں۔ یہ سیڑھیاں بھی پہاڑی کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے کمرے سے تابوت کو باہر لاتے ہوئے دیکھا۔ چھ نوجوان راہب تابوت کو اٹھائے ہوئے صحن تک پہنچ گئے تھے۔ اب تابوت کو سیڑھیوں سے اتار کر نیچے واقع اس ہموار قطعۂ زمین تک لانا تھا جہاں... نہایت دلکش فرش بنا ہوا ہے۔ اس جگہ پر آخری دعا ہوتی، اس کے بعد تابوت کو سپرد خاک کردیا جاتا تھا۔

ایبٹ جان نے تابوت کو کمرے سے باہر آتا دیکھا تو اپنے مزدوروں کو کام روک کر ایک طرف ہٹنے کے لیے کہا۔ وہ خود بھی ایک طرف ہو کر کھڑا ہوگیا تاکہ تابوت اٹھا کر چلنے والوں کو راستہ کھلا مل جائے۔ یہ جگہ کافی تنگ تھی اس لیے اس نے مزدوروں کو کام سے روک دیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تابوت تھام کر چلنے والے راہب تنگ سیڑھیاں طے کر کے تابوت کو اس فرش تک لے آئے جہاں بنے چبوترے پر اسے رکھ کر آخری دعا کی جانی تھی۔ راہبوں نے تابوت کو سرخ رنگ کے ٹائلوں سے مزین نہایت دیدہ زیب فرش والے چبوترے پر رکھ دیا۔

☆☆☆

چرچ کے برابر واقع پرانے قبرستان میں گزشتہ کئی سو سالوں کی بارشوں کے سبب پہاڑی ڈھلوان کو کاٹ کر بنائے گئے قبرستان کی حالت اتنی مخدوش ہوچکی تھی کہ قبروں کی مٹی لگ بھگ بہہ چکی تھی اور قبروں سے تابوت جھانکنے لگے تھے اس لیے چرچ نے فیصلہ کیا تھا کہ پرانے قبرستان کے لیے نیچے، وادی کی طرف جانے والے راستے کی جانب زمین ہموار کی جائے اور ان مُردوں کو نئے بنائے گئے قبرستان میں منتقل کردیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت زیر استعمال قبرستان میں بھی تدفین کی گنجائش تقریباً پوری ہوچکی تھی جس کے باعث قبرستان میں مردے دفنانے کے لیے جگہ تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ اسی لیے جان ایبٹ کو ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ چرچ کی تزئین و آرائش اور مرمت کے کام کو جہاں سے وہیں چھوڑ دے اور نئے قبرستان کے لیے جگہ ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ زیر استعمال قبرستان میں بھی توسیع کی کوشش کرے۔

یہ قدیم چرچ جنوبی ایریزونا کے اس پہاڑی علاقے میں واقع ہے، جہاں پہلے ہی زمین کی سخت قلت ہے۔ چرچ بھی ایک تنگ پہاڑی ڈھلوان پر بنا ہوا تھا وہاں سے کچھ سیڑھیاں نیچے اترنے کے بعد ارد گرد کی پہاڑیوں کو کاٹ کر قطعۂ زمین ہموار کیا گیا تھا جس پر نیا قبرستان واقع ہے۔ مگر اب اس قبرستان کی گنجائش تقریباً پوری ہوچکی تھی۔ ویسے یہ نیا قبرستان بھی لگ بھگ سو برس پرانا تھا۔ جب چرچ انتظامیہ نے ایبٹ جان کو حکم دیا تو اس نے پہاڑی ڈھلوانوں اور چٹانوں کی تراش خراش کر کے مزید قبروں کی گنجائش پیدا کرنے کا کام شروع کردیا۔ وہ کئی ہفتوں سے یہاں کام کروا رہا تھا۔ گزشتہ چند مہینوں کے دوران علاقے میں متعدد اموات ہوئی تھیں جس کے باعث رہی سہی گنجائش بھی تقریباً پوری ہوچکی تھی۔ اس لیے ایبٹ جان کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ نئے قبرستان میں توسیع کا معاملہ جلد از جلد نمٹایا جائے مگر مشکل یہ تھی کہ اس تنگ علاقے میں پہاڑیوں کو کاٹ کے بنا زمین کو ہموار کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ اگر انہیں مشینوں کی مدد حاصل ہوتی تو

یہ کام بہ آسانی مکمل ہوجاتا مگر اس تنگ ڈھلوانوں والے پہاڑی علاقے کے اس مقام پر بھاری مشینری پہنچانا ناممکن تھا۔ اس لیے اب وہ روایتی طور پر ڈائنامیٹ اور کدالوں کی مدد سے یہ کام کروا رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے عملے کے ساتھ کام میں مصروف تھا، جب راہب تابوت لے کر عبادت گاہ کی سیڑھیاں اتر کر اس طرف آرہے تھے۔ جب سے ایبٹ جان یہاں کام کر رہا تھا، مُردوں کی تدفین معمول بن چکی تھی... مگر اس بار بات ذرا مختلف تھی۔ برادر لوک کی موت ہوگئی تھی اور اب اس کی میت قبرستان پہنچائی جاچکی تھی۔

☆☆☆

اس وقت تابوت چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ آخری دعا ہونے والی تھی۔ جنازے کے ساتھ آنے والے تمام راہب اور راہبائیں تابوت کے گرد جمع تھے۔ جیسے ہی دعا ختم ہوئی، تمام لوگ تھوڑے فاصلے پر ہو کر خاموش کھڑے ہوگئے۔ صرف برادر لیو تابوت کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چرچ کی حدود میں واقع اس نہایت دیدہ زیب فرش کو دیکھے جارہا تھا جس پر سرخ، سنہری اور کہیں کہیں پر نارنجی رنگ کے ٹائلز کی مدد سے ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ ایبٹ جان گزشتہ کئی سالوں سے اس قدیم چرچ کی بحالی، مرمت اور تکمیل نو کے کاموں سے منسلک تھا۔ برادر لیو اس فرش کو بغور دیکھے جارہا تھا، اس کی بھی از سر نو تزئین و آرائش ایبٹ نے ہی کی تھی۔ وہ برادر لیو کی نظروں کو پہچانتا تھا۔ دوسروں کا تو پتا نہیں کہ وہ اس وقت برادر لیو کے اس انہماک کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ برادر اس وقت فرش پر غور کر رہا ہے۔ جو ٹائل فرش پر لگائے گئے تھے، ان کا ڈیزائن برادر لیو کو پہلے بہت پسند آیا تھا، اس لیے یہ ٹائل یہاں لگائے تھے۔ دو سال قبل جب اس فرش کی تزئین نو کی جارہی تھی تو اس نے ایبٹ کو ہدایت کی تھی کہ تزئین کے دوران اس فرش کے قدیم اور اصل ڈیزائن کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ مرمت کے دوران اصل فرش اور اس کا قدیم ڈیزائن غائب ہوجائے۔

برادر لیو دو روز پہلے ہی یہاں پہنچا تھا اور جس طرح فرش کو گھورے جارہا تھا، ایبٹ جان سمجھ گیا کہ وہ اسے پسندیدہ نگاہوں سے تو کم از کم نہیں دیکھ رہا۔ کچھ دیر بعد برادر لیو نے فرش پر سے نظریں اٹھائیں، سینے پر کراس کا نشان بنایا اور میت کو قبر میں اتارنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

سورج پوری طرح نکل چکا تھا۔ یہ موسم سرما کا آغاز تھا۔ ایبٹ جان کا کمرا چرچ کی دوسری منزل پر تھا۔ اس نے ناشتا ختم کر کے کھڑکی کھولی تو سامنے برادر لیو بالی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مالی کو پودوں سے متعلق ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس وقت وہ لیمو کی جھاڑی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ایبٹ کو لیمو پانی سخت ناپسند تھا جبکہ برادر لیو کا وہ پسندیدہ مشروب تھا۔ وہ برادر لیو اور لیمو پانی دونوں سے ایک جیسی نفرت کرتا تھا۔ برادر کو لیمو کی جھاڑی کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ کیا برادر بھی اس سے اتنی ہی زیادہ نفرت کرتا ہے جتنی کہ میں اس سے۔ برادر لیو کچھ دیر تک پھول دار پودوں اور سبزیوں کی کیاری کا جائزہ لینے کے بعد واپس عمارت کی طرف پلٹ گیا۔ ایبٹ جان اب بھی کھڑکی میں کھڑا... اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے وہ واقعہ یاد آگیا۔

یہ لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ اس دن برادر لیو نیچے وادی سے واپس چرچ کو لوٹ رہا تھا جب پرانے قبرستان سے گزرتے ہوئے ایک جنونی نے اس پر حملہ کردیا۔ اس نے کو بہت مارا پیٹا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت چند راہب وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے مداخلت کی تو وہ شخص بھاگ گیا۔ یوں لیمو کی جان بخشی ہوئی۔ لیمو کا کہنا تھا کہ وہ شخص قبری بے حرمتی کر رہا تھا، وہ زمین سے باہر کی طرف ابھرے ہوئے ایک تابوت کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں برادر لیو پہنچ گیا۔ اس نے جب اسے روکنا چاہا اور سرزنش کی تو وہ الٹا اس پر ہی پل پڑا۔

ایبٹ کو جب اس واقعے کی خبر ملی تو اس نے کہا۔ "پرانا قبرستان تو بہت خطرناک ہے پھر یہ کیسے زندہ بچ گئے؟"

اس وقت برادر جان وہاں موجود تھا۔ وہ بھی برادر لیو سے نالاں تھا لیکن ایبٹ کی بات سن کر اس نے کہا۔ "اپنی خیر چاہتے ہو تو اس کا ہر حکم خوشی خوشی بجا لایا کرو۔ آخر کو وہ یہاں کا ذمے دار اور چرچ میں اوپر تک پہنچ رکھنے والا آدمی ہے۔"

"میرا بس چلے تو پرانے قبرستان میں ہی اسے گاڑ دوں۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے ان مہلک خیالات کو پرانے قبرستان میں گاڑ دو۔" ایبٹ کی بات سن کر برادر جان نے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور اسے نصیحت کی۔ ہر چند کہ برادر لیو اسے بھی ناپسند تھا مگر وہ خون خرابے سے دور رہنے والا شخص تھا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ ایبٹ فطرتاً نرم خو اور بے ضرر انسان ہے لیکن پھر بھی اسے خون خرابے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے ایبٹ کو نصیحت کی تو وہ ہنس پڑا۔

http://pakistanipoint.blogspot.com

جب پرانے قبرستان میں برادر لیو پر جوتی نے قاتلانہ حملہ کیا تو چرچ نے اس کو یہاں سے واپس بلوالیا لیکن اب لگ بھگ ڈیڑھ سال کے بعد وہ دوبارہ یہاں واپس آگیا تھا۔ جب اس کی واپسی کی اطلاع ملی تب ہی چرچ میں ہدایت جاری کردی گئی تھی کہ ان کی حفاظت کا خاص خیال رکھا جائے اور اگر کوئی شخص کسی بھی اجنبی کو یہاں دیکھے تو فوراً مجھے کو اطلاع کردے۔

ایبٹ جان کھڑکی میں کھڑا ہوا برادر لیو کو واپس عمارت کی طرف آتا ہوا دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک اجنبی شخص اس کے پیچھے واقع سبز جھاڑیوں سے نمودار ہوا۔ لاکھ نفرت کے باوجود ایبٹ کا ہاتھ فوراً الارم کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں اس اجنبی نے زور سے پکارا ''برادر لیو۔'' وہ پیچھے مڑا تو اجنبی نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ برادر لیو نے بھی رک کر اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھوڑا آگے آیا تو ایبٹ نے بھی اسے پہچان لیا۔ وہ عمارتیں منہدم کرنے والی کمپنی ناکسون کا مالک والکر تھا۔ پرانے قبرستان سے تابوتوں کی منتقلی کا کام اسے ہی ملا ہوا تھا اور وہ گزشتہ کئی ہفتوں سے یہاں کام کررہا تھا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ کو ایک بار پھر یہاں دیکھ کر۔'' والکر نے برادر کے پاس پہنچ کر خوشی کے مارے اپنی پوری بتیسی کھول دی اور مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مصافحے کے بعد [illegible] اتارا اور اس میں سے ایک کتاب نکال کر برادر کو پیش کی۔

''راجر ٹرائے پیٹرسن کی کتاب کا نیا ایڈیشن۔ میں نے اور بھی کئی کتابیں دیکھی ہیں لیکن پرندوں کے بارے میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔'' برادر نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''بہت اچھی کتاب ہے۔'' برادر نے کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔

''آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔''

''شکریہ۔ کیا اس کتاب کی ایک کاپی اور مل سکے گی؟ میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب چرچ کی لائبریری میں بھی ہو۔'' برادر لیو پھولوں اور پرندوں کا بہت شوقین تھا اس لیے اسے یہ کتاب بہت پسند آئی۔

''لے آؤں گا۔'' والکر نے اپنی بتیسی کی ایک بار پھر نمائش کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''یہ اچھا ہوگا۔ اچھی کتابیں یوں بھی بہت کم ہی شائع ہوتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت بھی ہوجاتی ہیں۔ ویسے یہ کتاب تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔''

''آج کل کوئی نیا پرندہ دیکھا آپ نے یہاں؟'' والکر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ بھی پرندوں کا بہت شوقین ہے اور دونوں میں یہ قدر مشترک ہے۔ ''پرانے قبرستان تو گئے ہوں گے، وہاں کوئی نیا پرندہ نظر آیا؟''

''یہاں تو کوئی نیا پرندہ نہیں دیکھا لیکن یہ قبرستان کا ذکر کیوں کیا تم نے؟'' برادر لیو نے حیرت سے سوال کیا تو والکر گڑبڑا گیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ وہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ قبرستان میں کیڑے مکوڑے بہت ہوتے ہیں اس لیے پرندے وہاں زیادہ آتے ہیں۔ ورنہ تو کوئی خاص بات نہیں تھی میرے ذہن میں۔'' یہ سن کر برادر لیو نے نظریں اٹھائیں۔ کیاری کے پار چھوٹی سی دیوار تھی اور اس کے بعد پرانے قبرستان کی حدود شروع ہوجاتی تھی۔ برادر نے چند لمحوں کے لیے قبرستان کی طرف دیکھا اور پھر والکر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''ہاں... بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے۔'' یہ سن کر والکر کی بتیسی ایک بار پھر نمایاں ہوگئی۔

''وہ... میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ ایبٹ جان سے کہہ دیں کہ جب میرے آدمی قبرستان میں کام کررہے ہوں تو باہر کچھ لوگ کھڑے کردے، جو غیر متعلق لوگوں کو اندر نہ [illegible]

''وہ اس لیے برادر کہ جب میرے لوگ تابوت کو باہر نکال کر انہیں منتقل کرنے کا کام کررہے ہوتے ہیں تو یہ بڑا خوفناک نظارہ ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ کام کے دوران اس طرف آئیں اور تابوتوں کو دیکھ کر ڈر جائیں۔'' والکر نے سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اصل میں تو یہ تابوت ہیں بھی کئی صدیوں پرانے۔ اکثر جب ہم انہیں باہر نکالتے ہیں تو لکڑی تقریباً گل سڑ کر ختم ہوچکی ہوتی ہے... باقی صرف ڈھانچا یا ہڈیاں ہی رہ جاتی ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ سب دیکھ کر میرا بھی دل دہل جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے والکر نے جھرجھری لی۔

''اوہ... میں سمجھ گیا۔'' برادر لیو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایبٹ سے کہہ دوں گا۔''

''ویسے آپ کہاں جارہے تھے؟'' والکر نے پوچھا۔

''وہ سامنے منڈیر پر میری نوٹ بک رکھی ہوئی ہے، ذرا اسے اٹھالاؤں۔'' والکر کی بات سن کر برادر لیو نے ایسے کہا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ جھٹ سے منڈیر کی طرف لپکا اور سیاہ چمڑے کی جلد والی نوٹ بک اٹھالایا۔ یہ منڈیر چرچ

کی عمارت کو پرانے قبرستان سے جدا کرتی تھی۔

''کچھ لکھ رہے تھے آپ؟'' والکر نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں چاہتا ہوں کہ پرانے قبرستان کی تمام تر تفصیلات لکھ ڈالوں۔ ویسے بھی یہ قبرستان بہت پرانا ہے۔ اب جبکہ یہ قبرستان یہاں سے ختم کیا جارہا ہے تو بہتر ہے کہ اس بارے میں تمام تفصیلات لکھ لی جائیں تاکہ ریکارڈ رہے اور آئندہ کسی کو ضرورت محسوس ہو تو اس کے کام آسکے۔''

''تو کیا آپ صبح قبرستان گئے تھے؟'' والکر نے برادر لیو کی بات سن کر چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... ویسے بہت بری حالت ہے وہاں کی کئی قبروں سے تو تابوت نظر آرہے تھے۔''

''اسی لیے تو میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آج کل وہاں کا نظارہ بہت بھیانک ہے۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ویسے یہ کام کب تک ختم ہوجائے گا؟''

''کوشش کررہا ہوں کہ جلد اس کام کو نمٹالوں۔'' والکر نے گول مول جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ ایبٹ بھی سر توڑ کوشش کررہا ہے کہ جلد سے جلد [illegible] ہموار کرے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' والکر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب تم چلو۔ ویسے میں ایبٹ سے کہہ کر وہاں کچھ لوگ تعینات کروادیتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' والکر نے یہ سن کر برادر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور جدھر سے آیا تھا، اسی طرف واپس پلٹ گیا۔

والکر کو رخصت کرنے کے بعد برادر لیو چرچ کی عمارت کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ اندر داخل ہورہا تھا کہ برادر جوزف نظر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی برادر لیو کو کچھ یاد آیا۔ ''ذرا سنو تو سہی۔'' جوزف یہ سن کر پلٹا۔

''صبح بخیر برادر لیو۔'' وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔

''ایبٹ کہاں ہے؟''

اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اپنے کمرے میں ہی آرام کررہا ہے۔ کیوں... کوئی کام ہے اس سے؟''

''ہاں... اسے میرا پیغام دے دینا کہ کسی وقت مجھ سے میرے کمرے میں آکر مل لے۔''

''ٹھیک ہے برادر لیو... اور کوئی کام؟''

''نہیں، شکریہ۔ بس اسے میرا پیغام دے دینا۔'' یہ کہہ کر

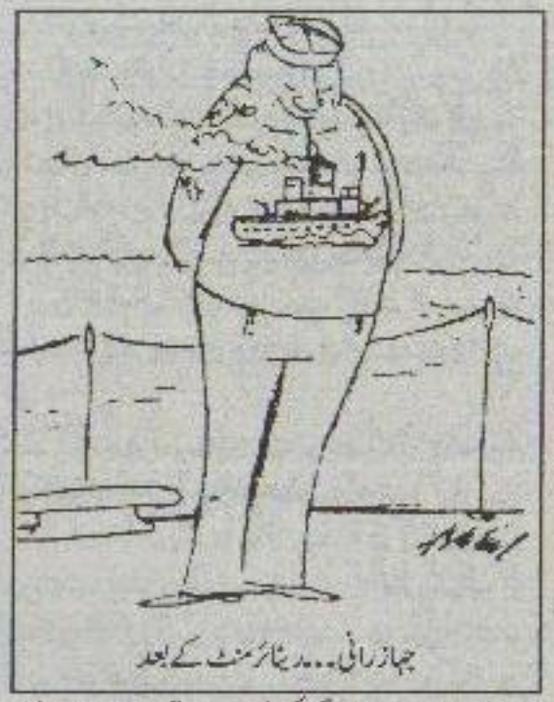

جہاز رانی... ریٹائرمنٹ کے بعد

برادر لیو راہداری میں آگے کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری کے کونے پر اس کا کمرا تھا۔

☆☆☆

برادر جوزف کو ایبٹ سہ پہر کے وقت چہل قدمی کرتے ہوئے مل گیا۔ اس نے جب لیو کا پیغام اسے پہنچایا تو وہ چونک گیا۔ ''کیا کام ہے کیا اس کو مجھ سے؟'' اس نے جوزف سے پوچھا۔

''مجھے تو معلوم نہیں، تم خود ہی جاکر اس سے پوچھ لو۔''

جوزف جانتا تھا کہ وہ لیو کو سخت ناپسند کرتا ہے اس لیے اس نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے مل لوں گا۔'' ایبٹ نے بے پروائی سے کہا اور پھولوں کی کیاری میں لگے گلاب کے پودے سے ایک پھول توڑ کر اسے سونگھنے لگا۔

رات کے کھانے کے بعد اسے لیو کا پیغام یاد آیا۔ اس وقت وہ آرام کرسی پر بیٹھا تاریخ کے بارے میں ایک کتاب کی ورق گردانی کررہا تھا۔ ایبٹ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کام کے سوا بے آرامی محسوس ہوتی ہے۔ اگر گزشتہ رات اسے بخار نہ ہوگیا ہوتا تو وہ آج بھی چھٹی نہیں کرتا۔ ''چلو بھئی، ذرا منحوس لیو کی بھی سن لیں کہ اس کو کیا تکلیف ہے۔'' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے خود کلامی کی، کھونٹی پر ٹنگا ہوا کوٹ اتار کر پہنا اور لیو کے کمرے پر پہنچ کر دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے لیو نے پکارا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"براور! میں ہوں ایبٹ جان۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے، اندر آجاؤ۔"

ایبٹ اندر داخل ہوا تو وہ چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے ایبٹ کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اپنا قلم بند کیا اور سیاہ جلد والی نوٹ بک کے کھلے صفحات پر کرسٹل سے بنے پیپر ویٹ کو رکھ دیا۔

"ادھر آجاؤ۔" اس نے نہایت شفقت بھرے لہجے میں اسے اپنے قریب رکھی ہوئی کرسی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ برادر... کہیے، کیسے یاد کیا مجھے؟ جوزف نے آپ کا پیغام دیا تھا کہ آپ ملنا چاہتے ہیں مجھ سے۔"

"ہاں... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آج صبح میں پرانے قبرستان سے لوٹ کر آیا تو ذرا کیاری کی دیکھ بھال میں لگ گیا تھا، وہیں والکر بھی پہنچ گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ پرانے قبرستان کی حالت بہت مخدوش ہے۔ دن کے وقت جب اس کے مزدور وہاں کام کر رہے ہوں تو باہر کی طرف چند آدمی کھڑے کر دیے جائیں جو غیر متعلقہ لوگوں کو اس طرف آنے جانے نہ دیں۔" لیو نے تفصیل سے کہنا شروع کیا، وہ خاموش بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔ "والکر کا خیال ہے کہ قبرستان کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ عام لوگ وہاں جائیں۔"

"حالت تو میں جانتا ہوں برادر۔" ایبٹ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے عام لوگوں کو بھی پتا ہے کہ وہاں مُردوں کی منتقلی کا کام جاری ہے اس لیے لوگ خود وہاں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے تو میں کل ہی تین چار آدمی تعینات کروا دوں گا۔" ایبٹ نے سپاٹ لہجے میں اپنی بات ختم کی۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو، وہ اس کے پاس سے اٹھ جائے۔ نہ جانے کیوں ایبٹ ہمیشہ سے ہی اس شخص سے متنفر رہا تھا اور اب بھی اس کے پاس بیٹھے ہوئے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے تپتی ریت پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ اسی لیے اس نے برادر کی بات کو بیچ سے ہی اچک لیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا جسے کرنے کے لیے لیو نے اسے بلایا تھا۔

"بہت شکریہ تمہارا۔" لیو نے یہ سن کر کہا۔

"ویسے مجھے ذاتی طور پر والکر کی منطق سمجھ نہیں آئی۔" ایبٹ نے لیو کے شکریے کے جواب میں کہنا شروع کیا۔ "جو اندر ہیں، ان میں باہر آنے کی سکت نہیں اور باہر والے اپنی خوشی سے اندر جاتے نہیں... تو پھر اسے آخر پریشانی کیا ہے جو قبرستان پر پہرا لگوانا چاہتا ہے؟"

"تم تو بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔ سادہ سی بات کی ہے اس بیچارے نے اور تم اس پر شک کر بیٹھے۔" لیو کے چہرے پر ناراضی جھلک رہی تھی۔

"میں شک تو نہیں کر رہا ہوں، صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اگر یہ بات آپ کو بری لگی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔" ایبٹ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" لیو نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میں کل ہی چند آدمی چوکیداری پر تعینات کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟"

"نہیں اور کوئی بات نہیں۔ بس یہی کہنے کے لیے تمہیں بلوایا تھا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔" ایبٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "شب بخیر۔"

ایبٹ کئی سال سے اس قدیم چرچ کی نگہبانی اور تزئین نو میں مصروف تھا اور قصبے کے ایک ایک شخص کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ایبٹ کی طرح والکر بھی مقامی باشندہ نہیں تھا۔ وہ کئی برسوں سے یہاں مقیم تھا اور ٹھیکے پر کام کر رہا تھا۔ وہ عمارتیں منہدم کرنے، ملبا صاف کرنے اور کھدائی جیسے چھوٹے موٹے کاموں کا ٹھیکا لیا کرتا تھا جس سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ قصبے کے باشندوں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ لوگ اسے لالچی اور بخیل سمجھتے تھے۔ وہ ڈالر کا پجاری، مکار اور بد دیانت شخص تھا جو اپنے معمولی سے فائدے کے لیے کسی بھی شخص کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے ایبٹ کو بھی وہ شخص پسند نہیں تھا لیکن یہاں کام کرنے کا ٹھیکا اسے چرچ کی اعلیٰ انتظامیہ نے دیا تھا اسی لیے وہ بے بس تھا اور اسے خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔

والکر، برادر لیو کو پہلے سے ہی جانتا تھا اور اب جبکہ وہ ڈیڑھ سال بعد دوبارہ یہاں تعینات کیا گیا تھا تو وہ اس سے کتاب کے بہانے ملنے چلا آیا۔ ایبٹ نے جب اس کو آج صبح یہاں آتے دیکھا تھا، وہ تب ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے لیو سے کوئی خاص کام ہوگا، ورنہ "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" کے اصول پر کاربند والکر اسے کتاب کیوں تحفے میں دیتا؟ جس وقت وہ اپنے تھیلے سے کتاب نکال کر مؤدبانہ انداز میں قدرے جھکتے ہوئے اسے پیش کر رہا تھا، تب ہی اس نے بھانپ لیا تھا کہ کوئی مطلب ہے اس کا ورنہ...

رات اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ایبٹ یہ سوچ رہا تھا کہ گزشتہ کئی مہینوں کے دوران، جب سے پرانے قبرستان سے مُردوں کی منتقلی کا کام شروع کیا گیا ہے، جب سے قصبے کے لوگوں نے

اس حصے کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ والکر دن بھر قبرستان میں رہتا ہے اور اندھیرا چھا جانے پر اس وقت باہر نکلتا ہے، جب اس کے تمام مزدور چھٹی کر کے جا چکے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے کئی مزدور مقامی نہیں ہیں اور چہرے مہرے سے بھی وہ مزدور سے زیادہ لٹیرے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے غیر مقامی مزدوروں کو اس کام کے لیے بلوایا؟ حالانکہ وادی میں مزدوروں کی کمی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس علاقے میں معاشی سرگرمیاں بہت ہی محدود اور غربت عام تھی جس کی وجہ سے مزدوروں کی دستیابی کوئی مسئلہ نہیں تھا تو پھر یہ اجنبی اس کے پاس کہاں سے پہنچے؟ دوسرے یہ کہ اس نے کئی مہینوں سے کسی بھی عام شخص کو قبرستان کے اس حصے میں پھٹکتے ہوئے نہیں دیکھا تو آخر والکر کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی ہے، جو اسے لیو سے یہ درخواست کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟ ایبٹ سوچ رہا تھا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جسے والکر جیسا لالچی شخص دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور اس نے یہ درخواست بھی اسی لیے کی ہے تاکہ پیش بندی کے طور پر ایسا انتظام کرے کہ کام کے دوران میں اگر کوئی شخص اتفاق سے اس طرف آنکلے، تب بھی وہ قبرستان کے پرانے حصے میں داخل نہ ہونے پائے۔ اب وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ ایبٹ رات گئے تک اسی معمّے کو سلجھانے کی کوشش میں الجھا رہا۔ مگر اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسے لیو کی سادہ لوحی پر بھی غصہ آرہا تھا کہ اس نے والکر کی درخواست کا تجزیہ کرنے کے بجائے اس کی بات فوری طور پر کیوں مان لی؟ شاید یہ اس کتاب کا اثر تھا۔ والکر نے پرندوں کے بارے میں تازہ ترین اور قیمتی کتاب برادر لیو کو تحفے میں دے کر اس کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر ہوگا، جب انہی سوچوں میں گم ایبٹ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح جب ایبٹ نیند سے بیدار ہوا، اس وقت بھی اس پر تھکاوٹ طاری تھی۔ جسم مضمحل ہو رہا تھا۔ اس نے آج بھی کمرے میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ ناشتے کے بعد وہ کافی کا مگ ہاتھ میں تھام کر کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ اس نے پردے ہٹائے اور کھڑکی کھولی تو سورج کی حرارت بخش کرنیں کمرے کو جگمگانے لگیں۔ وہ کھڑکی کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا اور کافی پینے لگا۔ کافی دیر بعد اسے برادر لیو پرانے قبرستان کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی بغل میں سیاہ چمڑے کی جلد والی بڑی سی نوٹ بک دبی ہوئی تھی۔ وہ کیاری کی طرف آیا۔ اس نے نوٹ بک منڈیر پر رکھی اور کیاریوں کا جائزہ لینے لگا۔

لیو کا یہ معمول تھا۔ اس سے پہلے بھی جب وہ یہاں تھا، تب بھی وہ ان کیاریوں کی اسی طرح دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ ان کیاریوں میں پھل دار پودوں کے علاوہ سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ لیو کو تازہ سبزیاں کھانے کا بہت شوق تھا اسی لیے ان کیاریوں میں لگنے والی سبزیاں نہ صرف وہ خود کھاتا تھا بلکہ اس کی دیکھا دیکھی کئی لوگوں نے بھی یہ عادت اپنالی تھی۔ لیو کے یہاں سے جانے کے باوجود بھی کیاریوں کی رونق باقی تھی۔ اکثر دوپہر کے کھانے میں کچی سبزیوں کی سلاد اسی کیاری کا تحفہ ہوتی تھی۔

لیو کو دیکھ کر ایبٹ کو رات والی بات یاد آ گئی۔ اس نے فوراً ایک آدمی بھیج کر سپروائزر کو بلوایا جو اس وقت کام کی نگرانی کر رہا تھا۔

"میں نے تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ فوری طور پر دو چار آدمیوں کو پرانے قبرستان کی چوکیداری پر لگا دو۔" جب سپروائزر جوناتھن پہنچا تو ایبٹ نے اسے حکم دیا۔

"میں ابھی یہ کام کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہاں... تم والکر کے پاس جاؤ، اس وقت وہ پرانے قبرستان میں ہوگا۔ اسے فوراً میرے پاس بھیج دو۔"

"ٹھیک ہے... اور کوئی بات؟"

"نہیں۔"

جوناتھن کے چلے جانے کے بعد وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کی سوچ کا دائرہ پرانے قبرستان تک محیط تھا۔ جوناتھن کو گئے ہوئے پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ والکر آ گیا۔

"آپ نے بلوایا ہے مجھے... سب خیریت تو ہے؟" اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"مسٹر والکر... فی الوقت آپ مزید قبروں کی کھدائی اور لاشوں کی نئے تابوتوں میں منتقلی کا کام روک دیجیے۔"

"خیریت... ہوا کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" ایبٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کوئی تو وجہ ہوگی؟" والکر جاننا چاہتا تھا کہ آخر اسے کام سے کیوں روکا جا رہا ہے۔

"صرف دو چار دن کی بات ہے۔" ایبٹ نے کام بند کرنے کی وجوہات بیان کرنا شروع کیں۔ "قبرستان کی توسیع میں ایک رکاوٹ پیش آگئی ہے۔ ایک بہت بڑی چٹان بیچ میں حائل ہو گئی ہے۔ جب تک اسے توڑ نہیں دیا جاتا، تب تک تم کام بند کر دو۔ نئے قبرستان میں ہم ابھی اتنی جگہ نہیں بنا پائے ہیں کہ مزید لاشوں کی تدفین کر سکیں۔ ہاں، ذرا جگہ بن جائے تو

http://pakfunplace.blogspot.com

تم پھر کام شروع کر دینا۔"

"برادر لیو یہ بات جانتے ہیں؟" والکر نے سوال کیا۔

"یہ بات ان کے علم میں لانا ضروری نہیں۔"

"تو میں دوبارہ کب کام شروع کر سکتا ہوں؟"

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دو دن بھی لگ سکتے ہیں اور دو ہفتے بھی۔" ایبٹ کا لہجہ بدستور سپاٹ تھا۔ "جب تک میں نہ کہوں، تم دوبارہ کام شروع نہیں کرو گے۔ ہاں، میں نے قبرستان کے گرد آدمی کھڑے کروا دیے ہیں اور جاتے جاتے یہ بھی سن لو کہ اپنے مزدوروں کو بھی یہاں آنے مت دینا۔ میری اجازت کے بنا انہیں اندر گھسنے نہیں دیا جائے گا، خوامخواہ انہیں زحمت ہوگی۔" یہ سن کر والکر کا چہرہ اتر گیا۔

"ٹھیک ہے، جب تم کام شروع کروانا چاہو، مجھے اطلاع کر دینا۔" والکر نے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایبٹ بھی والکر کی بے چینی کو سمجھ چکا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"برادر لیو نظر نہیں آ رہے۔" والکر نے جواب دیا۔

"وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں، کوئی کام ہے ان سے؟" ایبٹ نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں... میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔ کام ہوگا تو میں تمہیں فون کر دوں گا۔"

"بہت بہتر۔" والکر یہ کہہ کر بنا ہاتھ ملائے واپس چل دیا۔

ایبٹ پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر تھا اور گزشتہ بیس سال سے وہ قدیم گرجا گھروں کی بحالی اور تزئین کے کاموں سے وابستہ تھا۔ اس نے امریکا کے کئی قدیم گرجا گھروں کی بحالی اور آرائش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم ہسپانوی انداز میں تعمیر شدہ جب اس چرچ کی بحالی کا معاملہ سامنے آیا تو اس سے رابطہ کیا گیا۔ ابھی وہ چرچ کی بحالی کا کام مکمل نہیں کر سکا تھا کہ پرانے قبرستان کی تبدیلی اور اس کی جگہ کو چرچ میں شامل کرنے اور نئے قبرستان کی توسیع کا مسئلہ درپیش ہو گیا جس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کام میں جُت گیا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا لیکن کل رات جب والکر کی جانب سے چوکیداروں کی تعیناتی کا مطالبہ سامنے آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اگرچہ اس نے اپنے خدشات کا سرسری اظہار برادر لیو کے سامنے کر دیا تھا لیکن اسے شک تھا کہ اس کا واضح جھکاؤ والکر کی طرف ہے۔ اس لیے اس نے کھل کر کچھ کہنے کے بجائے از خود معاملے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اسی لیے اس نے پرانے قبرستان سے تابوتوں کی منتقلی کو روکنے کا حکم دیا تھا، البتہ وجہ وہ نہیں تھی جو والکر کو بتائی گئی تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ گزشتہ دو ماہ کے دوران جب سے تابوتوں کی منتقلی کا کام والکر نے شروع کیا تھا، تب سے اب تک قصبے میں کئی اموات ہو چکی تھیں۔ مرنے والے سارے افراد معمر مگر بالکل تندرست تھے اور ان سب کی موت اچانک ہوئی تھی۔ وہ سب ایک جیسی پُراسرار موت کا شکار ہوئے تھے۔ سارے افراد اپنی زندگی کے آخری دن قبرستان گئے تھے اور رات کو سوئے تو صبح مردہ پائے گئے۔ آخری موت برادر لوک کی ہوئی تھی جو صرف دو دن پہلے کی بات ہے۔

قصبے کی زیادہ تر آبادی قدیم ریڈ انڈین کی نسل پر مشتمل تھی۔ مرنے والوں کے لواحقین کا کہنا تھا کہ جب ان لوگوں نے سنا کہ ان کے اجداد کے تابوت بہ وجوہ یہاں سے منتقل کر کے نئے قبرستان مین دفن کیے جا رہے ہیں تو وہ اپنے بزرگوں کی قبروں کو دیکھنے کے لیے مختلف اوقات میں یہاں آئے تھے، تاہم اگلے روز وہ خود ان کے پاس چلے گئے۔ ان اموات کی باقاعدہ تحقیقات بھی نہیں کی گئی تھیں۔ مقامی باشندے کے مطابق تابوتوں کی منتقلی کے باعث بدروحیں سرگرم ہو گئی تھیں اور مرنے والے سارے افراد انہی بدروحوں کے عتاب کا شکار بنے۔ چنانچہ ان افواہوں کے پھیلنے کے بعد قصبے کے لوگوں نے پرانے قبرستان کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس کے باوجود والکر کو چوکیدار کی ضرورت درپیش تھی۔ یہ بات ایبٹ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الفور اس کام کو بند کرا کے اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرے گا کہ آخر والکر قبرستان میں عام لوگوں کے آنے جانے سے کیوں خائف ہے؟ وجہ... والکر، برادر لیو کو بتا چکا تھا لیکن ایبٹ اس بات سے مطمئن نہیں تھا۔

سہ پہر کا وقت ہوگا جب والکر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس وقت چرچ پر عام طور پر خاموشی کا راج ہوا کرتا تھا۔ تمام لوگ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے ہوتے۔ اس لیے ایبٹ کو یقین تھا کہ اسے باہر نکلتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ چرچ سے باہر نکل کر اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور پہاڑی کے دوسری جانب سے گھوم کر، ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا پرانے قبرستان میں داخل ہو گیا۔ یہاں کئی پرانی قبریں خالی پڑی تھیں۔ یہ وہ قبریں تھیں جن میں سے

تابوت نکال کر منتقل کر دیے گئے تھے۔ کچھ نئے مگر خالی تابوت بھی رکھے ہوئے تھے جن پر ترپال ڈال کر ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ایبٹ ایڑھ گھنٹے تک گھوم پھر کر قبرستان کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر وہ ایک قبر کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ یہ کافی پرانی قبر تھی۔ اس کے اوپر سے ساری مٹی سیلابی بارشوں نے بہا دی تھی اور اب زمین کے اندر سے تابوت کا خستہ حال ڈھکن جھانک رہا تھا۔ اس نے قبر کا کتبہ پڑھنا شروع کیا۔ کتبے پر لکھی تحریر مٹ چکی تھی، البتہ ایک فقرہ قابل مطالعہ تھا:

"تاریخِ وفات: 10 جنوری 1711ء"

"یہ قبر مناسب رہے گی۔" کتبہ پڑھنے کے بعد اس نے خود کلامی کی۔ اس کے بعد وہ جس راستے سے قبرستان میں داخل ہوا تھا، اسی راستے سے واپس چل دیا۔ اگرچہ اس نے سپروائزر سے کہہ کر قبرستان کے باہر چوکیدار تعینات کروا دیے تھے لیکن ایبٹ نے جو راستہ چنا وہ عام راہ گزر نہیں تھی۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ یہاں آتے اور اب واپس جاتے ہوئے اسے کوئی نہیں دیکھ پائے گا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟" جب وہ چرچ میں داخل ہو رہا تھا تو سامنے سے آنے والے برادر جوزف نے اسے دیکھ لیا۔

"بس یونہی ذرا ٹہلنے کے لیے نکلا تھا۔ دو دن سے کمرے میں لیٹ لیٹ کر بور ہو گیا تھا۔ سوچا چلو ہوا خوری کرتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"چلو اچھا ہے۔ اس سے طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔" جوزف نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

جب ایبٹ چرچ میں واپس لوٹا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ اب اسے رات ہونے کا انتظار تھا۔

جب ایبٹ اپنے کمرے سے دبے پاؤں باہر نکلا تو اس وقت تک کافی رات بیت چکی تھی۔ اس نے ڈانگری پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا جس میں زمین کھودنے کے لیے ضروری سامان، کیمرا، نوٹ بک اور ایک بڑی سی ٹارچ اور ایمرجنسی لائٹ رکھی ہوئی تھی۔ بہار کا موسم تھا لیکن اس کے باوجود رات بہت ہی ٹھنڈ تھی۔ اس نے اپنے چہرے اور سر پر مفلر کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت تک تمام لوگ سو چکے ہوں گے اور اگر کوئی جاگ بھی رہا ہوگا تو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے بجائے گرم گرم بستر میں دُبکے رہنے کو ہی ترجیح دے گا۔ جب وہ راہداری میں نکلا تو وہاں کی بھی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ اس نے جوگرز پہنے ہوئے تھے اس لیے چلنے کی معمولی سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

احساسِ محرومی

احساسِ محرومی یعنی فرسٹریشن انسان کو متبادل طرزِ عمل اپنانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ اسے کسی مخصوص صورتِ حال کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ بہتر راستہ اختیار کرنے یا کسی متبادل مقصد کو اپنانے پر اکساتی ہے۔ محرومیوں کی ایک معقول حد، انسان کی قوتِ کار کو بڑھاتی ہے اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور آنے والے خطرات یا مزاحمتوں کے بارے میں حساس بھی بنا دیتی ہے۔ اس طرح وہ زیادہ مستعد اور متحرک ہو جاتا ہے۔

لیکن یہی محرومی بعض اوقات انسان میں جارحیت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ براہ راست اسی شخص یا ماحول پر زبانی، سماجی یا اپنے رویے کے ذریعے حملہ کرتا ہے یا پھر اپنا انتقام بے بس کمزور اور بے ضرر لوگوں سے لیتا ہے۔

ایک

ایک نوجوان لڑکی نے اچانک سیر و تفریح سے توبہ کر کے مذہب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ پادری صاحب نے اس کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی! کیا تم پہلے انسان کا نام بتا سکتی ہو؟"

"نہیں۔" لڑکی نے بگڑ کر جواب دیا۔ "میں اس ذلیل کا نام اپنے منہ سے ادا کرنا گناہ سمجھتی ہوں جس نے آج مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔"

وجیہہ احمد... جلال پور جٹاں

وہ جس راستے سے دن میں قبرستان گیا تھا، اسی راستے پر ہو لیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس قبر کے سرہانے کھڑا تھا جو سہ پہر کو دیکھ کر گیا تھا۔ اس نے چھوٹے سے بیلچے کی مدد سے تابوت پر پڑی مٹی ہٹانا شروع کی۔ اس دن چاند بھی جوبن پر تھا اس لیے چاندنی رات میں مٹی ہٹانے کے لیے اسے روشنی کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ کم و بیش آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد تابوت کا ڈھکن اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ یہ بہت خستہ حال تھا۔ اس نے نہایت آرام سے تابوت کا ڈھکن کھولنے کی کوشش کی لیکن خستہ حال ڈھکن کھلنے کے بجائے کئی جگہ سے ٹوٹ گیا۔ آخر کافی دیر کی کوشش کے بعد اس نے یہ ڈھکن ہٹا دیا۔ اندر ایک انسانی ڈھانچا موجود تھا۔ یہ اس کے لیے حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس

http://pakurdu.blogspot.com

نے ٹارچ کی روشنی سے تابوت کے اندر تفصیل سے جائزہ لینا شروع کیا۔ جب اس نے کھوپڑی پر نظر ڈالی تو ایک چیز نے اسے حیران کر دیا۔ یہ بڑے بڑے پتھروں سے بنی ایک مالا تھی جو مُردے کے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مٹی کے کچھ برتن، سکے اور چند ایسی اشیا تھیں جن کا شمار آج نوادرات میں ہوتا ہے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی سے تابوت کے اندر موجود اشیا کی مختلف زاویوں سے اپنے ڈیجیٹل کیمرے کے ذریعے تصاویر لیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے تابوت پر اسی طرح ڈھکن رکھا جیسے پہلے رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اس پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ قبر کو اس طرح بند کیا جائے کہ دیکھنے والے کسی بھی شخص کو شائبہ تک نہ ہو کہ اسے کھولا گیا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ واپس چرچ کی طرف لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے نو بج چکے تھے جب ایبٹ کے کمرے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو برادر لیو سامنے کھڑا تھا۔

"خیریت تو ہے؟ مجھے معلوم ہوا کہ دو روز سے تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور آج صبح تم نے ناشتا بھی نہیں کیا؟" اس نے ایبٹ کو دیکھتے ہی کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی کا تاثر واضح تھا۔

"رات کافی تیز بخار ہو گیا تھا۔ پوری رات بے چین رہا۔ صبح کے وقت ہی آنکھ لگی تھی اس لیے اٹھ نہیں سکا۔" ایبٹ اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔ اس نے برادر کو مطمئن کرنے کے لیے بہانہ تراش لیا۔ "مگر اب بہت بہتر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ڈاکٹر سے معائنہ کروالو۔ میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

"بہت بہتر۔" لیو کے جاتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ رات کے واقعات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور نہا دھو کر ناشتا کرنے کے بعد سائٹ پر چلا گیا۔

مزدور قبرستان کی توسیع کے کام میں مصروف تھے۔ اس نے سپروائزر جوناتھن کو بلایا۔

"چوکیدار تعینات کر دیے؟"

"وہ کام تو کل ہی کر دیا تھا۔" سپروائزر نے مستعدی سے جواب دیا۔

"ان سے کہہ دو کہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھیں اور ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دو کہ وہ خفیہ طور پر قبرستان میں گھومے پھرے اور اس بات کا پتا چلائے کہ اندر کوئی شخص موجود تو نہیں۔" جوناتھن غور سے ایبٹ کی ہدایات سن رہا تھا۔ "اسے کہہ دینا کہ اگر وہ کسی شخص کو دیکھے تو اس پر کڑی نظر رکھے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہ خود اس شخص کو نہ تو نظر آئے اور نہ ہی اسے روکنے کی کوشش کرے۔"

"جیسا آپ کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ مگر بات کیا ہے؟" جوناتھن کے لہجے میں تشویش تھی۔ جوناتھن سیدھا سادہ آدمی تھا اور ایبٹ اسے بہت پسند کرتا تھا۔

"فی الحال تو میں کچھ نہیں بتا سکتا، البتہ اگر کچھ ہوا تو تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔" ایبٹ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس کام احتیاط اور رازداری سے ہونا چاہیے۔"

"بے فکر رہیے۔"

"تم شام کو سارے آدمیوں سے حالات معلوم کر کے مجھے میرے کمرے میں آ کر دن بھر کی رپورٹ دینا۔ اب تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔" ایبٹ نے جوناتھن کو ہدایات دیں اور واپس چرچ کی طرف چل دیا۔

آج رات وہ دوبارہ ایک اور قبر کو کھول کر اس کے اندر موجود اشیا کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ آج شام پھر وہ راستہ بدل کر قبرستان جائے گا اور کسی اور قبر کو دیکھ کر آئے گا جسے وہ رات کو کھول سکے۔

"ہاں، کیا رپورٹ ہے۔" شام کو جوناتھن اس کے پاس پہنچا۔

"دن میں ایک بار صرف وائکر قبرستان پہنچا۔ جب وہ آیا تو اس کے پاس شولڈر بیگ تھا لیکن جاتے ہوئے اس نے ایک بڑا سا تھیلا کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔" جوناتھن نے کہنا شروع کیا۔ "اس کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

"وہ کس راستے سے قبرستان میں داخل ہوا تھا؟"

"ہاں، یہ غیر معمولی بات ہے۔" جوناتھن نے ایسے کہنا شروع کیا جیسے وہ یہ بات بتانا چاہتا تھا لیکن کہنا بھول گیا۔ "وہ بہت لمبا رستہ کاٹ کر، پہاڑی کی دوسری طرف سے گھوم کر قبرستان میں داخل ہوا تھا۔ پیٹر کا کہنا ہے کہ وہ قبرستان میں بہت اندر تک گیا۔ پیٹر کے مطابق کافی آگے جا کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب پچیس تیس منٹ کے بعد دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے کندھوں پر وہ بڑا سا تھیلا لٹک رہا تھا جس میں یقیناً کچھ سامان ہوگا۔"

"اچھا... ٹھیک ہے، تم اپنا کام جاری رکھو اور مزید چند روز تک نگرانی کرواؤ۔"

"بہتر سر... میں چلتا ہوں۔"

جوناتھن کے جانے کے بعد اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور تابوت کی جو تصاویر اس نے کھینچی تھیں، دیکھنے لگا۔

سر پیر کو وہ اٹھا اور ایک بار پھر نہایت محتاط انداز میں قبرستان کی طرف چل دیا۔ آج اس نے جو قبر منتخب کی تھی اس پر لگے کتبے پر سنِ وفات تھا:

"29 نومبر 1691ء"

کافی رات ہو چکی تھی۔ کل کی طرح اس رات بھی وہ نہایت خاموشی سے باہر نکلا اور پرانے قبرستان پہنچ گیا۔ اس نے تابوت کا ڈھکن کھسکایا تو اس کے اندر کل رات والے تابوت سے زیادہ سامان موجود تھا۔ ڈھانچے کی گردن میں زمرد کی کئی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ان اشیا کی تصویریں کھینچیں اور قبر بند کر کے واپس چرچ لوٹ آیا۔

☆☆☆

دوسرے دن ایبٹ علی الصباح نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے چرچ انتظامیہ کے نام خط لکھا کہ وہ طبیعت کی ناسازی کے باعث دو دن کے لیے اپنے گھر جا رہا ہے۔ اس نے خط دینے کے بعد اپنا بیگ تیار کیا اور دوپہر کی فلائٹ سے نیویارک پہنچ گیا۔

نیویارک میں ایبٹ کا ایک پرانا دوست رہتا تھا جو پیشے کے اعتبار سے آرکیالوجسٹ تھا اور مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ جس شام وہ نیویارک پہنچا، اسی رات وہ اس کے پاس بیٹھا ہوا تمام تصویریں اسے دکھا رہا تھا۔

"تم بتاؤ... یہ سب کیا ہے؟ مرنے والے تو تمام لوگ عیسائی تھے۔ ان کی تدفین بھی انہی کے مذہب کے طور طریقوں کے مطابق ہوئی مگر پھر بھی یہ سب کچھ؟"

"تمہارا سوال مناسب ہے۔" پروفیسر جانسن نے تصویریں دیکھنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "جنوبی ایریزونا کے جس علاقے کی تم بات کر رہے ہو، وہ سرخ فاموں کا اہم علاقہ تھا۔ کئی سو سال پہلے چرچ مشنری نے وہاں برسوں تک تبلیغ کی اور وہ لوگ آہستہ آہستہ عیسائی مذہب قبول کرنے لگے لیکن مذہب اور ثقافت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔" پروفیسر عالمانہ انداز میں کہہ رہا تھا اور ایبٹ چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔ "مقامی سرخ فام لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار تو کر لیا لیکن اتنی جلدی وہ اپنی صدیوں پرانی ثقافت، رسم و روایات اور تہذیب ترک کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکے۔ اس لیے انہوں نے بعد از مرگ اپنے مردے عیسائی طور طریقوں کے مطابق دفنانا تو شروع کر دیے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ موت کے حوالے سے اپنی رسم و روایات کو بھی پورا کرتے تھے۔ دنیا کے کئی ادیان و مذاہب کی طرح ان میں بھی زندگی بعد از موت کا تصور موجود تھا۔ اس لیے وہ اگلی دنیا کے سفر پر اپنے مردوں کو اس طرح شان و شوکت اور دیگر ساز و سامان سے لدا پھندا کر بھیجتے جس کی ان کے مطابق، مردے کو دوسری دنیا میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ ان کے تابوتوں میں تمہیں یہ سامان نظر آ رہا ہے۔"

"وہ زمرد کی مالائیں؟"

"بہت دلچسپ بات ہے۔" پروفیسر نے ہنکارا بھرا اور پائپ سے کش لینے کے بعد کہنے لگا۔ "سرخ فاموں کا عقیدہ تھا کہ زمرد نہایت مقدس پتھر ہے اس لیے بچے کی پیدائش سے لے کر شادی اور پھر موت تک... سرخ فاموں کی زندگی میں یہ پتھر ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مردے کے گلے میں تدفین سے قبل زمرد کی کئی مالائیں پہنائی گئی تھیں، یہ بات ان کے ہاں مرنے والے کے سماجی مرتبے کو ظاہر کرتی تھی۔ البتہ غریب سے غریب انسان بھی اپنے مردے کے گلے میں کم سے کم ایک مالا ضرور ڈالتا تھا۔" پروفیسر نے بات ختم کی اور کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

"ویسے حقیقت یہ ہے کہ میکسیکو میں زمرد کی کانیں ہیں اور کئی سو سال پہلے بھی یہ پتھر وہاں عام طور پر پایا جاتا تھا۔" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "بس... رفتہ رفتہ یہ قیمتی پتھر ان کی روایات میں داخل ہو گیا، ورنہ تو کوئی اور بات نہیں۔ سب ضعیف الاعتقادی ہے۔" یہ کہہ کر پروفیسر ہنسنے لگا۔ "ویسے اس زمانے میں توہمات ہی تھے، حقیقت تو اب جا کر کھلی ہے۔ اس میں ان بے چاروں کو بھی کیا دوش دیں۔"

"ویسے پروفیسر... یہ سامان جو قبروں میں موجود ہے، اس کی نوادرات کی مارکیٹ میں کیا ویلیو ہوگی؟" ایبٹ نے سوال کیا۔

"درست قیمت تو بتانا مشکل ہے البتہ نوادرات کے چور بازار میں بھی ان کی کم سے کم قیمت بھی ہزاروں ڈالرز میں ہوگی۔"

"پروفیسر... یہ جو باتیں آپ نے کی ہیں، یہ سب ایک خط میں لکھ کر مجھے دے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مزموں کے خلاف پولیس کارروائی کی جائے تو آپ کا یہ خط بطور ماہر آثارِ قدیمہ ان نوادرات کے بارے میں ثبوت کے طور پر موجود ہو۔" ایبٹ نے کہا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"ٹھیک ہے۔ تم یہ خط کل صبح یونیورسٹی آ کر میرے دفتر سے لے لینا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن ایبٹ نے پروفیسر سے خط لیا اور اسی شام کی پرواز سے واپس لوٹ آیا۔ جب وہ چرچ میں پہنچا تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ تھکا ہوا ہونے کی وجہ سے اس نے کھانا کھایا اور پھر لمبی تان کر سو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ علی الصباح نیند سے بیدار ہو گیا اور ناشتے کے بعد سیدھا سائٹ پر چلا گیا۔ وہاں مزدور پہنچ چکے تھے۔ ایبٹ جوناتھن سے ملا اور اپنی غیر موجودگی کے دوران یہاں کے حالات کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔

"صرف ایک غیر معمولی بات ہوئی ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے جوناتھن سے پوچھا۔

"کل چوکیدار نے والکر کو دیکھا تھا قبرستان میں۔ اس نے ایک پرانی قبر کھودی اور تابوت کو باہر نکالے بغیر اس کا ڈھکن اٹھایا اور اندر ہاتھ ڈال کر کچھ چیزیں نکال نکال کر ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالنے لگا۔ اس کے بعد اس نے تابوت بند کیا اور قبر پر دوبارہ مٹی ڈال کر تھیلا لے کر چلا گیا۔"

"ہونہہ... تو یہ بات ہے۔"

"سر! مجھے یہ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔" جوناتھن نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "برادر لوک نے مرنے سے ایک دن پہلے بھی اسے ہدایت کی تھی کہ مردوں کا احترام کرنا سیکھو۔"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" ایبٹ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"جس رات برادر کی موت ہوئی، اس دن میں شام کو چرچ گیا تھا۔ میری نوٹ بک ختم ہو گئی تھی اور مجھے لکھنے کے لیے کاغذ چاہیے تھے۔ میں وہی لینے گیا تھا۔ جب میں چرچ میں پہنچا تو برادر لوک پرانے قبرستان کی طرف سے آ رہے تھے۔ والکر ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ برادر لوک کافی تیز چل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غصے میں ہیں۔ جب وہ چرچ کے داخلی دروازے کی طرف پہنچے تو انہوں نے والکر کو ڈانٹ کر واپس چلے جانے کو کہا۔ یہ دیکھ کر میں ذرا سا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ والکر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا تب برادر نے زوردار آواز میں کہا۔ "مردوں کا احترام کرنا سیکھو ورنہ خود کو جہنم میں شیطان کے ساتھ پاؤ گے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"برادر لوک چرچ کے اندر چلے گئے اور والکر کیاریوں والے راستے سے قبرستان کی طرف چلا گیا۔"

"بات سمجھ میں آ گئی۔" ایبٹ نے سر ہلا کر کہا۔ "تم یہاں کا خیال رکھو۔ میں ذرا قصبے کی طرف جا رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایک کافی شاپ میں بیٹھ کر شیرف کو فون کر رہا تھا۔

"اس ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم مجھ سے ایسے ملو گے جیسے اتفاقاً ملاقات ہو گئی ہے۔ کسی کو بھی شک نہ ہونے پائے کہ یہ ملاقات قصداً ہو رہی ہے۔" ایبٹ نے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم میرا انتظار کرو، میں پہنچ رہا ہوں۔"

تقریباً دس منٹ کے بعد شیرف کافی شاپ میں داخل ہوا اور سیدھا کاؤنٹر پر جا کر ایک کپ کافی کا آرڈر دیا اور ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھنے لگا۔ اس وقت ایبٹ اپنے دھیان میں مگن کافی پی رہا تھا۔ اس کی نظر ایبٹ پر پڑی تو اس نے وہیں سے کہا۔

"ہائے ایبٹ۔"

"ہائے شیرف۔" اس نے اپنی کافی کا مگ اٹھایا اور سیدھا اس کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ایسے ملے جیسے یہ اتفاقی ملاقات ہو۔ ویسے بھی صبح کا وقت تھا اور کافی شاپ میں گنتی کے ہی چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس طرح مل رہے تھے جیسے دو شناسا کئی ہفتوں کے بعد مل رہے ہوں۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں رسمی باتیں کرتے رہے تا کہ اگر کوئی انہیں دیکھ اور سن رہا ہو تو جان لے کہ کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ دیر بعد جب اسے لگا کہ اب ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں رہی ہو گی تو اس نے نہایت آہستہ آواز میں سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ قصبے میں ہونے والی اموات اور خود برادر لوک کی موت کے پیچھے والکر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔" شیرف نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے۔" ایبٹ نے جواب دیا۔

"بہت ہو چکا۔ اب مجرم کو مزید مہلت نہیں دی جا سکتی۔" شیرف نے غصے سے کہا۔ اس کے بعد شیرف اپنا منصوبہ ایبٹ کو سمجھانے لگا۔

☆☆☆

اگلے دو دن خیریت سے گزر گئے۔ جوناتھن کے آدمیوں کی رپورٹ کے مطابق ان دو دنوں میں بھی والکر قبرستان آتا رہا تھا۔ وہ روزانہ سہ پہر کے قریب چوروں کی طرح خفیہ راستوں سے قبرستان میں داخل ہوتا اور پھر سورج ڈھلتے ہی یہاں سے باہر نکلتا... وہ بھی بھرے ہوئے تھیلے کے ساتھ۔ یہ اس کا گزشتہ کئی دنوں سے معمول بنا ہوا تھا۔ اس لیے ایبٹ کو اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔

ایبٹ کا شیرف سے فون پر رابطہ تھا۔ وہ نگرانی پر مامور آدمیوں کی رپورٹ اسے روزانہ پہنچا رہا تھا۔ اس دن بھی جب اس نے اطلاعات سے شیرف کو آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔

"بس ٹھیک ہے۔ کل یہ قصہ ختم کر دیں گے۔" اس کے بعد وہ سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگا کہ کل کیا ہو گا اور کیسے ہو گا۔

☆☆☆

دوسرے دن جب ایبٹ پرانے قبرستان میں داخل ہوا تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ اسے نگرانی پر مامور ایک شخص سے اطلاع مل چکی تھی کہ والکر قبرستان کے شمالی حصے میں ایک قبر کھود رہا ہے۔ ایبٹ سیدھا شمالی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ چوکیدار کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچا تو وہاں والکر اپنی مذموم کارروائی میں مصروف تھا۔ وہ اپنے اور والکر کے بیچ میں کچھ فاصلہ رکھ کر ٹھہر گیا اور پاٹ دار آواز میں چلایا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟" ایبٹ کی گونج دار آواز سنتے ہی وہ گڑبڑا گیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے تو پہلے ہی تم پر شک تھا۔ آج رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔"

یہ سنتے ہی والکر کہنے لگا۔ "ایبٹ! ایسی کوئی بات نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"مجھے سب پتا ہے۔ تم قبروں سے نوادرات چوری کرتے ہو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔ دیکھو، تم میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں آدھا حصہ دوں گا۔ اب تم سب جان چکے ہو تو پھر اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ دوست۔" پولیس کا نام سن کر وہ گھبرا گیا اس کے لہجے میں خوشامد در آئی تھی۔

"خبردار جو مجھے دوست کہا۔" یہ کہہ کر اس نے چند قدم آگے بڑھائے۔ اس کی نظریں بدستور والکر پر تھیں۔

"تم بھی بے وقوف ہو۔ تم جیسے احمقوں کا ٹھکانا صرف قبر ہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں پستول موجود تھا۔

"بولو... ساتھ دو گے؟"

"نہیں۔" پستول دیکھ کر ایبٹ کے لہجے میں خوف جھلکنے لگا۔

"میں تین تک گنتا ہوں... فیصلہ کر لو۔"

"میرا جواب تب بھی نہ میں ہی ہو گا۔"

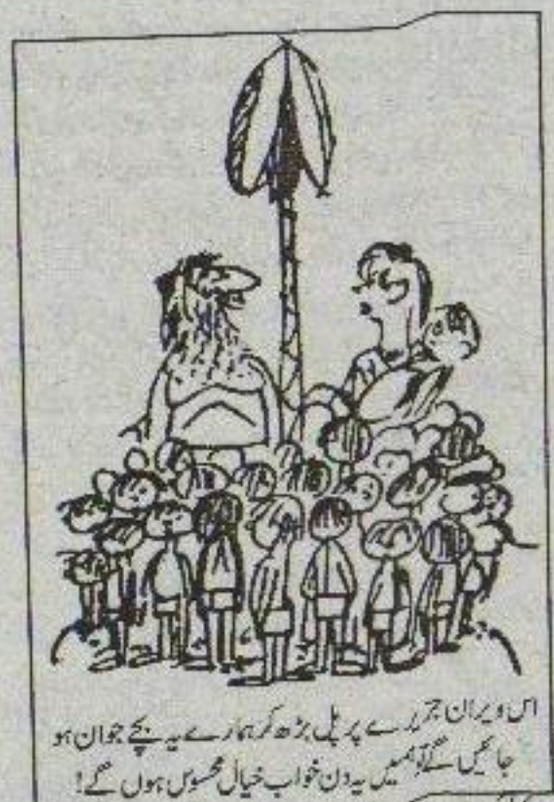

"ٹھیک ہے تو پھر مرو۔ تم بھی برادر لوک کی طرح بیوقوف آدمی نکلے۔" یہ کہہ کر اس نے گولی چلا دی۔ ایبٹ نے چھلانگ

اس ویران جزیرے پر پل بڑھ کر ہمارے یہ بچے جوان ہو جائیں گے تو انہیں یہ دن خواب خیال محسوس ہوں گے!

لگائی لیکن ذرا سی دیر ہو گئی۔ گولی اس کے بازو سے رگڑ کھاتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی سفید قمیص کی آستین لہولہان ہو گئی... وہ زمین پر گر پڑا۔

"ہینڈز اپ۔" گولی چلتے ہی کئی آوازیں گونجیں۔ اس کے ساتھ ہی شیرف اور کئی سپاہی سامنے آ گئے۔ والکر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

"ویسے یہ گولی سینے پر بھی لگتی تو تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔" شیرف نے ایبٹ کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو، اسپتال چلتے ہیں۔ مرہم پٹی ضروری ہے۔"

"پہلے میری قمیص کے اندر سے بلٹ پروف جیکٹ باہر نکالو۔ بڑی الجھن ہو رہی ہے۔" ایبٹ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اگلے چند گھنٹوں میں سارا راز کھل چکا تھا۔

والکر کو جب پرانے قبرستان سے میتوں کی نئے قبرستان میں منتقلی کا کام ملا تو اس نے پہلے ہی تابوت میں ایسی اشیا دیکھ لیں جس نے اس کے شیطان ذہن میں خیال پیدا کیا کہ اگر انہیں نوادرات کے چور بازار میں بیچا جائے تو لمبا مال کمایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کام تنہا اس کے بس کا نہیں تھا۔ اس نے اپنے تین اور جرائم پیشہ ساتھیوں کو مدد کے لیے بلوا لیا۔ یہ تینوں قبرستان میں مزدور کے روپ میں اس کے ساتھ ہی داخل

http://pakfunplace.blogspot.com

"ہاں... برادر بدعنوان اور لالچی نہیں ہے، بس ذرا سنکی ہے۔" ایبٹ نے سر ہلا کر شیرف کی تائید کی۔

والکر کے تینوں ساتھی بھی پکڑے گئے۔ وہ پولیس کو چوری چکاری اور قتل کی متعدد وارداتوں میں مختلف امریکی ریاستوں کو مطلوب اشتہاری ملزم تھے۔ نوادرات کی چور بازار میں فروخت انہی کی ذمے داری تھی۔ پولیس نے والکر کے گھر سے کافی نوادرات برآمد کر لیے، البتہ بہت کچھ وہ فروخت کر چکا تھا۔ والکر نے برادر لوک کی موت کے سوا، باقی تمام اموات سے خود کو بری الذمہ قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ دیگر لوگوں کو اس کے تینوں ساتھیوں نے اپنی مرضی سے قتل کیا ہے۔ اس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

شام کے سوا پانچ بج رہے تھے، جب ڈاکٹروں نے ایبٹ کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ بستر سے اٹھ ہی رہا تھا، تب اچانک کمرے میں برادر لیو داخل ہوا۔ وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے اندر آتے ہی بے چینی سے پوچھا۔ "خدا بیڑا غرق کرے اس والکر کم بخت کا۔ مردوں کو تو چھوڑو، زندوں کے پیچھے بھی پڑ گیا تھا۔"

"اب وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا برادر۔" ایبٹ نے سکون سے کہا۔ "ویسے فکر کی بات نہیں، میرا زخم بہت معمولی ہے۔" ایبٹ دل ہی دل میں لیو پر چیخ و تاپ کھا رہا تھا۔ "مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میں بس نکل ہی رہا تھا۔" وہ بستر سے اتر کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے تو پھر تم میرے ساتھ چلو۔"

☆☆☆

صبح کو جب ایبٹ نیند سے جاگا تو آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے نہا دھو کر ناشتا کیا اور کھڑکی کھولی تو سامنے برادر لیو کیاریوں کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مالی لیمو کی جھاڑیاں کاٹ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ بڑا حیران ہوا اور فوراً کمرے سے نکل کر نیچے پہنچا۔ وہ نیچے کیاری کی طرف جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے برادر؟" اس نے لیو کے پاس پہنچ کر حیرت سے سوال کیا۔

"کچھ خاص نہیں۔ میں لیمو کی جھاڑیاں کٹوا رہا ہوں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں... مگر کیوں؟"

"نہ رہے گا لیمو، نہ میں پیوں گا لیمو پانی۔" لیو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تو تم خوش ہو؟" اس نے ایبٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ایبٹ نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" جینی کی آواز ابھری۔ وہ عقبی دروازے میں دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے مشکوک نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

کیڈ نے بڑے گڑھے پر سے نگاہیں اٹھا کر جینی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے یہاں کچھ دکھائی دیا ہے۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ تم ایک شیڈ بنانے جا رہے ہو؟ اور یہاں ایسا دکھائی دے رہا ہے جیسے تم سوئمنگ پول کے لیے گڑھا کھود رہے ہو۔ تم میرے صحن کو تباہ کر رہے ہو!" جینی نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے یہاں کچھ دکھائی دے رہا ہے۔" کیڈ نے یہ کہہ کر بیلچہ ایک طرف رکھ دیا اور ایک کلہاڑی اٹھالی۔

جینی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

پھر جونہی کیڈ نے کلہاڑی اوپر فضا میں بلند کی، جینی چیخ اٹھی۔ "نہیں... یہ مت کرو۔"

کیڈ کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں رک گیا۔ اس نے پلٹ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ جینی کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ کیڈ نے اس سے پہلے کبھی اپنی بیوی کو اس قدر خوف زدہ نہیں دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ڈیئر...؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں بس... میرا مطلب ہے... یہ تم کیا کر رہے ہو؟" الفاظ جینی کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

کیڈ نے گڑھے کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "اس گڑھے میں لکڑی کا ایک صندوق دبا ہوا ہے۔ یہ کوئی خزانہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"احمقوں والی باتیں مت کرو۔" جینی نے اپنی کیفیت پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔ "شاید یہ کوئی پرانی لکڑی ہوگی۔ اس پر واپس مٹی ڈال دو۔"

کیڈ نے اپنے جوتے سے اس لکڑی کے بکس پر ہلکی سی ٹھوکر ماری اور بولا۔ "یہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ یہ کسی چیز کا

رازوں کا صندوق

سلیم انور

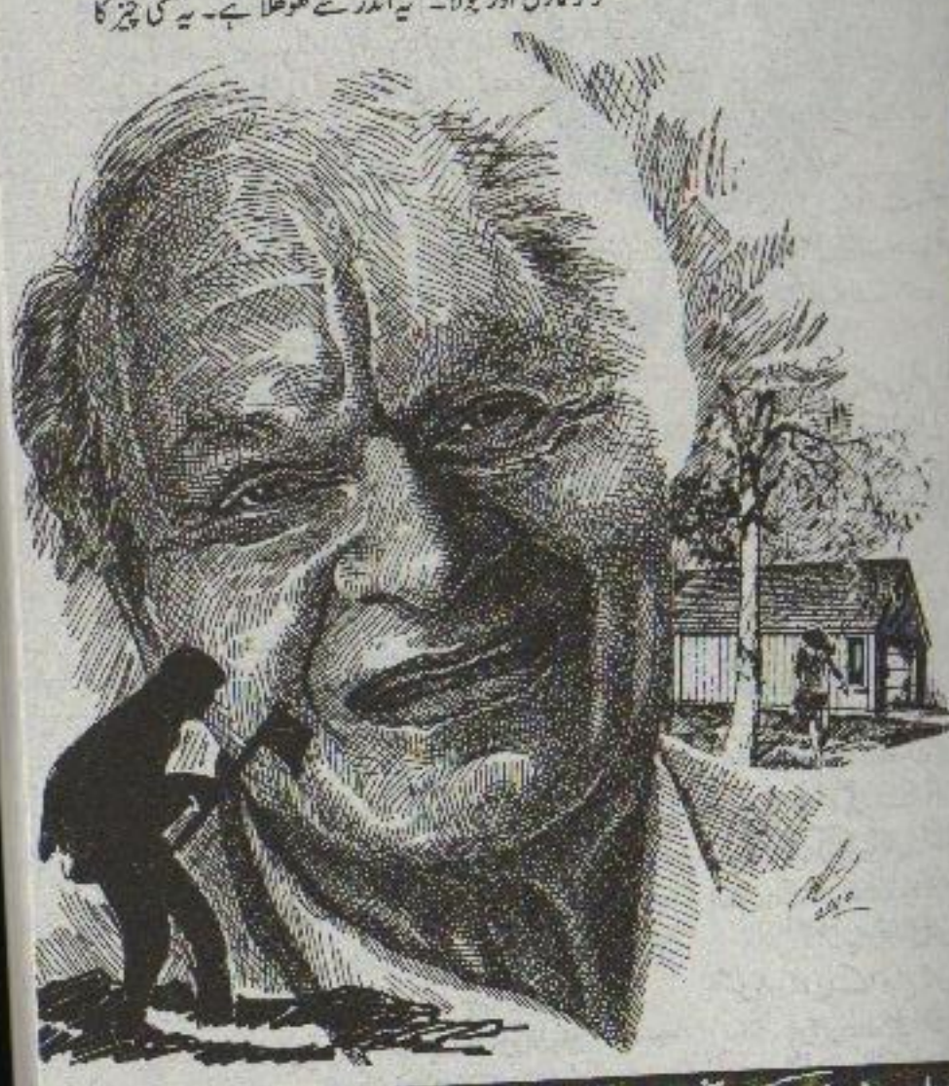

میاں بیوی سے زیادہ ایک دوسرے کا واقف حال شاید ہی کوئی اور ہو... مگر ان بستیوں کی زندگی کے نہاں خانوں میں بعض گوشے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان سے ایک نا واقفِ حال رہے تو ساگرِ حیات میں موجزر نہیں اٹھتے - کیونکہ نا آگہی میں ہی سب کچھ کارفرما ہوتا ہے۔

ان میاں بیوی کا احوال جو اپنی اپنی بات پر سختی سے کاربند تھے

http://pakfunplace.blogspot.com

لیلی یاد آ رہی تھی۔
کیڈ کا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر وہ آگے کی جانب جھکا اور اس نے اپنا ہاتھ لکڑی کے صندوق میں مزید گہرائی تک ڈال دیا۔

اچانک اس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیزی سے گھسٹتا ہوا گڑھے سے باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات نمایاں تھے اور اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

اس نے صندوق کے اندر گہرائی میں ٹٹولتے ہوئے جو کچھ محسوس کیا تھا، اس کے بارے میں وہ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔ اس کی انگلیوں نے جس چیز کو چھوا تھا، وہ اس کے بارے میں پُریقین تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس گڑھے کو واپس بھر دو۔''

یہ جملہ سنتے ہی کیڈ اچانک بوکھلا گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔

وہ جینی تھی۔

...اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔

کیڈ کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا حلق تر کیا اور بولا۔ ''تت... تم نے تو کہا تھا کہ لیلی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟''

''میں جو کہتی ہوں، تم سنتے کیوں نہیں ہو؟''

کیڈ اس صورت حال سے کافی خوف زدہ تھا اور اسی خوف کے زیر اثر اس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''ڈیئر... سنو، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ...''

''میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔'' جینی نے ایک آنکھ بند کرتے ہوئے پستول کا رخ کیڈ کے سینے کی جانب کر دیا اور ٹریگر دبا دیا۔

جب فائر کی گونج ختم ہو گئی تو جینی نے کیڈ کے بے جان جسم کو گھسیٹ کر گڑھے میں پھینک دیا اور ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

جب وہ لیلی سے کہا کرتی تھی کہ وہ اسے مار چھوڑے گی تو وہ بھی اس کی ایک نہیں سنتا تھا... اور اب کیڈ نے بھی یہی کیا تھا اور اس کے روکنے کے باوجود اس کی ایک نہیں سنی تھی۔

''آخر یہ مرد اپنی بیویوں کی سنتے کیوں نہیں ہیں؟'' جینی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

پھر اس نے بیلچہ اٹھایا اور گڑھے میں مٹی اچھال کر اپنے رازوں کے صندوق کو چھپانے میں مصروف ہو گئی۔

فتنہ پرداز

منظر امام

بے ایمانی اور بدعنوانی کی شاہراہ پر گامزن راہزنوں کا انوکھا کھیل

مہذب معاشروں میں سیاست کو عوام کی خدمت کا ایک معزز پیشہ کہا جاتا ہے مگر بعض ممالک میں حرص و ہوس کا ناسور اس بری طرح سرایت کر جاتا ہے کہ سیاست دان جائز و ناجائز کی پروا کئے بغیر شہرت اور دولت کے پیچھے دوڑتے چلے جاتے ہیں... اقتدار گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھ آتا ہے، باقی اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں کہ کب اور کہاں سے شہرت اور دولت سمیٹی جائے... ایسے ہی ایک سیاست داں کا احوال جس کا واسطہ ایک چور سے پڑ گیا تھا۔

اس نے اپنے استاد سے کہا۔ ''استاد، میں چوریاں کرتا چاہتا ہوں۔'' استاد نے بہت برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ابے... کیا پاگل ہو گیا ہے؟ اس دور میں چوریاں کرنے کا... اب اس فن کی عزت ہی کہاں ہے۔ اب تو [illegible] نے لے لی ہے۔ بس ایک ٹی ٹی اٹھاؤ اور مال [illegible] چلے جاؤ۔''

''نہیں استاد، مجھے ڈاکو نہیں بننا۔'' اس نے کہا۔ ''میں [illegible] دنیا کا سب سے کامیاب چور۔ تم مجھے اس [illegible] کوئی تکنیک سکھا دو۔''

استاد نے گہری سانس لی۔ ''ہا... کیا زمانہ تھا۔ کیسی قدر ہوتی تھی ہم لوگوں کی۔ ابے ہم آنکھوں کا کاجل تک چرا لیتے تھے۔ برسوں کی ریاضت کے بعد تھوڑی بہت کاریگری آتی ہے اور اب تو ذرا ذرا سے لونڈے موبائل چھینتے پھرتے ہیں۔ میرا موبائل بھی چھین کر لے گئے۔''

استاد دیانت اپنے زمانے کا نامی گرامی چور تھا لیکن اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں ایسے ایسے کارنامے کیے تھے کہ پورا شہر اسے استاد استاد کہہ کر پکارتا تھا۔

چوروں میں اس کی بہت عزت تھی۔ سب ہی اسے بابا کہا کرتے اور وہ اپنے اڈے پر شان سے بیٹھا رہتا۔ ہر جمعرات کو اس کے یہاں قوالیاں ہوا کرتیں اور وہ اپنے پیرو مرشد کو یاد کر کے جھومتا رہتا۔

تنویر نے استاد کو پھر مخاطب کیا۔ ''استاد پلیز، چوری کی ٹیکنیک سکھا دو۔''

''ایک بات بتا، تو چوری کیوں کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکو کیوں نہیں بنتا؟''

''میں نے بتایا نا استاد کہ میں پرانی روایات کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔'' تنویر نے کہا۔

''ہوں۔'' استاد نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے آنکھیں کھول کر تنویر کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تجھے شاگرد بنانے کے لیے تیار ہوں۔ ایک کلو مٹھائی اور اگر بتیاں لے آ۔''

تنویر ذرا سی دیر میں دونوں چیزیں لے آیا۔ استاد بہت دیر تک آنکھیں بند کیے کچھ پڑھتا رہا تھا پھر اس نے تنویر کے حق میں دعائیں کیں اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا۔

یوں تنویر کی تربیت شروع ہو گئی۔ تب [illegible] طریقے، اپنے آپ کو چھپانے کے طریقے، مکان میں [illegible] گھروں میں گھسنے کے دس طریقے، بھاگنے کے طریقے اور نہ جانے کیا کیا۔

تنویر کی تربیت یونہی پندرہ دن تک چلتی رہی۔

پندرہ دن کے بعد اس سے ایک چھوٹا سا امتحان لیا گیا۔ وہ اس امتحان میں شاندار انداز سے کامیاب ہو گیا۔ اس نے استاد ہی کی یادگار گھڑی چرالی تھی۔ استاد نے اس کامیابی پر اسے شاباش دی تھی۔ استاد نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جس مکان میں چوری کرو وہاں کی تفصیلی معلومات ضرور حاصل کر لو۔ مکان کتنا بڑا ہے، اس میں کتنے کمرے ہو سکتے ہیں۔ ملازمین کتنے ہوں گے اور کتے ہیں یا نہیں۔ مکان والوں کا طرز زندگی کیا ہے، وہ کس وقت سوتے ہیں یا کس وقت جاگتے ہیں۔

''ابے چوری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' چوری تو ایک فن ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھ دوں۔'' استاد نے فخریہ انداز میں کہا۔

☆☆☆

تنویر نے ایک مکان تاڑ لیا تھا۔

وہ ایک سیاست داں کا مکان تھا اور اس نے سیاست داں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

سیاست داں۔ اس کی بیوی، ایک کتا اور چھ ملازمین۔

تنویر نے یہ معلومات ایک ملازم سے حاصل کی تھیں۔ ''بھائی، ہمارا صاحب بہت عجیب مزاج کا بندہ ہے۔ میں تو رات کی ڈیوٹی سے تنگ آ چکا ہوں۔''

''تو کیا تم رات کو پہرا دیتے ہو؟''

''نہیں بھائی، گانے سنتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہی میری ڈیوٹی ہے۔ گیارہ بجے رات سے صبح چار بجے تک گانے سنتا ہوں۔''

''یہ کیسی ڈیوٹی ہے؟'' تنویر نے حیرت سے پوچھا۔

''صاحب کو نیند نہیں آتی۔ وہ چار بجے تک جاگتا رہتا ہے۔ لان میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی بھونڈی آواز میں گانے گاتا رہتا ہے اور میری ڈیوٹی یہ ہے کہ میں اس کی خدمت میں حاضر رہوں۔ پیتا بھی ہے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گلاس بنا بنا کر اس کے سامنے رکھتا رہتا ہوں۔''

''اور اس کی بیگم... وہ کیا کرتی ہے، وہ ساتھ نہیں دیتی؟''

''وہ اپنے مقدر کو برا بھلا کہتے ہوئے اپنے کمرے [illegible] ملازم نے بتایا۔ ''صاحب کو نیند نہ [illegible] پیتا ہے [illegible] بھی نیند نہیں آتی... اس لیے وہ رات بھر گانے گاتا رہتا ہے۔''

''تمہارے تو مزے ہیں یار، تمہیں تو کوئی خاص کام نہیں کرنا پڑتا۔''

''کیا خاک مزے ہیں میرے، تم اس طرح ایک ہفتہ رات رات بھر جاگتے رہو تو دماغ خالی ہو جائے گا اوپر سے اس کے گانے بھی سنو۔''

''اور کتا... وہ کیا کرتا ہے؟''

''وہ بھی منحوس قسم کا کتا ہے۔'' ملازم نے بتایا۔ ''صاحب تو جاگتا رہتا ہے اور وہ کم بخت سویا رہتا ہے اسے پرواہی نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون گیا۔'' یہ ایک کام کی بات معلوم ہو گئی تھی یعنی وہ کتا کسی کام کا نہیں تھا۔

''صاحب کے بچے تو ہوں گے؟'' تنویر نے پوچھا۔

''کیسی بات کرتے ہو صاحب کی کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''تو پھر تم کے دوسرے نوکر کیا کرتے ہیں؟''

''وہ اپنے اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاتے ہیں۔ صرف میں پھنس جاتا ہوں کیونکہ میری ڈیوٹی لگی ہے۔''

پھر تنویر نے اس رات اس مکان میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

استاد نے دعائیں دے کر اسے رخصت کیا بلکہ اس پر کچھ پڑھ کر پھونک بھی دیا تھا۔ ''بس اب جا تیرا کام ہو جائے گا اور ہاں پہلی کامیابی پر دس فقیروں کو کھانا ضرور کھلانا ہے۔''

''بالکل استاد یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ بس دعا کریں کہ اچھا بزنس ہو۔''

استاد سے اجازت لے کر وہ اس مکان کی طرف چل پڑا۔ اس کی جیب میں ایک چاقو کے سوا کچھ بھی نہیں تھا یہ بھی روایات کو نبھانے والی بات تھی۔

چور اپنے ساتھ آتشیں ہتھیار نہیں رکھا کرتے صرف چاقو رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس نے بھی ایک چاقو رکھا تھا اور ایک نقاب جیب میں رکھ لی تھی تاکہ وقت ضرورت اپنے آپ کو چھپائے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس مکان کے اگلے حصے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ عقبی حصے کی طرف پہنچ گیا۔ اس طرف بالکل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ اس کی معلومات کے مطابق صاحب اس وقت [illegible] اپنے اپنے کوارٹرز میں ہوں گے، بیگم صاحبہ کمرے میں ہوں گی اور کتا اپنی عادت کے مطابق سو رہا ہو گا یعنی اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس نے ریکی کرتے ہوئے اس درخت کو دیکھا وہ بڑی آسانی سے چار دیواری کے اندر کود سکتا تھا۔

اس نے استاد کو یاد کرتے ہوئے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ استاد کی تربیت اس کے کام آ رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ چار دیواری کے اندر تھا... چند لمحے سن گن لینے کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

مکان کے اگلے حصے سے کسی کے زور زور سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ''ساون کے بادلوں ان سے یہ جا کہو۔'' یہ صاحب کی آواز ہو گی جو اس وقت شروع ہوا تھا اور چار بجے تک اسی طرح گاتا چلا جاتا۔

اس نے باتوں باتوں میں اس ملازم کے ذریعے مکان کا پورا نقشہ بھی سمجھ لیا تھا۔ یہ گر بھی استاد ہی نے سکھایا تھا کہ کس طرح باتوں باتوں میں پورے حالات معلوم کیے جاتے ہیں اور وہ معلومات اس وقت اس کے کام آ رہی تھیں۔

دو چھپکلیاں کسی گھر کی دیوار پر ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہوئی تھیں اور چھپکلیوں کی نفسیات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں ادھر سے ایک جنازہ گزرا۔

پھر ایک شکاری چند لمحوں کے لیے چھپکلی کی نفسیات کو بھول گیا اور ڈور چھوڑ کر بچوں کی طرح سسکیاں اور ہچکیوں سے رونے لگا۔

''کیا بات ہے دوست؟'' دوسرے شکاری نے پوچھا۔ ''تم ہمیشہ جنازے دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی پر اس قدر سیم ہو جاتے ہو؟''

''نہیں۔'' پہلے شکاری نے چھپکلی سے نگاہ ہٹائی اور ڈور ہلائی۔ ''مرحومہ میری نہایت اچھی بیوی تھی۔''

وہ پچھتا گیا۔ ایک صحن تھا، آگے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک [illegible] کے بعد دوسرا [illegible] اور [illegible] اس کی بیگم ایک کنگ سائز بیڈ پر سوتی ہو گی۔

اس نے دروازے پر رک کر آہٹ لی۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا بلکہ ہلکی سی جنبش سے وہ کھلتا چلا گیا۔

کمرے میں گہرے نیلے رنگ کا بلب جل رہا تھا اسی لیے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ ایک قدم آگے بڑھا اور کوئی اس سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

تنویر کو احساس ہو گیا کہ اس سے کوئی مرد نہیں بلکہ ایک عورت لپٹی تھی۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ''آخر تم آ گئے نا، میں جانتی تھی کہ تم زیادہ دنوں تک کانوں پر ہاتھ نہیں رکھ سکتے۔ میری یاد ضرور آئے گی اور تم بے قرار ہو کر میرے پاس آؤ گے۔''

تنویر کو اب اندازہ ہو گیا کہ وہ عورت اسے کیا سمجھ رہی ہے لیکن وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس عورت کی گرفت مضبوط تھی۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"کیا بات ہے، اب اتنے خاموش کیوں ہو۔" اس عورت نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔

تنویر کا دم گھٹنے لگا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "ارے چھوڑ، چھوڑ مجھے۔"

"ارے واہ۔" وہ عورت ہنس پڑی۔

"اتنے عرصے بعد تم آئے ہو اب میں اتنی جلدی تمہیں جانے نہیں دوں گی..."

تنویر پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن اس نے مضبوطی سے اس کو جکڑ لیا۔ "تم جانتے ہو کہ میں کتنی طاقت ور ہوں۔ تم پہلے بھی کوشش کر کے دیکھ چکے ہو۔ میری پکڑ ایسی نہیں ہوتی کہ آسانی سے چھوٹ جائے۔"

تنویر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔

اس کا پورا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ اس کی آنکھیں... حلقوں سے باہر آنے لگی تھیں۔ بالآخر اس نے تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لیے چھوڑ دیں مجھے، میں آپ کا شوہر نہیں ہوں۔"

"کیا...!" اس عورت نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے سوئچ دبا کر روشنی بھی کر دی۔ وہ حیرت سے تنویر کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "ارے واہ، یہ بات ہوئی نا تم نے اپنی فرنچ کٹ صاف کرا دی۔ یہ کب کیا تم نے؟"

فرنچ کٹ۔" تنویر نے بوکھلا کر اپنے چہرے کو ٹٹولا۔ "لیکن میں نے تو کبھی ڈاڑھی نہیں رکھی۔"

"کامران تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔" اس عورت نے کہا۔ "سچ بتاؤ یہ فرنچ کٹ کب صاف کروائی؟"

"بیگم صاحبہ میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" تنویر جلدی سے بولا۔ "آپ ذرا غور سے سنیں۔ آپ کے شوہر کے گانے کی آواز آ رہی ہے۔"

کامران کے گانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ دوسرا گانا گا رہا تھا۔ "جب دل ہی ٹوٹ گیا تو پھر جی کر کیا کریں گے۔"

"سن لیا آپ نے؟" تنویر نے پوچھا۔

"ہاں سن لیا۔" اب وہ عورت خوفزدہ ہونے لگی۔ "یہ کامران ہی کی آواز ہے لیکن تم کون ہو؟"

"میں ایک چور ہوں بیگم صاحبہ۔" تنویر نے بتایا۔

"چور... لیکن اس دور میں چور کہاں ہوتے ہیں؟" عورت نے کہا۔ "چور تو ترقی کر کے ڈاکو بن گئے ہیں۔"

"لیکن میں وہی چور ہوں۔"

"کمال ہے، تم بالکل کامران کی شکل کے ہو۔ ٹھہرو میں کامران کو بلاتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں آپ انہیں نہ بلائیں۔ وہ آئے تو مجھے بند کرا دیں گے۔" تنویر نے کہا۔ "جبکہ آپ کچھ مہربان معلوم ہوتی ہیں۔ آپ مجھے جانے دیں۔ یہ میری پہلی چوری تھی اور وہ بھی بری طرح ناکام ہو گئی۔"

"بالکل نہیں، اب تم اس طرح نہیں جاؤ گے۔" اس عورت نے کہا۔ "تمہیں میرے شوہر سے مل کر جانا ہوگا۔"

تنویر کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ عورت نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ "کامی، کامی، شیخو، کامران جلدی آؤ جلدی۔"

اس کی چیخ پکار سن کر اس کا شوہر کامران جو سیاست اور دولت میں بھی کامران ہی تھا، کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ؟" اس نے کمرے میں آتے ہوئے کہا پھر تنویر کو دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ "یہ... یہ کون ہے؟"

"کامی یہ ایک چور ہے۔" عورت نے بتایا۔

"چور ہے تو اس کو پولیس کے حوالے کرو۔" کامران نے کہا۔

"نہیں، تم ذرا اسے غور سے تو دیکھو۔" عورت نے تنویر کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر اس کے چہرے پر فرنچ کٹ لگا دی جائے تو یہ کیسا ہو جائے گا۔"

کامران نے اب غور سے تنویر کی طرف دیکھا اور اچھل پڑا۔ "اوہ گاڈ، یہ تو بالکل میری طرح ہے۔"

"خود سوچو یہ تمہارے کتنے کام آ سکتا ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔" کامران نے اپنی گردن ہلائی۔ "یہ میرے بہت کام آ سکتا ہے۔" پھر اس نے تنویر کی طرف دیکھا۔ "تم یہ بھول جاؤ کہ تم ایک چور ہو۔ اب تم میرے دوست ہو... سمجھے۔"

☆☆☆

کامران اس کو اپنے خاص کمرے میں لے آیا۔

اس کی بیگم بھی اس کے ساتھ تھی۔

"سنیں!" بیگم نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "اس بندے سے پہلے پوچھ تو لیں یہ کہیں آپ کا جڑواں بھائی تو نہیں ہے۔"

"مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میرا کوئی جڑواں بھائی بھی تھا۔"

"ہو سکتا ہے کسی میلے میں بچھڑ گیا ہو کیونکہ جڑواں بھائی عام طور پر میلوں میں ہی بچھڑتے ہیں۔"

"نہیں بیگم صاحبہ۔" اس بار تنویر... بول پڑا۔ "میرا کوئی جڑواں بھائی نہیں تھا۔ میں اکیلا ہی اس دنیا میں آیا ہوں۔"

"تو پھر تم کامران کے ہم شکل کیوں ہو؟"

"اس کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے۔"

"سنو نوجوان۔" کامران نے اسے مخاطب کیا۔ "تم کو اقرار کرنا ہوگا کہ تم ایک چور ہو اور چوری کی نیت سے میرے گھر میں داخل ہوئے تھے۔"

"اقرار تو کر ہی رہا ہوں کیا اب لکھ کر دے دوں؟"

"ہاں لکھ کر بھی دو گے اور اپنا انگوٹھا بھی لگاؤ گے۔" پھر اس نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ "نازنین جاؤ۔ کیمرا لے آؤ۔"

اس کی بیگم کا نام اب معلوم ہوا تھا۔ نازنین... جو نازنین ہرگز نہیں تھی، کیمرا لے آئی۔ کامران نے کیمرا آن کرتے ہوئے حکم دیا۔ "چلو اب شروع ہو جاؤ۔"

اور تنویر شروع ہو گیا۔ "میں ایک چور ہوں۔ میں نے چوری کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ مجھے کہیں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ میں نے استاد ریاضت سے اس فن کی باقاعدہ تربیت لی ہے۔ میں چوری کرنے کامران خان کی کوٹھی میں داخل ہوا اور پکڑا گیا۔ یہ ہے میری کل داستان۔"

کامران نے ایک کاغذ پر یہ سب کچھ لکھوا کر اس کے دستخط کے ساتھ ساتھ اس کے انگوٹھے کا نشان بھی لے لیا۔

"کیا آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے؟" تنویر نے کہا۔

"نہیں تم سے کام لوں گا۔" کامران نے کہا۔ "اب تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"ظاہر ہے جناب، اب تو میں پھنس چکا ہوں۔ بتائیں میں کیا کروں؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی ہم خفیہ طور پر تمہاری تربیت کریں گے۔ تم کو بالکل میری طرح بننا ہوگا اور یہ اچھی بات ہے کہ تمہاری آواز بھی میری طرح ہے۔ تم ایک مہینے تک اس مکان کے ایک کمرے میں بند رہو گے۔ اس دوران میں تم شیو نہیں کرو گے تاکہ تمہاری ڈاڑھی نکل آئے۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی۔"

"میں سمجھ گیا جناب آپ مجھے اپنا ڈپلی کیٹ بنانا

ہمارے رہنما

"میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی شدید مصروفیات میں سے ہمارے اخبار کے لیے کچھ وقت نکالا۔"

"اس میں ممنونیت کی کون سی بات ہے، آپ غریب خانے پر تشریف لائے جس سے میری عزت افزائی ہوئی۔"

"یہ غریب خانہ کتنے ایکڑ میں ہے؟"

"صرف دو ایکڑ میں۔ بس جی بھلے وقتوں میں سر چھپانے کے لیے یہ جگہ بنائی تھی، میں تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس ملک میں لاکھوں کے پاس تو اتنی جگہ بھی نہیں ہے!"

"آپ کی جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟"

"مقاصد تو اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اگر صاحبانِ اقتدار سے آپ کی رسم و راہ ہو تو اغراض بھی عرض کر سکتا ہوں۔"

"اس کے لیے ہم علیحدہ میٹنگ کریں گے، فی الحال آپ یہ بتائیں کہ موجودہ خلیجی جنگ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

"معافی چاہتا ہوں، ابھی میں کھل کر رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"عراق اور سعودی عرب کے سفارت کاروں سے علیحدہ علیحدہ بات چل رہی ہے، حتمی طور پر کل پتا چل سکے گا کہ ان دونوں میں سے کس کے وسائل کی تباہی مسلم کے حق میں ہے!"

"مسلم آپ کے ایک بیٹے کا بھی تو نام ہے۔"

"جی ہاں! اسی کی وجہ سے پریشان ہوں، اس نے کاروبار شروع کیا ہے جس کے لیے وسائل کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عراق اور سعودی عرب میں سے کس کے وسائل مسلم کے کام آ سکتے ہیں!"

("ہنسنا رونا منع ہے" عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

http://pakmplace.blogspot.com

چاہتے ہیں۔"

"بالکل، تم میرے ڈپٹی کیٹ بن کر زندگی گزارو گے۔ جہاں میری ضرورت ہوگی۔ میں جاؤں گا اور جہاں میں تمہیں بھیجوں گا تم میرا رول ادا کرو گے۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے جیل ہی بھجوا دیں۔"

"نہیں تم وہی کرو گے جو کامران کہہ رہے ہیں۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "اسی میں تمہاری بھلائی ہے اور ویسے بھی تمہارا مستقبل ہی کیا ہے۔ تم ایک معمولی چور ہو۔ یہاں رہو گے تو عیش کرو گے۔" تنویر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

کامران نے خود اس کی تربیت شروع کر دی۔

اپنی طرح چلنا، باتیں کرنا، تقریر کرنا سب سکھا دیا۔ اپنے دوستوں، دشمنوں کے نام، ان کا تعارف، سیاسی معاملات۔ اس نے تنویر کو سب کچھ بتا دیا۔ اس دوران تنویر کو شیو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

ایک مہینے کے بعد دونوں بالکل ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ خود اس کی بیگم نازنین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔ "خدا کی پناہ، بالکل ایک جیسے۔ یہ بتاؤ کہ میں دونوں کو پہچانوں گی کس طرح؟"

"میں نے اسی وجہ سے اس کی مونچھ کو صرف ایک بات نہیں بتائی ہے۔" کامران نے کہا۔ "اور وہ بات صرف میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔"

"وہ کون سی بات ہے؟"

"وہ بلی اس رات کیا کر رہی تھی۔" کامران نے بتایا۔

"ہاں وہ اس رات۔" نازنین جھونک میں آ کر کچھ بتانے لگی۔

"بس خاموش، اب اس کے سامنے نہیں کہنا ہے۔"

"جناب اب تو میں آپ کی طرح ہو چکا ہوں۔" تنویر نے کہا۔ "اب مجھے کام بتائیں۔"

"تم سے گٹر کی صفائی کروائی ہے۔" تنویر نے بتایا۔

"جی، گٹر کی صفائی...؟" تنویر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہاں ایک علاقہ ہے، جس کو اسلم نگر کہتے ہیں۔ اس علاقے کے گٹر کئی دنوں سے بھرے ہوئے ہیں تمہارے ساتھ ایک ٹیم جائے گی اور تم ان کے ساتھ گٹر کی صفائی کرواؤ گے۔"

"یہ کیسا کام ہے جناب؟"

"تمہیں اعتراض نہیں کرنا ہے۔" نازنین نے کہا۔

"کامران نے جو بتایا ہے وہ تمہیں کرنا ہوگا۔"

آدھے گھنٹے بعد تنویر کو سوٹ پہنا کر بھنگیوں کی ٹیم کے ساتھ اسلم نگر بھیج دیا گیا۔ وہ کامران بنا ہوا بڑی شان کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو مسلح محافظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر استاد اسے اس طرح دیکھ لیں تو شاید ان کا انتقال ہی ہو جائے۔

ان کا یہ قافلہ اسلم نگر پہنچا تو وہاں ایک ہلچل مچ گئی۔ پورا علاقہ سمٹ کر ان کے پاس آ گیا۔ اس وقت تنویر بہت شاندار اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر شروع کر دی۔ "کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا۔ میں تو قطرہ ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا۔ میرا سمندر آپ لوگ ہیں، عوام ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے اور آپ کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اسی لیے جب پتا چلا کہ آپ کے علاقے کی گٹر لائن بند ہو گئی ہے تو خود صفائی کی ٹیم کو لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔"

کسی نے آواز لگائی۔ "کامران خان۔"

پھر دوسری آوازیں آئیں۔ "زندہ باد" بہت دیر تک یہ نعرہ بازی ہوتی رہی۔ اس وقت تنویر دل ہی دل میں کامران خان کو گالیاں دے رہا تھا۔ کم بخت خود تو گھر کے کسی کمرے میں عیش کر رہا ہوگا اور مجھے صفائی مہم پر بھیج دیا۔

کچھ دیر میں اخبارات اور چینل والے بھی آ گئے۔ ان کے سامنے صفائی مہم شروع ہو گئی۔ تنویر ایک طرف بیٹھا کام کی نگرانی کر رہا تھا اور لوگ تبصرے کیے جا رہے تھے۔

"میاں سیاست داں ہو تو ایسا۔"

"بھئی اس نے تو آج پرانے بادشاہوں کی یاد تازہ کر دی۔"

"میاں چہرہ تو دیکھو کتنا پُرسکون ہے۔"

"بھئی میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایسے آدمی کو ملک کا وزیر اعظم ہونا چاہیے۔"

دوپہر کے وقت اس نے بھنگیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا حالانکہ علاقے کے لوگ اسے اپنے اپنے گھر بلانے پر اصرار کر رہے تھے لیکن کامران خان کا حکم تھا کہ وہ صرف بھنگیوں کے ساتھ کھانا کھائے گا۔

اس کے اس عمل کے بعد پورے علاقے میں کامران خان کی دھوم مچ گئی۔ مرد، عورتیں، بچے اسے دیکھنے کے لیے چلے آ رہے تھے اور وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ان کا استقبال کیے جا رہا تھا۔

شام کو جب واپسی ہوئی تو اس کا پورا بدن درد کر رہا تھا۔ کامران خان نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا.....

"بہت لاجواب پرفارمنس رہی ہے تمہاری۔ مجھے ساری رپورٹس ملتی رہی ہیں۔"

"جناب، میں باز آیا ایسے کام سے یا تو مجھے اجازت دیں یا پھر سیدھے سیدھے جیل بھجوا دیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" کامران خان نے کہا۔ "ابھی تو تمہیں میرے لیے اور بہت کچھ کرنا ہے۔"

☆☆☆

ایک رات اس پر کمیٹی کے گانوں کا بھوت سوار ہو گیا۔

اس نے تنویر کو آٹھ دس گانے سنا ڈالے۔ تنویر اس کے سامنے بیٹھا بور ہوتا رہا پھر اس نے اکتا کر پوچھا۔ "جناب آخر آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ آپ سوتے کیوں نہیں ہیں؟"

"میرے بھائی، ایک عرصہ ہو گیا نیند سے محروم ہوئے۔" کامران خان نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ کوٹھی، شان و شوکت، سیاست، دولت، یہ سب میری نیند کو واپس لانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ میں تو تمہیں دیکھ کر رشک کرتا ہوں کہ تم کتنے آرام اور سکون کے ساتھ سو جاتے ہو۔"

"اس لیے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" تنویر مسکرا کر بولا۔

"ہاں شاید یہی بات ہے۔" اس نے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا لیا پھر دھیرے دھیرے چسکیاں لیتا ہوا بولا۔ "اب کل تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ یہ سمجھو کہ یہ تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہے۔"

"بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کل تمہیں ایک واک میں شرکت کرنی ہے۔" کامران خان نے بتایا۔ "تم تو جانتے ہو میرا تعلق اپوزیشن سے ہے۔ میں کل حکومت کے خلاف نکلنے والے جلوس کی قیادت کروں گا۔ میں سے مراد ہے تم۔ تم جلوس کے آگے آگے چلو گے۔"

"اگر حکومت نے کوئی ایکشن لے لیا تو پھر کیا ہوگا؟"

"یہی تو میں چاہتا ہوں کہ حکومت ایکشن لے۔" کامران خان نے کہا۔ "کل کا جلوس میری مقبولیت بڑھانے کا ایک زینہ ثابت ہوگا۔ لوگ مجھے ایک باکردار اور نڈر سیاست داں کی حیثیت سے جاننے لگیں گے۔"

"اور آپ کے لیے یہ سب کچھ میں کروں گا؟"

"ہاں، یہ سب تم کرو گے کیونکہ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب جو آپ کی مرضی۔"

دوسرا دن کافی شاندار رہا۔ بہت بڑا جلوس تھا جس کی قیادت تنویر کو کرنی تھی۔ وہ جب جلوس میں شرکت کے لیے پہنچا تو تالیاں بجنے لگیں۔ لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ "کامران خان، زندہ باد۔ کامران خان زندہ باد۔"

تنویر نے اس وقت پھر دل ہی دل میں کامران خان کو گالیاں دیں اور جلوس کی قیادت کرنے لگا۔ لوگ بہت پرجوش ہو رہے تھے کیونکہ کامران خان حق و انصاف کی خاطر اپنے گھر کے آرام کو چھوڑ کر باہر نکل آیا تھا۔

اس وقت تنویر خود کو کامران خان ہی محسوس کرنے لگا تھا۔ جب جلوس میں شریک ایک بوڑھے نے اس کے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔

"آپ لوگ مایوس نہ ہوں۔" وہ عوام کی طرف دیکھ کر بولا۔ "وہ صبح ضرور آئے گی جب ہر طرف اجالا ہوگا اور آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ہوں گی۔ تنویر... میرا مطلب ہے کامران خان آپ کے لیے جان کی بازی بھی لگا دے گا۔"

"کامران خان زندہ باد۔ کامران خان زندہ باد۔"

لیکن اس کے دیوتا اس وقت کوچ کر گئے۔ جب اس نے سامنے پولیس والوں کی قطاریں دیکھیں۔ وہ سب بہت جارحانہ انداز میں اپنی ڈھال آگے کیے آہستہ آہستہ بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

اس وقت کسی نے تنویر سے کہا۔ "سر، آپ ان کو بتا دیں کہ آپ ان سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔"

"ہاں، میں کسی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔"

"یہ لیں علامت کے طور پر پولیس والوں پر پہلا پتھر آپ ماریں۔"

"کیوں میں کیوں ماروں؟"

"اس لیے کہ پھر پورا جلوس آپ کی تقلید کرے گا سر۔"

تنویر نے پہلا پتھر مارا اور اس کے بعد اسے پھر ہوش نہیں رہا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ پولیس والے شاید کامران خان سے خار کھائے ہوئے تھے اسی لیے انہوں نے تنویر کو بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ پندرہ ڈنڈوں کے بعد اس نے چلانا شروع کر دیا۔ "ارے بھائی میں کامران نہیں ہوں، کامران نہیں ہوں۔"

لیکن اس ہنگامے میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ

http://pakfunplace.blogspot.com

بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

کچھ لوگوں نے اسے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ہر طرف کامران خان کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ حق و انصاف کا غازی، جرّی مجاہد اور نہ جانے کیا کیا۔

☆☆☆

اس وقت کامران خان اپنے گھر کے تہ خانے میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا پوری کوریج دیکھ رہا تھا۔

''واہ، اس بندے نے تو کمال کر دیا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس وقت پورے ملک کا سب سے مشہور سیاست داں ہوں دیکھ لینا اگلا وزیر اعظم میں ہی ہوں گا۔''

''دیکھیں کامران ایسا نہ ہو کہ وہ بوکھلا کر میڈیا کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دے۔''

''اگر اس نے یہ بتا دیا تو پھر میرے حق میں زیادہ اچھا ہوگا۔'' کامران مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ کیوں؟''

''پوری دنیا یہ سمجھے گی کہ مشہور سیاست داں اور عوامی رہنما سر پر لگنے والی کسی چوٹ کی وجہ سے پاگل ہو گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میری عزت اور بھی زیادہ ہونے لگے گی۔ لوگ پیار اور احترام کی نگاہوں سے مجھے دیکھیں گے اور کچھ دن بعد جب میں ٹھیک ہو کر ان کے سامنے پہنچ جاؤں گا تو لوگ مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔''

''واقعی آپ سچے سیاست داں ہیں۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔'' نازنین نے کہا۔ ''پھر اس بے چارے کا کیا ہوگا؟''

''اس کو خاموش کرنے کے اور راستے ہیں۔'' کامران سنگدلانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ٹی وی والے اسپتال کی کوریج کر رہے تھے۔ تنویر کے سر پر چوٹ آئی تھی لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ اس وقت بھی کامران خان کا رول نبھائے جا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ ہماری حکومت اور پولیس نہتے عوام پر اتنا ظلم کیوں کرتی ہے۔ آخر ہم نے مانگا ہی کیا تھا۔ صرف انصاف مانگ رہے تھے نا..... تو کیا انصاف پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے؟''

''نازنین۔'' کامران خان نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''اب مجھے اس شخص سے خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس کی باتیں سن رہی ہو۔ یہ کسی مستند سیاست داں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔'' کامران خان نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ اس کے دماغ پر کوئی بھوت سوار ہو جائے اور یہ میری جگہ لینے کی کوشش کرے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس بے چارے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک معمولی سا چور ہی تو ہے۔''

''معمولی سا چور تو ہے لیکن دماغ خراب ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس کو قابو میں رکھنا ہوگا اب۔''

ٹی وی اسکرین پر اب دوسری خبریں دکھائی جا رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر کامران خان نے نازنین سے کہا۔ ''نازنین ہم لوگوں سے ایک ٹیکنیکل غلطی ہو رہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اصولاً تمہیں اسے دیکھنے کے لیے اسپتال جانا چاہیے۔'' کامران خان نے کہا۔ ''کیونکہ دنیا اسی کو کامران خان سمجھ رہی ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔''

''تو جلدی جاؤ اور بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرنا۔''

''آپ اس کی فکر ہی نہ کریں۔''

نازنین جب اسپتال پہنچی تو اخبار والوں نے اسے بھی گھیر لیا۔ ''بیگم صاحبہ یہ فرمائیں کامران صاحب کے اس طرح زخمی ہو جانے پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟''

''مجھے اپنے شوہر پر فخر ہے۔'' نازنین نے کہا۔ ''میں ان کی محبت اور جرأت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ ملک اور قوم کے لیے کیا ہے۔''

''آفرین ہے آپ پر۔''

نازنین دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی تنویر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہاں ایک نرس موجود تھی اور تنویر پوری طرح ہوش میں تھا۔ نازنین کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''لیٹے رہو، لیٹے رہو۔'' نازنین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کامران، مجھے تم پر فخر ہے۔''

''کامران نہیں بیگم صاحبہ۔ میں تنویر ہوں۔''

''بے وقوف ہو تم۔'' نازنین نے سرگوشی کی۔ ''اس سے اچھا موقع تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ کامران تو ایک بزدل اور ناکارہ شخص ہے۔ اس کو جو عزت اور شہرت مل رہی ہے۔ وہ صرف تمہاری وجہ سے ہے۔''

''پھر بھی... وہ کہاں اور میں کہاں؟''

''بے وقوف، فائدہ اٹھاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ اگر تم ہمت کر جاؤ تو آج سے تم کامران اور وہ تنویر ہے۔''

''کیسے... یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''بہت آسان ہے۔ میں نے تو اسی وقت سوچ لیا تھا

تم تو ٹریننگ کے بہانے مجھے سچ مچ مار رہے ہو!

جب تم چوری کی نیت سے میرے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ اس بے وقوف کو تو رات رات بھر جاگ کر سوائے گانا گانے کے اور کچھ بھی نہیں آتا۔''

''لیکن مجھے تو گانا نہیں آتا۔'' تنویر نے کہا۔

''آپ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' نازنین مسکرا دی۔ ''اب تم میرے ساتھ چلو۔''

☆☆☆

ایک بار پھر وہ آمنے سامنے تھے۔ کامران کے اس وقت ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وہ فریاد کرنے والی نگاہوں سے نازنین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''نازنین میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگر یہ ہیرو پیا میری جگہ لینا چاہے تو آسانی سے لے سکتا ہے۔ اب دیکھ لو، اس کم بخت نے اپنی اصلیت دکھا دی۔''

''تم دونوں مجھے کیوں الجھا رہے ہو۔'' نازنین نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم دونوں میں سے کون کامران ہے اور کون تنویر؟''

''میں ہوں کامران۔'' تنویر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''کیا تم مجھے پہچان نہیں رہیں، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔'' کامران غصے سے دہاڑا۔ ''نازنین اگر یہ کم بخت کامران ہے تو اس سے پوچھو کہ اس رات بلی کیا کر رہی تھی؟''

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود بتا دیتا ہوں کہ اس رات بلی کیا کر رہی تھی۔''

''چل بتا، کیا کر رہی تھی؟''

''وہ دودھ پی رہی تھی۔'' تنویر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''او خدا، یہ بات تجھے کس نے بتائی۔'' کامران بلبلانے لگا۔ ''نازنین کیا تم نے بتائی ہے؟''

''میں کیوں بتانے لگی۔ یہ کامران ہے، میرا شوہر۔ اسے نہیں معلوم ہوگا تو اور کسے معلوم ہوگا۔''

''میں جان سے مار دوں گا تم دونوں کو۔ یہ میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔''

''سازش تو تم کر رہے ہو ذلیل انسان۔'' تنویر نے کہا۔ ''میری جیسی فرنچ کٹ رکھ کر، مجھ جیسا بن کر مجھے اور پورے ملک کو دھوکا دے رہا ہے۔''

''خاموش۔'' کامران گلا پھاڑ کر چلّایا۔ ''جان سے مار دوں گا تجھے۔''

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جھوٹے سیاست داں۔ کیونکہ میں کامران ہوں۔ پوری دنیا اس بات کی گواہی دے گی۔ کامران خان کے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی۔''

''وہ تو میرے چہرے پر بھی ہے۔'' کامران خان نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی رہ گیا۔ ''کم بختو۔ کہاں ہے میری ڈاڑھی؟''

''وہ ہم نے رات ہی کو صاف کر دی تھی۔'' تنویر نے بتایا۔

''تم کو نیند تو آتی نہیں ہے۔'' نازنین نے کہا۔ ''اسی

http://pakfunplace.blogspot.com

یے انہیں شراب میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔
"مکار عورت تو یہ تیری سازش ہے۔" کامران غصے سے بلبلانے لگا۔

"ہاں۔" نازنین مسکرادی۔ "تم تو بس ساری رات جاگ کر الٹے سیدھے گانے گاتے رہو اور دن بھر بستر پر پڑے رہو اور تمہاری سیاست کا سارا بوجھ یہ بے چارہ برداشت کرے۔" اس نے تنویر کی طرف اشارہ کیا۔

اچانک کامران خان نے تنویر پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اسے مارنا چاہتا تھا لیکن نازنین نے شور مچا کر ملازمین کو اکٹھا کرلیا۔ "پکڑلو اسے۔" اس نے کامران کی طرف اشارہ کیا۔ "چور گھس آیا ہے۔"

ملازمین نے کامران خان کو پکڑ کر مارنا شروع کردیا۔ کامران خان غصے سے پاگل ہونے لگا۔ اس نے گالیاں دینی شروع کردیں۔ اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔

نازنین تنویر کے ساتھ چپکی ہوئی کھڑی تھی۔ اس دوران میں کسی نے پولیس کو بھی فون کردیا تھا۔ پولیس آفیسر کامران خان کا مداح معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تنویر سے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں سر، اس پر ہم کئی کیس بنادیں گے۔ یہ کوئی بہت خطرناک بہروپیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔"

"لے جاؤ اس کو۔" تنویر نے کہا۔ "اور لمبی سزا دلوانا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر۔" پولیس آفیسر مسکرادیا۔ "اس پر تو شہر بھر میں بکنے والی ہیروئن کا کیس بھی ڈال دوں گا۔"

"اور صاحب جی پرسوں جو بینک میں ڈاکا پڑا تھا۔" ایک پولیس والے نے یاد دلایا۔

"ہاں، ہاں وہ بھی اس کے کھاتے میں جائے گا۔"

کامران اس دوران چیخ چیخ کر گالیاں دیتا رہا۔ پولیس والے اسے مارتے ہوئے لے گئے بلکہ جاتے جاتے ایک پولیس والے نے تنویر سے آٹوگراف بھی لے لیا۔ کامران خان کا آٹوگراف... جو مستقبل کا وزیراعظم بننے جا رہا تھا۔

ان کے چلے جانے کے بعد تنویر نے نازنین سے پوچھا۔ "یہاں تک تو ہوگیا بیگم صاحبہ اب بتائیں اب کیا کرنا ہے؟"

"بیگم صاحبہ نہیں... نازنین۔" نازنین نے تصحیح کی۔ "مجھے امید ہے کہ تمہیں پرانے گانے نہیں آتے ہوں گے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" تنویر مسکرادیا۔ "اور نہ ہی مجھے رات کو جاگنے کی عادت ہے۔"

☆☆☆

جیل میں کچھ دنوں تک تو کامران خان نے بہت شور مچایا پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ اس نے شاید حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔

ایک رات ایک قیدی نے اسے پہچان لیا۔ "سر جی آپ تو کامران خان ہیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں بھائی میں تنویر ہوں، ایک چور۔"

"دنیا چاہے کچھ بھی کہتی رہے میں تو نہیں مانوں گا سر جی۔" قیدی نے کہا۔ "آپ کامران خان کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتے۔ میں نے برسوں آپ کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔"

"کس قسم کی خدمت کی ہے؟"

"سر جی، آپ کو نیند نہیں آتی تھی اور آپ رات کو لان میں بیٹھ کر پرانے گانے گاتے رہتے تھے۔"

"بے وقوف ہو تم مجھے کوئی پرانا گانا نہیں آتا اور میں خوب رج کے سوتا ہوں۔" کامران خان نے کہا۔ "اس کامران خان کو نیند نہیں آتی ہوگی لیکن میں زندگی میں بھی اتنے آرام کی نیند نہیں سو پایا جتنا آج کل سو رہا ہوں۔ وہ کامران خان مرچکا ہے بھائی میں دوسرا کامران خان ہوں۔ وہ کمبخت کامران خان تو اس وقت بھی جاگ رہا ہوگا۔"

اور تنویر واقعی جاگ رہا تھا۔ بالکل کامران خان کی طرح۔ ملازم اس کے پاس تھا اور وہ شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے گائے جا رہا تھا۔ "آیا ہے پھر یاد وہ ظالم گزرا زمانہ بچپن کا۔"

نازنین کو آتے دیکھ کر ملازم خاموشی سے چلا گیا۔ نازنین غصے میں بھری ہوئی تنویر کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ "یہ تم کیا کرنے لگے ہو۔ تم بھی وہی حرکت کررہے ہو جو کامران خان کرتا تھا۔"

"نازنین میں مجبور ہوں۔" تنویر دھیرے سے بولا۔ "جب سے دولت، شہرت اور سیاست میرے پاس آئی ہے۔ میری نیند مجھ سے روٹھ گئی ہے نازنین... نیند روٹھ گئی ہے۔ میں چور ہی بہتر تھا۔ کم از کم سکون کی نیند تو سو لیتا تھا لیکن اب..."

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر دھیرے دھیرے رونا شروع کردیا۔ لان کی فضا بوجھل ہوتی چلی گئی۔

○

پہلا رنگ

سودوزیاں

انوار صدیقی

کبھی کبھی کوئی وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان امنگوں اور ترنگوں سے لبریز ہوتا ہے... اس کا ہر لمحہ اک عہد کے مانند ہوتا ہے... اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ہی اس انسان کے جذبات و احساسات برف زاروں میں بدل جاتے ہیں... جب نظروں میں کوئی نظارا اور آنکھوں میں کوئی خواب باقی نہیں رہتا... اس کی زندگی کے آسائشات سے بھرپور لمحے محض سراب... اور اعداد و شمار کے حساب میں صرف خسارہ ہی نکلتا ہے۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں میں ڈوبتی ابھرتی... درد بھری کتھا جس کا ہر کردار شدت جذبات سے مغلوب تھا۔

فکرِ سودوزیاں کی قید سے رہائی پانے والے ذہنوں کی عبرت ساماں تصویریں

فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔

مہوش اور ضیا ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے کھانے میں مشغول تھے لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی فون کی سمت توجہ نہ دی۔ گویا یہ گھنٹی کسی اور کے گھر بج رہی ہو۔

فون چیخ چیخ کے خاموش ہوگیا تو دونوں نے اپنی اپنی جگہ سکون کا سانس لیا لیکن یہ سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ دو منٹ گزرنے کے بعد فون نے چیخ کر پھر کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی مہوش نہایت سکون سے بیٹھی اپنی پسندیدہ ڈش کے ساتھ انصاف کرتی رہی۔ البتہ ضیا نے اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ اسے شبہ تھا کہ کانچ میں

پڑھنے والی آزاد خیال لڑکی جسے کھانے پینے، بڑے بڑے ہوٹلوں میں پارٹیاں اٹینڈ کرنے، قیمتی لباس اور قیمتی زیورات پہننے والی... اس وقت جس انداز میں معصوم اور بے نیاز بیٹھی ہے، وہ اس کی اصلیت نہیں تھی۔

وہ اپنی شریک حیات کو اپنے اس عالی شان بنگلے کے قیمتی فرنیچر اور نایاب سامان سے آراستہ ڈائننگ روم میں بیٹھا چور نظروں سے دیکھتا رہا۔ مہوش کی بے نیازی اس کے ذہن پر آہنی ضربیں لگا رہی تھی... پھر وہ چپ نہ رہ سکا۔ اس نے خاصی بلند آواز میں گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کو آواز دی۔

"روبی... روبی! کہاں مر گئیں تم؟"

ضیا کی آواز سن کر جو خوبصورت ملازمہ ماتھا باندھے سہمی سہمی سامنے آئی، وہ بھی کسی حسین تتلی سے کم خوبرو نہ تھی۔

"جی صاحب..." روبینہ نے جسے روبی کہتے تھے، گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "آپ نے آواز دی تھی؟"

"کہاں مر گئی تھی...؟" ضیا نے مہوش کو سنانے کی خاطر روبینہ کے شانے استعمال کیے۔ "اتنی دیر سے فون کی گھنٹی چیخ رہی ہے اور تجھے سنائی نہیں دیتی۔"

"سنائی تو دے رہی تھی صاحب لیکن وہ... وہ..." روبینہ نے ڈرتے ڈرتے مہوش کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں جواب دیا۔ "بیگم صاحب نے منع کیا تھا کہ جب آپ دونوں کھانے میں مشغول ہوں تو کوئی قریب نہ آئے۔"

"پہلے فون سن... پھر فضول باتیں کرنا۔" ضیا نے سخت لہجے میں ڈانٹا تو روبینہ کسی پھرکی کی طرح گھوم کر فون کی طرف چلی گئی۔

"ہیلو... جی... آپ کون بول رہی ہیں؟... جی نہیں، آپ نے غلط نمبر ملایا ہے..." روبینہ نے بات ختم کر کے فون رکھا تو مہوش کے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و گداز ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم پھیل گیا مگر وہ بدستور بے نیاز بنی رہی۔

"کس کی کال تھی؟" ضیا نے اس بار قدرے نرم آواز میں سوال کیا۔

"کوئی پروین بی بی تھیں۔ اختر صاحب کو پوچھ رہی تھیں۔ جو نمبر بتا رہی تھیں، وہ ہمارا نہیں تھا۔" روبی نے ایک ہی سانس میں پوری بات کہہ ڈالی۔

ضیا نے برا سا منہ بنا کر ہاتھ سے اشارہ کیا تو روبینہ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

"آج کل پھر رانگ نمبرز کا سلسلہ شروع ہو گیا؟" روبینہ کے جانے کے بعد ضیا نے مہوش کو سنانے کے لیے کہا۔

"ایک بار کیبل کی تاریں الجھ جائیں تو پھر اس قسم کی خرابیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔" مہوش نے ضیا کی طرف دیکھے بغیر بے پروائی سے جواب دیا۔

"طنز کر رہی ہو...؟" ضیا اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا۔

"بات رانگ کالز کی ہو رہی تھی۔ اس میں آپ کو طنز کیسے نظر آ گیا؟" اس بار مہوش نے شوہر کو دیکھ کر چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے... کیا میں اس شہر میں نہیں رہتا؟"

"میں بھی محفلوں میں جاتی ہوں تو وہاں الٹی سیدھی خبریں سننے کو مل جاتی ہیں۔" مہوش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "لوگوں کی زبانوں پر تالے تو نہیں ڈالے جا سکتے۔"

"شیش محل جیولرز کے مالک کو جانتی ہو...؟"

"ہاں..." مہوش نے شانے اچکائے۔ "پہلی بار آپ ہی نے اس سے میرا تعارف کرایا تھا۔"

"دو روز پہلے اس کا ایک بل اور آیا تھا میرے پاس۔" ضیا نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے مہوش کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ "بیالیس ہزار کا..."

"زرد رنگ کے پکھراج کی ایک معمولی انگوٹھی تھی۔" مہوش نے ہاتھ میں دبے گلاس سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے بے پروائی سے وضاحت کی۔ "راحیلہ ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ شیش محل جیولرز کی شاپ پر لے گئی تھی۔ دراصل اسے اپنے شوہر کو سالگرہ پر دینے کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔ اسے پکھراج کی انگوٹھی پسند آ گئی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے اور آپ کی طرف سے وہ انگوٹھی لے کر اسے پیشگی تحفہ دے دیا۔ کیوں... کیا آپ شاکر بھائی کو کوئی تحفہ نہ دیتے؟"

"پہلے تم انہیں صرف شاکر صاحب کہتی تھیں... یہ شاکر بھائی کہنا کب سے شروع کر دیا...؟"

"تعلقات گہرے ہونے لگیں تو رشتوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔" اس نے بھویں سکیڑ کر طنزیہ انداز میں شوہر کی طرف دیکھا۔ "آپ بھی تو اب انہیں شاکر بھائی ہی کہتے ہیں۔ پھر مجھ پر یہ اعتراض کیوں...؟"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا..." ضیا جھلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"شروعات ہمیشہ آپ ہی کی طرف سے ہوتی ہے ورنہ..." اس نے مسکرا کا جملہ ادھورا چھوڑا تو ضیا کی تیوری پر بل آ گئے۔

"ورنہ کیا...؟" اس نے سر سراتے انداز میں وضاحت چاہی۔

"بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو آئینہ سمجھ کر نہیں دیکھنا چاہیے..." وہ تلملا کر کسی بپھرے ہوئے طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اسی میں ہماری اور ہمارے بچوں کی بہتری ہوگی۔"

پھر وہ ضیا کا جواب سننے کے لیے رکی نہیں۔ ہاتھ میں دبا نیپکن ایک طرف اچھال کر تیزی سے پلٹی اور اپنی بیٹی ماہ جبیں کی خواب گاہ کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ ماہ جبیں جسے وہ لاڈ سے ماہا کہہ کر پکارتی تھی۔

☆☆☆

رات کے سوا گیارہ بجے تو ماہا نے آہٹ سن کر کروٹ لیتے ہوئے ماں کی طرف معصوم نظروں سے دیکھا۔

"تم... ابھی تک سوئی نہیں...؟"

"مما... کیا پاپا ابھی تک نہیں آئے...؟" ماہا نے ماں سے سوال کیا۔ "کیا آج پھر دفتر میں دیر ہو گئی؟"

"کوئی ضروری کام پیش آ گیا ہوگا۔" اس نے ماہا کو پیار اور غصے کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔ "تم اب سو جاؤ... صبح اسکول بھی جانا ہے۔"

کچھ دیر بعد ماہا کروٹ لے کر سو گئی تو وہ اپنے نائٹ گاؤن کو درست کرتے ہوئے لان کی جانب کھلنے والے ٹیرس پر آ گئی جہاں ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اسے خوش آمدید کہا۔ بڑی دیر تک وہ ٹیرس پر کھلے آسمان تلے چہل قدمی کرتی رہی۔

اس کے ذہن میں ماضی اور حال کے گزرے واقعات گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ تلخ و شیریں یادوں کے دوش پر کسی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی ڈولتی کئی سالوں کی مسافت پل بھر میں طے کر گئی۔

وہ ایک درمیانے درجے کے مکان کی چھت پر ننگے پاؤں کھڑی، منڈیر کی جالیوں سے سامنے والے کھلے میدان کے ایک بڑے پتھر پر بیٹھے اس نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو کئی دنوں سے نہ جانے کیوں اس پتھر پر خاموش بیٹھا بار بار اسی کی چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا... جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

نوجوانی کے دن تھے اور وہ دل میں تجسس لیے سوچ رہی تھی... کون ہے وہ جس نے اس بھولے بھالے نوجوان کو دیوانہ بنا رکھا ہے؟ کس نے اس نوجوان کو بار بار چور نظروں سے اسی کی منڈیر کی طرف نظریں اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے؟

وہاں تو چھوٹے بڑے اور بھی بہت سارے مکان تھے جن کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

وہ نوجوان اس آبادی کا رہائشی نہیں تھا۔

پھر اتنی دور کیا لینے آتا تھا؟

بڑی دیر تک وہ اس نوجوان کے صبر، اس کے انتظار کے حوصلوں کو کھوجتی رہتی پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی بے پروائی سے کھڑی ہو جاتی۔ ساڑھے تین فٹ کی دیوار سے وہ کسی بدلی میں چھپے چاند کی طرح منڈیر کی جالیوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آتی تو وہ نوجوان بھی کسی چکور کی طرح بے تابی سے پتھر کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا — اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ بھی دیوانہ وار پرواز کرتا ہوا اس کی منڈیر پر آ بیٹھتا اور بڑی حسرت سے پوچھتا۔

"کب تک میرے صبر کو آزماتی رہو گی...؟ کب تک انتظار کی سلیب پر چڑھائے رکھو گی؟ جب حوصلہ دیا ہے تو میری طرح تم بھی قدم آگے بڑھاؤ۔ محبت ہے تو اس کا اظہار بھی کر ڈالو... تمہاری طرف سے انکار میں جواب ملا تو میں واپس اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں گا اور... اگر حوصلہ دیا تو پھر میں بوڑھے والدین کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دوں گا۔ آگے جو قدرت کو منظور ہو..."

وہ اس نوجوان کو مسکرا مسکرا کر ٹالتی رہی... کبھی اپنی کسی شوخ ادا سے اس کو خوابوں کی حسین وادی کی سیر کراتی، کبھی سرراہ اس کے قریب سے یوں گزر جاتی جیسے کوئی اجنبی ہو۔ اس کے ساتھ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتے کھیلتے ہر طرح آزماتی رہی پھر ایک دن اس نے ضیا کو اپنانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ کاغذ کے ایک پرزے پر "ہاں" لکھ کر اس کی طرف پھینک دیا۔

اس دوران میں ضیا کے بارے میں اس نے بہت ساری معلومات جمع کر لی تھیں۔ وہ بھی اس کی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں گھرانوں کے والدین بھی تقریباً ہم خیال ہی تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضیا کے گھر والوں کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے اپنا اور ضیا کا موازنہ نہ کیا ہو۔

ضیا درمیانے قد، سانولی رنگت کا حامل سیدھا سادہ اور نیک طبیعت کا مالک انسان تھا جو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کے کاروبار میں بھی ہاتھ بٹاتا تھا۔ ضیا نے شاید زندگی میں پہلی بار اسی کی شکل میں کوئی حسین خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر پانے کے لیے وہ دیوانہ ہو گیا تھا جبکہ مہوش ایسا ہی ایک حسین خواب تھی جسے دیکھنے کی تمنا میں کوئی ساری زندگی بھی امیدوں کے سہارے گزار سکتا تھا۔ وہ پری چہرہ تھی۔ سرخ اور

http://pakurdupoint.com

گلابی رنگت کی مالک۔ وہ قہقہہ لگاتی تو اس کے موتی جیسے دانت اپنی جھلک دکھاتے۔ فضا اس کے قہقہوں کی آواز سے کھنک اٹھتی۔ اس کی دراز زلفیں اس کے مخملی جسم سے سرگوشیاں کرنے لگتیں۔

وہ کسی شاعر کا خواب تھی جس میں پہاڑی جھرنوں کی سی ترنم ریزیاں گھلی ہوئی تھیں۔ وہ کسی مصور کا شاہکار تھی۔ انمول اور نایاب۔ کسی نرم و نازک اور لچکتی شاخ پر گلاب کا ادھ کھلا پھول تھی۔

اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ جس راہ سے گزرتی اس کے ہزاروں طلب گار نگاہ و دل فرش کر دیتے۔ بڑے بڑے گھرانوں سے اب تک اس کے سیکڑوں رشتے آچکے تھے۔ والدین اس کی مرضی دریافت کرتے تو وہ "نہ" کر دیتی۔ قرب و جوار میں رہنے والی واجبی شکل و صورت رکھنے والی لڑکیوں کے والدین جب اس کے دروازے کے سامنے کوئی چمچماتی قیمتی کار کھڑی دیکھتے تو ان کے دلوں پر سانپ لوٹ جاتے۔

ایک روز اس کے لیے ضیا کے والدین بھی رشتہ لے کر آگئے۔

جس گھر میں بیری کا درخت ہو، وہاں پتھر بھی ضرور آتے ہیں۔ مہوش کے والدین نے حسب معمول ضیا کے گھر والوں کو دیکھ کر بظاہر خوشی کا اظہار کیا مگر انہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں بھایا۔ اول تو مہوش اور ضیا کے رنگ روپ میں زمین آسمان کا فرق تھا، دوسرے ضیا کا قد بھی ذرا چھوٹا سا تھا۔ اس کے علاوہ باقاعدہ وہ کہیں برسر روزگار بھی نہیں تھا۔ جس کاروبار میں وہ باپ کے ساتھ مل کر محنت کر رہا تھا، وہ بھی ایسا نہیں تھا جس پر بھروسا کر کے لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا۔

لڑکی اور لڑکے کا بیاہ اندھا جوا ہوتا ہے۔ قبل از وقت یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہوگا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکا کروڑوں میں کھیل رہا ہوتا ہے لیکن آنے والی قسمت کی پرچھائیں اس کو پیسے پیسے کا محتاج کر دیتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکا روکھی سوکھی پر گزارہ کرتا ہو اور بیاہ کر آنی والی لڑکی اس پر دولت کے خزانوں کا منہ کھول دیتی ہے لیکن دیکھتے بھالتے، جیتی جاگتی مکھی کوئی نہیں نگلتا۔

ضیا کے گھر والے سیدھے سادے شریف لوگ ضرور تھے لیکن ضیا اور مہوش کے درمیان خوبصورتی اور قد کا معاملہ قطعی بے جوڑ تھا۔ پھر بھی انہیں ٹکا سا جواب دے کر مایوس نہیں کیا گیا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد مہوش کی والدہ نے حسب معمول اپنے خاوند سے ان کی رائے معلوم کی جو ایک دین دار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ نکلتا ہوا قد، چوڑا چکلا سینہ، مور کے کھلے پروں کی طرح مٹھی بھر سے کہیں زیادہ بڑی سفید داڑھی۔ سفید شلوار قمیص پر سیاہ رنگ کی شیروانی اور سر پر اونچے دائرے والی کلف شدہ ٹوپی پہن کر وہ اپنی کشمیری کام والی چھڑی تھامے گھر سے نکلتے تو گلی میں رہنے والے سارے چھوٹے بڑے انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے لیکن گھر میں... گھر کی مرغی دال برابر والی بات تھی۔

مہوش کی والدہ نے جب سرسری طور پر ضیا کے رشتے کی بات چھیڑی تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئے پھر بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد بولے۔ "مجھے تو اس رشتے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی بلکہ ایک اچھی بات یہ ہے کہ ضیا کے والد مجھے کی نماز اسی مسجد میں پڑھتے ہیں جس میں، میں پابندی سے جاتا ہوں۔ واجبی سلام دعا بھی ہوتی رہتی ہے ان سے۔"

"میں لڑکے کے والد کے بارے میں نہیں، ان کے گھرانے ... مالی حالات اور خاص طور پر لڑکے کے بارے میں دریافت کر رہی ہوں۔"

"آپ عورتوں کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں، اس سے آپ نے کوئی نتیجہ تو ضرور اخذ کیا ہوگا؟" مہوش کے والد نے گیند اس کی طرف اچھال دیا۔

"ہاں ہاں... زبان کلام کے اعتبار سے تو وہ بھی ہم جیسے ہی ہیں لیکن ان کے لڑکے اور ہماری لڑکی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"مثلاً... کیا؟"

"لڑکا قد و قامت میں درمیانہ ہے جبکہ اپنی مہوش اب بھی قد نکال رہی ہے۔"

"اور..."

"لڑکا ذاتی طور پر کچھ بھی نہیں کھاتا کماتا، باپ کے کاروبار میں ہاتھ ضرور بٹاتا ہے لیکن کاروبار ایسی نوعیت کا ہے جس میں ترقی کے امکانات بھی کم ہیں۔ میں بڑا بول نہیں بولوں گی لیکن اس بات کا اندیشہ بھی ضرور ہے کہ ہماری بچی کو وہاں جا کر ایک ایک دمڑی کے لیے ساس سسر کا محتاج ہونا پڑے گا۔"

"اپنی بیٹی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے...؟"

"چشم بددور... وہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں بہتر ہے۔ پھر میرا دل بھی کہتا ہے کہ اس کے نصیب میں دوسرے گھر جا کر بھی راج کرنا لکھا ہے۔"

"ان دوسرے گھروں میں آپ نے کیا کسی وجہ سے ضیا

http://pakfunplace.blogspot.com

میاں کے گھر کا شمار نہیں کیا؟"

"مجھے معلوم ہے آپ بہت زیادہ بال کی کھال نکالنے والے ہیں لیکن یہ ہماری لڑکی کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ اس لیے خدا کے واسطے ذرا سنجیدہ ہو جائیں۔" مہوش کی والدہ نے پیشانی سے پسینا خشک کرتے ہوئے عاجزی کا اظہار کیا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میں اب تک تقریباً ایسے بیس رشتوں سے انکار کر چکی ہوں جہاں مہوش اگر ایک بار ہاں کر دیتی تو ساری زندگی دولت میں کھیل سکتی تھی لیکن نہ جانے اس کے سر میں کیا سینگ سمایا ہے کہ جب بھی کسی بڑے گھرانے سے کوئی پیغام آتا ہے، وہ یا تو لڑکے کی تصویریں دیکھ کر اس میں بلاوجہ کے کیڑے تلاش کرنے لگتی ہے یا پھر صاف انکار کر دیتی ہے۔ میں اسی وجہ سے اسے میٹرک سے آگے تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں تھی لیکن آپ نے اس کے کالج جانے کی حمایت کی تو میں بے بس ہو گئی۔"

"ارے... ارے..." مہوش کے والد نے احتجاج کیا۔ "آپ نے پھر وعدہ خلافی کی۔ یہ کالج کے سلسلے میں میری حمایت والی بات کے بارے میں پہلے بھی آپ دس بیس موقع پر وعدہ کر چکی ہیں کہ اس ایک غلطی کو فراموش کر دیں گی لیکن آپ کو جہاں بھی موقع ملتا ہے، شرم تم کو مگر نہیں آتی... والا مصرع فٹ کر کے سارا الزام میرے سر تھوپ دیتی ہیں۔"

"اچھا بابا... میں ہی بری ہوں لیکن خدا کا واسطہ ہے رشتے کے سلسلے میں کوئی آخری فیصلہ صادر فرمایئے کہ میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟" مہوش کی والدہ نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "لڑکے کی والدہ ہفتہ دس روز بعد جواب لینے کے لیے دوبارہ آنے کا کہہ گئی ہیں۔"

"آپ نے اپنی بیٹی سے بھی معلوم کر لیا کہ اس کی کیا رائے ہے؟" پہلی بار مہوش کے والد نے سنجیدگی اختیار کی۔

"نہیں... لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ کبھی ہاں نہیں کہے گی۔"

"اتنا دل برداشتہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے... آپ ایک بار اور کوشش کر دیکھیے پھر میں براہ راست مہوش سے اس کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"عندیہ سے آپ کی کیا مراد ہے...؟"

"ہو سکتا ہے وہ کسی لڑکے کو پسند کرتی ہو جہاں سے ابھی تک کوئی پتھر نہیں آیا۔"

"اور اگر کوئی پتھر آ گیا تو آپ کیا کریں گے؟"

"ظاہر ہے کہ ضروری چھان بین ضرور کی جائے گی۔ اس کے بعد آپ کے مشورۂ خاص کے بعد ہی کوئی آخری جواب دیا جائے گا لڑکے والوں کو۔"

"گویا آپ اس بات کے حق میں ہیں کہ جہاں لڑکی اپنی پسند کا بر تلاش کر لے، وہاں ماں باپ کو گھنگھنیاں منہ میں ڈال کر چپ اختیار کر لینی چاہیے؟"

"بڑوں کی مرضی بہرحال ضروری اور مقدم سمجھی گئی ہے لیکن پسند کا کچھ اختیار تو اس کا ہے جس کو پوری زندگی گزارنی ہے۔"

"اور پہلے کیا ساری لڑکیاں بھاڑ میں جھونکی جاتی تھیں...؟" مہوش کی والدہ کا پارا چڑھنے لگا۔

"میں نے ایسا بھی نہیں کہا۔" شوہر نے پھر بذلہ سنجی کا رخ اختیار کرتے ہوئے گنگھار کا جواب دیا۔ "آپ خود اپنی مثال لے لیجیے۔ آپ نے بھی مجھے ایک نظر بغیر دیکھے ہاں کا اظہار کر دیا تھا جس کا نتیجہ چاند سورج سے زیادہ روشن آپ کے روبرو موجود ہے۔ آج بھی جب پوری تیاریوں سے باہر نکلتا ہوں تو نہ جانے کتنی بڑی بوڑھیاں شرم سے دوپٹے میں چہرہ چھپا لیتی ہوں گی۔"

"یہ آپ کی نہیں میری قسمت کی خوبصورتی تھی جس نے آپ کو ایسا بنا دیا۔" مہوش کی والدہ نے شوخی سے جواب دیا پھر دوبارہ اصل موضوع اختیار کرتے ہوئے بولیں۔ "آپ کا مشورہ ہے تو میں ایک آخری بار اور نوشین کے ذریعے اس کی مرضی معلوم کیے لیتی ہوں مگر اس کے بعد آئندہ سے آپ کی بیٹی کا عندیہ لینے والی بات زبان سے نہیں نکالیں گے۔ جہاں میں مناسب سمجھوں گی وہاں ہاں کر دوں گی۔"

"اور اگر کہیں آپ کے ہاں کرنے کے بعد لڑکے کے بجائے اس کا بوڑھا کھوسٹ والد سر پر سہرا باندھ کر..."

"بس خاموش رہیں۔" مہوش کی والدہ نے شرما کر شوہر کو تیز نظروں سے گھورا۔ "خبردار جو آئندہ آپ نے مذاق میں بھی ایسی کوئی بری فال زبان سے نکالنے کی کوشش کی۔"

شوہر کے مشورے پر مہوش کی والدہ نے ایک بار پھر نوشین کو بلوا لیا جو محلے میں قریب ہی رہتی تھی۔ مہوش اور نوشین دونوں ساتھ ہی کھیل کود کر بڑی ہوئی تھیں۔ ایک ہی کالج میں دونوں نے تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی عزیز ترین سہیلیاں بھی تھیں۔ ان دونوں گھرانوں کے بزرگوں میں بھی اچھی سلام دعا تھی، ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے۔

نوشین، مہوش کی والدہ کا پیغام ملتے ہی جس حلیے میں تھی، اسی میں دوڑی چلی آئی۔

"تسلیم... خالہ جان۔" اس نے بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا حکم ملا تو میں اپنا دوپٹا رنگ رہی تھی لیکن اسے جیسا تیسا ہی ابلتے پانی میں ڈال کر بھاگی چلی آئی... کیا حکم ہے؟"

"خدا تم کو اور تمہارے ابو امی کو بھی سلامت رکھے جو ہمارا اتنا لحاظ مروت کرتے ہیں۔ ورنہ آج کل تو خون کے سگے رشتے بھی موقع محل دیکھ کر رنگ بدل لیتے ہیں۔"

نوشین خاموش کھڑی کسی حکم کی منتظر رہی۔

"تمہاری اسی لاڈلی چہیتی سہیلی کا ایک اور رشتہ آیا ہے۔" مہوش کی والدہ نے لفافہ جس میں ضیا کے شجرے کے علاوہ اس کی تصویر بھی تھی، نوشین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسی سلسلے میں تمہیں پھر زحمت دے رہی ہوں۔ ایک بار اور اپنی نک چڑھی سہیلی کی رائے معلوم کر لو۔ اور ہاں، یہ بھی کہہ دینا کہ اس کے بعد میں اس کی کسی رائے یا مشورے کی ضرورت سمجھے بغیر... اب تک جو رشتے آ چکے ہیں، انہی میں سے کسی ایک کے حق میں سوچ سمجھ کر کوئی حتمی فیصلہ کر دوں گی اور اس کا کوئی عذر نہیں سنوں گی۔"

"آپ ماں ہیں اس کی خالہ جان۔" نوشین نے مہذب انداز میں مسکرا کر کہا۔ "جو فیصلہ کریں گی، وہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔"

"خدا تمہارے نصیب اچھے کرے میری بچی۔ تمہاری بات نے میرے کلیجے میں جیسے ٹھنڈک ڈال دی۔ اور ایک وہ ہیں تمہاری حسینۂ جہاں... کہ جن کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" مہوش کی والدہ نے دبی زبان میں اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ "خدا جانے کس آسمان میں تھگلی لگانے کا سوچ رہی ہے۔ ذرا تم بھی اپنے طور پر اس کی مرضی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنا۔ اس کی بات کہیں طے ہو جائے تو پھر ہمیں دو چار سال بعد اس کی چھوٹی بہن کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔"

"آپ درست فرما رہی ہیں۔"

"نوشین بیٹی!" اچانک مہوش کی والدہ کو شوہر کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ "تم سے ایک بات پوچھوں... چھپاؤ گی تو نہیں؟"

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا خالہ جان کہ میں آپ کی کسی بات کو ٹالنے کی جسارت بھی کر سکتی ہوں۔" نوشین نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

"تم اور مہوش ایک ساتھ پلی بڑھی ہو... ایک ہی کالج میں ساتھ پڑھی ہو اور..."

"ایک ساتھ ہی کہیں آتی جاتی بھی ہیں... ہمارے شوق اور ہماری پسند بھی مشترک ہیں۔" نوشین نے کئی بار سنا ہوا جملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں... یہی بات ہے۔" مہوش کی والدہ نے دبی زبان میں دل کی بات زبان سے نکالی۔ "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کی پسند کیا ہے؟"

"میں سمجھی نہیں؟" نوشین چونکی۔

"میں دراصل تم سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اگر مہوش کسی کو پسند کرتی ہے تو تمہاری زبانی بھی اپنے دل کا حال کھول سکتی ہے۔ ہم اس کی کسی پسند کو دوسرے رشتوں پر ضرور ترجیح دیں گے لیکن ماں باپ ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیں اتنا حق تو ضرور دے گی کہ ہم لڑکے کے بارے میں ضروری چھان پھٹک کر کے اپنی بھی تسلی کر لیں۔"

"آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں خالہ جان۔" نوشین نے کہا۔ "میں کل دوپہر میں اس سے کھل کر بات کروں گی۔"

"میں تمہیں سارے اختیار دے رہی ہوں نوشین بیٹی لیکن... اگر برا نہ مانو تو ایک شکوہ کروں؟"

"اگر میری کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہو تو میں قبل از وقت آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔" نوشین نے کسمسا کر بڑی فرماں برداری سے کہا۔

"میں نے شکایت نہیں... شکوے کی بات کی تھی میری لاڈلی۔" مہوش کی والدہ نے نوشین کو شانوں سے پکڑ کر اس کی کشادہ پیشانی پر اپنے ہونٹوں سے ممتا اور اپنی محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے بڑے مدھم لہجے میں پوچھا۔ "کیا ایسا ممکن ہے کہ تم نے اور مہوش نے ایک دوسرے سے اپنے دل کا کوئی بھید چھپانے کی کوشش کی ہو؟"

شکوہ جائز تھا۔ سوال بھی بہت واضح تھا۔ نوشین اس کا جواب بھی دے سکتی تھی لیکن اس نے گریز سے کام لیا۔ وہ اپنی سہیلی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی، یہ وعدہ بھی کر چکی تھی کہ وہ اس کی مرضی معلوم کیے بغیر اس کے دل کی کوئی بات بھی زبان تک نہیں لائے گی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے درمیانی راستہ اختیار کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں خالہ جان! اگر مہوش نے اس بار بھی آپ کو اور خالو جان کو ناراض کرنے کی کوشش کی تو پھر میں بھی اس سے روٹھ جاؤں گی۔"

"جگ جگ جیو نوشین... خدا تمہارے والدین کو تمہارا سکھ دیکھنا نصیب کرے۔ دودھوں نہاؤ اور..."

نوشین کے کان سرخ ہونے لگے تو جملہ پورا سنے بغیر ہی وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر شرماتی لجاتی واپس چلی گئی۔ دوسری دوپہر کو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر کے

http://pakfunplace.blogspot.com

مہوش کو تیز نظروں سے گھورا تو اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے... کہیں میرے سلسلے میں تیرے ارادے خطرناک تو نہیں ہو گئے؟“

”بس... بہت ہو چکا مہوش۔“ نوشین سنجیدگی سے بولی۔ ”آج تجھے ہر حال میں مجھے اپنا آخری جواب دینا ہوگا۔“

”کس سلسلے میں میری جان۔“ اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کچھ پتا تو چلے کہ آخر بات کیا ہے؟“

”کیا تو نہیں جانتی کہ کل کس کا رشتہ آیا تھا تیرے لیے؟“

”چھوٹے بڑے پتھر تو آتے ہی رہتے ہیں روزانہ۔“ اس نے بڑی حمکنت سے شانے اچکا کر کہا۔ ”تو کس پتھر کی بات کر رہی ہے؟“

”تو جان کر انجان بننے کی اداکاری کر رہی ہے؟“

”کچھ غلط بھی نہیں کر رہی...“ مہوش شانِ بے نیازی سے اٹھلا کر بولی۔ ”خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔“

”تیرا یہی اعتماد کسی دن تجھے لے ڈوبے گا۔“ نوشین نے اس کی والدہ کو دی ہوئی زبان کے پیشِ نظر بے رخی کا مظاہرہ کیا تو وہ بھی یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔

”بددعا دے رہی ہے تو... اپنی معصوم سہیلی کو؟“

”خدا کے لیے یہ اداکاری چھوڑ اور کچھ دیر کے لیے سنجیدہ ہو جا۔“ نوشین نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

مہوش کے گداز ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ ”تو جانتی ہے کہ میں دس منٹ سے زیادہ سنجیدہ رہوں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔“

”چل... دس منٹ کے لیے ہی سہی لیکن اگر تُو نے دس منٹ کے دوران ایک سیکنڈ کے لیے بھی غیر سنجیدہ ہونے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”گھڑی غور سے دیکھ لے، دس منٹ شروع کرنے کے لیے بھی تجھے آدھا منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتی۔“

”یہ تو ظلم ہے یار... تو آج اس قدر جلاد کیوں بن رہی ہے؟“

”خالہ جان کو آخری بار زبان دے کر آ رہی ہوں۔“

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ اس کی بڑی بڑی خمار آلود اور شربتی آنکھوں میں امید کے سیکڑوں دیے جل اٹھے۔ وہ کرسی پر ٹک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”دے تجھے دس منٹ... تو بھی کیا یاد کرے گی کہ...“

”کل تیرے لیے اس درمیانے پتھر کا رشتہ آیا تھا جو بہت بڑے پتھر پر بیٹھ کر تیری منڈیر کی جالیوں میں اپنی قسمت کا فیصلہ تلاش کر رہا ہے۔“ نوشین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”خالہ جان نے مجھے تیری مرضی معلوم کرنے کا مشکل ترین کام پھر سونپ دیا ہے۔“

”نوشین...“ مہوش مارے خوشی کے کرسی سے اچھل پڑی۔ اس نے شوخی سے پوچھا۔ ”سچ بتا؟ تو کہیں مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی؟“

”باتوں میں اڑانے کی کوشش مت کر... صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے۔“

”تو اگر میری جگہ ہوتی تو کیا جواب دیتی؟“ وہ الٹا سوال کر بیٹھی۔

”میرا ایک ہی جواب ہوتا... نہیں... نہیں... نہیں۔“

”کیوں...؟“ وہ بجھ سی گئی، اس کو نوشین سے اس قدر کھرا جواب ملنے کی توقع نہیں تھی۔

نوشین تو اس کی واحد سہیلی تھی۔ اس کی سب سے بڑی رازدار تھی۔ کبھی اس نے مہوش کو مذاق میں بھی دکھ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر... آخر اس نے اس قدر صاف گوئی سے اس کے ارمانوں کا خون کس طرح کر دیا...؟ وہ نوشین کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہی... کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں کی۔

”تو نے میرا جواب مانگا تھا۔“ نوشین نے اس کو غور سے دیکھ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں نے تجھے اپنا فیصلہ سنا دیا، اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟“

”کیا ضیا تجھے ایک نظر اچھا نہیں لگتا۔“ مہوش نے اسے بڑی امیدوں سے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”بحیثیت انسان وہ ایک شریف اور نیک نوجوان ہے لیکن...“

”جب شریف اور نیک ہے تو پھر یہ لیکن درمیان میں کیوں آ گیا؟“ اس نے تملا کر احتجاج کیا۔ ”کیا غریب ہونا کوئی جرم ہے؟“

”میں نے کب کہا۔“ نوشین نے مہوش کو بڑے پیار سے گلے لگا کر محبت بھرے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”غربت انسانیت کا سب سے بڑا اور قابلِ قدر سچ ہے اور شرافت اس کی عزت اور حرمت کی دلیل بھی ہے۔“

”پھر... تیری زبان سے نہیں کیوں نکلا؟“ اس نے نوشین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”اس لیے میری حسین شہزادی کہ مستقبل کے جو خواب تو پلکوں پر سجائے ابھی ہے، وہ ضیا پورے نہیں کر سکے گا۔“

”اس بے چارے کو دولت میں نہیں کھیل رہا؟ اس کے پاس کار، بنگلا اور کسی بینک کی چیک بک یا کریڈٹ کارڈز نہیں ہیں؟“

”تم نے ٹھیک کہا۔“

”میں جو تجھے سمجھا رہی ہوں وہ تیری موٹی عقل میں نہیں آ رہا۔“ وہ الٹا بگڑ گئی۔

”اور تیری پتلی عقل میں کیا آ رہا ہے؟“ نوشین نے مسکرا کر پوچھا۔

”تیرے ساتھ کالج آتے جاتے وقت شاہراہوں اور بسوں میں جو اثر کر رہی ہے نا؟“

”ہاں...“

”تو نے لوگوں کی نگاہوں میں کیا دیکھا میرے لیے؟“

”یہ پانے کا ارمان، تجھے بار بار دیکھنے کی تمنا، تجھے اپنے گھر کی زینت بنانے کے میٹھے خواب۔“ نوشین نے کہا۔ ”تو جدھر سے گزرتی ہے لوگوں کے دلوں پر بجلیاں سی گرتی ہیں۔“

”یہی تو فرق ہے تیری اور میری سوچ میں۔“ مہوش جذباتی ہو گئی۔ ”ان کی نگاہیں میرے حسن پر نہیں میرے گھر کی [illegible] پر ہیں۔ یہ بڑے بڑے لوگ مجھے اپنے گھر کی زینت بنانے کے لیے پیچھے ہیں۔ آج ان کے دلوں پر بجلیاں گرتی دیکھ کر تو خوش ہو رہی ہے لیکن کل جب میرے حسن کی بجلی گرے گی اس وقت تو سوائے پچھتانے کے اور کیا کر سکے گی؟ جواب دے... کیا اس وقت تیری ہمدردیاں میرے کسی کام آ سکیں گی؟“

”خدا نہ کرے جو کبھی تیرے آشیانے پر ایک چنگاری بھی گرے۔“ نوشین نے اسے گھور کر کہا۔ ”یہ آج تو بقراط جیسی باتیں کیوں کر رہی ہے؟“

”میں بقراط اور سقراط کو نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ دولت اور حسن کا ملاپ آگ اور پیٹرول سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

”اچھا...؟“ نوشین نے تعجب کا اظہار کیا۔

”تو کیا یہ رشتہ پسند کرے گی؟“ اس کا چہرہ خون کی تیز روانی سے گلنار ہونے لگا۔ اس نے نفرت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”دولت صرف قوت خرید ہوتی ہے جو دنیا کی ہر نایاب سے نایاب اشیا بھی حاصل کر سکتی ہے، خواہ وہ کسی خوبصورت سی عورت کا جسم ہی کیوں نہ ہو۔ بچے بازار سے کھلونے خرید کر بڑے شوق سے لاتے ہیں۔ کچھ دن بڑے پیار سے ان سے کھیلتے ہیں پھر جب ان کا دل بھر جاتا ہے تو دوسرا آرام سے بدل لیتے ہیں۔“

”تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ نوشین الجھنے لگی۔ ”میں نے تجھ سے ایک مختصر سی بات کی تھی اور تُو افسانے گھڑنے بیٹھ گئی۔“

”یہی تو میں تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ خوبصورت افسانے رسالوں اور جریدوں کی زینت بنتے ہیں۔ ان کا خیال لکھنے والوں کے ذہنوں میں غیب سے نہیں اترتا، یہ سب اسی دنیا کی سچی حقیقتیں ہیں جو بعد میں افسانہ بن جاتی ہیں۔“

”اچھا بابا... خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ اور صرف اتنا بتا دے کہ ضیا کے بارے میں تو نے کیا سوچا ہے؟“ نوشین نے ہتھیار ڈالنے کی کوشش کی لیکن مہوش نے اپنی بات جاری رکھی۔

”تُو نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورتیں جو کوٹھے کی زینت بن کر پاؤں میں گھنگرو باندھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، یہ کون ہوتی ہیں؟ کہاں سے آتی ہیں؟ یہ بھی اسی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں لیکن کسی دولت مند یا مکار مرد کے ہاتھوں جھوٹی محبت کا شکار ہو کر... یہ بھی اپنے خوابوں کی تکمیل کا سنہرا خواب دیکھتی رہتی ہیں پھر... جب خواب کی تعبیر الٹی ثابت ہوتی ہے تو ان کی مجبوری دو وقت کی روٹی کی تلاش کوٹھے تک پہنچا دیتی ہے... پھر یہ پانار ہر معاشرے میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔“

”زبان کو لگام دے گی یا اسی طرح بولتی رہے گی؟“

”ابھی تو نے دولت اور حسن کے ایک دو ہی قصے سنے اور اکتانے لگی؟“ اس کے ہونٹوں کے تراشیدہ گداز پر ایک زہریلا

سربراہ اور عوام

ایک مجلس میں لوگ عوام کی سعادت اور شقاوت پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ مختلف جگہوں کا نام لے کر کہتے۔ ”وہاں کے لوگ باسعادت اور اچھے ہیں لیکن فلاں جگہ کے عوام شقی القلب اور بد ہیں۔“

ایک بزرگ نے اکتا کر فیصلہ سنا دیا۔ ”کسی خاص جگہ کے عوام نہ تو برے ہوتے ہیں اور نہ اچھے بلکہ ان کی سعادت اور شقاوت کا انحصار ان کے رہبروں پر ہوتا ہے۔“

میاں محمود... شیاں والا

http://paktunplace.blogspot.com

تبسم ابھرا۔ ”تو نے ابھی افسانوں کی بات کی تھی، کیا تو نے بھی کسی افسانے میں یہ نہیں پڑھا کہ عورت محض ایک کھلونا ہوتی ہے؟ ایک سے دل بھر جائے تو بازار سے جا کر دوسرا خرید لاؤ... دولت کی طاقت کے بل بوتے پر! عورت پاؤں کی جوتی ہے اور کسی بڑے شاعر نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ عورت اعضا کی شاعری کا دوسرا نام ہے... بہت خوب۔“ مہوش کی زبان زہر اگلتی رہی۔ ”کوئی صنفِ نازک شاعرہ بن جائے تو یہ مرد شاعر مشاعروں میں بیٹھ کر بھی کھسر پھسر شروع کر دیتے ہیں۔“ مہوش نے انداز بدل کر کہنا شروع کیا۔ ”یار! یہ تو کوئی چوٹ کھائی معلوم ہوتی ہے، آپ بیتی کو کیا لہک لہک کر ترنم سے سنا رہی ہے۔ اتنے اونچے خیال اس کے اپنے تو ہو ہی نہیں سکتے، کسی مرد سے لکھوایا ہوگا۔“

”اچھا بابا! تو جیتی اور میں ہاری۔“ نوشین نے پھر ہاتھ جوڑ لیے۔ ”اب تو میرے گناہ معاف کر دے...“

”ابھی میں نے تیرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں۔“ اس کو نوشین پر ترس آیا تو شوخی سے مسکرا کر بولی۔ ”معاف کرنا یار! میں روانی میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی لیکن میں نے جو کچھ کہا، وہ غلط بھی نہیں ہے۔ اب دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دے۔“

”ذرا سانس لے لینے دے پھر جواب دینے کے قابل ہو گئی تو دوبارہ تیرے حضور میں خالہ جان کا پیغام بیان فرما کر تیری رائے معلوم کرنے کی خاطر اوکھلی میں سر دینے پر غور کروں گی۔“

مہوش، نوشین کی ”اوکھلی میں سر دینے والی مثال“ سن کر ہنستے ہوئے دُہری ہونے لگی تو نوشین نے سکون کا سانس لیا۔

”کسی غریب آدمی کے ہاتھ اگر اتفاق سے کوئی نادر یا قیمتی شے آ جائے تو وہ اس کی قدر بھی ضرور کرتا ہے، بہت سنبھال کر رکھتا ہے۔“ اس نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ ”اس کے برعکس دولت مند کو اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ اس کے پاس سکون تلاش کرنے کے بہت سارے راستے ہوتے ہیں۔ لیکن غریب... وہ تو صرف اپنی چار دیواری کی حدود تک محدود رہ کر اپنا سکون تلاش کرتا ہے... اور... اگر وہ غریب ہونے کے ساتھ شریف بھی ہو تو کیا کہنے... ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی جانتا ہے۔“

”خدا کی قسم مہوش... اگر تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ لہولہان کرنے میں ایک پل کی بھی دیر نہ لگاتی۔“ نوشین نے اس کے آخری جملے پر غور کیا تو جھلا کر کہا۔ ”یہی بات تو سہولت سے شروع میں بھی کہہ سکتی تھی۔ تقریر جھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور دنیا میں ہر لڑکی کو شادی کے بعد ماں بھی بننا ہے۔ اس لیے اسے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق ضرور ملنا چاہیے۔“ مہوش نے کہا پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”آج کا انسان مریخ اور چاند کی سطح تک پہنچ گیا لیکن ہمارے والدین ابھی تک زمین پر پیر جمائے کھڑے ہیں۔ لڑکیاں ان کے ادب اور احترام میں زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرتیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان سے ان کی مرضی معلوم نہ کی جائے جبکہ اس کا حق خدا اور اس کے رسولؐ نے بھی دیا ہے... آنکھ بند کر کے کسی کو بھاڑ میں جھونک دینا دانش مندی تو نہیں کہلاتی۔“

”تالیاں...“ نوشین نے بڑے خوشگوار موڈ میں تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ”آج میں مان گئی کہ تو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ عقل نامی کسی قیمتی شے کی بھی مالک ہے۔“

”بندی تسلیم عرض کرتی ہے...“ مہوش نے بڑی نیاز مندی سے سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

”تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تو نے ضیا کے سلسلے میں بقول خالہ جان کے اپنا عندیہ دے دیا ہے۔“

”لڑکی... زبان سنبھال کے۔“ مہوش نے اسے محبت میں آنکھیں دکھائیں۔ ”خبردار جو تو نے میرے باپ کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات کی۔“

کچھ دیر دونوں سہیلیوں کے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی پھر نوشین نے دوبارہ سنجیدگی اختیار کر لی۔

”یہ تو حقیقت ہے کہ ضیا شریف بھی ہے اور تیرے حق میں ابھی تک سعادت مندی کا ثبوت بھی دے رہا ہے۔“

”انشاء اللہ آئندہ بھی دیتا رہے گا۔“ اس نے مسکرا کر درمیان میں ایک جملے کا اضافہ کر دیا۔

”لیکن ایک بار پھر غور کر لے ورنہ بقول شاعر۔

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے“

”کیا ضروری ہے کہ قدرت اس کو اسی حال میں رکھے۔“ اس نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ میرے ان خوابوں کی تعبیر بن جائے جو میں دیکھتی رہتی ہوں۔ ہماری قسمت کے ستاروں کا ملاپ حالات میں تغیر لانے کا سبب بھی تو بن سکتا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو جیسا تو سوچ رہی ہے۔“ نوشین نے اسے گلے لگا کر صدقِ دل سے دعا دی۔

اور پھر...

شادی کے بعد وہی ہوا جو مہوش کی زبان سے نکلا تھا! زندگی کے پانچ چھ سال اس نے ضیا کے گھر میں رہ کر

بڑے سکون سے گزارے۔ کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پاس پڑوس میں رہنے والی اور حسد کرنے والی عورتوں کے اس خیال کو بھی غلط ثابت کر دکھایا کہ... ”بہو بیگم اپنے حسن کے زعم میں اترائی ہوئی آئیں گی تو اس خیال سے چھپر کھٹ پر بیٹھی رہیں گی کہ کہیں ان کے خوبصورت پاؤں میں زمین کی گرد نہ لگ جائے... شوہر زن مرید بن کر خوبصورت بیوی کے پیر دھو دھو کر پیتا رہے گا اور ساس اور نندیں چولھا جھونکتی رہیں گی۔“

مہوش نے سب کی زبان پر تالے ڈال دیے... کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ شادی کے دو دن گزرنے کے بعد اس نے گھر کے ایک مستقل فرد کی حیثیت سے اپنی تمام تر ذمے داریاں سنبھال لیں۔ ساس اور سسر کو اس نے کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیا۔ نند کو چھوٹی بہن کی طرح اپنا سمجھ کر ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی تو سب کی نظروں میں جگمگاتا ستارہ بن گئی۔

پانچ سال یوں گزر گئے جیسے ابھی کل کی ہی بات ہو۔ پھر اس کی زندگی کو اس وقت ایک جھٹکا ضرور محسوس ہوا جب سسر کی موت کے بعد ساری ذمے داری اس کے شوہر کے سر آن پڑی۔ لیکن وہ مشکل وقت بھی کسی نہ کسی طور پر گزر گیا۔ پھر تقدیر نے پلٹا کھایا۔

ضیا کے والد اپنے کام کو پھیلانے کے حق میں نہیں تھے [illegible] کم کھاؤ لیکن سکون سے کھاؤ کے اصول پر چل رہے تھے لیکن مہوش کے مشورے پر ضیا نے آہستہ آہستہ کام پھیلانا شروع کیا۔ اس کی شب و روز کی مصروفیات بڑھنے لگیں۔ شروع شروع میں اسے بھی کاروباری اونچ نیچ کا سامنا کرنا پڑا مگر ایسے وقتوں میں مہوش ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ پھر خدا نے اس کے دل کی پکار سن لی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی قسمت اور خدا کی نظرِ کرم سے ضیا کا کام اتنا چل نکلا کہ اسے نیا دفتر لینا پڑا۔ پھر قدرت نے دو سال کے قلیل عرصے میں اتنا نواز دیا کہ ضیا نے ضرورت کے پیشِ نظر اپنی موٹر سائیکل فروخت کر کے ایک چھوٹی سی کار خرید لی۔ شہر کے پوش علاقے میں ہزار گز کا پلاٹ لے کر آہستہ آہستہ اس کی تکمیل بھی شروع کر دی۔ کاروبار کی ترقی میں بیوہ ماں کی دعائیں بھی شامل تھیں۔ مہوش کا ستارہ بھی اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں ایک خوبصورت اور عالی شان بنگلے کی تعمیر مکمل ہو گئی تو ضیا نے وہاں شفٹ ہونا چاہا۔ اب اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ کاروبار چمکا تو بینک بیلنس بھی عروج پر پہنچ گیا۔ ضیا نے بڑی

ایئر کنڈیشنڈ کار خرید لی۔ سوٹ بوٹ پہننے کے بعد وہ بھی شہر کے امرا میں شمار کیا جانے لگا۔

ماں نے ضیا کی بھی کوئی بات نہیں ٹالی تھی لیکن انہوں نے وہ گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا جہاں سے ان کی زندگی کی بے شمار حسین یادیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے جوان بیٹی اور چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ رکھا، ہنسی خوشی دعائیں دے کر ضیا اور مہوش کو عالی شان بنگلے میں منتقل ہونے کی اجازت دے دی۔

مہوش اپنی تقدیر پر نازاں تھی۔ اس نے ماضی میں جتنے حسین خواب دیکھے تھے، سب کی تعبیریں اب اس کی دسترس میں تھیں لیکن اس نے ہمیشہ متانت اور بردباری کو برقرار رکھا۔ ایک گھریلو عورت کی طرح اپنے عالی شان بنگلے میں بیٹھی ضیا کے دل پر راج کرتی رہی۔ ضیا کے اصرار پر اس نے گاڑی چلانا سیکھ لی تو ضیا نے ایک اور قیمتی کار اس کے نام پر خرید کر اپنے بنگلے میں کھڑی کر دی لیکن اس نے کبھی تنہا باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کبھی کبھار نوشین آ جاتی تو اسے ساتھ لے کر وہ ساحلِ سمندر کے ایک دو چکر ضرور لگا لیتی تھی لیکن اپنی ذاتی اور گھریلو ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لیے بھی وہ ہمیشہ ضیا کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلتی۔ بڑے بڑے پُررونق بازاروں میں مردوں کی حریص نگاہیں اس کے حسین وجود اور قیمتی لباس پر پڑتیں۔ وہ ان نگاہوں کا مفہوم سمجھتی تھی اس لیے ان کا منہ چڑانے کے لیے ان کے درمیان سے [illegible] محفلوں پر ماتم [illegible] بڑی بڑی دعوتوں میں اسے شریک کرنے کی ضد کرتا تو وہ خود کو لیے دیے اس میں سے چند ایک میں شریک بھی ہو جاتی لیکن اکثر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال جاتی تھی۔

خنک ہوا کا ایک تیز جھونکا مہوش کے کھلے ہوئے گیسوؤں کو چھیڑ کر گزرا تو اسے ہلکی سی ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی ہیرے جڑی قیمتی دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ ماضی کی حسین یادوں سے نکلتی وہ اتنی دور نکل گئی تھی کہ گزرتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جانے کے ارادے سے بڑھی تو ضیا کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر دبے قدموں ٹیرس کے ایک کنارے پر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ پارکنگ لاٹ میں آ کر رک گئی۔ دروازے پر موجود گارڈ نے لپک کر دروازہ کھولا پھر فوجی انداز میں سیلوٹ کر کے ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد ضیا حسبِ معمول نشے میں جھومتا ہوا کار سے باہر آیا۔ اس نے چڑھی چڑھی نظروں سے چوکیدار اور گارڈ کو دیکھا جو

http://pakfunplace.blogspot.com

اس کے استقبال میں ہاتھ باندھے موجود تھے۔ کچھ دیر وہ اپنی عادت کے مطابق انہیں گھورتا رہا پھر خود کو سنبھالتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، ادھر اُدھر ڈولتا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ مہوش ایک سرد آہ بھر کر پلٹی اور دوبارہ راہداری میں آگئی۔

"بیگم صاحب کہاں ہیں...؟" نیچے سے ضیا کی آواز سنائی دی جو ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے مخاطب تھا۔ اوپر آنے والی سیڑھیوں پر قدم رکھنے سے پہلے یہ سوال کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔

"اپنے بیڈروم میں ہوں گی۔" ملازمہ نے وہی جواب دیا جو آئے دن دیا کرتی تھی۔

"ماہا بی بی سو گئیں؟"

"جی صاحب!"

"ٹھیک ہے، اب تم بھی آرام کرو۔"

اس نے ضیا کو سیڑھیوں پر قدم رکھتے دیکھا تو وہ دبے قدموں خواب گاہ میں جا کر بستر پر لیٹی اور ایسی بن گئی جیسے سو رہی ہو۔ دل ضرور دھڑک رہا تھا۔ کان دروازے پر لگے تھے۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ لگ رہا تھا۔۔۔ ضیا دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا۔ نہ جانے حد سے گزر جانے کے بعد بھی اب اسے کس بات کا خوف باقی رہ گیا تھا جو اس نے لائٹ روشن کرنے کی غلطی نہیں کی۔ معمول کے مطابق نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اور موزے اتارے پھر لڑکھڑاتا ہوا ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ مہوش پلکوں کے درمیان جھری کیے اس کی ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہی۔

دس پندرہ منٹ بعد ضیا سلیپنگ سوٹ پہنے باہر آیا، آہستہ سے مہوش کے ساتھ اپنے نرم و گرم بیڈ پر لیٹا۔ پھر اس نے مدھم آواز میں وہی پرانا سوال کیا۔ "کیا سو گئیں...؟"

مہوش نے اپنی خاموشی برقرار رکھی تو ضیا نے بھی...... کروٹ بدل لی۔ خواب گاہ میں مہنگی شراب کی ناخوشگوار بو پھیلنے لگی۔ اس کا پریشان ذہن ایک بار پھر ماضی کی پُرپیچ وادیوں میں اپنا کھویا ہوا سکون تلاش کرنے لگا۔

شادی کے پندرہ سال بڑے خوشگوار ماحول میں گزر گئے۔ اپنے عالی شان بنگلے میں اس نے اور ضیا نے مل جل کر اپنا پندرہ سالہ جشن بھی منایا۔ ٹیلی وژن اور اسٹیج کے معروف فنکار ان کی خوشیوں میں شرکت کے لیے بلائے گئے۔ کھانے اور چائے کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ شہر کی سب سے مشہور رقاصہ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔

اس محفل میں مہوش کو مجبوراً مسکرا مسکرا کر مہمانوں کی پذیرائی کرنی پڑی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کچھ فنکار لوگ پینے میں بھی تکلف کا مظاہرہ کر رہے ہیں پھر یہ راز بھی کھل گیا کہ جسے وہ کوک سمجھ رہی تھی، ان بوتلوں میں شراب بھری تھی۔ بے تکلفوں کی ایک ٹولی جس میں سرمایہ داروں کے علاوہ نامی گرامی فنکار بھی شامل تھے، ایک گوشے میں بیٹھے شراب نوشی سے شغل کر رہے تھے۔ ان میں ضیا بھی گاہے بگاہے شامل ہو رہا تھا۔ مہوش کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ ایک موقع پر اس نے کسی بہانے ضیا کو پاس بلایا تو ضیا کے منہ سے شراب کی بو سونگھ کر سرتاپا لرز اٹھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ دس سالہ جشن صرف اس کی خوشیوں کی انتہا کے لیے نہیں تھا...... ان خوشیوں میں اس گھر کی بربادی کا آغاز بھی شامل تھا جسے وہ دس سال کے طویل عرصے سے محفوظ کیے بیٹھی تھی۔

جشن ختم ہو گیا لیکن بات نہیں ختم ہوئی۔ مہمانوں نے جانا شروع کیا تو ضیا اور وہ دونوں مہمانوں کی شرکت کا شکریہ ادا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس روز اس نے بڑی شدت سے کئی بھوکی نظروں کو اپنے صاف ستھرے جسم پر کسی تیروں کے مانند گڑتا محسوس کیا۔ وہ دل پر جبر کرتی رہی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ کھل کر ضیا سے بات کرے گی۔ اسے احساس دلانے کی کوشش کرے گی کہ شراب ہزار برائیوں کی جڑ ہوتی ہے اور پھر اب تو ان کے پیار کی نشانی ماہا کی شکل میں بھی گھر میں جوان ہو چکی تھی۔ وہ بچی نہیں رہی تھی۔ اس کی عمر چودہ سال ہو گئی تھی۔ وہ "او" لیول کر رہی تھی۔ اسے اس...... جشن سے دور رکھنے کی خاطر ضیا کی ماں کے گھر بھیج دیا گیا تھا لیکن اسے کب تک دور دور رکھا جا سکتا تھا؟

محراب کی طرح بیرونی گیٹ پر سجے ہوئے برقی قمقموں سے جگمگاتے گیٹ پر کھڑی وہ ایک ایک مہمان کو مسکرا مسکرا کر خدا حافظ کر رہی تھی۔ ضیا مردوں سے ہاتھ ملا رہا تھا وہ خواتین سے گلے مل کر خدا حافظ کہنے میں مصروف تھی، جب ضیا کا بے تکلف دوست اور ٹی وی کا معروف پروڈیوسر اور اس کی حسین بیوی شہلا سامنے آ گئے۔ مہوش نے شہلا کو ہاتھ ملا کر گلے لگانے کی کوشش کی تو طاہر ندیم نے شہلا کو شانوں سے تھام کر پیچھے کر دیا۔ اس نے دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پی رکھی تھی۔

"کیا مطلب...؟" شہلا نے ایک ادائے خاص سے اپنے بہکے ہوئے شوہر کو دیکھا۔ "کیا آپ مہوش بھابی سے مجھے گلے نہیں ملنے دیں گے؟"

"نہیں۔" طاہر ندیم نے مہوش کو بھوکی نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "آج ہمارے یار کی خوشیوں کا

...... پندرہ سالہ جشن ہے۔ تم آج ضیا سے ہاتھ ملاؤ، میں بھابی سے ہاتھ ملاؤں گا۔"

مہوش اسے صرف مذاق سمجھ رہی تھی لیکن جب شہلا نے ایک قدم بڑھا کر ضیا کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام لیا تو وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔

"کم آن مہوش..." طاہر ندیم نے پہلی بار اسے بھابی کے بجائے بڑی بے تکلفی سے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ "اس خوشی کے موقع پر آج اپنی قسم توڑ ہی دیجیے۔"

وہ ذرا ہچکچائی تو ضیا جو بدستور شہلا کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا، اس کی ہمت بڑھانے لگا۔

"اب اس قدامت پسندی کا چولا اتار پھینکو جو تم نے پندرہ سال سے پہن رکھا ہے۔ اور پھر طاہر کوئی غیر تو نہیں، میرا بے تکلف دوست ہے۔"

مہوش نے زبردستی مسکراتے ہوئے مگر حیرت بھری نظروں سے ضیا کی طرف دیکھا اور اسی ایک لمحے کی غفلت سے اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ طاہر نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور مخصوص انداز میں بار بار اسے دبا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ طاہر کے چہرے پر حقارت سے تھوک کر اندر چلی جائے لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو سب کے سامنے تماشا بن جاتی۔ اس نے جبر کرکے مسکرانے کی کوشش کی، ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو طاہر ندیم کی گرفت اس کی نازک کلائی پر اور مضبوط ہو گئی۔

"آٹھ روز بعد میں شہلا کے نام سے جو ورائٹی پروگرام منعقد کر رہا ہوں، اس میں آپ بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کر رہی ہیں جس کا فیصلہ ضیا بھی کر چکے ہیں۔"

"لیکن میں..." مہوش نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس بار ضیا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے فیصلہ نہیں سنایا تھا صرف اجازت دی تھی۔" ضیا نے مہوش کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔

"چلو پھر یونہی سہی..." طاہر ندیم نے پھر اس کی کلائی کو ہلکا سا دبا کر کہا۔ "اجازت تم نے دی، فیصلہ میں سنا رہا ہوں۔"

"ایک بار باہر قدم نکال کر تو دیکھو مہوش۔" شہلا نے بڑی بے حیائی سے آنکھ مار کر اسے اکسانے کی کوشش کی۔ "گھر میں تم نے صرف ایک رنگ دیکھا ہے۔ باہر کھلی فضا اور آزاد ماحول میں تمہیں دھنک رنگ نظر آئیں گے۔"

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا؟" طاہر بڑی ڈھٹائی سے اس کے اور شہلا کے درمیان بھی آ گیا۔ وہ مہوش کی آنکھوں میں بڑی گہرائی تک جھانکتا ہوا نشیلی آواز میں بولا۔ "ہاں... یا نہیں۔"

"آپ بلاوجہ کی ضد کر رہے ہیں۔" اس نے کسمسا کر طاہر کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم پہ طاہر کے کلائی تھامے رہنے سے سرخ سرخ چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

"سوچ لیجیے۔" طاہر نے اس کے اور قریب ہو کر کہا۔ "جب تک آپ ہاں نہیں کہیں گی میں آپ کی حسین کلائی سے دل بہلاتا رہوں گا۔"

"آ جاؤں گی..." اس نے بے رخی سے بات ٹالنے کی کوشش کی تو طاہر اور شوخ ہونے لگا۔

"ایسے نہیں... ذرا مسکرا کر دل سے پکا وعدہ کیجیے ورنہ آج میں آپ کو فرار کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔"

مہوش نے گھبرا کر زبردستی مسکرا کر وعدہ کر لیا پھر طاہر ندیم سے ہاتھ چھڑا کر دوسرے مہمانوں کو رخصت کرنے لگی۔ رات کو وہ اپنی خواب گاہ میں آئی تو اس نے دبی زبان سے ضیا سے شکوہ کیا۔

"مجھے آپ کے طاہر صاحب کی بے تکلفی کچھ پسند نہیں آئی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں غیر مردوں سے ہاتھ نہیں ملاتی۔"

"ڈونٹ بی سلی..." ضیا نے پہلی بار اس کی ان سنی کر کے قدرے جھلا کر جواب دیا۔ "آخر شہلا بھی تو سب کے سامنے میرا ہاتھ تھامے کھڑی مسکرا رہی تھی... لیکن اس کا یہ مطلب کب ہوا کہ میرے اس سے ناجائز تعلقات بھی ہیں۔"

"بات جائز ناجائز کی نہیں، اپنی اپنی عادت کی ہے۔" اس نے ضیا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہو سکتا ہے کہ آج آپ کو یہ سب کچھ اچھا لگے لیکن کل آپ ہی کوئی اعتراض بھی کر بیٹھیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔" ضیا اسے اپنی بڑائی کا احساس دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں جس سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا ہوں، وہاں اس قسم کی فضول باتیں نہیں سوچی جاتیں۔"

مہوش چپ ہو گئی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"آپ نے شراب کب سے شروع کر دی ہے؟"

ضیا ایک لمحے کو گڑبڑایا پھر اس کو آغوش میں لے کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتیں میری جان کہ یہ کیسی اعلیٰ شے ہوتی ہے۔ اس کا خمار لوگوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ ہر لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔"

مہوش عورت ہونے کے ساتھ ساتھ بیوی بھی تھی اس

http://pakfunplace.blogspot.com

لیے اس نے انکار کرنے کی غلطی نہیں کی۔ کچھ دیر تک وہ ضیا کے منہ سے خارج ہونے والی بُو سے پیچھا چھڑاتی رہی مگر جب ایسا پر بھی بے خودی طاری ہوئی تو وہ ہر بات سے بے نیاز ہوگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی اس حماقت کا احساس بھی بڑی شدت سے ہوا کہ اس نے ضیا سے شراب نوشی ترک کرانے کی جو دل میں ٹھان لی تھی، اس پر وہ خود بھی ثابت قدم نہ رہ سکی۔ اگر وہ ضیا کو کھل کر کھیلنے کا موقع نہ دیتی، اس کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے جھوٹ موٹ کو ہی روٹھ کے ماما کے کمرے میں چلی جاتی تو ضیا یقیناً توبہ کرلیتا یا پھر آہستہ آہستہ اس بُری عادت کو ترک کرنے کا وعدہ ہی کرلیتا... لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ ضیا کے پہلو میں لیٹی پچھتانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

اس کے بعد وہ ضیا کو راہِ راست پر لانے کی خاطر اس کے شانہ بشانہ چلنے لگی۔ بڑی بڑی محفلوں میں بحیثیت مہمانِ خصوصی کے دعوت نامے اسے بڑی پابندی سے ملنے لگے۔ بڑے بڑے لوگ اس کے قریب آنے لگے۔ وہ ان کی نگاہوں کی تپش کو اپنے وجود پر برداشت کرتی رہی۔ اس طرح کم از کم ضیا اس کی نظروں کے سامنے تو رہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تو ضرور ہوتا ہوگا کہ بیوی کی موجودگی میں اسے غیر عورتوں سے بہت زیادہ نہیں گھلنا ملنا چاہیے۔ شراب بھی کم سے کم پینی چاہیے لیکن ایک روز وہ خود بھی حالات کا شکار ہوکر اسی دلدل میں گلے گلے ڈوب گئی... لتھڑ گئی!

اس روز ایک بڑے پاپ گروپ نے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں پروگرام ارینج کیا تھا۔ ضیا نے بطور ڈونیشن اس گروپ کو تیس ہزار کا چیک ایڈوانس دے رکھا تھا لیکن شرط یہی تھی، مہوش کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا جائے جسے بخوشی منظور کرلیا گیا تھا۔ طاہر ندیم نے بھی اس گروپ کو سپورٹ کر رکھا تھا اس لیے انتظامات کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ایک کمرا دو روز سے حاصل کر رکھا تھا۔ پروگرام والے دن وہ مہوش اور ضیا کو دو تین گھنٹے پہلے ہی اپنے ساتھ ہوٹل لے آیا تھا۔

اس وقت وہ تینوں پاپ گروپ کے سربراہ کے ساتھ سر جوڑے بیٹھے اسٹیج کی روشنیوں اور فنکاروں کی انٹری کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے جب شہلا نے ایک تجویز پیش کی۔ "اس طرح کمرے میں بیٹھ کر آپ حضرات ایکچوئل لوکیشن کے بارے میں کیوں وقت برباد کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا...؟" طاہر نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"بڑی موٹی سی بات ہے جو آپ لوگوں کی عقل میں نہیں آرہی۔" شہلا نے کہا۔ "جب اسٹیج صرف دو منزل کے فاصلے پر ہے تو پھر وہاں جا کر ہر چیز کو کیوں نہیں ایک بار طے کرلیتے؟"

"دیکھا تم نے..." ضیا نے مسکرا کر طاہر کو دیکھا۔ "میں کہتا تھا نا کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ عقل مند ہے۔"

پھر مرد سب اٹھ کر کمرے سے اسٹیج کی طرف چلے گئے تو شہلا نے سکون کا سانس لیتے ہوئے مہوش سے کہا۔

"دیکھا بھابی آپ نے... ہم عورتوں کے قیمتی مشورے شامل نہ ہوں تو یہ مرد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔"

"ہاں... تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔" اس نے گلاس میں رکھی ہوئی شراب کا پہلا گھونٹ لیا اور پھر منہ بنا کر بولی۔ "اس اورنج جوس میں ہلکی سی کڑواہٹ بھی ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ اسے اورنج اور گریپ فروٹ سے ملا کر بطورِ خاص آپ کے لیے تیار کیا گیا ہو۔" شہلا نے مہوش کے حسن سراپا پر ایک نظر ڈال کر شوخی سے کہا پھر سنجیدہ ہوکر بولی۔ "آپ کہیں تو کوئی دوسرا ڈرنک منگوالوں؟"

"رہنے دو... فی الحال اسی پر گزارہ کرلیں گے۔"

جوس کا گلاس ختم کرنے کے پندرہ بیس منٹ بعد اس کے ذہن پر ہلکی ہلکی غنودگی سی طاری ہونے لگی تو اس نے شہلا سے کہا۔

"ضیا اور طاہر بھائی ابھی تک واپس نہیں آئے؟"

"میں دیکھتی ہوں جا کر جب تک آپ کچھ دیر آرام کرلیں۔" شہلا اٹھی اور نہ جانے کیوں بڑی معنی خیز نظروں سے مہوش کو ایک نظر دیکھتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

شہلا چلی گئی تو وہ یوں ہی بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ اس پر رہ رہ کر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھنے کے بجائے لڑکھڑا کر بستر پر ہی دراز ہوگئی۔ پھر قدموں کی یہی لڑکھڑاہٹ اس کی زندگی کا روگ بن گئی۔ اسے تین روز بعد اس وقت حقیقت کا علم ہوا جب طاہر ندیم نے بڑی دیدہ دلیری سے ضیا کی غیر موجودگی میں اس کے گھر آکر بتایا تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں برباد ہوچکی ہے۔ مہوش بپھر کر رہ گئی۔ اس نے جواب میں طاہر ندیم کے منہ پر پوری قوت سے ایک تھپڑ رسید کیا پھر اس کا سر پھاڑنے کے لیے قریب رکھا گل دان اٹھالیا لیکن دوسرے ہی لمحے جب طاہر نے جیب سے ایک مخرب اخلاق تصویر نکال کر اس کی نظروں کے سامنے فضا میں بلند کی تو مہوش کے ہاتھوں میں دبا ہوا گل دان زمین پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اس کے اندر مہکتے ہوئے تازہ پھول بھی ادھر ادھر بکھر گئے۔

وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی، وہ ایک بھیانک حقیقت تھی۔ تصویر میں اس کا اور طاہر ندیم کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے چکراتے ہوئے ذہن میں مشروب کا وہ گلاس ابھرا جس کو بقول شہلا کے اورنج اور گریپ فروٹ سے ملا کر خاص طور پر بنایا گیا تھا۔ شہلا کے مکروہ ہونٹوں پر ابھرنے والا وہ معنی خیز تبسم بھی اس کے وجود میں کانٹا بن کر چبھنے لگا۔ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے حق میں اس قدر بے غیرتی کا مظاہرہ بھی کرسکتی تھی، یہ بات اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔

"پریشان مت ہو۔" طاہر ندیم نے اسے پسپا ہوتے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے اس کا احساس ہے کہ اگر یہ تصویر منظرِ عام پر آگئی تو تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ تمہاری ساری بنی بنائی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔ میڈیا کے لوگوں کو ایک ذرا بھنک مل گئی تو وہ تمہارا گھر کی چار دیواری میں رہنا بھی دوبھر کردیں گے۔ مجھے اپنی عزت کا بھی خیال ہے اس لیے کیا یہ سمجھوتا نہ کرلیں کہ ہم دونوں اپنی اپنی زبانیں بند رکھیں؟"

مہوش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سکتے کے عالم میں کھڑی ان بڑی بڑی طوفانی لہروں کا تصور کرتی رہی جو اسے پوری طرح غرقِ آب کردینے کا فیصلہ کرچکی تھیں۔ خاموشی کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے...؟" طاہر نے بڑی ڈھٹائی سے دریافت کیا۔

"ضیا آپ کو سگے بھائی سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔" مہوش نے نظریں جھکا کر دل کی ڈوبتی دھڑکنوں کو سنبھال کر کہا۔ "آپ نے ان کا خیال بھی..."

"ہمیشہ کرتا رہا لیکن..." طاہر ندیم کے ہونٹوں پر ایک زہریلا تبسم جاگ اٹھا۔ "جب شہلا کے سلسلے میں ضیا نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا تو پھر مجھے بھی جوابی کارروائی کا حق تو پہنچتا تھا۔"

"لیکن شہلا..." مہوش نے ہمت کر کے شہلا کے ماضی کے بارے میں زبان کھولنے کی کوشش کی۔ "وہ تو..."

"شادی سے پہلے ایک ماڈل تھی۔ سوسائٹی گرل بھی رہ چکی ہے... میں جانتا ہوں۔" طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "لیکن میری بیوی بن کر تو رشتے کی نوعیت بھی بدل چکی تھی۔ ضیا نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ضیا کی شراب نوشی کے بعد اس کی عیاشی کی پہلی داستان اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کا ذہن جیسے گنگ ہوکر رہ گیا، اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔

"میرے پاس ایسی اور کئی تصویریں بھی مختلف زاویوں سے موجود ہیں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تک تم میرے ساتھ دوستی قائم رکھو گی، اپنی زبان بند رکھو گی... اس وقت تک یہ تصویریں بھی میرے لاکر میں بند ہی رہیں گی۔ میں اب چلتا ہوں... اس یقین کے ساتھ کہ تم کوئی جذباتی قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کرو گی ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ جھلملاتا ہوا فانوس بھی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوجائے گا جسے تم نے ماں کا خوبصورت نام دے رکھا ہے۔"

طاہر ندیم تیز تیز قدم اٹھاتا الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ مہوش خاموش کھڑی اپنی بے بسی پر سسکتی رہی، آنسو بہاتی رہی... اور ان آنسوؤں میں معصوم ماہا کا دھندلا دھندلا سا تصور بھی شامل تھا۔

اس روز مہوش نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ شام کی چائے بھی گول کرگئی تو روبی نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے بیگم صاحبہ... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں...؟" اس نے خالی خالی نظروں سے روبی کو گھورا۔ "کیا ہوا میری طبیعت کو؟"

"آپ نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا... شام کی چائے بھی نہیں پی۔"

"اوہ..." مہوش نے ایک حقیقت کو چھپانے کے لیے ایک جھوٹا تبسم اپنے کپکپاتے ہونٹوں پر سجالیا۔ پہلی بار اس نے دروغ گوئی کو شعار بنانے کی کوشش کی۔ "کل رات جس پارٹی میں میں نے ایک نئی تھائی (Thai) ڈش کھائی تھی، اس کی کھٹی کھٹی ڈکاریں ابھی تک آرہی ہیں۔ خدا جانے وہاں کے رہنے والے اسے کس طرح برداشت کرتے ہیں؟"

روبی اس کا جواب سن کر مسکرادی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "جب انسان کسی چیز کا عادی ہوجائے تو وہ اسے بری نہیں لگتی... زبان کا ذائقہ بھی حالات اور ماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔"

"تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟" مہوش نے اسے پہلی بار مشکوک نظروں سے دیکھا۔ شاید اس لیے کہ وہ شہلا سے کہیں زیادہ خوبصورت اور تروتازہ تھی۔ پھر وہ ضیا کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے گزشتہ کئی سالوں سے رہ رہی تھی... تو کیا، کہیں اس کی زبان کا ذائقہ بھی حالات اور ماحول کے ساتھ بدل تو نہیں گیا تھا؟ ایک بار طوفان زور پکڑ لے تو بڑے بڑے درخت بھی جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ روبی تو ابھی صرف ایک

http://paktunplace.blogspot.com

معصوم پودا تھی جس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ بھی مہوش کی طرح اورنج اور گریپ فروٹ کے کسی مشروب کو غلطی سے حلق کے نیچے اتارنے کے بعد بے بسی کا شکار بن چکی ہو اور اب... اپنی شرافت اور عزت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہو۔ جس ماحول میں وہ دونوں رہ رہی تھیں، وہاں سب کچھ ممکن تھا۔

"آپ ہی بڑے لوگوں سے سیکھی ہیں بیگم صاحبہ... ورنہ میں نے تو کبھی اسکول اور کالج کا منہ بھی نہیں دیکھا۔" روبی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تو اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ایک کام کر... تو آج سے ماہا بی بی کے برابر والے کمرے میں سویا کر... صاحب اس طرف کم ہی آتے ہیں۔"

"میں... میں سمجھی نہیں بیگم صاحبہ... وہ کمرا تو ماہا بی بی کے کھیل کے سامان کے لیے مخصوص ہے۔"

"تو کیا ہوا؟... تو تھوڑا سا سامان ایک طرف کرکے وہیں اپنا بیڈ لگالے... میں ماہا سے کہہ دوں گی تو وہ بھی تیرا خیال رکھے گی اور... میں بھی یہی چاہوں گی کہ اب تو بھی اٹھتے بیٹھتے ماہا بی بی پر نظر رکھنا... زمانے کی روش بھی بدلتے موسموں کی طرح کبھی کچھ اور کبھی کچھ ہوتی رہتی ہے۔" اس نے قریب بلا کر روبی کو پیار سے سمجھایا۔ "میں گھر کے دوسرے ملازموں کے مقابلے میں تجھ پر زیادہ بھروسا کرتی ہوں۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں بیگم صاحبہ۔" روبی نے بڑے خلوص بھرے انداز میں جواب دیا۔ "میں ماہا بی بی کا ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔ آپ کو یا صاحب کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"گڈ..." مہوش نے اس کے شانے تھپتھپا کر کہا۔ "اسی بات پر آج سے تیری تنخواہ میں پانچ سو روپے کا اضافہ بھی کرتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد روبی چلی گئی تو وہ اٹھ کر ماہا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وقت کا پنچھی ہوا کے دوش پر پنکھ پھیلائے اڑتا رہا۔

ضیا کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ اس کا ستارہ بامِ عروج پر تھا۔ خوشامدیوں کی ایک بڑی تعداد اسے وقت بے وقت گھیرے رہتی۔ مہوش نے جب سے مہمانِ خصوصی کے دعوت نامے قبول کیے تھے، ضیا کو بھی اسٹیج پر اس کے برابر جگہ ملنے لگی تھی۔ ضیا کو دولت کے ساتھ ساتھ شہرت کی بھی خواہش تھی جو مہوش کی وجہ سے اسے مل رہی تھی۔

جب حرص حد سے تجاوز کر جائے تو پھر ہوس کی آگ بھی بھڑک کر اٹھتی ہے۔ اس نے شراب نوشی کے علاوہ دل کھول کر عیاشی شروع کر دی۔ ملکی اور غیر ملکی شوخ و شنگ لڑکیاں کھنکتے سکوں کے بدلے اس کی غلام تھیں۔ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتا رہا پھر اس نے بیرونِ ملک کے دورے بھی شروع کر دیے جہاں اس جیسے بے لگام کو اور زیادہ کھل کھیلنے کے مواقع میسر آتے رہے۔

مہوش کو ضیا کے دوستوں کے ذریعے ہر ایک بات کی بھنک ملتی رہتی لیکن وہ جانتی تھی کہ جب "طغیانی" زیادہ ہو تو موجوں کے سامنے کوئی بند زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے۔ ایک تیز ریلا سب کچھ اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے۔ وہ خود بھی مجبور تھی، اس کے پیروں میں ماہا کی بیڑی پڑی تھی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر ضیا کی چوکیداری کرنے کی خاطر اس کے ساتھ ملکوں ملکوں نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اکثر خدا سے دعا مانگتی۔

"میرے معبود! تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ میرا دامن اپنے سہاگ کو بچاتے بچاتے خود بھی آگ کی لپیٹ میں جھلس چکا ہے۔ طاہر کی بلیک میلنگ سے بچنے کے لیے مجھے اپنے اندر کی عورت کو مار کر جو تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے، اس کا سلسلہ روک دے۔ میری معصوم بچی... میری ماہا کو بچالے۔ اسے بخیریت طوفان میں گھرے اس گھر سے باعزت طور پر عروسی جوڑے میں رخصت کرا دے... مجھے کچھ اور نہیں چاہیے میرے معبود... بس تجھ سے التجا ہے کہ میری معصوم اور بھولی بھالی ماہا کا دامن آلودہ نہ ہونے پائے۔ تیرے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں... تجھے اپنے محبوب کا واسطہ کہ میری ماہا کو اپنی پناہ عطا فرمادے۔" پھر وہ بلک بلک کر رونے لگتی۔ گناہ دوسرے کر رہے تھے، سزا اسے بھگتنی پڑ رہی تھی۔

درمیان میں ضیا کو ایک جھٹکا لگا، اچانک ایک روز اسے بیٹھے بٹھائے ماں کی موت کی اطلاع ملی تو وہ پہلی مرتبہ چکرا کر رہ گیا۔ ماں کو ایسی کوئی خاص بیماری بھی لاحق نہیں تھی۔ ضیا دنیا میں جہاں بھی ہوتا، روزانہ ماں کی خیریت دریافت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ نشے کی حالت میں بھی اسے اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اس کے ساتھ قدرت نے جو مہربانی کی ہے، اس میں سب سے بڑا ہاتھ ماں کی دعاؤں کا ہے۔ ماں کے آرام کی خاطر اس نے دنیا جہان کی آسائشیں مہیا کر رکھی تھیں۔ نوکر چاکر، گاڑی، ڈرائیور حتیٰ کہ گھر کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی اسی نے اٹھا رکھا تھا۔ پھر ماں کو کیا دکھ، کیا پریشانی تھی جو اس قدر خاموشی سے روٹھ کر چلی گئیں؟ ایک لمحے کو اس نے سوچا... کہیں ایسا تو نہیں کہ ماں کو اس کی عیاشی کی خبر مل گئی ہو اور وہ اس صدمے کو برداشت نہ کرسکی ہوں؟

ہر مقابلے کے بعد اسے اسٹریچر پر باہر لانا پڑتا ہے۔ ہم نے سوچا اس بار اسے اسی طرح رنگ میں لے جائیں

اس خیال نے اسے کئی دنوں تک گھر کی چار دیواری میں قید کیے رکھا۔ دوست یار آتے تو ملازم انہیں دروازے سے ہی یہ کہہ کر لوٹا دیتے کہ... "صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" کوئی فون آتا تو روبی حسبِ ہدایت الٹا سیدھا بہانہ کرکے انہیں ٹال دیتی۔

ضیا ایک بار پھر مہوش کی بانہوں تک محدود ہو گیا۔ گھنٹوں اس کے قریب بیٹھا اپنی ماں کا سوگ مناتا رہتا، بیتی باتیں اور یادیں آنسو بن کر اس کی پلکوں سے چھلک اٹھتیں۔ ایسے میں مہوش اسے تسلیاں دیتی۔ ضیا زیادہ پریشان ہوتا تو ماہا کی معصوم باتیں اس کے زخموں پر کسی مرہم کا پھایا بن جاتیں۔ مہوش خوش تھی کہ ضیا میں بدلاؤ آ گیا تھا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ دس بارہ دن بڑے سکون سے بیت گئے پھر ضیا کے معمولات آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے۔ خود غرض دوستوں نے اس کے کانوں میں یہ زہر پھونک دیا کہ شراب ہر غم کا بہترین اور مؤثر علاج ہے۔ ضیا نے اس علاج کو پہلے سے زیادہ بڑی خوشی اختیار کرلیا۔

اس کی عیاشیاں حد سے بڑھیں تو اس کے ذہن میں رفتہ رفتہ شک کا پودا بھی پروان چڑھنے لگا۔ ایک دن اس نے اچانک سوچا کہ مہوش جو اس کے بغیر پندرہ دن گزرتے ہی بے چین ہو جاتی تھی، اب کیسے اس کی کمی کو پورا کر رہی ہوگی؟ بے اختیار ہنستے ہوئے اس نے ایک لمبا گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر کسی پنجابی فلم کا ایک گھسا پٹا مکالمہ دہرایا۔

"دریا کی سرکش موجیں جب ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر تھک جاتی ہیں تو بچنے کے لیے اور کوئی راستہ اختیار کر لیتی ہیں۔ تو مہوش اور کسی... اور کسی اور کسی..." ضیا نے بہکے لہرا کر گنگنایا پھر غصے میں بھرے ہوئے گلاس کو سامنے والی دیوار پر اس شدت سے مارا کہ اس کے ذرات ادھر ادھر بکھر گئے۔ پھر اس نے اندر لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر پوری بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی۔ اس وقت وہ شہر کے ایک بڑے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا جینا کا انتظار کر رہا تھا۔ جینا جو عرب کی بہترین بیلے ڈانسر تھی، ایک مقامی فور اسٹار کے مالک نے اپنا بزنس چمکانے کی خاطر اس کی خدمات کو ایک ہفتے کے لیے دس لاکھ روپے میں خریدا تھا۔ دیگر اخراجات بھی ہوٹل والوں کے ذمے تھے۔ جینا اگلی صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہی تھی لیکن اس نے دو لاکھ کے عوض اپنی آخری رات کے آرام کو بھی ضیا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ضیا اس وقت اسی کا منتظر تھا، وہ آ گئی تو ضیا کا غم بھی غلط ہو گیا۔ وہ بیوی کے علاوہ ماہا کو بھی یکسر فراموش کرکے جینا کے جسمانی نشیب و فراز میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔

رات کو دو بجے جینا کاروباری انداز میں جاتے جاتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ایک ہوائی بوسا اچھال کر چلی گئی تو ضیا بھی بے خبر ہو گیا۔ دوسری صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تو گزری رات کے خمار کے ساتھ مہوش پر بلاوجہ ہونے والا شبہ بھی اس کے ذہن میں کروٹیں لینے لگا۔ وہ تیار ہو کر سیدھا گھر گیا۔

ماہا اسکول جا چکی تھی۔ وہ لاؤنج سے گزر کر سیدھا باورچی

http://pakfunplace.blogspot.com

خانے میں گیا جہاں مہوش خانساماں کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایت دے رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو ضیا کو خلافِ توقع سامنے کھڑا دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔

"آپ...؟" اس نے خوشگوار حیرت سے سوال کیا۔

"کمرے میں آؤ... مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" وہ پلٹ کر باہر آیا۔ گول سیڑھیاں عبور کرتا ہوا، اوپر والی راہداری سے ہو کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ مہوش سیکڑوں ارمان دل میں لیے تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چلی گئی۔ ضیا اسے رات کو ایک فنکشن اٹینڈ کرنے اور صبح دیر سے آنے کا کہہ کر گیا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے بڑی اپنایت سے سوال کیا۔ "آج آپ سویرے سویرے کیسے آ گئے؟ رات کا فنکشن کیسا رہا؟"

"کچھ لطف نہیں آیا..." ضیا نے اسے تولتی نظروں سے دیکھا۔ "تمہارا خیال آتا رہا۔"

"میرا خیال؟" مہوش خوشی کے ایک احساس سے... جھوم اٹھی۔ "خدا کا شکر ہے، آپ کو میرا خیال تو آیا۔"

"تمہیں آئندہ ہفتے کتنے ورائٹی پروگرامز اور فیشن شوز میں مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا ہے؟"

"یاد نہیں لیکن... دو تین تو ہوں گے۔"

"سب سے انکار کر دو۔" ضیا کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔ "مجھے تمہارا غیر مردوں کے سامنے آزادی سے گھومنا پھرنا، ہنس ہنس کر... بے تکلف ہونا بالکل پسند نہیں ہے۔"

"بے تکلف ہونا؟" مہوش چونکی۔ "لیکن میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ جو باتیں دوسرے کرتے ہیں، وہ بھی آپ کے سامنے ہی کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" ضیا نے پہلی بار اسے نفرت سے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "میں اتنا بچہ بھی نہیں ہوں کہ پارٹیوں میں تمہارے بن سنور کر جانے کا مطلب بھی نہ سمجھ سکوں۔"

"اس کے لیے بھی آپ ہی مجھے بار بار مجبور کرتے ہیں۔" وہ چپ نہ رہ سکی۔

"کل جو باتیں پھیلیں گی، اس کے بارے میں بھی مجھے موردِ الزام ٹھہرا دینا۔" ضیا نے چیخ کر کہا۔

"کیسی باتیں؟" وہ ایک بے بنیاد الزام کو برداشت نہ کر سکی۔

"بحث نہیں... میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ مجھے سکون کی ضرورت ہے... گیٹ آؤٹ۔"

مہوش کو اپنی تضحیک کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ اس کے پاس جواب میں کہنے کو ہزاروں جائز باتیں موجود تھیں، بے شمار شکوے تھے جو وہ ملنے جلنے والی عورتوں سے سن چکی تھی... اور کچھ نہیں تو وہ کم از کم پلٹ کر شہلا کا نام تو زبان پر لا سکتی تھی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ وہ خواب گاہ کی باتوں کو اسی ساؤنڈ پروف کمرے میں دفن کر دینا چاہتی تھی۔ بات باہر نکل کر ملازموں تک پھیلتی تو وہ کس کس کا منہ بند کرتی پھرتی؟

ایک ہفتے تک دونوں کے درمیان کھینچا تانی رہی۔ مہوش نے ضیا کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کی خاطر ماہا کے ساتھ سونا شروع کیا تو ضیا کو ایک روز ہوش مندی میں جوان بیٹی کا خیال آ ہی گیا۔

آٹھویں روز اس نے روبی کے ذریعے مہوش کو اپنی خواب گاہ میں بلایا، ماہا اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ وہ پڑوس میں کمپائنڈ اسٹڈی کرنے کے لیے اپنی ایک پرانی سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مہوش کچھ دیر خیالوں کے ہجوم میں گھری رہی پھر کچھ سوچ کر قدم اٹھاتی ضیا کے سامنے جا کر خاموش کھڑی ہو گئی۔

"کیا بہت زیادہ خفا ہو؟" ضیا نے دبی زبان میں پوچھا۔ ایک عرصے بعد اس کے ہونٹوں پر وہی پیارا سا معصوم تبسم نہ جانے کیسے بھولے سے ابھر آیا تھا جس کی مہوش دیوانی تھی۔

"کیسے یاد کیا آپ نے؟" اس نے دل پر جبر کر کے خود کو سنجیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ ورنہ اس کا دل تو چاہا تھا کہ دوڑ کر ضیا کے سینے سے لگ جائے، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہے۔

"ضیا! اب بھی کچھ وقت باقی ہے۔ اپنی روش بدلنے کی کوشش کرو ورنہ پانی سر سے گزر گیا تو پھر سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ زیادہ عرصے کے لیے نہیں تو کم از کم اس وقت کے لیے اپنی موجودہ مصروفیات کو صرف دفتر تک محدود کر لو جب تک ہماری ماہا سرخ جوڑا پہن کر اپنے مجازی خدا کا ہاتھ تھام کر نئی زندگی کا آغاز کرنے اپنے گھر نہیں چلی جاتی... پھر... میں تمہارے راستے کی دیوار بننے کی کوشش نہیں کروں گی۔" مگر مہوش نے اپنی بات زبان تک لانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ پتھر میں جونک نہیں لگا کرتی۔ لہٰذا دل کی حسرتیں دل میں دبائے کھڑی رہی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا...؟" ضیا نے پھر پیار سے پوچھا۔ "کیا معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟"

اس کے سوکھے ہونٹوں پر ایک زہریلا تبسم تڑپ کر رہ گیا۔ اسے مکڑی کا وہ خوبصورت جالا یاد آ گیا جو صبح اس کی موجودگی میں باغ کے مالی نے بڑی حقارت سے ایک ڈنڈی سے تہس نہس کر ڈالا تھا۔ مکڑی کا جال دور سے بہت خوبصورت

نظر آتا ہے مگر کسے خبر کہ اس جال میں زندگی اور موت کا کھیل ہر دم جاری رہتا ہے اور جال بنانے والا دور سے یہ کھیل دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو...؟" ضیا نے اسے خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔

"سوچ رہی ہوں کہ آپ کی باتوں کا کیا جواب دوں...؟" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"کم آن یار... ختم بھی کرو..." ضیا نے آگے بڑھ کر اس کے حسین مگر سوگوار وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کے ریشمی بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو چوم کر بولا۔ "ہوٹل کا باسی کھانا کھاتے کھاتے تنگ آ چکا ہوں۔ آج گھر پر ہوں تو پھر تازہ ڈش ہو جائے۔"

"ایک شرط پر..." وہ ضیا کی مضبوط بانہوں میں الجھ کر نرم پڑنے لگی۔ امیدوں کے بہت سارے چراغ جلنے بجھنے لگے۔

"بغیر سنے منظور..." ضیا نے اپنی دریا دلی کا ثبوت دیا۔

"ایسے نہیں..." اس نے قدرے مچل کر کہا۔ "قسم کھا کر وعدہ کریں کہ آپ آئندہ مجھ پر شک نہیں کریں گے۔"

"نشے کی حالت میں کہے ہوئے ایک جملے کو اب تک دل میں لیے بیٹھی ہو؟" ضیا نے بڑی شان سے جواب دیا۔

طاہر ندیم کے حوصلے کی داد دو۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے شہلا کو کس قدر پیار سے "شلو" کہہ کر مخاطب کرتا ہے، جانتی ہو کیوں؟... شہلا اس کی ضرورت ہے۔ اس کی آڑ میں اب تک نہ جانے وہ کتنی ادھ کھلی کلیوں کو مسل کر پھول بنا چکا ہے۔ اور شہلا... سب کچھ جانتے بوجھتے بھی خود اس کے لیے نئے نئے شکار گھیر کر لاتی ہے اور تم... ایک ذرا سی بات پر مجھ سے روٹھ گئیں... وہاٹ نان سنس۔"

"میں شہلا اور طاہر کی نہیں، اپنی اور آپ کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے کسمسا کر کہا۔ "جب تک آپ قسم کھا کر وعدہ نہیں کریں گے، میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔"

"اچھا بابا لو..." ضیا نے کانوں کو ہاتھ لگا کر مسکرا کر کہا۔ "وعدہ رہا کہ آئندہ آپ کی شان میں کوئی غلط خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔"

"زبان سے بھی کوئی الٹی سیدھی بات نہیں نکالیں گے؟"

"وعدہ... نہیں نکالوں گا اور کچھ...؟" ضیا اس کو بہلانے کے طریقوں سے واقف تھا۔ اس نے مسکرا کر سارے وعدے کر ڈالے۔ "تمہیں ایک خوش خبری سناتا تو بھول ہی گیا۔ میں نے آٹھ تاریخ کی برٹش ائرویز میں فرسٹ کلاس کی دو نشستیں بک کرا لی ہیں۔ پندرہ تاریخ کو میرے بچپن کے دوست اسلم پینڈو کی شادی کی سالگرہ ہے، ہم دو روز لندن میں رکنے کے بعد وہاں جائیں گے۔"

مہوش کو پینڈو کا خطاب سن کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"شادی کے موقع پر تو اسے پرانے خطاب سے نہ یاد کیجیے۔" اس نے مسکرا کر ضیا سے کہا۔

"اگر آپ اس کی سفارش کر رہی ہیں تو نہیں کہوں گا اسے پینڈو... ورنہ اب تو امریکا میں اس کے پاس پڑوس والے بھی اسے امریکی پینڈو ہی سمجھتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور ضیا... اسے کھینچ کر... ایک گوشے میں رکھے عربی طرز کے خوب صورت بیڈ پر لے گیا جو اس نے نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد بیرونِ ملک سے خطیر رقم خرچ کر کے بطورِ خاص منگوایا تھا۔

مہوش نے جان بوجھ کر کسی مزاحمت سے پھر گریز کیا، اس امید پر کہ شاید صبح کا بھولا شام کو گھر واپس لوٹ آئے۔

☆☆☆

جہاز نے لندن سے امریکا کے لیے پرواز کی تو آف سیزن کی وجہ سے فرسٹ کلاس میں کل نو مسافر تھے جو دور دور بیٹھے تھے۔ اس نے موقع جان کر ضیا سے ماہا کی بات چھیڑ دی۔

"آپ نے اپنی ماہا کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟ چار ماہ بعد اگست میں وہ پورے سولہ سال کی ہو جائے گی اور خدا نے چاہا تو اولیول بھی کر چکی ہو گی۔"

"سوچنا کیا ہے... کوئی اچھا رشتہ آیا تو اس کی بات بھی پکی کر دیں گے... لیکن ایک شرط پر۔"

"وہ کیا...؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ماہا امریکا کی کسی معروف یونیورسٹی سے گریجویشن کر لے۔" ضیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "کل کو اگر خدانخواستہ کوئی بُرا وقت آئے تو وہ شوہر کی محتاج ہونے کے بجائے خود اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہو سکے۔"

"خدا نہ کرے جو اس کی نوبت آئے۔" مہوش نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

"تمہاری طرح ایک باپ کی حیثیت سے میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرے چاند کو کبھی گہن نہ لگے لیکن زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

"آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن لڑکے والے مان جائیں گے ہماری شرط پر؟" اس نے دبی زبان میں کہا۔ "رخصتی کے بعد ویسے بھی لڑکی پر میکے والوں کا زور نہیں چلتا۔ جو سسرال

http://pakistanipoint.com

والے چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے۔"

"کیا تمہاری نظر... میں اپنی ماہا کے لیے کوئی ایسا لڑکا ہے..... جو ہماری شرط پر پورا اترتا ہو؟"

"ہے تو سہی اپنوں میں ہی ایک دیکھا بھالا لڑکا... لیکن ابھی وہ خود بھی انٹر میں ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے..." ضیا نے تیزی سے کہا۔ "ہم لڑکے کو بھی باہر بھیج کر اپنے خرچ پر اگر ایم بی اے کرانے کا وعدہ کرلیں تو پھر وہ بھی خوشی خوشی ہماری شرط مان لیں گے... لیکن تم کس کی بات کررہی ہو؟"

"آپ کی فرخندہ باجی کے بڑے بیٹے یوسف کی۔" اس نے بات آگے بڑھائی۔ "کئی بار وہ ڈرتے ڈرتے دبی زبان میں اپنی ماہا کی ڈھیروں تعریف بھی کرچکی ہیں لیکن اپنی غربت کی وجہ سے کھل کر کوئی بات زبان پر بھی نہیں لائیں۔"

"گڈ!" ضیا نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "فرخندہ باجی کے گھر کا مشرقی ماحول مجھے پسند بھی ہے اور خاص طور پر یوسف بھی بہت شریف اور ذہین لڑکا ہے۔ تم امریکا سے واپس لوٹتے ہی فرخندہ باجی کو ذرا کریدنے کے بعد بات پکی کرلینا۔ باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔"

مہوش کے دل کی مراد بر آئی تو اس نے دل ہی دل میں خدا کے حضور سیکڑوں سجدے شکر گزار دیے، پھر کچھ توقف سے بولی۔

"میں ایک بات کہنا چاہوں گی۔"

"کہو..."

"میری خواہش ہے کہ ماہا کی سالگرہ اور اس کی اولیول کی کامیابی کی خوشی میں یوسف اور ماہا کے نکاح کی رسم بھی ادا کر دی جائے، رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ ہم امریکا میں بھی ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ بورڈنگ میں رہنے کا بندوبست کرادیں تو کسی اونچ نیچ کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔"

ضیا نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نظریں اس غیر ملکی کا فرحسینہ ائر ہوسٹس پر منڈلا رہی تھیں جو اپنی اداؤں سے تین الگ الگ بیٹھے تنہا مسافروں کو رجھانے کا فرض بڑی بے باکی سے ادا کررہی تھی۔

"کیا بہت زیادہ بھا گئی ہے آپ کے دل کو...؟" مہوش نے کہنی مار کر ضیا کو ٹٹولا تو اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"قیامت لگ رہی ہے ظالم..."

"لیکن یہاں جہاز میں آپ کی دال نہیں گلے گی۔"

"چیلنج کررہی ہو؟"

"نہیں ہابا... نہیں۔" وہ جلدی سے محتاط ہوگئی۔ "یونہی ایک بات روانی میں منہ سے نکل گئی تھی۔" پھر اس نے دوبارہ بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا رخ ماہا اور یوسف کے رشتے کی طرف کردیا۔

☆☆☆

امریکا سے واپس آتے ہی اس نے پہلی فرصت میں فرخندہ باجی سے میل ملاپ بڑھانا شروع کردیا۔ وہ جلد از جلد ماہا کو اس دوزخ سے دور کردینا چاہتی تھی جہاں اب اس کا بھی دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اپنے اندر کی گھٹی گھٹی عورت سے بھی خائف تھی کہ اگر کسی دن اس نے بھی بغاوت کردی تو اس گھر کا انجام کیا ہوگا؟

وہ اس بات کی منتظر تھی کہ فرخندہ باجی اپنی زبان سے ماہا کے لیے یوسف کا رشتہ مانگیں۔ قدرت نے ایک دن اس کی یہ خوشی بھی پوری کردی۔ اس دن ماہا اسکول سے واپس آئی تو فرخندہ باجی اور مہوش باہر لان میں موجود تھیں۔ ماہا بھی ہنستی مسکراتی انہی کے پاس آبیٹھی۔ اس نے بڑے ادب سے فرخندہ باجی کو سلام کرتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی تو جواب میں فرخندہ باجی نے اسے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں اور بڑے پیار سے پوچھا۔

"اور سناؤ بیٹی! تمہارا نتیجہ کب آرہا ہے؟"

"وہ ماہ بعد..." ماہا نے معصومیت سے کہا۔ "دعا کیجیے گا کہ میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"خدا نے چاہا تو تم شان دار نمبروں سے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوگی۔" فرخندہ باجی نے دل سے دعا دی۔

کچھ دیر بعد ماہا اٹھ کر اندر چلی گئی تو فرخندہ باجی نے ایک دو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مہوش سے پوچھا۔

"تم نے اپنی ماہا کے لیے کیا سوچا ہے؟"

"کس سلسلے میں...؟" وہ انجان سی بن گئی۔

"خدا رکھے اب بچی سولہ سال کی ہورہی ہے۔ تم نے اس کے مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ ضرور سوچا ہوگا؟"

"میرا کیا سوچنا ہے۔" اس نے دبی زبان میں بات آگے بڑھائی۔ "ضیا تو ہمیشہ میری بات سن کر ایک ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ پہلے ماہا امریکا جاکر گریجویشن کرلے پھر رشتے کے بارے میں بھی سوچا جائے گا۔"

"یہ تو بہت اچھا خیال ہے لیکن امریکا کا ماحول..." فرخندہ باجی کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں تو اس نے بات آگے بڑھانے کی خاطر کہا۔

"میں نے ضیا کو ایک مشورہ اور بھی دیا تھا۔"

"وہ کیا...؟"

"یہیں کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر پہلے نکاح کی رسم ادا کر دی جائے پھر ماہا گریجویشن کرلے تو رخصتی دھوم دھام سے بھی کی جاسکتی ہے۔"

"پھر... ضیا نے کیا کہا؟"

"وہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ لڑکی نکاح کے بعد پرایا دھن ہوجاتی ہے جس کے بعد میکے والوں سے زیادہ سسرال والوں کی ضد چلتی ہے۔" وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد پھر بولی۔ "ضیا کچھ غلط بھی نہیں کہتے لیکن ایک طریقہ اور بھی ہوسکتا ہے کہ اگر لڑکا اور لڑکی دونوں امریکا میں الگ الگ رہیں اور تعلیم بھی حاصل کرتے رہیں تو وہاں کا ماحول اپنانے سے بھی ایک دوسرے کی وجہ سے کتراتے رہیں گے۔ آپ کی نظر میں کوئی ایسا لڑکا ہے جس کے والدین ہماری شرط... مان جائیں؟"

مہوش نے دھڑکتے دل سے پوچھ ہی لیا۔

"ہے تو سہی مہوش لیکن..." فرخندہ باجی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"لیکن کیا...؟" وہ سمجھ رہی تھی کہ فرخندہ باجی جو خواب دل میں لیے بیٹھی ہیں، اس کو زبان تک لانے میں ان کی غربت آڑے آرہی ہے۔ عمر میں وہ ضیا سے بڑی ضرور تھیں لیکن دولت اور غربت کا درمیانی فرق اب اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ ان کی ہچکچاہٹ بھی بے جا نہیں تھی۔

"ایک بات منہ کھول کر کہوں لیکن ایک شرط پر۔"

"کیسی شرط فرخندہ باجی؟" اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "آپ عمر اور رشتے، دونوں میں بڑی ہیں پھر درمیان میں یہ شرط والی بات کہاں سے آگئی؟"

"سچ کہوں تو تم اب بھی بالکل اپنی اپنی سی لگتی ہو لیکن ضیا میاں نے تو بھول کر ہمارے گھر کی طرف بھی قدم نہیں اٹھایا۔ شاید دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح ان کی مصروفیات بھی اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب انہیں فرخندہ باجی کا نام بھی نہ یاد رہا ہو۔"

"ایسا نہیں ہے فرخندہ باجی..." مہوش ان کی دل جوئی کی خاطر اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے پہلو میں جا بیٹھی اور بڑی خوبصورتی سے جھوٹ بولی۔ "ضیا کی مصروفیات بھی کاروبار کے ساتھ بڑھ ضرور گئی ہیں لیکن وہ آپ کو ابھی تک بھولے نہیں۔ اکثر آپ کا اور یوسف کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں بلکہ ایک بار تو شکایت بھی کررہے تھے کہ یوسف نے ہماری طرف آنا جانا ہی بند کردیا۔"

"تم اس کی وجہ بھی ضرور جانتی ہوگی؟"

"میں آپ کا اشارہ سمجھ رہی ہوں لیکن اپنے تو ہمیشہ اپنے ہی رہتے ہیں اور پھر آپ تو ہم دونوں کی بزرگ بھی ہیں۔"

"اگر چھوٹا منہ بڑی بات نہ سمجھو تو ایک بات پوچھوں...؟" فرخندہ باجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "لیکن ایک شرط پر... اگر میری بات تمہیں پسند نہ آئے تو اس کا تذکرہ ضیا سے نہ کرنا۔"

"آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو آپ کہیں گی تو میں برا مان جاؤں گی... اچھا، نہیں بتاؤں گی۔"

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" فرخندہ باجی اس کو ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازتی رہیں پھر ہمت کرکے اپنے دل کی بات زبان تک لے ہی آئیں۔ "تمہیں اپنی ماہا کے لیے یوسف کیسا لگتا ہے...؟"

"میرے خیال میں تو یہ جوڑی انتہائی مناسب رہے گی لیکن..." مہوش نے جان بوجھ کر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "اس سلسلے میں ضیا سے تو بہرحال پوچھنا ضروری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی اور لڑکا بھی ہو۔"

"تم چاہو تو اسے اپنی فرخندہ باجی کی خودغرضی بھی سمجھ لو۔" اس بار فرخندہ باجی کی آواز رندھ گئی۔ "یوسف ذہین بھی ہے اور ہمیشہ پہلی دوسری پوزیشن بھی لاتا رہا ہے۔ اس نے کئی بار اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ کسی باہر کی یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنا چاہتا ہے۔ اگر سر چھپانے کا آخری سہارا ایک مکان بھی فروخت کردیں تو بھی شاید یوسف کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ ہاں، اگر ضیا میاں اس غریب کے سر پر ہاتھ رکھ دیں تو اور بات ہے۔"

"آپ دل چھوٹا نہ کریں۔" اس نے اپنی بے پناہ مسرتوں کو چھپاتے ہوئے فرخندہ باجی کو حوصلہ دیا۔ "یوسف ہر اعتبار سے مجھے ماہا کے لیے بہت مناسب رشتہ نظر آرہا ہے۔ بس آپ دعا کریں کہ ضیا بھی مان جائیں..."

فرخندہ باجی چلی گئیں تو اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اسی رات اتفاق سے ضیا جلدی گھر آگیا تو مہوش نے اسے بھی نیک شگون سمجھ کر فرخندہ باجی کے آنے اور یوسف کی خواہش کا تذکرہ چھیڑ دیا... اور اس وقت تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ضیا نے کچھ ترمیم و اضافے کے بعد اپنی منظوری کا اعلان بھی کردیا۔

تین روز بعد مہوش کے بے حد اصرار پر ضیا، فرخندہ باجی کے گھر بھی گیا اور تمام ضروری باتیں طے ہوگئیں۔ چار ماہ بعد ماہا کا نتیجہ بھی آگیا۔ وہ دوسری پوزیشن حاصل کرسکی تھی۔ پھر حسب

http://pakistanipoint.com

پروگرام ماہا کی سالگرہ اور اس کی کامیابی کی خوشی کی دھوم دھام کے ساتھ یوسف اور ماہا کا نکاح بھی ہوگیا۔ اس روز ایک مدت بعد اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ اس خوشی کے موقع پر دل کھول کر روئی۔

دو ماہ بعد یوسف اور ماہا اس جہنم سے دور چلے گئے جہاں مہوش گھٹ گھٹ کر سانس لے رہی تھی۔ ضیا نے امریکا میں ان کے علیحدہ علیحدہ ہوسٹل میں باقاعدہ قیام کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ نکاح کے اخراجات کے لیے ضیا نے فرخندہ باجی کو بھی ایک معقول رقم دینے کی کوشش کی تھی جسے انہوں نے دعاؤں کے ساتھ واپس کر دیا تھا... ماہا کے جانے کے بعد مہوش نے سکون کا سانس لیا اور... پھر اس نے گھٹ گھٹ کر مرنا چھوڑ دیا۔ اس کے اندر قید عورت کو اپنی گھٹن کا جو احساس تھا، وہ ختم ہوا تو اس نے بھی ضیا کی طرح زندہ رہنے کا ڈھنگ اختیار کر لیا۔ اس نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش تو نہیں کی لیکن اب وہ جہاں چاہتی، ضیا کی اجازت کے بغیر آنے جانے لگی۔ ضیا نے ایک دو بار اس سے اس سلسلے میں باز پرس کی تو وہ ٹال گئی پھر تنگ آ کر اس نے بھی زبان پر پڑے تالے توڑ دیے، ترکی بہ ترکی جواب دینے لگی۔

اس روز بھی اس نے بڑی دیدہ دلیری سے ضیا کو جواب دیا جس روز ضیا نے شیشم کی جیولری سے موصول ہونے والے بیالیس ہزار کے بل پر اعتراض کیا تھا۔ وہ بھر اج کی وہ انگوٹھی اس نے حقیقتاً ضیا کے دوست شاکر اور اس کی بیوی راحیلہ کو شادی کی سالگرہ کے موقع پر گفٹ دینے کے ارادے سے راحیلہ کی پسند پر خریدی تھی۔ اسے ضیا اور شاکر کی دوستی کا علم تھا۔ ضیا براہ راست کوئی تحفہ دیتا تو وہ بھی پچاس ہزار سے کم کا نہ ہوتا۔ اس دن اس نے کھلے الفاظ میں ضیا کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اس کے ایما اور بے حد اصرار کے بعد اس نے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالا تھا۔ اس کی شہرت میں چار چاند لگانے کی خاطر اس نے مہمان خصوصی کے دعوت نامے قبول کرنا شروع کیے تھے، ورنہ ذاتی طور پر اسے کوئی شوق بھی نہیں تھا۔

پھر... اب جب پانی سر سے گزر گیا تو بات بات پر اعتراض کرنے کی کیا تک تھی؟ اس کا گناہ کیا تھا؟... صرف اتنا کہ اس نے ایک مرد کی خواہش اور اس کی خوشی کے لیے، جو اس کا مجازی خدا بھی تھا، ایک مشرقی اور گھریلو عورت کے جسم سے وہ لباس اتار کر پھینک دیا تھا جس کو شادی کے بعد برسوں تک وہ حیا اور تقدس کا "آہن پوش" جان کر اپنے پاکیزہ جسم کو اس میں چھپائے رکھتی تھی... اور آج جب نقاب رخ سے اٹھا، انسان نما درندوں نے اس پر میلی نظر ڈالنا شروع کی تو ضیا کو اپنی عزت اور غیرت کا خیال کس طرح آ گیا؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ ایک مرد تھا...؟

مہوش نے اب اپنا حق جان کر برابری کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے ضیا سے اب بھی اتنی ہی محبت تھی۔ ضیا کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھی۔ ضیا اگر اسے ایک بار پھر پلٹ کر اپنی وفا کا یقین دلا دیتا تو وہ اس کے قدموں پر سر رکھ کر اس کی غلامی دوبارہ خوشی خوشی قبول کر لیتی لیکن اسے... "اپنے کو نصیحت اور دوسرے کو فضیحت" والی بات کسی طور گوارا نہیں تھی۔ وہ پوری طرح سرکشی پر آمادہ ہو گئی۔ کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک ضیا کو خود اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔

کبھی ضیا نرم پڑ جاتا تو وہ اپنے رویے میں ایک معمولی سی لچک پیدا کر لیتی۔ کبھی ضیا نشے میں دھت ہو کر اسے برا بھلا کہتا، اس کے دامن کو اپنے رکیک جملوں سے داغ دار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ حقیقتوں کے آئینے میں ضیا کو اس کا مکروہ چہرہ دکھانے سے دریغ بھی نہیں کرتی تھی۔

مہوش کو ایک بات کا یقین تھا کہ ضیا کم از کم ماہا کے حق میں کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اسی یقین نے اس کے اندر ابلتے ہوئے لاوے کو تقویت بھی دے رکھی تھی۔

وقت کسی نہ کسی طرح گزرتا رہا...!

☆☆☆

نوشین اپنی شادی کے بعد شوہر کے ساتھ دوسرے شہر چلی گئی تھی، کبھی کبھی اس کے فون آتے رہتے تھے۔ اس روز لاؤنج کا دروازہ کھلا اور نوشین اچانک مہوش کے سامنے آئی تو اس نے دوڑ کر نوشین کو گلے لگا لیا۔ روبی ناشتے کے اہتمام میں لگ گئی۔ مہوش، نوشین کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ ان کے درمیان دنیا جہان کی باتیں شروع ہو گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کی نجی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر مزے مزے کی باتیں کرتی رہیں پھر نوشین یک لخت سنجیدہ ہو کر بولی۔ "ضیا بھائی کہاں ہیں...؟"

"انہیں اپنے کاروباری معاملات سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔" مہوش نے اپنے غموں کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کی۔

"تو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہی؟" نوشین نے اس کی مسکراہٹ میں چھپے غم کو محسوس کر لیا۔

"کیا چھپاؤں گی تجھ سے...؟" اس نے اسے پھر ٹالا۔

"ہاں، یہ تو ہے لیکن... میں ضیا بھائی کے بارے میں جو کچھ اڑتی اڑتی خبریں سن رہی ہوں ان کے بارے میں تو کیا کہے گی...؟" نوشین نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"کیا سن رکھا ہے تُو نے...؟"

"تُو نہیں بتائے گی...؟"

"کیا بتاؤں؟" وہ دل مسوس کر بولی۔ "اب بتانے کو باقی بھی کیا رہ گیا ہے؟"

"میں ضیا بھائی کو مل کر سمجھانے کی کوشش کروں؟" نوشین نے خلوص دل سے اپنی خدمات پیش کرنی چاہیں۔

"تیرا مان بھی ٹوٹ جائے گا... اور کیا عجب کہ وہ نشے کی حالت میں تجھے بھی نہ پہچان سکیں۔" مہوش کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ نظریں جھکا کر مدھم آواز میں بولی۔ "ان کے لیے خوبصورت اور جوان عورتیں اب بازار میں سجی شوکیس میں بے کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اگر تجھے بھی میلی نظروں سے دیکھا گیا تو میرے ضبط کے سارے بند ٹوٹ جائیں گے۔"

"بات اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے؟" نوشین کو جیسے سکتہ ہو گیا۔

"چل چھوڑ ان باتوں کو..." اس نے اس ناخوشگوار تذکرے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ "یہ بتا کہ وہ تیرا انتھا ہیلو... کیا نام ہے اس کا... ہاں، وہ گول مٹول فرقرم کہاں ہے؟"

"اب اس کے سامنے فرقرم کے بجائے فرقرم بھول کر بھی نہ کہنا۔" نوشین نے ہنس کر کہا۔ "اپنے باپ کی طرح بڑا حساس طبیعت کا مالک ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے۔"

"کیا اب وہ صاف بولنے لگا ہے؟" مہوش نے خوشی کا اظہار کیا پھر جھلا کر بولی۔ "تو اس کو ساتھ کیوں نہیں لائی؟ خدا کی قسم، اس کے منہ سے "کھالا" سننے کو کان ترس رہے ہیں۔"

"ابھی وہ اپنے دادا دادی کے پاس بیٹھے اترا رہے ہیں، اسی وجہ سے عابد بھی میرے ساتھ نہیں آئے۔ تجھے سلام کہلوایا ہے۔"

"نوشین..." اس نے دل مسوس کر پوچھا۔ "کیا عابد بھائی کو بھی ضیا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے؟"

"وہ باہر دوستوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں تو انہیں بھی ضرور حالات کا علم ہوگا لیکن خدا گواہ ہے کہ عابد نے کبھی میرے سامنے ضیا بھائی کے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالی... ہاں، ان کی خیریت ضرور دریافت کرتے رہتے ہیں۔"

اچانک باہر سے ضیا کے مخصوص ہارن کی تیز آواز سنائی دی تو مہوش اور نوشین دونوں ہی اٹھ کر باہر آ گئیں۔ ضیا بھی اتنی جلدی گھر واپس نہیں آتا تھا۔

ضیا اس وقت بھی نشے میں تھا لیکن کوئی بات ضرور تھی جو وہ تیزی سے گول زینہ عبور کرتے ہوئے اوپر آ رہا تھا۔ مہوش کے ساتھ اس نے نوشین کو بھی اپنا منتظر پایا تو نہ جانے کیوں گڑبڑا کر رہ گیا۔

"ارے... تم... کب آئیں نوشین؟" اس نے خود کو بہت سنبھال کر براہ راست نوشین کو مخاطب کیا۔ "عابد کہاں ہیں...؟"

"آپ آرام سے لباس تبدیل کر لیں پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔" مہوش نے شوہر کی بوکھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں... میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔" ضیا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر گاڑی میں... ایس پی ابرار بھی موجود ہے۔ ہم دونوں کو فوری طور پر طاہر عدیم کے دفتر پہنچنا ہے۔"

"کیوں...؟ کیا ہوا طاہر عدیم کو...؟" اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں... ایس پی کے حوالے پر نوشین بھی چونکی تھی۔

دو نشے

شراب کے نشے میں بدمست شخص لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا تو کسی سے ٹکرا گیا۔ اس نے بہکے بہکے لہجے میں معافی مانگی۔ "بھائی معاف کرنا، مجھ سے غلطی ہو گئی، اس وقت میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔"

اس شخص نے شرابی کو جھڑک دیا۔ "تجھے ہوش نہیں تو میں کیا کروں، میں تجھے اسی وقت بند کرا سکتا ہوں۔ کیا تو مجھے پہچانتا نہیں؟"

شرابی نے اس شخص کو غور سے دیکھا اور مسکرا کے جواب دیا۔ "میں نے آپ کو پہچان لیا۔ معاف کیجیے گا آپ وہی ہیں نا، جو کل تک حالتِ ناداری میں اپنے دوستوں کے آگے دستِ سوال دراز کیا کرتے تھے لیکن آج اچانک کی دولت مندی نے جسے مغرور اور خودسر بنا دیا ہے۔" پھر اس نے نہایت ادا سے کہا۔ "حضرت! شراب پی کر تو انسان اپنی حالت پر قابو رکھ سکتا ہے لیکن جب دولت کا نشہ سوار ہو جائے اور کوئی اس کی مستی سے بچ جائے تو سمجھو کہ اصل مرد وہی ہے۔"

کاشف عمر کی ریاضت، ملیر کراچی سے

http://paktunplace.blogspot.com

''وہ... وہ... شاکر نے طاہر ندیم کے دفتر جا کر اسے گولی ماردی ہے۔ میں بہت جلدی میں ایک ضروری چیز لینے آیا ہوں۔ واپسی پر تمہیں تفصیل سے آگاہ کروں گا۔'' ضیا نے خواب گاہ میں جا کر کوئی چیز لی پھر واپس جاتے ہوئے اس نے نوشین کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا۔ ''عابد کو میرا اسلام کہنا۔ میں آج رات کو کسی وقت فون پر ان سے بات کروں گا۔''

پھر ضیا جس طرح بوکھلایا ہوا آیا تھا، اسی طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس چلا گیا۔ ''طاہر ندیم کو گولی ماردی گئی۔'' یہ خوش خبری سن کر مہوش کو ایک طرح سکون ملا تھا لیکن اس کی کچھ پریشانیاں ابھی باقی رہ گئی تھیں جس کے بارے میں وہ بُری طرح الجھ رہی تھی۔

''یہ طاہر ندیم کون ہے...؟'' نوشین نے پوچھا۔

''طاہر اور شاکر دونوں ضیا کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔'' اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''پھر... یہ گولی مار دینے والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔'' نوشین نے یوں ہی ایک بات کہہ ڈالی۔

''چھوڑ ان باتوں کو...'' اس نے نوشین کا ہاتھ تھام کر دوبارہ کمرے کی طرف کھینچتے ہوئے اس ذکر کو ٹالنے کی خاطر کہا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ ''تو ان چکروں میں کہاں الجھنے بیٹھ گئی؟ اس قسم کے واقعات تو آئے دن ہمارے شہروں میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔''

نوشین کے ساتھ بیٹھ کر اس نے خود کو بہلانے کی کوشش کی لیکن طاہر ندیم کی اچانک موت کی اطلاع پھیلی تو اس کی سہیلیوں کے فون کا بھی تانتا بندھ گیا۔ نوشین کچھ دیر بیٹھی پھر اس کو الجھا دیکھ کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ مہوش اسے دروازے تک رخصت کرنے کے بعد دوبارہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔

''کس کا فون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی ندا صاحبہ ہیں...''

''ندا...'' مہوش نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آگیا کہ ندا ٹی وی اور فلم کی ایک نئی ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی جس سے دو تین بار اس کی رسمی سلام دعا بھی ہو چکی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ریسیور روبی کے ہاتھوں سے لے لیا۔

''ہیلو... میں مہوش بول رہی ہوں۔''

''میں ندا ہوں بھابی جان۔'' ندا نے بلاوجہ ایک رشتہ جوڑتے ہوئے کہا پھر سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ نے طاہر ندیم صاحب کے قتل والی خبر سنی؟''

''ہاں... آں، ایک دو فون تو آئے تھے لیکن ابھی تک کوئی تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''شاکر اور ندیم تو ایک دوسرے کے بے تکلف اور پرانے دوست تھے... پھر یہ سب کیسے ہو گیا اچانک؟''

''کیا آپ کو ابھی کچھ نہیں معلوم...؟''

''معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتی؟'' مہوش نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ''ضیا کو فون کیا تھا لیکن ان کا موبائل بند ہے۔ اس وقت وہ دفتر میں بھی نہیں ہیں۔ ان سے بات ہوتی تو ضرور معلوم ہو جاتا کہ یہ افسوس ناک سانحہ کیوں پیش آیا۔''

''سچائی کیا ہے اس کی تصدیق تو بعد میں ہی ہوگی لیکن فی الحال ہر طرف خاص واقف کاروں میں ایک ہی خبر گشت کر رہی ہے کہ شاید طاہر ندیم صاحب نے شاکر صاحب کی عزت پر ڈاکا مارا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ راحیلہ بھابی اپنی بدنامی کی وجہ سے زبان بند رکھیں گی لیکن انہوں نے پہلی فرصت میں شاکر صاحب کو سب کچھ بتا دیا جس کے بعد شاکر صاحب کے سر پر خون سوار ہو گیا اور انہوں نے طاہر ندیم کے دفتر میں پہنچ کر کئی لوگوں کی موجودگی میں اپنا ریوالور نکالا اور ساری گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔''

''تمہیں کس سے اطلاع ملی؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے طاہر صاحب کے اسسٹنٹ کا فون آیا تھا۔'' ندا نے جواب دیا۔ ''دراصل میں ان کے ایک سیریل میں کام کر رہی تھی لیکن اب شاید وہ بھی کاغذات تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔''

''تمہاری زبانی تفصیل جان کر افسوس ہوا... اوکے... بائے۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے لائن کاٹ دی پھر روبی کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''اب صاحب کے علاوہ کسی کا بھی فون آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں لیکن ان کے نام ضرور نوٹ کر لینا۔''

اس کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی خواب گاہ میں آگئی، وہ سوچوں میں گم تھی۔

اب ان بے ہودہ تصویروں کا کیا بنے گا جو مرنے والے کے بیان کے مطابق اس کے لاکر میں محفوظ تھیں؟... اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ اپنی بے گناہی کا کیا ثبوت دے سکے گی...؟ ضیا کو کیا منہ دکھائے گی...؟ کیا ان تصویروں کی آڑ میں پھر اسے کسی اور سے اپنی آبرو کا سودا کرنا پڑے گا؟

☆☆☆

رات گئے ضیا واپس گھر آیا تو وہ بھی خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ ضیا نے بھی رک رک کر وہی کہانی سنائی جو مہوش ندا کی زبانی پہلے ہی سن چکی تھی۔

''اب کیا ہوگا...؟'' اس نے ضیا کو ٹٹولنے کی خاطر اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔

''شاکر نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن جو لوگ طاہر کے دفتر میں موجود تھے، انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ پولیس نے شاکر کو گرفتار کر لیا ہے۔ وہ ریوالور بھی قبضے میں لے لیا جس سے شاکر نے گولیاں ماری تھیں۔'' ضیا نے سہمے سہمے انداز میں بتایا۔ ''موقع کے عینی گواہوں کا بیان بھی قلم بند کیا جا چکا ہے۔ بظاہر شاکر کے بچنے کی کوئی امید نہیں نظر آرہی۔''

''شاکر نے پولیس کو کیا بیان دیا؟''

''اس نے ابھی تک اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ بار بار ایک ہی جواب دیتا ہے کہ وہ اپنے وکیل سے مشورہ کیے بغیر کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالے گا۔''

''اور طاہر ندیم؟''

''اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی ہے۔''

''راحیلہ بھابی بے چاری کا اب کیا بنے گا؟'' مہوش نے ہمدردی کا اظہار کیا تو ضیا قدرے جھلا کر بولا۔

''بنے گا کیا... اس نے جب زبان کھول دی ہے تو اس کا نتیجہ بھی اسی کو بھگتنا پڑے گا۔''

''میں سمجھی نہیں...'' اس نے شوہر کو حیرت سے دیکھا۔

''کیا انہیں زبان بند رکھنی چاہیے تھی؟''

''تم کیا سمجھ رہی ہو کہ راحیلہ خود بڑی پاکباز عورت ہے؟'' ضیا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''پولیس نے فی الحال اسے زیادہ پریشان نہیں کیا لیکن جب تفتیش باقاعدہ شروع ہوگی تو طاہر ندیم کے علاوہ اور بھی بہت سارے نام ریکارڈ پر آجائیں گے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' مہوش کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''کیا اتنی بڑی بات ہو جانے کے بعد بھی راحیلہ بھابی کو زبان بند رکھنی چاہیے تھی؟''

''اب اسے کون سے تمغے مل گئے؟ شاکر اگر پھانسی چڑھ گیا تو اس کے پاس باقی کیا رہ جائے گا؟'' ضیا نے دبی زبان میں کہا۔ ''خود جو راحیلہ بیگم نے اپنی مرضی سے دس جگہ چکر چار کھے تھے جب اس کا علم شاکر کو ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟''

''یہ... یہ...'' مہوش ایک لمحے کو جیسے گنگ ہو گئی۔ اس نے کچھ توقف کے بعد سنبھل کر پوچھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ راحیلہ بھابی...''

''طاہر نے کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔'' ضیا نے تلملا کر جواب دیا۔ ''جب تصویری ثبوت پولیس کے ہاتھ آئیں گے تو راحیلہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جائے گی۔ جب ایک حمام میں سب ننگے ہوں تو کسی ایک کو دوسرے پر انگلی نہیں اٹھانی چاہیے۔''

''کیا آپ نے بھی دیکھ رکھی ہیں وہ تصویریں...؟'' تصویروں کے حوالے پر اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''انہی تصویروں کو دیکھ کر راحیلہ بیگم نے طاہر ندیم کی دست درازی پر کوئی مزاحمت بھی نہیں کی تھی لیکن بعد میں غالباً وہ زبان پر قابو نہ رکھ سکی اس لیے کہ وہ طاہر کے اسسٹنٹ شاہد پر ڈورے ڈال رہی تھی اور خود کو طاہر کے سامنے بڑا پاکباز ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔''

''آپ نے میرے سوال کا ٹھیک جواب نہیں دیا۔'' مہوش نے پھر دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے تصویریں دیکھی تھیں؟''

''ہاں...'' ضیا نے جواب دیا۔ ''ایک راحیلہ بیگم کیا اور بھی بہت ساری عورتیں ہیں جو اپنے شوہروں کے سامنے کسی دوسرے کی طرف نگاہ اٹھانا بھی گناہ سمجھتی ہیں لیکن ان کی غیر موجودگی میں جو گل کھلاتی ہیں اگر تمہیں ان کی تفصیل معلوم ہو جائے تو شاید تم ان کی شکلوں پر تھوکنا بھی گوارا نہ کرو۔''

''بہرحال۔'' اس نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔ ''جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔''

''ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔'' ضیا نے الماری سے بوتل نکال کر گلاس اپنے لیے تیار کیا پھر شراب کے کئی گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے ہوئے بولا۔ ''طاہر اگر زندہ بچ جاتا تو وہ بھی خاموش نہ رہتا اور نہ جانے کتنے لوگ لپیٹ میں آجاتے۔''

''کیا طاہر صاحب نے عورتوں کو بلیک میل کرنے کی خاطر پوری البم بنا رکھی تھی؟'' مہوش کے خوف نے پھر اسے بال کی کھال نکالنے پر مجبور کر دیا۔

''ہو سکتا ہے کہ پولیس تفتیش کا دائرہ وسیع کرنے کی خاطر اِدھر اُدھر بھی ہاتھ پھیلائے۔'' ضیا نے ایک گلاس بڑی جلدی میں ختم کر کے دوسرا تیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ابرار سے ہماری واقفیت ضرور ہے لیکن جہاں بڑے بڑے لوگ ملوث ہوں وہاں ایک معمولی سی بات کو بھی چھپانے کی خاطر پولیس افسران ایک کی جگہ ہزار روپے وصولنے کی کوشش بھی ضرور کرتے ہیں۔''

''آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے...؟'' وہ روانی میں کہہ گئی پھر بات بنانے کی خاطر جلدی سے بولی۔ ''کیا پولیس والے ہمارا بھی بیان لیں گے۔''

''ابرار نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہ بات کو زیادہ نہیں پھیلنے دے گا لیکن اگر اس کے کسی ماتحت نے منہ پھاڑنے کی کوشش

http://pakistanipoint.blogspot.com

کی تو پھر وہ کسی کو روک بھی نہیں سکتا۔"
مہوش کے دل و دماغ میں ضیا کی باتوں سے خوف دہراس نے اور سر ابھارنا شروع کر دیا۔
"کیا سوچ رہی ہو...؟" ضیا نے کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے لیے تیسرا گلاس بناتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔
"ہم... میں آپ کی وجہ سے پریشان ہوں۔" اس نے ضیا کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ... آپ میرا ایک مشورہ مانیں گے؟"
"کہو..."
"آپ دفتر کا کوئی ضروری کام نکال کر کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔ مناسب سمجھیں تو ابرار سے مشورہ بھی کر لیں..."
"اس سے کیا فرق پڑے گا...؟" ضیا نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے سوال کیا۔
"مجھے دوسروں سے زیادہ آپ کی فکر لاحق ہے۔" اس نے بڑی محبت سے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "خدانہ کرے اگر آپ کی عزت پر بھی کوئی حرف آ گیا تو ہماری ہی بنائی ساکھ خراب ہو جائے گی۔"
"ابرار نے بھی مجھے دبی زبان میں یہی مشورہ دیا ہے۔" ضیا نے ایک بعد دیگرے شراب کے کئی گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ "میں بھی اسی سلسلے میں غور کر رہا ہوں لیکن تم... تم اکیلے یہاں رہ کر کیا کرو گی... میری غیر موجودگی میں ہو سکتا ہے کہ تمہیں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔"
"میں آپ کے خیال سے متفق ہوں لیکن اگر اس وقت ہم دونوں ساتھ گئے تو ممکن ہے اس بات کو شبے کی نظروں سے دیکھا جائے۔" مہوش نے کہا۔ "آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوں، میں فرخندہ باجی کو کچھ دنوں کے لیے اپنے پاس بلا لوں گی۔ اس کے علاوہ نوشین اور عابد بھی یہاں موجود ہیں۔ بات کو کچھ دن گزر جائیں تو پھر میں بھی آپ کے پاس آ جاؤں گی۔"
ضیا کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی تو ضیا نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو... ہاں بول رہا ہوں... پریشان مت ہو... نہیں، فوری طور پر ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ماما کے پاس گیا بھی تو کچھ ضروری کام نمٹا کر جلدی واپس لوٹ آؤں گا۔ گھبراؤ مت، میں نے ابرار سے کہہ دیا ہے... ہاں کم سے کم باتیں کرنا... کہہ تو چکا ہوں کہ میں اس سے بات ضرور کروں گا... یقین تو ہے کہ وہ مان جائے گا... میں جانتا ہوں... اپنے تجربوں سے کام لینا، سب ٹھیک ہو جائے گا... ہاں، ہاں... میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا... اوکے... ضرورت پڑی تو تمہیں بھی کال کر لوں گا۔ اوکے، بائے..."
ضیا نے فون رکھا تو اس نے پوچھ ہی لیا... "کس کا فون تھا...؟"
"شہلا کا..." ضیا نے قدرے جھلا کر خشک لہجے میں جواب دیا۔ "اسے طاہر ندیم کے مرنے سے زیادہ اس کے بینک لاکر کی فکر پڑی ہوئی ہے۔"
"بینک لاکر..." مہوش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "بینک لاکر میں ایسی کیا چیز ہے جو اسے مرنے والے سے زیادہ اس کی پریشانی بے چین کر رہی ہے؟"
"طاہر کے انشورنس کے پیپر کے علاوہ کچھ غیر ملکی کرنسی بھی لاکر میں موجود ہے۔ ممکن ہے شہلا کے اپنے زیورات بھی ہوں۔" ضیا نے اپنا شغل جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "شہلا کا یہ خیال بھی درست ہے کہ اگر کہیں طاہر کی موت کی تفتیش کے سلسلے میں اس کے لاکر کو بھی سیل کر دیا گیا تو پھر اسے کھلوانے میں بڑا لمبا چوڑا طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا۔"
"کیا آپ کا اس معاملے میں سامنے آنا مناسب ہوگا؟"
"قطعی نہیں... میں براہ راست بینک سے کسی قابل اعتماد آدمی کو درمیان میں اس طرح لانے کی کوشش کروں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"
"میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی کہ اس وقت آپ کا براہ راست کسی معاملے میں سامنے آنا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔"
ضیا نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ تیسرا گلاس ختم کرنے کے بعد اس نے چوتھا تیار کر کے ایک لمبا گھونٹ لیا پھر مہوش کو غور سے دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں بولا۔ "اس وقت ہمارے لیے ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔"
"وہ کیا...؟"
"ہمیں موجودہ حالات میں اپنی تمام رنجشیں بھلا کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلنا ہوگا۔ ایک ذرا بھی لغزش ہوئی تو بات سنبھالنا دونوں کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"
"ضیا..." اس نے ایک عرصے بعد ضیا کی طبیعت میں لچک دیکھی تو اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی اور بڑی اپنایت سے بولی۔ "آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اور آپ کے خلاف کوئی بات زبان تک لانے کی کوشش کروں گی؟"
"تم جانتی ہو کہ میرا دامن بھی پاک نہیں ہے۔" ضیا نے پہلی بار کھل کر اعتراف کیا۔ "ایک نہیں بے شمار باتیں تمہارے

چیک کے ساتھ تمہارا کریڈٹ کارڈ تو خیر چل گیا۔ لیکن یہی ریڈیو نے واشنگ مشین تو ذرا... یہ نہیں چل سکا۔

علم میں ضرور ہوں گی۔ تم نے کبھی کھل کر شکوہ نہیں کیا، یہ اور بات ہے مگر کبھی کبھی ایک شدید جھٹکا انسان کی زندگی کا رخ موڑ بھی دیتا ہے۔ مجھے... اس وقت... تمہاری محبت کے سہارے کی ضرورت ہے۔"
مہوش نے حیرت سے ضیا کو بہت غور سے دیکھا۔ نہ جانے اسے ضیا کے جملوں میں کیا نظر آیا کہ اس کی شبنمی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ وہ بے اختیار آگے بڑھ کر ضیا کے سینے کی کشادگی میں سمٹ گئی۔ ضیا نے اس کے یاقوتی ہونٹوں پر بڑے عرصے بعد محبت کی مہر ثبت کی پھر ندامت سے بولا۔
"میں کوشش کروں گا کہ زندگی کی پرانی شاہراہوں کی جانب واپس پلٹ آؤں... بشرطیکہ تم میری تمام کوتاہیوں اور کردہ ناکردہ گناہوں کو معاف کر سکو..."
"ضیا..." اس نے اپنے سہاگ کو بڑی محبت سے اپنی باہوں میں لے لیا۔ وہ بڑی اپنایت سے نم ناک نگاہوں کے شبنمی قطروں کو اپنے دامن میں جذب کرتے ہوئے محتاط لہجے میں بولی۔ "صرف ہمارے لیے نہیں... ماما کے مستقبل کی خاطر بھی ہمیں ایک دوسرے کی تمام غلطیوں کو فراموش کرنا ہوگا۔ ہم اپنے اپنے ماضی کی تمام تلخیوں کو فراموش کر کے از سر نو ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں گے اور..."
فون کی گھنٹی کی تیز آواز ابھری تو بات آگے نہ بڑھ سکی۔ ضیا اٹھ کر فون کی طرف متوجہ ہوا تو مہوش بھی لباس درست کرتے ہوئے سنبھل کر بیٹھ گئی... وہ رات اسی طرح محبت اور حالات کی پیچیدگیوں کی کشمکش کے درمیان کسی نہ کسی طرح بیت گئی۔
دوسرے دن ضیا ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تیار ہو کر جلدی گھر سے نکل گیا۔ دن میں اس کے فون آتے رہے، مہوش حالات سے باخبر ہوتی رہی لیکن طاہر ندیم کی موت کے بعد بھی اس کا بینک لاکر مہوش کے لیے کسی پل صراط سے گزرنے سے کم نہیں تھا۔ بار بار... یہ تصور ہی اس کے وجود کو کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈسنے لگتا کہ اگر اس کی اور طاہر کی تصویریں کسی غلط ہاتھ میں پہنچ گئیں تو کیا ہوگا...؟
عورت تو مرد کے ایک دو نہیں سیکڑوں گناہ صدق دل سے معاف کر دیتی ہے لیکن... کیا ضیا اس کے صرف ایک گناہ کو جو اس کی بے ہوشی اور بے خبری کے عالم میں دھوکے سے سرزد ہو گیا تھا... معاف کر سکے گا؟
دن بھر وہ خدا سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتی رہی پھر اس رات ضیا دیر سے واپس آیا تو اس نے پہلا سوال طاہر ندیم کے لاکر ہی کے بارے میں کیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ لاکرز کو ہینڈل کرنے والے دو کارندوں نے نچلے پیمانے پر ہی منیجر یا کسی اور کے علم میں آئے بغیر شہلا کی مشکل حل کر دی لیکن انہوں نے بھی پورا لاکر خالی کرنے کی حماقت نہیں کی۔ کچھ سربمہر لفافوں کے علاوہ انشورنس پالیسی کے کاغذات، تقریباً نصف غیر ملکی کرنسی اور آدھے سے زیادہ زیورات خاموشی سے نکال کر شہلا کو پہنچا دیے جس کے عوض مجھے ان دونوں کا منہ بند رکھنے کے لیے پانچ لاکھ دینے پڑے..."
"کیا شہلا بینک نہیں گئی تھی؟" اس نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔
"نہیں... صرف طاہر کے لاکر کی چابی میں نے بینک کے ان دونوں آدمیوں تک کسی خاص ذریعے سے پہنچا دی تھی۔"
"پانچ لاکھ کی رقم کس نے ادا کی...؟" نہ چاہنے کے باوجود بھی مہوش نے اسے کرید۔
"کسی مجبوری کے تحت میں نے ہی ادا کی ہے۔" ضیا نے دبی زبان میں کہا پھر گفتگو کا رخ بدل کر بولا۔ "میں نے آج ابرار سے بات کی تھی، اس کا بھی یہی مشورہ ہے کہ میں زیادہ نہیں تو دو تین ہفتوں کے لیے تنہا ملک سے چلا جاؤں۔ میں نے احتیاطاً ایک سیٹ بھی بک کرا لی ہے امریکا کے لیے۔ ابرار نے یہی مشورہ دیا ہے کہ میں کم از کم ایک ہفتہ شروع میں ماما اور یوسف کے پاس کسی ہوٹل میں رہ کر گزاروں اور اس کا باقاعدہ کاغذی ثبوت بھی رکھوں... اس عرصے میں وہ مجھے حالات سے باخبر رکھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تفتیش کا رخ دیکھ کر ہفتہ دس دن بعد تمہیں بھی میرے پاس آنے کا گرین سگنل دے

دے۔"

"ایک درخواست کروں آپ سے؟" اس نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھال کر بڑے پیار سے کہا۔ "امریکا میں جا کر اپنا بہت خیال رکھیے گا اور...."

"ماہا اور یوسف کے خیال سے پینے پلانے سے بھی گریز کروں۔" ضیا مسکرا کر بولا "اور کچھ....؟"

"اگر جانے سے پہلے آپ ڈاکٹر منہاس سے ایک بار چیک اپ بھی کرا لیجیے تو مناسب ہوگا۔"

"وہ بھی آج کراتا ہوا آیا ہوں۔" ضیا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "حسب معمول انہوں نے مجھے حوا کی بیٹیوں اور شراب سے پرہیز کی ہدایت کی ہے۔ اس بات کا خطرہ بھی ہمیشہ کی طرح باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہر بڑے آدمی کی طرح مجھے بھی کسی وقت ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔"

"خدا نہ کرے...." اس نے شوہر کو پیار سے ٹوکا۔ "ایسی بری فال انسان کو کبھی بھول کر بھی زبان سے نہیں نکالنی چاہیے۔ بس خوش رہا کریں اور اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔"

"کچھ سمجھداری کا ثبوت آج آپ بھی دے ڈالیے۔" ضیا نے مہوش کو بانہوں میں لے کر اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکا۔ "پھر خدا جانے رہے یا نہ رہے ہوش مجھے...."

"پھر شروع کر دیں آپ نے وہی باتیں۔" اس نے شوخی کا اظہار کیا۔

جواب میں ضیا نے محبت سے بانہیں پھیلائیں تو وہ دفعتاً مسکراتی آگے بڑھ کر اس کے سینے کی کشادگی میں گم ہونے لگی۔

☆☆☆

فرخندہ باجی کے آجانے سے مہوش کو دوہرا ہٹ ضرور ہوگئی تھی۔ وہ ہر وقت اس کی دل جوئی کا خیال رکھتی تھیں لیکن پھر بھی جن تصویروں نے اسے مضطرب کر رکھا تھا، اس کی تلوار بدستور اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ یہ پریشانی علیحدہ تھی کہ پولیس نہ جانے کب آجائے۔

تین دن سکون سے گزر گئے۔ دو بار ضیا کا فون بھی آیا۔ وہ خیریت سے ماہا اور یوسف کے پاس امریکا پہنچ گیا تھا۔ مہوش کی خیریت دریافت کرنے کی خاطر نوشین اور عابد بھی دو تین چکر لگا چکے تھے لیکن اس کے دل کو جو دھڑکا لگا ہوا تھا، اس کو اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ وہ ضیا کی طرف سے بھی پریشان تھی کہ کہیں طاہر ندیم کے رگڑے میں وہ بھی بدنام نہ ہو جائے۔ ضیا کی طبیعت کی طرف سے بھی اسے تشویش لاحق رہتی۔ ڈاکٹر منہاس مہوش کے سامنے بھی کئی بار کہہ چکے تھے کہ

اگر ضیا نے شراب سے کنارہ کشی اختیار نہ کی تو اس کے پھیپھڑے بہت جلد خراب ہو جائیں گے۔ مرغن غذائیں کھانے سے اس کی ای سی جی (E.C.G) کی رپورٹس بھی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھیں۔

اس روز بھی وہ دوپہر میں اپنے بستر پر تنہا لیٹی انہی خیالوں میں غرق تھی جب روبی نے اسے شہلا کی آمد کی اطلاع دی۔ شہلا کا نام سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے ذہن میں اچانک بے شمار وسوسے سر ابھارنے لگے۔ ابھی طاہر ندیم کا واقعہ تازہ تھا۔ ایسی حالت میں شہلا کا اس کے گھر آنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ پولیس مہوش سے اس کی ملاقات کے دس مطلب نکال سکتی تھی۔

فرخندہ باجی دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اس نے کچھ سوچ کر نیچے جانے کے بجائے شہلا کو اوپر ہی بلوا لیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شہلا کے چہرے پر طاہر ندیم کی موت کا ایک عکس بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"خیریت تو ہے....؟" مہوش نے سنجیدگی سے شہلا سے اس کی خیریت دریافت کی۔

"مجھے شاید موجودہ حالات میں آپ کے گھر آنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں برقع پہن کر اور کسی دوسرے کی گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ اس لیے کہ پولیس والے پوچھ گچھ کی خاطر بار بار دن میں کئی چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟" اس نے ہمدردی کا اظہار کیا تو شہلا مسکرا کر بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"آپ کی ایک امانت لوٹانے آئی ہوں۔"

"میری کون سی امانت ایسی تھی کہ تمہیں اس وقت...."

لیکن مہوش کا جملہ اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا۔ شہلا نے پرس کھول کر ایک بادامی رنگ کا لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے بولی۔ "آپ کو تو شاید معلوم ہوگا کہ میں نے ضیا صاحب کے ذریعے طاہر کا لاکر چوری چھپے کھلوا کر کچھ ضروری کاغذات اور اپنے زیورات نکلوائے ہیں۔ اسی سامان میں آپ کی یہ امانت بھی میرے ہاتھ لگ گئی جس کا موجودہ حالات میں پولیس کی نظروں میں آنا آپ کے لیے وبال جان بھی بن سکتا تھا۔"

مہوش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس گنگ سی بیٹھی اس لفافے کو دیکھتی رہی جس میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری بند تھی۔

"میں نے آپ لوگوں کو ہمیشہ اپنا سمجھا ہے۔ بڑے

احسانات ہیں ضیا صاحب کے میرے اوپر.... اس لیے میں ان تصویروں کے سلسلے میں بھی زبان کھولنے کی کوشش نہیں کروں گی۔" شہلا الفاظ چبا چبا کر بولتی رہی۔ "مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ بالکل بے قصور ہیں۔ طاہر کے مجبور کرنے پر میں نے ہی اورنج اور گریپ فروٹ کا وہ گلاس آپ کو پینے پر اکسایا تھا جس میں خواب آور گولیاں بھی گھلی ہوئی تھیں۔ بہرحال، آپ کا یہ راز بھی میرے سینے میں دفن رہے گا جس کی قیمت آپ کو کئی بار چکانا پڑی تھی۔ آپ تصویروں کو ایک نظر دیکھ کر تسلی کر لیجیے۔ پرنٹس کے ساتھ اس کے نیگیٹو بھی موجود ہیں۔"

"مجھے.... تمہاری زبان پر.... اعتبار ہے۔" اس نے شہلا سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ "میں تمہارا یہ احسان بھی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"فکر نہ کریں۔" شہلا نے بے باکی سے جواب دیا۔ "دوستی کے حساب ہمیشہ دل میں ہوتے ہیں۔"

"کیس کے سلسلے میں پولیس والے تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کر رہے؟" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"ضیا صاحب کی مہربانی ہے کہ وہ ایس پی ابرار صاحب کو اپنے اور میرے نجی تعلقات سے بھی آگاہ کر گئے تھے۔" شہلا نے پھر بے شرمی سے کہا۔ "مجھے ان کے اشارے پر تفتیشی افسر جہانگیر کو کچھ خرچہ پانی کے علاوہ مجبوراً ایک رات [illegible] بیڈ روم میں کسی جگہ دفن پڑی تھی۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آجائے تو معاملے کو ختم کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔"

"ایک بات پوچھوں....؟" مہوش نے دبی زبان میں سوال کیا۔ "کیا راحیلہ کے ساتھ...."

"میں سمجھ گئی...." شہلا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں.... کم از کم طاہر نے اس کے ساتھ زبردستی ہی کی تھی لیکن وہ اتنی پارسا بھی نہیں تھی، جتنا اظہار اس نے شاکر صاحب کو پھانسی کے تختے تک پہنچا کر کیا ہے.... معاملہ ذرا دب جائے تو میں راحیلہ بیگم کو بھی ان کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش ضرور کروں گی جس نے اپنے ساتھ ساتھ میرا سکون بھی برباد کر دیا.... مرنے والا کیسا تھا؟ یہ سب ہی جانتے ہیں۔ میں بھی کوئی پارسائی کا مجسمہ نہیں ہوں لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کی ضرورت ضرور تھے۔" پھر اچانک شہلا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے زیادہ دیر گھر سے دور نہیں رہنا چاہیے۔"

"تمہیں اگر اس کے عوض لاکھ دو لاکھ کی ضرورت ہو تو بے تکلف...."

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" شہلا نے اس کا جملہ کاٹ کر پھر بے باکی سے جواب دیا۔ "ضیا صاحب کے ہزاروں احسانات ہیں مجھ پر اس لیے میں اس وقت یہاں اس مقصد سے نہیں آئی ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں.... ہاں، اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کسی تکلف سے کام نہ لیتی۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔"

شہلا جتنی جلدی میں آئی تھی، اتنی ہی جلدی میں پلٹ کر واپس چلی گئی۔ مہوش کچھ دیر پتھر کے بت کے مانند اپنی جگہ کھڑی اس لفافے کو تکتی رہی جس میں اس کی ذلت و رسوائی کا دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ اسے اپنے کانوں پر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ شہلا نے ان تصویروں کے عوض دو لاکھ کی آفر کو کس جذبے کے تحت ٹھکرایا تھا؟ مہوش کو ضیا اور شہلا کے ناجائز تعلقات کا بخوبی علم تھا۔ ایک شہلا کیا اور بھی بہت سارے ایسے حسین اور معصوم چہرے اس کی نظروں میں تھے جن کی اصلیت کا شوخ رنگ صرف رات کی تاریکی میں کھل کر ابھرتا تھا۔

کئی لمحے گزر گئے پھر اس نے دھڑکتے دل سے لفافے کو اٹھا کر اس کے اندر ایک نظر ڈالی جس میں سات تصویروں کے علاوہ کچھ نیگیٹو بھی موجود تھے۔ مہوش انہیں تفصیل سے دیکھ کر خود اپنی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے لفافے کو دوبارہ بند کیا اسے چھپا کر اپنے امریکن کچن میں گئی جہاں خوش [illegible] چاروں اطراف کی [illegible] لفافہ اس کے اوپر رکھ دیا۔ ایک شعلہ سا فضا میں بلند ہوا پھر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے اس کی راکھ بھی ایک کاغذ میں سمیٹ کر سنک میں بہا دی، پھر دبے.... قدموں واپس اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ اس کا دل کسی ایسی معصوم کبوتری کی طرح تیز تیز دھڑک رہا تھا جو بلی کے پنجوں میں آنے کے بعد بھی قدرت کی مہربانی سے زندہ بچ گئی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر خود کو بستر پر گرا دیا پھر بے اختیار سسک پڑی۔ روتے روتے کب اس کی آنکھ لگی، اسے احساس نہیں ہوا۔ لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی کی تیز آواز ہی تھی جسے سن کر وہ دوبارہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ یہ اس کے کمرے کا براہ راست نمبر تھا جس کا علم زیادہ لوگوں کو نہیں تھا۔

"ہیلو.... مہوش بول رہی ہوں۔" اس نے اپنی بکھری بکھری سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے....؟" دوسری جانب سے ضیا کی آواز ابھری۔ "تم اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو....؟"

"گھنٹی کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی اوپر آئی ہوں اس لیے سانس پھولنے لگا۔" اس نے خود کو سنبھال کر بڑی خوبصورتی

http://pakfunplace.blogspot.com

سے بات بتائی۔ ”آپ کیسے ہیں؟ ماہا اور یوسف کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“

”فرسٹ کلاس...“ ضیا نے کہا۔ ”اس وقت تمہیں ایک خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا تھا۔“

”وہ کیا...؟“

”ابھی دو منٹ پہلے ہی ابرار کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آگئی اور شاکر نے بھی عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ اس نے کسی ذاتی کاروباری دشمنی کے سبب طاہر ندیم کو گولی ماری تھی۔“

”گویا راحیلہ بدنامی سے بچ گئی...؟“ مہوش نے ایک عورت ہونے کے ناتے خوشی کا اظہار کیا۔ شاید اس لیے بھی کہ کچھ دیر پہلے وہ بھی ایک آتش فشاں کے دہانے سے ہٹ کر زندہ درگور ہونے سے بال بال بچی تھی۔

”تمہیں راحیلہ کی پڑی ہے... ابرار بتا رہا ہے کہ شاکر کے اقبال جرم کرلینے کے بعد بہت سے معزز چہروں سے شرافت کے نقاب اترتے اترتے رہ گئے۔“

”خدا کا شکر ہے... اب پولیس کی کارروائی بھی رک جائے گی۔“

”ہاں... ابرار یہی کہہ رہا تھا۔“ ضیا نے پوچھا۔ ”اس کا فون تو نہیں آیا تھا تمہارے پاس...؟“

”جی نہیں...“

”شاید وہ کسی وقت تمہیں فون کرے۔“ ضیا نے کہا۔ ”اس نے گرین سگنل دے دیا ہے، اب تم چاہو تو آسکتی ہو لیکن میں یہاں سے کل لندن جارہا ہوں۔ ابرار کا فون ملنے کے بعد اپنے لیے لندن کی سیٹ بک کرالینا۔ ہم ایک ہفتہ اپنے لندن والے ذاتی فلیٹ میں ہی نئے سرے سے ہنی مون منائیں گے۔“

”آپ کی طبیعت کیسی ہے...؟“ مہوش نے سکون کا سانس لے کر پوچھا۔

”امریکا میں بچوں کی وجہ سے زیادہ پرہیز کرلیا ہے اس لیے کچھ بہتری ہے۔“

”آئندہ بھی پرہیز ہی سے کام لیجیے گا۔“

”اس کا وعدہ تمہارے آنے کے ایک ہفتے بعد ہی کروں گا۔“

ضیا اس وقت موڈ میں تھا، مہوش نے بھی ایک ایسے طوفان سے نجات حاصل کرلی تھی جو کسی وقت بھی سر اٹھا سکتا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر ضیا سے باتیں کرتی رہی پھر اس نے جیسے ہی فون رکھا دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس بار ایس پی ابرار کا فون تھا۔

”کیسی ہیں میڈم...؟“

”جب آپ ہیں تو پھر کس بات کا غم...“ مہوش نے حسب معمول شوخی سے جواب دیا۔

”آپ کا فون بہت دیر سے انگیج مل رہا تھا، کہاں باتیں ہورہی تھیں؟“

”بتادوں...“

”نہ بتائیں جب بھی آپ کی آواز میں چھپی خوشی سے اندازہ ہوگیا۔“ ابرار نے کہا۔ ”ضیا سے باتیں ہورہی ہوں گی۔“

”جی ہاں... اور سنایئے، ہماری سوئٹ سی افشاں بھابی کیسی ہیں؟“

”ابھی تک وہی پہلے کی طرح ڈاؤٹنگ کے روگ میں جتلا ہیں۔“

”اچھا تو اب تک کررہی ہیں...“ مہوش نے پھر شوخی سے کہا۔ ”اپنی فیگر کا خیال نہ رکھیں تو پھر پولیس والوں کی نظریں بھی ادھر ادھر بھٹکنے لگتی ہیں۔“

”ویل سیڈ!“ ابرار نے دوسری طرف سے ایک قہقہہ لگایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”ضیا کی زبانی آپ کو دیگر باتوں کا علم تو ہوگیا ہوگا؟“

”جی ہاں... آپ کی بڑی تعریفیں کررہے تھے... ویسے میں دو روز بعد ان کے پاس لندن جارہی ہوں۔“

”پھر یہ جلیبی کیوں؟“ اس بار ابرار نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”جب آپ لندن پہنچ جائیں گی تو وہ پھر صرف آپ کے گن گانے شروع کردیں گے۔“

ابرار سے بات ہوجانے کے بعد مہوش نے سکون کا گہرا سانس لیا پھر اس نے نیچے جاکر فرخندہ باجی کو سوتے سے جگا کر خوف کے بادل چھٹ جانے کی خوش خبری سنائی تو ان کی آنکھیں بھی خوشی سے چھلک اٹھیں۔

آج نہ جانے کتنے طویل انتظار کے بعد وہ دل کھول کر مسکرا رہی تھی۔ ضیا کے ساتھ لندن میں ایک ہفتہ ہنی مون منانے والی محبت کی گونج بھی اس کے وجود میں رچی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت پر لگا کر لندن کی طرف پرواز کرجاتی۔

☆☆☆

مہوش بڑے ارمانوں سے لندن جانے کی تیاری کررہی تھی۔ گھر میں فرخندہ باجی کے علاوہ نوشین اور عابد بھی موجود تھے۔

پرواز کے وقت میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے لیکن وہ بار بار اپنی اس دستی گھڑی کو دیکھ رہی تھی جو ضیا نے شادی کی دسویں سالگرہ کی خوشی کے موقع پر اسے تحفے میں دی تھی۔ بڑے عرصے بعد اس نے آج صبح ہی اس خوبصورت اور قیمتی تحفے کو اپنی نازک سی کلائی پر کسی انمول زیور کی طرح سجایا تھا۔

”آج کل پروازوں کا شیڈول بار بار بدلتا رہتا ہے۔“ عابد نے اسے چھیڑنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔ ”انکوائری سے ایک بار پھر معلوم کرلیجیے کہیں...“

”خبردار جو آپ نے اس وقت مجھے چھیڑنے کی کوشش کی۔“ اس نے پیار سے عابد کو گھورا پھر نوشین کو دیکھ کر کہا۔ ”سمجھا لے اپنے ’میاؤں‘ کو... تو نے بہت زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔“

”نہ بابا...“ نوشین نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ”یہ تم سالی اور بہنوئی کا معاملہ ہے، خود ہی فیصلہ کرلو۔ میں کچھ بولی تو کوئی ایک فریق بلاوجہ مجھے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”سن لیا عابد بھائی... یہ آپ کی چہیتی سب کے سامنے بچوں کا ذکر کرکے آپ کو کیا ظاہر کرنا چاہ رہی ہے؟“

”گھر کا پالتو جانور ہوں اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ مالکن کے سامنے دُم ہلاتا رہوں ورنہ حقہ پانی بھی بند ہوسکتا ہے۔“ عابد نے برجستہ کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ فرخندہ باجی بھی ساڑی کا پلو منہ کے سامنے کرکے ہنسنے لگیں۔ خود نوشین بھی لوٹ پوٹ ہوگئی۔

”اتنی ڈھیل بھی مت دیجیے کہ خاتون کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جائے۔“ اس نے عابد کو مزید اکسانے کی کوشش کی۔ ”جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو پھر ڈر کس بات کا... ساری دکھتی رگوں کی خبر بھی رکھتی ہوں۔“

”مشورہ تو نیک ہے لیکن آپ پانچ گھنٹوں بعد لندن پرواز کرجائیں گی تو اکیلے میں وہ بندہ بھی کیا کرسکے گا جو پہلے ’بی بی میں تیرا غلام‘ ہونے کا اقرار کرچکا ہو۔“

”بس رہنے دیجیے۔“ نوشین نے پیار سے شوہر کو گھورا۔ ”اب آپ اتنے نیک بھی نہیں ہیں جتنا اپنی چہیتی کے سامنے بن رہے ہیں۔“

”روبی ڈارلنگ دیکھنا...“ مہوش نے نوشین کو چھیڑنے کی خاطر آواز لگائی۔ ”کہیں سے کسی چیز کے جلنے کی بو آرہی ہے۔“

محفل ایک بار پھر زعفران زار بن گئی پھر یہ ہنسی مذاق جاری تھا کہ فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ روبی جو قریب ہی کھڑی تھی، اس نے مہوش کے اشارے پر آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے مہوش سے کہا۔

بہترین کافی

گاہک بے چارہ کافی کا انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا تو ہوٹل سے اٹھ کر جانے لگا۔ اتنے میں بیرا دوڑا دوڑا آیا اور میز پر کافی رکھتے ہوئے بولا۔

”ناراض نہ ہوں جناب! بڑی مزے دار کافی لایا ہوں۔ جنوبی امریکا کی ہے۔“

گاہک نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

”معاف کرنا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری خاطر اتنے دور چلے گئے ہو۔“

دانیال عمر... واہ کینٹ

”لندن سے صاحب کا کیئر ٹیکر ولیم آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

نہ جانے کیوں ولیم کا نام سن کر وہ ہنستے بولتے یک لخت سنجیدہ سی ہوگئی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر ریسیور روبی سے لے کر گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”ہاں ولیم... کیا بات ہے؟“

”میں اس وقت اسپتال سے بول رہا ہوں۔“ ولیم نے ٹوٹی پھوٹی اردو انگلش ملا کر جواب دیا۔ ”رات صاحب کو اٹیک ہوا تھا۔ میں اسی وقت صاحب کو لے کر اسپتال آگیا تھا اور اس وقت... اس وقت صاحب آپریشن تھیٹر میں ہیں۔“

”کیس کون سا سرجن کررہا ہے...؟“ مہوش نے دیوانوں کی طرح چیخ کر سوال کیا تو سب ہی کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوگئی۔ ہنستی بولتی محفل پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ نوشین اپنی جگہ سے اٹھ کر مہوش کے قریب آگئی۔

”سرجن الفرڈ جانسن...“ ولیم نے دوسری جانب سے کہا۔ ”آپ اسپتال کا نمبر... ملا کر بات کرسکتی ہیں۔“

مہوش نے پاگلوں کی طرح لائن کاٹ کر دوسرے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے تو نوشین نے دبی زبان میں پوچھا۔

”کیا بات ہے مہوش... سب خیریت تو ہے؟“

”ضیا کو رات ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں... خدا سے دعا مانگ نوشین...“ اس کی آواز رندھ گئی۔ فرخندہ باجی نے بھی ”اللہ خیر“ کہہ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کرلیے۔ عابد بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہیلو... میں پاکستان سے مہوش ضیا بول رہی ہوں۔“

http://pakfunplace.blogspot.com

لائن مل گئی تو اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے سرجن الفرڈ سے اپنے شوہر ضیا کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔ وہ کل رات اسپتال میں داخل ہوئے تھے... کیا... آپریشن میں مصروف ہیں۔ پلیز، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اب میرے شوہر کی حالت کیسی ہے؟... اوکے، میں خود پہنچ رہی ہوں لندن... آپ سرجن کو میرا نام ضرور بتا دیں... جی ہاں، وہ جانتے ہیں مجھے بھی اور ضیا کو بھی...''

مہوش ریسیور ایک طرف رکھ کر بے اختیار نوشین کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہمت سے کام لو مہوش...'' فرخندہ باجی نے قریب آ کر اسے دلاسا دیا۔ ''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ بدستور نوشین کے گلے لگی ماہیِ بے آب کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

ضیا کا آپریشن ہو چکا تھا، اسے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا گیا تھا۔ مہوش شیشے کی اوٹ سے ضیا کو ایک نظر دیکھ کر سرجن الفرڈ کے روم میں آ گئی۔ سرجن نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

''ضیا کا آپریشن کیسا رہا...؟'' اس نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے دل کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہماری ٹیم اپنی جگہ پوری طرح مطمئن ہے لیکن کوئی بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔''

''کوئی خطرہ تو نہیں ہے...؟'' اس نے سرجن کو امید بھری نظروں سے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

سرجن نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک اپنی کرسی کی پشت پر سر ٹکائے کچھ غور کرتا رہا پھر اس نے سنبھل کر مہوش کو مخاطب کیا۔ ''ہم نے آپ کے شوہر کو بہت پہلے تمام خطروں سے آگاہ کر دیا تھا لیکن انہوں نے ہماری بات پر توجہ نہیں دی۔ اب ان کے ہارٹ کی کنڈیشن وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ میں نے پچھلی تمام رپورٹوں سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ ہارٹ کا ایک چوتھائی حصہ کام کرنا چھوڑ چکا ہے۔ آپریشن کے بعد ان کے دل کی حالت قدرے بہتر ہے لیکن اس کے کچھ نہ کچھ نتائج تو بہرحال ظاہر ہوں گے جس کے بارے میں ہم قبل از وقت کوئی یقینی بات نہیں کر سکتے۔''

''آپ کس قسم کے نتائج کی طرف اشارہ کر رہے ہیں...؟'' مہوش کے دل کی دھڑکنیں ڈانواں ڈول ہونے لگیں۔ اس کی دراز پلکوں کے سائے تلے اندھیرے سے لپکنے لگے۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔

اس کے پیچھے ضیا کا کیئر ٹیکر ولیم بھی ہاتھ باندھے اداس کھڑا تھا۔

سرجن الفرڈ نے مہوش کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں... ہو سکتا ہے مسٹر ضیا کے جسم کا کوئی حصہ کچھ عرصے کے لیے مفلوج ہو جائے۔ ان کے ذہن پر بھی اثر ہو سکتا ہے۔''

''ذہن پر...؟'' مہوش اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر الفرڈ... ذہن سے متعلق آپ کن خدشات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں صرف امکانات کی بات کر رہا ہوں۔'' سرجن الفرڈ نے اپنی نشست پر کسمسا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''ہو سکتا ہے جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہ ہو... گاڈ از گریٹ۔ سب کچھ اس کی مرضی سے نارمل بھی ہو سکتا ہے، آپ فی الحال پریشان نہ ہوں۔ کوئی یقینی بات تین چار ہفتے بعد ہی ٹھیک طور پر کہی جا سکتی ہے۔''

''ڈاکٹر... پلیز۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میرا ذہن الجھتا رہے گا، آپ کم از کم یہ تو بتا دیں کہ جو آپریشن ہوا ہے اس کا اثر دماغ پر کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے مسز ضیا اپنی یادداشت سے مکمل طور پر محروم ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی وہ مکمل طور پر ہوش مند نظر آئیں اور کبھی بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں لیکن...'' سرجن الفرڈ نے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ان تمام امکانات اور خدشات کے باوجود ان کی طبعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ البتہ، یہ ضرور ہوگا کہ اگر آپ نے ایک ہاؤس وائف کی طرح ان کا پورا خیال رکھا اور زیادہ دیر ان کی نظروں سے دور نہ رہیں تو وہ کم از کم آپ سے ضرور مانوس ہو جائیں گے مگر... وہ شاید آپ کی ازدواجی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکیں... ان تمام باتوں کو یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ سب آپ کی ذاتی توجہ اور دلچسپی پر منحصر ہوگا... ویسے ایک بات میں قبل از وقت آپ کو باور کرا دوں کہ آپ کسی طور بھی اپنے ہسبینڈ کے سامنے اپنی اکتاہٹ یا جھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گی۔ ان کی تمام باتوں کو آپ جس قدر خندہ پیشانی سے قبول کریں گی، اتنا ہی مریض کے حق میں بہتر ہوگا۔ بصورتِ دیگر اگر مسٹر ضیا کسی ڈپریشن کا شکار ہوئے تو پھر...''

سرجن الفرڈ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''پھر... پھر کیا ہوگا...؟'' مہوش نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

''مسز ضیا۔'' سرجن الفرڈ دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''ایک نارمل آدمی بھی جب اپنے وجود کو زمین کا بوجھ سمجھنے لگے اور یہ محسوس کر لے کہ اب کسی کو اس کی زندگی سے کوئی دلچسپی، کوئی لگاؤ نہیں اور دوسرے اکتا گئے ہیں تو پھر اس کا ذہن بھی منفی سوچ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ پڑھی لکھی، سمجھ دار خاتون ہیں۔ شاید جو کچھ میں کہنا چاہ رہا ہوں، آپ سمجھ گئی ہوں گی...؟''

''یعنی خودکشی...؟'' مہوش کا ذہن یک لخت ماؤف ہونے لگا۔ اس کا وجود جیسے اچانک کسی نادیدہ طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو ٹکٹکی باندھے گھورتی رہی۔

''یس، مسز ضیا۔'' سرجن نے جواب دیا پھر فوراً ہی اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر دوبارہ تسلی دی۔ ''میں ایک بار پھر آپ کو مشورہ دوں گا کہ خود کو ریلیکس رکھنے کی کوشش کریں۔ صحیح صورتِ حال تین چار ہفتے بعد سامنے آ جائے گی۔''

''پلیز سرجن...'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں التجا کی۔ ''آپ جو چاہیں کریں لیکن ضیا کو کسی طرح نارمل کر دیں۔ اس کے لیے جو فیس آپ طلب کریں گے میں اس سے زیادہ آپ کو انعام بھی دوں گی۔''

''شکریہ مسز ضیا۔'' الفرڈ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں اپنا پروفیشن اور کسی مریض کی زندگی دولت سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ہم اس کرسی پر بیٹھ کر صرف اور صرف اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔ مول تول کم از کم اس ملک میں... اور ہمارے پروفیشن میں نہیں ہوتا۔''

مہوش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے بڑی بے چارگی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''آئی ایم سوری ڈاکٹر... شاید میں جذبات کی رو میں بہک کر کچھ ایسی بات کہہ گئی جو مجھے...''

''اٹ از آل رائٹ مسز ضیا...'' الفرڈ نے اس بار مسکرا کر اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے انتہائی خلوص سے کہا۔ ''میں آپ کی کیفیت اور پریشانی سمجھ رہا ہوں۔ بار بار آپ کو ایک ہی مشورہ دوں گا کہ... جسٹ ریلیکس... ریلیکس... اینڈ ریلیکس۔''

مہوش کچھ دیر بعد سرجن الفرڈ کے روم سے اٹھ کر باہر آئی تو اسے اپنا وجود ڈگمگاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ڈاکٹر کی باتیں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھیں اور ذہن کے افق پر بار بار ایک ہی سوال ابھر رہا تھا۔

''کل کیا ہوگا...؟''

اسپتال میں ایک گھنٹے اور رک کر اس نے کئی بار شیشے کی اوٹ سے ضیا کو دیکھا پھر دل میں خدا سے اپنے سہاگ کی سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوئی..... ڈگمگاتے قدموں سے ولیم کے ساتھ اپنے لندن والے اس فلیٹ میں آ گئی جو ضیا نے اسی کے نام سے خریدا تھا۔

☆☆☆

تین ہفتے بعد وہ ایک دن اسپتال گئی تو اس نے ضیا کو بستر پر آنکھیں کھولے لیٹا دیکھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ شاید دو تین ہفتے کا جو عرصہ اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا وہ اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھا۔

مہوش شیشے سے لگی کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ ضیا کو ہوش میں دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی پھر اس کے ذہن میں ڈاکٹر الفرڈ کے سارے خدشات ایک ایک کر کے ابھرنے لگے۔ اس نے ان سب امکانات کو رد کر کے سوچا۔

'ہو سکتا ہے قدرت کو مجھ پر اور معصوم ماہا پر رحم آ گیا ہو۔ ضیا کو قدرت نے اپنی کرم نوازی سے نواز دیا ہو، وہ بالکل نارمل ہو اور اس کی آنکھیں اس وقت اسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ اس کا ذہن اسی کے بارے میں سوچ رہا ہو، ہو سکتا ہے اسے ماہا اور یوسف کی یاد بھی آ رہی ہو۔'

وہ شیشے کی اوٹ میں کھڑی خوشی کے آنسو بہاتی رہی، خدا سے دعائیں مانگتی رہی کہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ پھر ایک خواہش نے اس کے دل میں بڑی شدت سے سر ابھارا۔ کاش ضیا ایک بار نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی جانب دیکھ لے۔ اسے دیکھ کر شناخت بھی کر لے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ ابھرے تو... تو...

''میڈم...'' ایک نرس نے آواز دے کر اس کے خوابوں کے سارے حسین تاج محل مسمار کر دیے۔ حسرتوں کی شاخ پر کھلنے والی کلیاں اپنے وجود کے اندر ہی سمٹ کر رہ گئیں۔ اس نے پلٹ کر نرس کی جانب دیکھا، وہ اسی سے مخاطب تھی۔

''آپ کو ڈاکٹر الفرڈ اپنے روم میں بلا رہے ہیں۔''

مہوش، ضیا پر ایک آخری نظر ڈالتی قدم اٹھاتی ہوئی ڈاکٹر الفرڈ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی تو ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم آج مسٹر ضیا کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر رہے ہیں۔ صرف آپ کے آنے کا انتظار تھا۔''

''ڈاکٹر...'' اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

http://pakistanipoint.com

"میں نے اسی لیے آپ کو زحمت دی ہے۔" ڈاکٹر نے کرسی پر پہلو بدل کر کہا۔ "مسٹر ضیا کو نارمل کنڈیشن میں آنے کے لیے کتنا وقت لگے گا، ہم اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فی الحال مسز ضیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں... آپ کو ان کے سامنے جو کردار ادا کرنا پڑے گا، وہ بہت اہم ہے۔ سارا دارومدار اسی بات پر ہے کہ آپ ان کی کسی بات کا تاثر اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیں۔"

"ڈاکٹر... ضیا مجھے پہچان تو لیں گے؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"ہو بھی سکتا ہے..." ڈاکٹر نے پُرامید انداز میں جواب دیا۔ "کل سے اب تک میں ان سے تین بار مل چکا ہوں۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ انہوں نے بس ایک لمحے کے لیے... لیکن مجھے پہچان لیا تھا۔ میرا نام بھی یاد آ گیا تھا انہیں... مگر ایک منٹ بعد ہی وہ پھر اِدھر اُدھر کے بے معنی سوالات کرنے لگے۔ آپ زیادہ سے زیادہ ان کے سامنے رہیں، ان کی دل جوئی کرتی رہیں تو اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ آپ کو پوری طرح شناخت بھی کر لیں مگر کسی بھی صورت میں آپ خود کو کنٹرول میں رکھنے کی پوری کوشش کریں گی۔ ابھی ان کا ایک ہفتے تک اسپتال میں انڈر آبزرویشن رہنا بھی ضروری ہے... ہاں، اگر آپ چاہیں تو اپنے رسک پر انہیں لے بھی جا سکتی ہیں۔"

"نہیں..." مہوش نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جو آپ کے مشورے کے خلاف ہو۔"

"شکریہ مسز ضیا..."

پھر وہ ڈاکٹر کے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔

دو گھنٹے بعد ضیا کو وی آئی پی روم میں منتقل کر دیا گیا جہاں مختصر سا ایک ویٹنگ روم اور بھی تھا جہاں وہ رہ سکتی تھی۔ ولیم نے اپنی ذہانت سے کام لے کر مہوش سے پوچھے بغیر ڈاکٹر الفرڈ سے مل کر وی آئی پی روم کا بندوبست کر لیا تھا۔ دو ایسی نرسیں بھی وہاں مقرر کر دی گئی تھیں جو ہر چھ گھنٹے کی روٹین ڈیوٹی سے مریض کا چوبیس گھنٹے خیال رکھنے کی پابند تھیں۔

مہوش مختصر سے کمرے میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ ضیا کے پاس ایک نرس موجود تھی جو دوائیں دے رہی تھی۔ مہوش کو ایک ایک لمحہ پہاڑ لگ رہا تھا۔ ضیا کو کمرے میں لانے کے تقریباً تین گھنٹے بعد نرس نے اس کے پاس آ کر مسکراتی نظروں سے کہا۔

"میڈم اب آپ اپنے اسپینڈ کے سامنے جا سکتی ہیں لیکن ڈاکٹر نے آپ کو جو ہدایتیں دی ہیں ان کا خیال رکھیے گا۔"

مہوش نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر وہ خود کو سنبھالتی ہوئی ضیا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑی اپنائیت سے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم سجا کر پیار سے پوچھا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے... ضیا؟"

"تم..." ضیا نے اسے بہت غور سے دیکھا، اس کی نظروں میں تجسس مچل رہا تھا۔ بڑی دیر تک وہ مہوش کو پلکیں جھپکا کر دیکھتا رہا پھر الجھے الجھے انداز میں بولا۔ "مم... مم... میں نے... شاید تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے... کہاں..."

"ذہن پر زور نہ ڈالیں۔" اس نے بدستور پیار سے کہا۔ "میں بتاتی ہوں آپ کو... میں آپ کی مہوش ہوں... ہاں... مہوش، آپ کی چہیتی بیوی۔"

"مہ... وش... بیوی؟" ضیا کی نظروں میں بس ایک لمحے کو خوشی کی ایک کرن چمکی پھر وہ کچھ غور کرنے کے بعد بولا۔ "تم سے پہلے ابھی سفید کپڑوں میں ایک عورت اور بھی میرے پاس تھی... وہ کون تھی؟"

"وہ نرس تھی۔" مہوش کی پلکوں پر روشن ہونے والی چراغ کی لَو پھر ٹمٹمانے لگی۔

"اور تم... کیا کہا تھا؟... میری بیوی؟"

"ماہا تو یاد ہو گی آپ کو...؟" مہوش نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ "آپ اپنی اسی پیاری سی لاڈلی بیٹی کے پاس امریکا گئے تھے... یاد کریں۔"

"ہاں... وہ... میری پیاری سی گڑیا..." ضیا کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری پھر اس نے بیزاری سے کہا۔ "اس کا بیٹا... کیا نام ہے اس کا... وہ بہت شریر ہو گیا ہے۔ ابھی سے کار چلانے کی ضد کرنے لگا ہے۔"

مہوش کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"ابھی بچہ ہے... بڑا ہو جائے گا تو آپ کے کہنے پر عمل کرے گا۔"

"تم نے... اپنا کیا نام بتایا تھا...؟" ضیا نے پھر اسے غور سے دیکھا۔

"مہوش..."

"اچھا نام ہے لیکن شہلا کو تمہارے نام سے ضد کیوں تھی؟ وہ اکثر تمہارے بارے میں..."

"شہلا یاد ہے آپ کو...؟" اس نے دل پر جبر کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کون شہلا..." ضیا کی پیشانی یک لخت شکن آلود ہو گئی۔ "ابھی تم سفید کپڑوں میں مجھے دوا پلا رہی تھیں... کہاں سے آ گئی اور... تم نے اپنا لباس کیوں بدل..."

مہوش کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت پر ماتم

کرے لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ضیا اس سے بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ کبھی بس ایک پل کو ماضی سے اس کی یادوں کا رشتہ جڑ جاتا اور پھر... وہ جھلا کر بے سروپا باتیں کرنے لگتا۔ ماہا کی تو ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی اور ضیا اس کے بچے کی بات کر رہا تھا۔ دل پر جبر کیے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی، زبردستی مسکراتی رہی اور خدا سے دعائیں مانگتی رہی کہ وہ اس کے سہاگ کی کھوئی ہوئی یادیں اسے واپس کر دے۔

☆☆☆

دو سال بیت گئے...!

ڈاکٹر الفرڈ کی تمام کوششیں اور مہوش کی تمام احتیاطیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ماہا اور یوسف کی رخصتی بھی جیسے تیسے انجام پا گئی۔ ضیا بھی کسی اجنبی کی طرح اس میں شریک ہوا، وہ مہوش سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اسے اس کے نام سے آوازیں بھی دینے لگا تھا لیکن اس کی یادداشت واپس نہ آ سکی تھی۔

کراچی کے اپنے گھر میں آنے کے بعد ضیا نے ہر ایک چیز کو بہت غور اور پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ مہوش کے سلیقے کی تعریف بھی کی لیکن اسے یہ یاد نہیں آیا کہ وہ گھر خود اس نے بڑے پیار سے بنوایا تھا۔ کبھی اسی آشیانے میں پہلی بار منتقل ہونے کے بعد وہ بھولے بھالے معصوم پنچھیوں کی طرح چہکا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی؟

ماہا اور یوسف کی رخصتی کے موقع پر سارے پرانے دوست اور عزیز شریک ہوئے۔ سب ہی نے ضیا کی کیفیت کو بطورِ خاص محسوس کیا۔ ضیا نے کسی ایک کو بھی نہیں پہچانا، البتہ مہوش جس سے ملتی وہ اس سے مسکرا کر ہاتھ ضرور ملا لیتا۔ کوئی کچھ سوال بھی کرتا تو وہ مسکرا کر جواب میں خاموش ہی رہتا... کسی روبوٹ کی طرح وہ مہوش کے اشاروں پر چلتا جیسے وہ اس کا ریموٹ کنٹرول ہو۔

پھر رفتہ رفتہ دوست یاروں نے بھی ایک ایک کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی، عزیز رشتے دار بھی کترانے لگے لیکن فرخندہ باجی، نوشین اور عابد پہلے سے بھی زیادہ اپنائیت سے مہوش کا ساتھ نبھاتے رہے۔ وہ اسے تسلیاں دیتے رہتے کہ جس خدا نے ضیا کو نئی زندگی دی ہے، وہی کسی دن اچانک اس کی یادداشت بھی بحال کر دے گا۔ لیکن وقت جیسے جیسے گزرتا گیا، مہوش کی ساری امیدیں... ایک ایک کر کے دم توڑتی گئیں پھر بھی اسے ایک بات کی خوشی ضرور تھی۔

ضیا اب اسے مستقل طور پر اسی کے نام سے پکارنے لگا تھا۔ پہلے وہ دن بھر نہ جانے کتنی آوارہ اور فیشن پرست لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا لیکن اب... ضیا صرف مہوش کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔

کبھی وہ دن رات شراب میں غرق رہتا تھا، اب شراب نام کی کوئی شے اسے یاد تک نہیں تھی۔ بس اس کا ایک ہی مشغلہ رہ گیا تھا، دن رات ہر وقت وہ مہوش کے سائے سے بھی زیادہ اس کے قریب رہنے لگا تھا۔ وہ مہوش کو ایک شادی شدہ عورت کی ضرورتوں کی تکمیل سے سیراب نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے مہوش کا ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہونا گوارا نہیں تھا۔

کبھی ماہا اور یوسف آ جاتے تو وہ ماہا سے دو چار پیار کی باتیں اجنبیوں کی طرح ضرور کر لیتا تھا، اسے اپنے قریب بٹھاتا۔ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا... وہ جب واپس چلی جاتی تو وہ مہوش سے بڑی معصومیت سے پوچھتا۔

"یہ کون لڑکی ہے... جو مجھے بیار سے پاپا... پاپا کہتی رہتی ہے...؟"

ایسے موقعوں پر مہوش کا دل تڑپ اٹھتا، روح آنسو بہاتی لیکن وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے سب کچھ برداشت کرتی رہتی... اکثر وہ سوچتی... جب ہم غریب تھے تو کتنے پیار سے مل جل کر رہتے تھے... ایک جتھے کی طرح۔ دور دور تک غموں کے سائے نہیں تھے۔ ایک کو زخم لگتا تو دوسرا مرہم کا پھایا رکھ دیتا۔ فوراً آرام بھی آ جاتا لیکن دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ان کا سکون بھی ایک ایک کر کے بیماروں سے روٹھ کر خزاں کی زد پر آنے لگا۔ وہ بڑے سے بنگلے میں منتقل ہوئے تو بڑے آدمیوں کی خو بُو نے بھی ضیا کو متاثر کیا۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ موم کی بیتی جاتی تتلیاں ضیا کی دولت کی گرمی پا کر پگھلنے لگیں۔ شباب کے ساتھ شراب بھی ضیا کی زندگی میں داخل ہوئی تو شباب اور شراب کے نشے نے مل کر اسے گمراہ کر دیا۔ مہوش نے اسے بچانے کی خاطر اس کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر چلنے کی کوشش کی تو اس کی شرافت کا دامن بھی آہنی شکنجوں کے کانٹوں میں الجھ کر تار تار ہو گیا... وہ کسی نہ کسی طرح اس جہنم سے نجات پا گئی لیکن ضیا شراب اور شباب کے تیز ریلوں میں بہتا چلا گیا۔ اس نے مہوش سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ماضی کی طرف واپس لوٹنے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن ماہا کے پاس سے لندن آنے کے بعد وہ ایک بار پھر شراب کے سیلاب میں اترا تو قدم نہ جما سکا... پارٹ اٹیک کے اچانک حادثے نے اسے ہر چیز سے بیگانہ کر دیا... اپنے آپ سے بھی!

اور مہوش...

وہ اپنی قسمت کے لکھے پر شاکر ہونے کے باوجود اکثر یہ ضرور سوچتی کہ... اس نے ضیا کی محبت میں کیا کھویا اور کیا پایا؟

●●●

http://pakfunplace.blogspot.com

سفینۂ حیات

کاشف زبیر

زندگی کی پُرخار راہوں پر کبھی کبھار ایسے پُر پیچ موڑ آجاتے ہیں کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی انجانی راہوں پر چل پڑتا ہے۔ مسافرتوں میں ہی اسے عافیت نظر آتی ہے۔ ان دیکھی اور ان سوچی راہیں اس کی منزل ٹھہرتی ہیں اور نا آشنا لوگ اس کی زندگی کا محور و مرکز بن جاتے ہیں... ایک دوسرے سے انجان.... لوگوں کا قصہ جنہیں ایک اتفاق نے شناسا بنادیا مگر ان کی زندگیاں داؤ پر لگ گئیں۔

مسافرت کے دوران دوستوں اور دشمنوں میں گھر جانے والے نا آشناؤں کی دلچسپ داستان

عرفان نے تشویش سے بڑھتی ہوئی تاریکی کو دیکھا۔ شام ہو چکی تھی اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی... اور اگر بارش ہو جاتی تو اس کے بعد اس سڑک پر سفر کرنا ناممکن ہو جاتا۔ چند مہینے پہلے آنے والے سیلاب نے سڑک کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ انہیں حویلی سے روانگی میں تاخیر ہو گئی تھی۔ آغا جی کی تدفین تو دوپہر تک ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد تعزیت کے لیے آنے والوں سے ملنے میں دیر ہو گئی اور انہیں نکلتے نکلتے بھی تین بج گئے۔ کچھ تاخیر شاہین کی وجہ سے بھی ہوئی۔ اس نے عین موقع پر زنان خانے سے پیغام بھیجا کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ عرفان حیران رہ گیا۔ شاہین کی اس کے ساتھ جانے کی کوئی تُک نہیں تھی۔ وہ آغا جی کی اکلوتی اولاد تھی اور عرفان کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم سوئم تک رکے گی۔ آغا جی اس کے تایا تھے اور اس دنیا میں وہی ان دونوں کے قریبی رشتے دار بھی تھے۔ اب وہ بھی نہیں رہے۔ حویلی میں اب صرف آغا جی کے سوتیلے بھائی چچا عظمت رہ گئے تھے۔

عرفان رک نہیں سکتا تھا۔ اسے بچوں کا خیال تھا جنہیں وہ ایک ملازم پر چھوڑ آیا تھا اور شاہین کار کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ عرفان اسے سمجھانے زنان خانے میں چلا آیا۔ ''تمہارا اس طرح جانا مناسب نہیں ہے، لوگ کیا سوچیں گے؟''

''لوگ جائیں جہنم میں۔'' شاہین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے بہر صورت جانا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھے لے جا رہے ہو یا نہیں؟''

عرفان اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور کیوں نہ ہوتا... وہ اس کی بیوی تھی اور ان کی شادی کو پندرہ سال ہو چکے تھے۔ اگرچہ معاملہ اب خاتمے تک پہنچ گیا تھا۔ شاہین کی فطرت میں ہٹ دھرمی تھی۔ اس نے روزِ اوّل سے عرفان کو قبول نہیں کیا اور پندرہ سال میں اس کے فیصلے میں ذرا بھی لچک نہیں آئی۔ آج اس کا باپ دفن ہوا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی لیکن وہ کسی کی پروا کیے بغیر واپس شہر جانا چاہتی تھی۔ عرفان نے اسے غور سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لی۔

''تمہاری مرضی... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

عرفان دو بجے ہی نکل جاتا لیکن شاہین کی وجہ سے نکلتے نکلتے تین بج گئے۔ اسے کوئی ایک سو میل دور دارالحکومت جانا تھا اور اگر موسم صاف ہو تو یہ فاصلہ تین گھنٹے میں آسانی سے طے ہو جاتا۔ ابتدائی چالیس میل تک پہاڑی علاقہ تھا، اس کے بعد پھر سڑک ہموار ہو جاتی لیکن گزشتہ دنوں آنے والے سیلاب نے سڑک کو جگہ جگہ سے برباد کر دیا تھا۔ گاڑی کی رفتار نہایت سست تھی، شاید ہی کہیں اسے گاڑی کی رفتار تیس میل سے اوپر لے جانے کا موقع ملا ہو۔ اوپر سے روانگی کے فوراً بعد موسم کے تیور خراب ہو گئے اور آسمان سیاہ کالے بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔

پھر دسمبر کا آخری دن تھا اور چار بجے ہی اندھیرا چھانے لگتا حالانکہ ابھی سورج طلوع تھا لیکن بادلوں میں اس کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ دارالحکومت ابھی کوئی ستر میل دور تھا۔

عرفان گاڑی کو تیس میل کی رفتار سے اوپر نہیں لے جا رہا تھا کیونکہ سڑک سنگل اور خراب حالت میں تھی پھر سامنے سے آنے والی گاڑیوں سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ عرفان نے جھنجلا کر اس سے کہا۔ ''تم جلدی نہیں نکل سکتی تھیں؟ ورنہ اب تک تو ہم اس علاقے سے نکل چکے ہوتے۔''

شاہین نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا، وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ بلا کی سردی تھی اور تاریکی بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں رات ہو جاتی اور بارش ہو جاتی تو سفر کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اس کے باوجود شاہین کے چہرے پر ندامت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اصل میں وہ کسی بات پر پچھتانے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے ساری عمر اپنی من مانی کی تھی۔ پینتیس برس کی عمر میں بھی وہ بے پناہ حسین تھی۔ لائٹ براؤن بال اور گریش بلو آنکھیں آغا فیملی کی مخصوص نشانی تھیں۔ گداز لب جن پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی اور دل کش نقوش۔ باپ کے مرنے پر بھی وہ پورے نک سک سے تیار ہوئی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں عرفان بہت خوش تھا اور اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ شاہین اس سے نہایت سرد انداز میں پیش آتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر بڑھتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور جھنجلانے لگا، یہ عورت ہمیشہ سے اسے تکلیف میں ڈالتی آئی تھی۔

☆☆☆

روبینہ پریشان تھی اور پریشانی کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ روبینہ کے اسکول میں اس بار سرمائی چھٹیاں دسمبر کے آخر میں ہوئی تھیں۔ حالات کی وجہ سے تعلیمی سیشن متاثر ہوا اور سیکنڈ ٹرم کے امتحانات اب مکمل ہوئے تھے۔ اس کے بعد روبینہ اپنے ماں باپ کے گھر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ وہ دارالحکومت سے دور ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ ان

http://pakfunplace.blogspot.com

کی دو اولادیں تھیں۔ ایک روبینہ جو بیاہ کر دارالحکومت چلی گئی۔ اس کا شوہر سرکاری افسر تھا۔ خود روبینہ بھی سرکاری ملازم تھی اور ہائر ایجوکیشن کمیشن میں جاب کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بیٹا تھا جو شادی کے بعد بیرونِ ملک ہی بس گیا تھا۔ وہ دو تین سال بعد ایک چکر لگاتا۔ بوڑھے ماں باپ اب روبینہ کا انتظار کرتے۔ وہ اور اس کی بیٹی سونا آتے تو گھر میں بہار آجاتی۔ پہلے وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے چند دن کے لیے آجاتی تھی لیکن جب سونا اسکول جانے لگی تو اس کی گرمائی اور سرمائی چھٹیوں میں ہی ماں باپ کے گھر جاتی۔

سونا کی عمر سات سال تھی اور وہ سنہری مائل براؤن بالوں، براؤن آنکھوں اور سرخ و سفید رنگت والی خوب صورت بچی تھی۔ وہ اپنی ماں کی دوسری کاپی لگتی تھی۔ روبینہ اکتیس برس کی ہونے کے باوجود اپنی عمر سے چھ سات سال کم ہی لگتی۔ اقبال کے بعد کئی لوگوں نے اسے شادی کا پیغام دیا لیکن اس کا دل نہیں مانا۔ وہ سونا پر سوتیلا باپ لاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ایک کہانی پڑھتی سونا کو محبت سے دیکھا۔ ٹارزن اس کا پسندیدہ کامک تھا اور وہ ماں سے فرمائش کر کے اس کی کہانیاں منگواتی۔ جب وہ جانے کے لیے نکل رہے تھے تو سونا نے اس سے کہا۔

”ماما! آپ کو معلوم ہے آج سال کا آخری دن ہے؟“

”ہاں، رات کو نیو ایئر نائٹ ہوگی۔“ روبینہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ جب اقبال زندہ تھا وہ یہ دن اور رات کتنے اہتمام سے مناتے تھے۔ ایک دوسرے کو نیو ایئر کارڈ اور چھوٹے چھوٹے گفٹ دیتے۔

”ہم یہ دن نانو کے گھر منائیں گے۔“ سونا نے کہا۔

روبینہ دوپہر میں نکلی۔ اسے منزل پر پہنچنے میں تین گھنٹے لگتے تھے۔ راستے میں ایک چھوٹا سا حصہ پہاڑوں پر مشتمل تھا جہاں سے اسے گزرنا پڑتا۔ یہ اصل میں بائی پاس تھا ورنہ میدانی سڑک سے جانے کی صورت میں اسے ایک گھنٹا اضافی لگتا۔ تین بجے وہ اس پہاڑی حصے میں داخل ہوئی تو دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو سڑک اچانک ہی خراب شروع ہو گئی لیکن وہ اس امید پر ڈرائیونگ کرتی رہی کہ شاید آگے جا کر سڑک ٹھیک ہو جائے مگر اس کی خرابی برقرار رہی۔ پھر ایک جگہ اسے کام کرنے والے ورکرز نے بتایا کہ سیلاب نے اس پوری سڑک کو برباد کر دیا ہے۔ یہ کوئی تیس میل طویل تھی۔ وہ تقریباً وسط میں آ گئی تھی اور ابھی چار بجے تھے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ موسم اچانک ہی ابر آلود ہو گیا اور آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا۔

اندھیرا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس خراب سڑک پر رات میں ڈرائیو بہت مشکل تھی۔ اگر تاریکی چھا جاتی اور بارش ہو جاتی تو سفر نا ممکن ہو جاتا۔ صورتِ حال زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ایک بار وہ میدانی علاقے میں داخل ہو جاتی تو پھر مسئلہ نہیں تھا۔ وہاں سڑک اچھی تھی اور راستہ بھی بارونق تھا، اسے رات میں مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو دور دور تک کوئی اور گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ گاڑی اس کے مرحوم شوہر اقبال نے لی تھی اور اس کی وفات کو بھی چھ سال ہونے کو آئے تھے۔ کوئی دس سال پرانی اس گاڑی کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی اور روبینہ نے کئی بار اسے فروخت کر کے دوسری بہتر کنڈیشن کی گاڑی لینے کا سوچا لیکن فی الحال اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے۔ سونا بور ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد نانا نانی کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”ماما! نانو کا گھر کب آئے گا؟“

”ابھی دور ہے بیٹا۔“ روبینہ نے کہا اور گاڑی کی رفتار مزید کم کر دی۔ اسی لمحے بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ جھنجلانے لگی۔ اسے اس موسم میں نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا پھر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر سے چلی تو دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ان حالات کا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

فراز بھی یہی سوچ رہا تھا، اسے اس موسم میں شہر سے دور نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ فرح کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ فرح اس کی بیوی تھی۔ اس کی عمر صرف بیس سال تھی اور وہ فراز سے عمر میں بارہ سال چھوٹی تھی لیکن دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی شادی کو ایک سال ہی ہوا تھا۔ فرح ماں بننے والی تھی۔ پیدائش میں کچھ وقت رہتا تھا کہ فرح کو پہاڑوں پر برف باری دیکھنے کی سوجھی۔ اس کی صحت ٹھیک تھی اس لیے فراز نے سوچا کہ اس کی فرمائش پوری کر دے۔ پہاڑوں پر اس کا اپنا کاٹیج تھا اور وہ فرح کو وہیں لے گیا تھا۔ برف باری جاری تھی اور انہوں نے دل کھول کر سرد موسم کو انجوائے کیا لیکن اچانک ہی فرح کو تکلیف شروع ہو گئی اور فراز نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اس نے کاٹیج میں نیو ایئر نائٹ منانے کی ساری تیاری بھی کر لی تھی اور کاٹیج بھی سجا لیا تھا مگر فرح کی خراب ہوتی طبیعت نے اسے واپسی کے لیے مجبور کر دیا۔

جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئے تو موسم زیادہ ہی خراب ہو گیا اور شہر جانے والی سڑک لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے کئی مقامات سے بند ہو گئی۔ فراز کو راستے میں پتا چلا کہ سڑک کھلنے میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔ اس لیے فراز نے متبادل راستہ

اختیار کیا۔ یہ متبادل راستہ بہت طویل تھا لیکن وہ بہرحال دارالحکومت تک پہنچ جاتے۔

فراز ایک درمیانے درجے کا تاجر تھا اور اس نے فرح سے پسند کی شادی کی تھی۔ فرح کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا اور ابھی اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں جو جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھیں۔ فرح کے ماں باپ پریشان تھے کہ تین بیٹیوں کو کیسے رخصت کریں گے۔ اس لیے جب فراز کا رشتہ آیا تو انہوں نے عمروں کا فرق نہیں دیکھا۔ فراز کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور پھر اس نے کوئی مطالبہ بھی نہیں رکھا تھا۔ ویسے وہ دیکھنے میں خوش شکل اور نوجوان لگتا تھا۔ فرح اس کے ساتھ خوش تھی۔ اب تو وہ ماں بھی بننے والی تھی۔

سفر کے آغاز میں فراز مطمئن تھا کہ انہیں سوائے سفر کی طوالت کے اور کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس نے فرح سے کہا کہ اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو وہ نیو ایئر نائٹ اسلام آباد میں بھی منا سکتے ہیں... لیکن جب وہ پہاڑوں سے ذرا نیچے آئے تو ایک بائی پاس سے گزرتے ہوئے ان کی مشکلات کا آغاز ہوا۔ سیلاب سے متاثرہ سڑک کا اصل روپ سامنے آیا اور راستہ بہت ہی دشوار ثابت ہوا۔ سڑک پر فراز کی نئی نئی پجارو رینگ رہی تھی۔ حالانکہ پہاڑی راستوں پر سفر کے لیے یہ بہترین گاڑی ہے۔ اس کے باوجود ان کا شام سے پہلے دارالحکومت پہنچنا محال لگ رہا تھا۔ چار بجے کے قریب بادلوں کے تیور خطرناک ہونے لگے اور ابھی سے ماحول تاریک لگنے لگا۔

فرح کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے آرام دینے کی خاطر فراز نے فرنٹ سیٹ کو پیچھے کر دیا۔ وہ نیم دراز حالت میں تھی اس کے باوجود اس کی تکلیف ہر گزرتے لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔ چونکہ اس کے لیے پہلا موقع تھا، اس لیے وہ کچھ گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ وہ بار بار فراز سے پوچھ رہی تھی۔ ”اب کتنا فاصلہ ہے؟“

فراز اسے تسلی دے رہا تھا کہ بس کچھ ہی باقی رہ گیا ہے۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ انہیں کہیں رکنا پڑے گا۔ وہ اس سڑک پر پہلی بار سفر کر رہا تھا اور کچھ افراد نے اسے یہاں سے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اصل میں یہ ایک لنک روڈ تھی جو دارالحکومت کو آس پاس کے شہروں سے ملاتی تھی اور ہائی ویز کو آپس میں جوڑتی تھی۔ اس پر زیادہ تر وہ لوگ سفر کرتے، جو وقت بچانا چاہتے تھے۔ چند مہینے پہلے تک یہ بہترین حالت میں تھی مگر اب سیلاب نے اسے بھی تباہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

ارشد اس وقت بہت مشکل میں تھا۔ اس کے دو ساتھی مارے جا چکے تھے اور وہ دشمن کے نرغے میں تھا۔ اس کا ایک

میں کسی کی شادی پر نہیں رویا... جانے کیوں آج اپنی شادی پر آنسو کیوں بہے چلے آرہے ہیں۔

ساتھی ظاہر زخمی تھا۔ صرف اس کا دستِ راست امیر علی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ارشد! یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

ارشد وارث ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کا گروہ مسلح ڈکیتیوں اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث تھا۔ مخالف گروہ رحیم شاہ کا تھا اور وہ اسلحے اور منشیات کا بیوپاری بھی تھا۔ ارشد نے کبھی یہ دونوں کام نہیں کیے تھے۔ مخالفانہ جذبات رکھنے کے باوجود وہ تصادم سے گریز کرتے تھے۔ لیکن چند ہفتے پہلے رحیم شاہ کے آدمیوں نے ارشد کے ایک اہم ساتھی کو مار دیا۔ اصل میں یہ جھڑپ زبانی جھگڑا بڑھ جانے کی صورت میں ہوئی مگر اس میں زیادہ قصور رحیم شاہ کے آدمیوں کا تھا۔ اس سے دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ ارشد نے اپنے آدمی کا بدلہ لینے کی قسم کھائی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کرتا، اسے دشمن اس وقت گھیر لیا گیا جب وہ اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ اس سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ ارشد ایک اغوا ہونے والے اسامی کا تاوان وصول کر کے واپس آ رہا تھا۔ ان کے پاس پانچ کروڑ روپے کی خطیر رقم موجود تھی۔

رحیم شاہ کو کسی ذریعے سے ساحل کی اطلاع مل گئی تھی اور اس نے آگے پیچھے سے دو گاڑیوں [illegible] ارشد کی جیپ کو گھیر لیا اور اس پر گولیوں کی بارش [illegible] ارشد کے آدمیوں [illegible] کے دو ساتھی مارے جا چکے تھے [illegible] ارشد اور امیر علی باقی رہ گئے تھے جو اب [illegible] فائر کر رہے تھے

اوران کے پاس اسلحہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا لیکن دشمن کا پلہ بھاری تھا۔ ارشد نے عقبی شیشہ توڑ دیا اور پیچھے والی گاڑی پر خودکار رائفل سے برسٹ چلایا۔

"امیر! یہاں سے نکلنے کی کوشش کر۔"

امیر نے ڈرائیونگ سیٹ پر مارے جانے والے ساتھی کی لاش دروازہ کھول کر نیچے دھکیل دی اور خود اس کی جگہ سنبھال لی۔ اس دوران میں اس پر بھی فائرنگ کی گئی لیکن وہ محفوظ رہا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور اس گاڑی کو ٹکر ماری جس نے سڑک بلاک کر دی تھی۔ اس گاڑی میں سوار افراد کی بدقسمتی کہ گاڑی ایک کھائی کے بالکل پاس تھی۔ ٹکر کھا کر وہ پیچھے سرکی اور کھائی میں لڑھک گئی۔ غالباً رحیم کے آدمیوں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کھائی بہت گہری تھی اور اس میں گرنی گاڑی کے سواروں کی چیخیں اوپر تک سنائی دے رہی تھیں۔ راستہ صاف ہوا تو وہ نکلتے چلے گئے۔ رحیم دوسری گاڑی میں تھا۔ اس نے تعاقب کرنا چاہا لیکن ارشد نے برسٹ مار کر اس کی گاڑی کے ٹائرز پنکچر کر دیے۔

ارشد کے مارے جانے والے دونوں ساتھی آگے بیٹھے تھے جبکہ وہ تینوں پیچھے تھے، اسی وجہ سے بچ گئے تھے۔ صرف طاہر زخمی ہوا تھا۔ دو گولیاں اس کے دائیں شانے اور اس سے ذرا نیچے پسلی میں لگی تھیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ ارشد اس کا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ امیر عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"پیچھے رہ گئے ہیں۔"

ارشد نے دانت پیس کر کہا۔ "رحیم کو یہ حرکت مہنگی پڑے گی۔"

لیکن فی الحال تو ان کو مہنگی پڑ رہی تھی۔ ان میں سے دو مارے جا چکے تھے اور ایک شدید زخمی تھا۔ رحیم شاہ کی گاڑی پنکچر ہوئی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔ ارشد ابھی اپنے علاقے سے دور تھا۔ اس وقت چار بجے تھے اور آسمان پر گہرے بادل جمع ہو رہے تھے۔ اس موسم میں سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے شارٹ کٹ اور پولیس کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا اور یہ شارٹ کٹ ان کو مہنگا پڑ گیا۔ اس نے امیر علی سے کہا۔

"کوئی جگہ دیکھ جہاں سے مدد مل سکے۔ طاہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اس سڑک پر تو مشکل ہی ہے۔" امیر علی نے مایوسی سے کہا۔ "سڑک بھی بہت خراب ہے۔" وہ جانتا تھا کہ رحیم شاہ اور اس کے آدمی پیچھے ضرور آئیں گے اس لیے سفر کرتے رہنا ضروری تھا ورنہ وہ مارے جاتے۔ اس حملے کا ایک محرک تاوان کی رقم بھی تھی اور اس کے لیے بھی رحیم شاہ ان کے پیچھے ضرور آتا۔ دوسری گاڑی میں اس کے ساتھ کم سے کم پانچ بندے تھے اور وہ سب پوری طرح مسلح تھے۔ وہ دو ان چھ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی عافیت اسی میں تھی کہ جلد از جلد دور نکل جائیں۔ ارشد نے اپنا موبائل نکال کر دیکھا لیکن اس پر سگنل نہیں تھے۔ پانچ کروڑ روپے اس کے پاس رکھے بیگ میں تھے۔ یہ خونی رقم تھی اور اس نے چند گھنٹوں میں کئی جانوں کا نذرانہ لے لیا تھا۔ مزید جانیں جانے کا پورا امکان موجود تھا۔ اس کے باوجود ارشد اسے چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

"اس رفتار سے تو ہم کل تک ہی پہنچ سکیں گے۔" شاہین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو کیا کروں؟" عرفان نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ "موسم دیکھ رہی ہو، اس میں اس سے زیادہ رفتار سے گاڑی نہیں چلائی جا سکتی۔"

شاہین کا منہ بن گیا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ میں حویلی میں ہی رک جاتی۔"

"رک جاتیں... کم از کم میں تو سکون سے ہوتا۔" عرفان چڑ کر بولا۔

شاہین نے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اب تو تمہیں سکون مل گیا ہوگا؟"

"ہاں، یہ سچ ہے... پندرہ سال میں پہلی بار مجھے سکون ملا ہے۔" عرفان نے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ سکون جو تم نے مجھے کبھی نہیں دیا۔"

شاہین چپ ہو کر پھر باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی ایک مل کھاتی پہاڑی سڑک سے گزر رہی تھی۔ اچانک چند بوندیں گریں اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ عرفان نے پریشان ہو کر سامنے دیکھا اور ہیڈ لائٹس آن کر دیں مگر ایک منٹ سے بھی پہلے بارش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں سامنے سے کوئی گاڑی آ جاتی تو تصادم سے بچنا مشکل ہو جاتا اور اگر گاڑی سڑک سے اتر جاتی تو پھر اللہ ہی حافظ تھا۔

"بس اسی کی کسر باقی رہ گئی تھی۔" شاہین نے طنز کیا۔

"خدا کے لیے..." عرفان نے اس کی طرف دیکھا۔

اسی لمحے سامنے سے اچانک ہی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ عرفان نے بے ساختہ بریکس لگائے۔ اس کے بائیں طرف کھائی تھی اور شدید طیش کے عالم میں بھی اسے یاد رہا تھا کہ اس طرف گاڑی موڑنے سے وہ کھائی میں گر سکتی ہے۔ مگر تصادم ناگزیر

تھا۔ گاڑی نے شدید جھٹکا لیا اور اچھل کر بائیں طرف گئی۔ عرفان نے گاڑی سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ سڑک سے اتر گئی اور تیزی سے کھائی میں جانے لگی۔ شاہین کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ پھر گاڑی کھائی میں گئی تو اس نے دوبارہ چیخ ماری مگر اسی لمحے گاڑی معجزانہ انداز میں رک گئی۔ سڑک سے نیچے ڈھلان پر دو مضبوط تنوں والے درخت تھے اور گاڑی ان کے درمیان پھنس کر رک گئی تھی۔ البتہ اس کا منہ نیچے کی طرف ہی تھا۔ صورتِ حال بہت خطرناک لگ رہی تھی۔

"عرفان۔" شاہین نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہلنا مت۔" عرفان بولا اور اس نے آہستگی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ خوش قسمتی سے اس طرف کا دروازہ آزاد تھا جبکہ شاہین کی طرف درخت کے تنے نے دروازے کو روک دیا تھا۔ عرفان سنبھل کر نیچے اترا تو فوراً یخ بستہ پانی نے اس کا استقبال کیا مگر موت کے منہ میں اسے بارش کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایک مضبوط شاخ پکڑی اور ہاتھ بڑھا کر شاہین سے کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

شاہین اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے آگے جھکی تو گاڑی ہلی۔ وہ مارے خوف کے ساکت ہو گئی۔ عرفان نے محسوس کیا کہ گاڑی آگے پھسل رہی ہے اور تنے اسے زیادہ دیر نہیں روک سکتے۔ اس نے چلا کر کہا۔ "میرا ہاتھ پکڑو، میں تمہیں باہر کھینچ لوں گا۔"

شاہین نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے کیا اور جیسے ہی اس کا ہاتھ عرفان کی گرفت میں آیا، گاڑی تیزی سے آگے سرکی لیکن عرفان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے پوری طاقت سے شاہین کو باہر کھینچ لیا حالانکہ اس کا وزن کافی تھا اور بھیگ کر اس کا ہاتھ پھسلنے لگا تھا لیکن اس نے شاہین کو گاڑی کے ساتھ جانے نہیں دیا۔ شاہین آنکھیں بند کر کے چیخ رہی تھی۔ حالانکہ وہ بچ گئی تھی۔ پھر جب اسے احساس ہوا تو وہ عرفان سے لپٹ کر تھر تھر کانپنے لگی۔

"شاہین! ہوش میں آؤ۔ ہمیں اوپر جانا ہے۔" عرفان نے ذرا سختی سے کہا۔ "خود کو سنبھالو اور اوپر چلو۔ یہ ڈھلان زیادہ مشکل نہیں ہے۔"

شاہین بہ مشکل کئی بار سمجھانے پر اوپر جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اوپر جو ایک سخت خول چڑھا رکھا تھا، وہ اس وقت اتر گیا تھا اور اس کے اندر سے ایک کمزور عورت ہی نکلی تھی۔ عرفان کو اس کی ہمت پر افسوس ہوا۔ جیسے ہی شاہین سڑک کے اوپر گئی، وہ بھی سنبھل کر اوپر چڑھ گیا۔ ڈھلان خطرناک نہیں تھی لیکن بارش کی وجہ سے پھسلواں ہو گئی تھی۔ اس کی گاڑی کوئی تیس چالیس فٹ کی گہرائی میں جھاڑیوں میں جا پھنسی تھی۔ لیکن ڈھلان اس سے بھی آگے تھی۔

اوپر آ کر اس نے ایک نظر شاہین کو دیکھا اور دوسری گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ سڑک کے دوسری طرف کچے میں اتری ہوئی تھی، اس کا انجن بند ہو گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والا شیشہ دھندلایا ہوا تھا۔ اس نے شیشہ بجایا۔ "ہیلو... تم ٹھیک ہو؟"

شیشہ نیچے ہوا تو عرفان کے سامنے ایک دہشت زدہ نسوانی چہرہ تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ "ہاں، ہم ٹھیک ہیں... لیکن میری گاڑی کا حشر ہو گیا ہے۔"

اندر کی لائٹ روشن تھی۔ عرفان نے دیکھا کہ فرنٹ سیٹ پر ایک بچی بھی بیٹھی ہے۔ اس نے شائستگی سے کہا۔ "آپ کی گاڑی کا حشر ہوا ہے اور میری گاڑی کھائی میں جا گری ہے۔ خدا کا شکر ہے ہم اس کے ساتھ نہیں گئے۔"

"میرے خدا!" عورت بولی اور نیچے اتر آئی۔ اس نے عقبی نشست سے ایک چھتری نکال لی۔ عرفان نے لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے بارش سے کسی قدر بچا ہوا تھا۔ عورت نے پہلے اپنی گاڑی کا معائنہ کیا۔ اس میں دائیں طرف ڈینٹ آیا تھا اور بمپر اندر کی طرف دب گیا تھا۔ اصل میں دونوں میں معمولی سی رگڑ لگی تھی۔ رفتار بھی کم تھی اس لیے تصادم شدید نہیں تھا۔ بس اچانک ہوا تھا تو شدید لگ رہا تھا۔ اگر بارش نہ اور ہی ہوتی تو عرفان کی گاڑی بھی بچ جاتی۔ اس نے عرفان سے معذرت کی۔

"سوری... میری وجہ سے آپ کا نقصان ہوا۔"

"نہیں، قصور میرا بھی ہے۔" عرفان نے دیانت داری سے کہا۔ "اس موسم میں ڈرائیو کرتے ہوئے میرا دھیان سامنے نہیں تھا۔"

"بس اتفاق سے ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں ایک لمحے کو مونا کی طرف متوجہ ہوئی اور یہ حادثہ ہو گیا۔ مونا میری بیٹی ہے۔"

"میں عرفان احمد ہوں۔" اس نے تعارف کرایا۔ "ایک اخبار میں کام کرتا ہوں۔"

"اوہ... آپ صحافی ہیں۔" وہ خوش ہو گئی۔ "میرا نام روبینہ ہے اور میں دارالحکومت میں ہائر ایجوکیشن میں جاب کرتی ہوں۔"

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" عرفان نے پوچھا۔

"قادر آباد۔"

http://pakistanipoint.com

"وہ تو یہاں سے کوئی چالیس میل دور ہے۔" عرفان بولا۔ "آپ اس موسم میں اتنی دور جائیں گی؟"

"ہم دارالحکومت سے آ رہے ہیں۔ اگر سڑک خراب نہ ہوتی تو اب تک پہنچ بھی چکے ہوتے۔ میں ہمیشہ اسی سڑک سے جاتی ہوں۔"

"میں دارالحکومت جا رہا ہوں۔" عرفان نے بتایا۔ "لیکن اب تو گاڑی ہی نہیں رہی ہے۔"

"ایسا کریں... آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں گی جہاں سے آپ مدد حاصل کر سکیں۔"

"میں شکر گزار ہوں گا۔" عرفان نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔"

"اچھا۔" روبینہ نے کہا۔ "کہاں ہیں؟"

شاہین ایک درخت کے نیچے تھی۔ اگرچہ وہاں بھی بارش کی بوچھاڑ آ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ براہ راست بارش سے محفوظ تھی۔ بارش کے ساتھ تیز اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آ رہے تھے۔ عرفان نے اسے آواز دی تو وہ دوڑتی ہوئی آئی اور دونوں گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ عرفان کا خیال تھا کہ شاہین اب ذرا چپ رہے گی لیکن اس کی زبان کو قرار نہیں تھا۔ اس نے اندر بیٹھتے ہی کہا۔ "شکر ہے تمہیں میرا خیال بھی آیا ورنہ تم شاید موسم پر تبادلہ خیال ہی کرتے رہتے۔"

روبینہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ شاہین کی بات سن کر ایک لمحے کو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس نے نظر انداز کر کے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ سیلف گھوما لیکن انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ ہر بار انجن گھر گھرا کر رہ جاتا۔ وہ بار بار سیلف گھما رہی تھی۔ عرفان نے اسے روک دیا۔ "ایک منٹ... اس طرح تو بیٹری بیٹھ جائے گی۔ میں انجن دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی پوائنٹ نکل گیا ہو۔"

"اللہ کرے یہی مسئلہ ہو۔" روبینہ پریشانی سے بولی۔ "ورنہ...... یہاں تو کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔"

عرفان نے نیچے اتر کر بونٹ کھولا۔ اپنے موبائل کی ٹارچ سے کام لیا اور انجن کے سارے پوائنٹ چیک کیے۔ ڈسٹری بیوٹر بھی کھول کر دیکھا۔ تمام تار درست لگے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس نے سب کو نکال کر دوبارہ لگایا اور روبینہ سے انجن اسٹارٹ کرنے کو کہا لیکن نتیجہ اس بار بھی حسب سابق رہا۔ روبینہ پریشان ہو گئی۔ "اب کیا ہوگا؟"

"آپ فکر مت کریں۔" عرفان نے تسلی دی۔ وہ دوبارہ گاڑی میں آ گیا تھا کیونکہ بارش مزید تیز ہو گئی تھی۔

"ہاں، فکر کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" شاہین نے طنز کیا۔ "یہاں حالات معمول کے مطابق ہی تو ہیں۔"

"پلیز! تم خاموش نہیں بیٹھ سکتیں؟" عرفان نے چڑ کر کہا۔

روبینہ نے عرفان کی حمایت کی۔ "یہ ایک حادثہ ہے۔"

"ہاں، میں بھی دیکھ رہی ہوں یہ ایک حادثہ ہے۔" شاہین معنی خیز انداز میں بولی۔ "خوش گوار قسم کا...."

"یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔" روبینہ کو غصہ آ گیا۔

"شاہین! بہتر ہوگا تم اپنا منہ بند رکھو۔" عرفان نے سرد لہجے میں کہا۔ "ورنہ تم جانتی ہو...." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

شاہین چپ ہو گئی۔ روبینہ اپنے غصے پر قابو پانے لگی۔ باہر بارش تیز ہو رہی تھی اور سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کاش کہ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں ہم پناہ لے سکتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اس طرح تو رات نہیں گزاری جا سکتی۔" عرفان نے کہا۔ "اگر آپ مجھے چھتری دے دیں تو میں آس پاس دیکھتا ہوں.... شاید کہیں سے مدد مل سکے۔"

"کیوں نہیں۔" روبینہ نے چھتری اور ٹارچ اس کی طرف بڑھا دی۔

عرفان دونوں چیزیں لے کر نیچے اتر آیا۔ اس نے جانے سے پہلے جھک کر کہا۔ "دروازے لاک کر لیں۔ یہ جگہ ویران ہے اور جب تک میں نہ آؤں، کوئی بھی گاڑی سے نہ اترے۔ اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو گاڑی کا ہارن بجا دیجیے گا۔"

"میں خیال رکھوں گی۔"

عرفان آگے کی طرف جانے لگا کیونکہ وہ جس طرف سے آ رہا تھا وہاں اسے ایسی کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی جہاں سے مدد مل سکے۔ بارش تیز ہو رہی تھی اور ساتھ ہی بجلی بھی وقفے وقفے سے چمک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو سارا ماحول روشن ہو جاتا۔ وہ کوئی دو سو گز آگے آیا ہوگا کہ بجلی چمکی اور ہر طرف دو سیکنڈ کے لیے روشنی ہو گئی۔ اس نے بائیں طرف ایک اونچے ٹیلے پر ایک مکان دیکھا۔ یہ بڑا سا مکان تھا جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عرفان رک کر اسی طرف دیکھنے لگا۔ جب دوبارہ بجلی چمکی تو اس نے اچھی طرح مکان کو دیکھا۔ یہ تقریباً پورے ٹیلے پر بنا ہوا کوئی پرانا مکان تھا اور یہ جس ٹیلے پر تھا وہ زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک طرف کھائی تھی جس سے یہ ٹیلا ابھرا ہوا تھا۔ یہ سڑک سے شاید تیس چالیس فٹ بلند تھا لیکن زمین سے اس کی

اونچائی کوئی سو فٹ تھی اور اس کے تین اطراف گہری کھائی لگ رہی تھی جبکہ سامنے سے ایک پتلا سا راستہ اس تک جا رہا تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں احاطہ بھی تھا۔ عرفان مکان تک جانے والے راستے تک آیا۔ یہ بہت خطرناک لگ رہا تھا کیونکہ اس کے دونوں طرف کھائی تھی اور اس کی ڈھلان بالکل سیدھی تھی۔ راستے پر کسی زمانے میں پتھروں سے سڑک بھی بنائی گئی تھی لیکن اب سڑک غائب تھی۔ بس کہیں کہیں نشان باقی رہ گئے تھے۔

عرفان نے سوچا کہ اس موسم میں یہ جگہ بری نہیں ہے۔ ممکن ہے غیر آباد ہو لیکن اس حویلی نما گھر میں وہ رات سکون سے گزار سکتے تھے۔ گاڑی میں وہ رات بھر بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتے۔ وہ واپس آیا۔ روبینہ اور شاہین اس کا انتظار کر رہی تھیں اور یقیناً ڈر بھی رہی تھیں کیونکہ اسے دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان آ گیا تھا۔ عرفان جلدی سے گاڑی میں گھس گیا۔ اتنی دیر میں سردی نے اسے جما کر رکھ دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" شاہین نے پوچھا۔

"ذرا آگے ایک بڑا سا مکان ہے لیکن غیر آباد نظر آ رہا ہے۔"

"اس صورت میں ہم اندر کیسے جائیں گے؟" روبینہ نے پوچھا۔

"اگر وہاں تک گئے تو پتا چل جائے گا۔"

وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ کیا سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ اس بارش میں مکان تک جائیں گے اور اگر نہ جا سکے تو یہ کوشش بے کار جائے گی۔ پھر چھتری ایک ہی تھی اور اتنے لوگ کس طرح جاتے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سے سڑک پر روشنی نمودار ہوئی۔ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ پھر روبینہ کو خطرے کا احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا کرتی، آنے والی گاڑی اس کی گاڑی سے آ ٹکرائی۔

☆☆☆

فراز، فرح کی کراہیں سن کر بے چین ہو رہا تھا اور اسی وجہ سے بار بار ایکسلریٹر پر اس کا دباؤ بڑھ جاتا تھا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سوا پانچ بجے تک سورج ڈوبنے سے ماحول تقریباً تاریک ہو گیا تھا۔ پہاڑی ڈھلان سڑک کے بائیں طرف تھی یعنی اس کی ڈرائیونگ سائڈ پر اور وہ کنارے سے دور رہنے کے لیے سڑک کے وسط میں رہ کر گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ اس مختصری سڑک پر خطرناک کام تھا۔ سامنے سے کوئی گاڑی تیزی سے آتی تو تصادم سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ اس وقت بیس میل کی رفتار بھی خطرناک تھی کیونکہ چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ وہ رفتار کو تیس تک بھی لے جاتا تھا۔ فرح کو خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"پلیز فراز.... رفتار کم کریں۔"

"تم فکر مت کرو، اس کے بریک بہت اچھے ہیں۔" اس نے پیار سے بیوی کا ہاتھ سہلایا۔ اسی لمحے اسے سڑک پر کسی گاڑی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے بے ساختہ بریک لگایا۔ اس کے باوجود ان کی گاڑی دوسری گاڑی سے جا ٹکرائی۔ یہ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اس کی لائٹس بند تھیں اس لیے فراز کو بالکل آخری لمحے میں نظر آئی۔ فراز نے بریک لگایا تھا.... اور گاڑی کی رفتار بھی کم ہوئی تھی اس کے باوجود تصادم ہوا اور دونوں گاڑیوں میں موجود افراد کو جھٹکا لگا۔ گاڑی کی دائیں ہیڈ لائٹ بکھر گئی اور تصادم کی آہنی گونج بھی تیز خراش تھی۔ فراز اچھلا لیکن اسے فکر فرح کی تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اس پر گیا۔ فرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی لیکن تصادم کے دھچکے سے وہ آگے گئی تو بیلٹ کا دباؤ پیٹ پر آیا اور اس پر ایک لمحے کو قیامت گزر گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ تصادم کی لہر نے اسے سر سے پاؤں تک ہلا دیا تھا۔ فراز اس کی طرف جھکا۔ اس نے بے تابی سے کہا۔

"فرح.... تم ٹھیک ہو؟"

فرح نے سانس لے کر ابھرنے والا درد دبا رہی تھی۔ "مجھے.... تکلیف ہو رہی ہے۔"

گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا فراز نے اسے ذرا پیچھے کیا اور سڑک سے نیچے اتار دیا۔ "ایک منٹ.... خود کو سنبھالو، میں آتا ہوں۔"

فراز غصے کے عالم میں نیچے آیا۔ اس نے گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا حرکت ہے.... گاڑی اس طرح کیوں کھڑی کی ہوئی ہے؟"

اس دوران میں عرفان اور روبینہ بھی نیچے اتر آئے۔ روبینہ نے بھی غصے سے کہا۔ "میری گاڑی خراب ہے اس لیے کھڑی ہے لیکن آپ اس موسم میں اتنی کیئرلیس ڈرائیونگ کیوں کر رہے تھے؟ آپ کو سامنے دیکھنا چاہیے تھا۔"

فراز کا غصہ ندامت میں ڈھل گیا۔ واقعی اس نے بے پروائی کا ثبوت دیا تھا۔ "سوری! اصل میں میری بیوی پریگنینٹ ہے اور میں اسے کسی اسپتال تک لے جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اوہ....!" روبینہ کا غصہ بھی ماند پڑ گیا۔ "وہ ٹھیک تو ہیں؟ کیا میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟"

http://pakfunplace.blogspot.com

"پلیز!" فراز بولا۔ "مجھے لگتا ہے اس قدم سے اسے تکلیف ہوئی ہے۔ اگر آپ دیکھ لیں تو میں شکر گزار رہوں گا۔"

روبینہ چھتری لے کر فراز کی گاڑی کی طرف آئی۔ اترنے سے پہلے اس نے مونا سے کہہ دیا تھا کہ وہ گاڑی میں رہے اور نیچے اترنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے شیشہ بجایا۔ فرح نے عورت کو دیکھ کر اپنی طرف سے شیشہ نیچے کیا۔

"ہیلو... میں روبینہ ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"درد ہو رہا ہے۔" فرح آہستہ سے بولی۔

روبینہ نے گہری نظروں سے اس کا معائنہ کیا۔ روبینہ نے اس سے کچھ سوال کیے اور اندازہ لگایا کہ اسے تخلیق کا درد شروع ہو گیا ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری تھا لیکن یہاں اسپتال کہاں تھا؟ اس نے واپس آ کر فراز کو صورتِ حال بتائی۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ "میرے خدا... اسپتال کیسے پہنچائیں؟"

"یہاں کوئی اسپتال نہیں ہے۔ ہمیں دارالحکومت تک جانا ہوگا۔" عرفان نے اسے بتایا۔

"اس موسم میں تم لوگوں کو نہیں نکلنا چاہیے تھا۔" روبینہ نے ملامت سے کہا۔

"مجبوری تھی۔" فراز نے انہیں بتایا کہ فرح کو درد قبل از وقت شروع ہوا ہے۔ "اب ہم کہاں پناہ لیں؟"

"یہاں سے کچھ دور ایک ویران سی عمارت ہے۔" عرفان نے بتایا۔ "ممکن ہے ہمیں وہاں پناہ مل سکے۔ لیکن وہاں تک جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت ہے۔"

"گاڑی میرے پاس ہے۔" فراز جلدی سے بولا۔ اسے اپنی بیوی کی فکر تھی۔ "آؤ چلیں۔"

طے ہوا کہ عرفان اور فراز جائیں گے۔ ظاہر ہے فرح بھی گاڑی میں رہتی جبکہ شاہین، روبینہ اور مونا یہاں گاڑی میں رہ کر انتظار کرتیں۔ عرفان ہچکچاتے ہوئے فراز کی گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔ فرح کی وجہ سے اسے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے عمارت کی نشان دہی کی۔ فراز نے سڑک سے اس راستے پر اترنے سے پہلے گاڑی روک کر اس کا معائنہ کیا۔ راستہ کوئی پچاس گز کا تھا اور مخدوش بھی لگ رہا تھا۔ مگر اس نے اللہ کا نام لے کر اپنی منی پجارو اس پر چڑھا دی اور اسے آہستہ سے چلانے لگا۔ بارش کے زور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ رینگ رینگ کر بالآخر اس نے گاڑی کو دوسری طرف پہنچا دیا۔ احاطے کے سامنے عمارت میں ایک برآمدہ بھی تھا اور عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عرفان، فراز کو رکنے کا کہہ کر گاڑی سے نکلا اور بھاگتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔

اس نے ٹارچ کی روشنی میں برآمدے کا معائنہ کیا۔ یہاں ایک بڑا سا داخلی دروازہ تھا اور اس کے دائیں بائیں محراب نما کھڑکیاں تھیں۔ دروازہ بند تھا اس پر ایک موٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ یہ تالا ثبوت تھا کہ عمارت بند ہے لیکن اس نے پھر بھی برآمدے سے اتر کر عمارت کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ یہ بڑے رقبے پر پھیلی عمارت تھی جس کے دائیں بائیں اور پیچھے کسی زمانے میں باغ تھا لیکن اب وہاں سوائے جھاڑ جھنکاڑ کے اور کچھ نہیں تھا۔ اطراف کی دیواریں بھی گر چکی تھیں۔ صرف سامنے کی احاطے والی دیوار برقرار تھی۔ پیچھے اور دائیں طرف بھی اندر جانے کے لیے دروازے تھے لیکن یہ بھی اندر سے بند تھے۔ کھڑکیوں پر فولادی سلاخیں تھیں۔ وہ واپس پلٹ کر آیا اور فراز سے کہا۔

"عمارت خالی ہے لیکن تالا توڑ کر اندر جا سکتے ہیں۔"

فراز ڈر گیا۔ "سوچ لو، کہیں پولیس کا معاملہ نہ بن جائے۔"

"کچھ نہیں ہوتا... یہ بتاؤ جیک ہے؟"

جیک گاڑی کے پچھلے حصے میں تھا۔ فراز نے اس کا لیور نکال کر دیا۔ عرفان نے اس کی مدد سے مرکزی دروازے کا تالا توڑ دیا۔ دروازہ مستقل بند ہونے کی وجہ سے جام ہو رہا تھا اور بڑی مشکل سے کھلا۔ عرفان نے اندازہ لگایا کہ آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے، ورنہ لوگ اس عمارت کی اینٹیں بھی نکال کر لے جا چکے ہوتے۔ اندر بدبو اور تاریکی تھی۔ یہ بڑا سا ہال نما کمرا تھا جس میں پڑا ہوا فرنیچر گل سڑ چکا تھا اور ہر طرف پرندوں کی بیٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پرندے روشن دانوں کی کھڑکیوں سے اندر آ جاتے تھے۔ یہ جگہ رہنے کے قابل تو نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ یہاں بارش اور سردی سے محفوظ رہتے۔ عرفان نے فراز سے کہا۔

"ہم یہاں رات گزار سکتے ہیں۔"

ٹارچ کی روشنی میں وہ اندر آئے۔ بڑے ہال نما کمرے کے سامنے والے حصے میں ایک بڑا کمرا تھا۔ اس کا دروازہ بند لیکن لاک نہیں تھا۔ کھولنے پر یہ ایک بیڈ روم ثابت ہوا۔ خوش قسمتی سے پرندے یہاں نہیں گھس سکے تھے اس لیے گرد تو تھی لیکن بیٹ نہیں تھی۔ عرفان نے بیڈ کی چادر جھاڑی تو منی بکھر گئی۔ موسم نم تھا اس لیے مٹی اڑنے کے بجائے فوراً ہی بیٹھ گئی۔ اب بیڈ صاف ستھرا تھا۔ فرح یہاں آرام سے لیٹ سکتی تھی۔ عرفان نے فراز سے کہا۔

"اپنی بیوی کو یہاں لے آؤ۔"

فراز باہر آیا اور اس نے سہارا دے کر فرح کو نیچے اتارا اور اندر لے آیا۔ وہ کراہ رہی تھی اور بڑی مشکل سے اندر تک آئی تھی۔ ناتجربہ کاری کے باوجود اسے احساس تھا کہ بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا ہے۔ عرفان دوسرے کمرے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے فراز سے کہا۔ "اب ان لوگوں کو لانا ہے۔"

"ایسا کرو... تم جا کر لے آؤ، میں یہیں رکتا ہوں۔" فراز نے اسے گاڑی کی چابی دی۔ عرفان نے اسے ٹارچ تھما دی۔

"میری واپسی تک تم یہاں روشنی کرنے یا آگ جلانے کی کوشش کرو۔"

عرفان باہر آیا اور گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ اس نے احتیاط سے پل نما حصہ عبور کیا اور سڑک پر آ گیا۔ روبینہ اور شاہین بے تابی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے گاڑی روکی، روبینہ چھتری لے کر باہر آ گئی۔ عرفان نے کہا۔ "جلدی سے گاڑی میں آ جاؤ، ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں۔"

روبینہ خوش ہو گئی۔ "کوئی ہے وہاں؟"

"نہیں... لیکن ہم نے عمارت کا لاک توڑ دیا ہے۔"

شاہین کار سے اتر کر گاڑی میں آ گئی۔ روبینہ نے پہلے مونا کو منتقل کیا اور پھر اپنی کار کی ڈکی کھول کر اس میں سے سوٹ کیس نکال لیا اور کار کو لاک کر دیا۔ سوٹ کیس میں اس کا اور مونا کا سامان تھا۔ وہ حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند منٹ بعد وہ حویلی میں تھے۔ فراز نے اس دوران میں سامنے والے کمرے سے کچھ خستہ حال فرنیچر توڑ کر اس کی لکڑی آتش دان میں ڈال کر آگ لگا دی تھی۔ یہاں بجلی نہیں تھی البتہ چند موم بتیاں مل گئی تھیں۔ ان سے روشنی ہو رہی تھی۔ ویسے ٹارچ کے علاوہ ان کے پاس موبائل بھی تھے جن میں ٹارچ تھی۔ یہاں آنے کے بعد سب اپنے موبائل چیک کر رہے تھے لیکن کسی پر سگنلز نہیں آ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر آئے، فراز روبینہ کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا۔

"پلیز! آپ فرح کو دیکھ لیں۔"

وہ اس کے لہجے سے سمجھ گئی تھی کہ کیا بات ہے۔ وہ اندر چلی گئی۔ شاہین نے زیرِ لب کہا۔ "کتنی بدبو ہے، دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

"اس ویرانے اور اس موسم میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی، اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔" عرفان نے خشک لہجے میں کہا۔

"ایسا کریں، آپ اندر چلی جائیں۔ یہ کمرا صاف ہے اور وہاں بدبو بھی نہیں ہے۔" فراز نے شاہین سے کہا تو وہ اندر چلی گئی۔ اس وقت ان میں سے کسی نے توجہ نہیں دی تھی کہ مونا کہاں ہے۔ عرفان نے کہا۔

"آؤ ذرا اس حویلی کو دیکھتے ہیں۔"

عرفان کے پاس ٹارچ تھی، فراز نے موم بتی اٹھا لی۔ وہ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ حویلی کوئی آدھے کنال پر پھیلی ہوئی تھی اور اس میں کم سے کم کوئی سات آٹھ کمرے تھے۔ سامنے والے ہال کے دائیں بائیں بھی دو خالی کمرے تھے۔ پھر وہ عقبی حصے کی طرف بڑھے وہاں قطار سے تین کمرے تھے اور ان میں سامان تھا لیکن سب برباد ہو چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ بیس تیس سال سے غیر آباد پڑی ہے۔ ایک بڑا سا کمرا شاید کبھی باورچی خانہ تھا لیکن اب وہاں سوائے چند برتنوں کے کچھ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایک کمرا تھا لیکن انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی جس کمرے میں فرح اور دوسری خواتین تھیں، اس کے برابر والے کمرے کی حالت بھی خاصی بہتر تھی۔ یہ شاید نشست گاہ تھی۔ یہاں فرش پر قالین اور صوفے تھے۔

"میرا خیال ہے، یہاں رکتے ہیں۔" عرفان نے کہا۔ "ہال میں تو بہت گندگی ہے۔"

فراز نے اس سے اتفاق کیا۔

☆☆☆

روبینہ فرح کو تسلی دے رہی تھی اور اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ اسے یہ پیاری سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ فرح کو ذرا سکون ملا تو اس نے ممنونیت سے کہا۔ "آپ بہت اچھی ہیں روبی باجی۔"

"تم بھی تو اتنی پیاری ہو۔" وہ بولی تو فرح شرما گئی۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟"

اس سوال پر روبینہ سنجیدہ ہو گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ "ہاں... چھ سال پہلے میرے شوہر کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔"

"اوہ... ریئلی سیڈ۔" فرح نے افسوس کیا۔ "کوئی بچہ ہے؟"

"ہاں، میری ایک سات سال کی بیٹی مونا ہے۔" روبینہ نے کہا۔ "میرے ساتھ ہی ہے۔"

"اچھا، میں نے دیکھا نہیں۔"

اس نے فرح سے کہا۔ "وہ میرے ساتھ ہی ہے، میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔"

"اسے وہاں کیوں چھوڑا ہے... ساتھ لے آئیں۔"

"خیال نہیں رہا۔" روبینہ بولی۔ "میں ابھی اسے لے کر

http://pakdigest.blogspot.com

آتی ہوں۔"

شاہین ان سے بے نیاز تھی اور اس نے ایک طرف پڑا کاؤچ صاف کرلیا تھا اور وہیں بیٹھی تھی۔ اس نے فرح کے پاس آنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ روبینہ باہر ہال میں آئی اور اس نے مونا کو آواز دی۔ "مونا! کیا کر رہی ہو....؟" وہ بولتے ہوئے رک گئی۔ اسے ہال میں مونا نظر نہیں آئی۔ اس نے گھبرا کر دوبارہ اسے آواز دی۔ اس بار بھی مونا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ اسے بلند آواز سے پکارنے لگی۔ "مونا.... تم کہاں ہو.... جواب دو.... مونا!"

مونا کی طرف سے جواب نہیں ملا لیکن فراز اور عرفان آگئے۔ انہوں نے پوچھا تو روبینہ نے.... روہانسے لہجے میں جواب دیا۔ "مونا.... یہاں نہیں ہے۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" عرفان بولا۔ "مجھے یاد ہے، وہ تمہارے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔"

"ہاں، اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر میں اندر چلی گئی۔" روبینہ رونے کے قریب ہو رہی تھی۔ "نہ جانے مونا کہاں ہے۔"

"نہیں کہیں ہوگی۔" فراز نے کہا۔ "آؤ اسے دیکھتے ہیں۔"

وہ دونوں [illegible] مونا کو تلاش کرنے لگے۔ وہ [illegible] آوازیں دے رہے تھے لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ روبینہ رونے لگی۔ "میرے خدا! مونا کہاں ہے.... ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے؟"

وہ مونا کو پوری حویلی میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ حویلی بڑی تھی لیکن بہت بڑی بھی نہیں تھی۔ دس پندرہ منٹ میں انہوں نے پوری حویلی چھان ماری۔ بچی کہیں نہیں تھی۔ اب ایک ہی صورت ہوسکتی تھی کہ وہ عمارت سے باہر نکل گئی ہو۔ اندر آتے ہوئے کسی کو داخلی دروازہ بند کرنے کا خیال نہیں آیا تھا اور وہ کھلا رہ گیا تھا۔

"شاید وہ کسی ضرورت سے باہر گئی ہو۔" عرفان نے کہا۔

"نہیں، وہ میرے بغیر کہیں نہیں جاتی اور اس جگہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ برآمدے میں نکل آئے۔ بارش اسی زور و شور سے جاری تھی اور بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ روبینہ چلا چلا کر مونا کو آوازیں دے رہی تھی کہ اچانک بجلی چمکی اور اسے برآمدے کے فرش پر کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور عرفان کو دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھو، یہ مونا کا ہیئر کلپ ہے۔"

خاصا مضبوط پکڑ والا ہیئر کلپ تھا اور آسانی سے بالوں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ان تینوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا کہ کوئی زبردستی مونا کو لے گیا ہے اور لے جانے کے دوران میں مزاحمت کرنے پر یہ کلپ اس کے بالوں سے نکل گیا۔

فراز نے عرفان سے کہا۔ "تم اسے یہاں بائیں طرف دیکھو، میں دائیں طرف دیکھتا ہوں۔"

"ایسا کرو تم چھتری لے لو۔" عرفان نے چھتری اس کی طرف بڑھا دی۔ "میں لیدر جیکٹ پہنا ہوا ہوں۔"

بارش سے خود کو بچاتے ہوئے وہ برآمدے سے نیچے اتر آئے اور مونا کو تلاش کرنے لگے۔ روبینہ برآمدے میں کھڑی رہی۔ وہ مونا کو آوازیں دے رہی تھی۔ عرفان حویلی کے دائیں طرف والے حصے میں آیا۔ یہاں کسی زمانے میں باغ ہوتا ہو گا۔ وہ حیران تھا کہ اس الگ تھلگ ٹیلے پر حویلی بنانے کا خیال کسے آیا ہوگا؟ یہاں تو کوئی آبادی بھی نہیں تھی اور ضروریات زندگی بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کوئی بہت دولت مند ہو جو جنگل میں منگل منا سکتا ہو اور اس نے یہ حویلی بنوائی ہو۔ سامنے کے رخ پر احاطے کی دیوار موجود تھی لیکن دائیں طرف کی ڈھلان کے ساتھ دیوار گر چکی تھی۔ زمین پر جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ یہ زیادہ بڑی تو نہیں تھیں لیکن ان میں مونا جیسی بچی آسانی سے چھپ سکتی تھی۔ عرفان کے پاس ٹارچ تھی۔ وہ اس کی مدد سے جھاڑیوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں یہ ساری جگہ بھی دیکھ لی۔ مونا یہاں نہیں تھی۔ اس طرف سے حویلی کے عقبی حصے میں جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ اسے جدا کرنے کے لیے ایک دیوار بنائی گئی تھی۔ شاید عقب میں حویلی کا اندرونی حصہ تھا اور یہ باغ شاید مہمان خانے کے ساتھ تھا اس لیے درمیان میں دیوار بنادی گئی تھی۔ عرفان واپس آیا۔ روبینہ انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا.... مونا ملی؟"

"نہیں، وہ یہاں نہیں ہے۔"

روبینہ پھر رونے لگی۔ "مونا کہاں چلی گئی؟"

"تم فکر مت کرو، وہ یہیں کہیں ہوگی۔ بچی ہے کسی وجہ سے باہر نکلی ہوگی اور راستہ بھٹک گئی ہوگی۔" عرفان نے اسے تسلی دی۔ "ایسا کرو تم اندر جاؤ۔ یہاں سردی اور تاریکی ہے۔"

"نہیں، میں یہیں رہوں گی۔"

"تم جاکر فراز کی بیوی کو دیکھو۔" عرفان نے کہا۔ "اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

روبینہ نہیں مان رہی تھی لیکن عرفان نے اسے سمجھا لیا۔ وہ

اندر چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد عرفان پچھلے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید بچی اس طرف آئی ہو اور کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو اس موسم میں اسے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔

اس دوران میں فراز حویلی کے بائیں حصے میں مونا کو تلاش کر رہا تھا۔ یہاں بھی بڑی جھاڑیاں تھیں اور وہ ان کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اس کے پاس موبائل کی ٹارچ تھی لیکن بجلی کے چمکنے سے ماحول صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مونا کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ چند منٹ میں اس نے یہ ساری جگہ دیکھ لی لیکن مونا اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ اب صرف عقبی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس طرف بڑھ گیا۔ حویلی کا عقبی صحن بہت بڑا نہیں تھا۔ یہ کوئی ستر فٹ چوڑا اور کوئی سو فٹ لمبا تھا۔ لمبائی حویلی کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس طرف عقب میں کمروں کی کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ فراز روشنی ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

یہاں جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں اس لیے اس نے چند منٹ میں سب جگہ دیکھ لی اور واپس جانے کے لیے مڑا تھا کہ اسے کسی کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی بچی چیخی ہو لیکن آواز واضح نہیں تھی۔ بارش کے شور میں یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ آواز حویلی کی طرف سے آئی تھی۔ وہ اسی طرف چلا آیا۔ جب عرفان نے [illegible] اسے بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔ وہ دیوار کے پاس آیا اور کان لگا کر سننے لگا لیکن آواز دوبارہ نہیں آئی۔ پھر وہ مایوس ہوکر جانے لگا تھا کہ اسے چیخ دوبارہ سنائی دی۔ اس بار آواز واضح تھی اور یوں لگا جیسے دیوار کے پیچھے سے آئی ہو۔ آواز بچی کی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خوف سے چلائی ہو۔ فراز نے محسوس کیا کہ آواز اوپر کمروں کے بجائے دیوار کی جڑ سے آئی تھی۔ وہ دیوار ٹٹولنے لگا۔ اچانک کوئی چیز اس کے ہاتھ میں آگئی۔

☆☆☆

ارشد اور اس کے ساتھی اس جگہ سے دور نکل آئے تھے جہاں ان پر حملہ ہوا تھا لیکن ارشد کو اطمینان نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ رحیم شاہ اس کے پیچھے آئے گا۔ یہ حملہ یقیناً مخبری کی بنا پر ہوا تھا اور ان کو معلوم تھا کہ ان کے پاس بھاری رقم ہے۔ وہ بار بار امیر علی سے تیز رفتاری سے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کی کوشش سے طاہر کا خون بہنا رک گیا تھا لیکن آدھے گھنٹے میں وہ بخار میں تپنے لگا تھا۔ گولیاں اس کے زخم میں تھیں اور ان کا زہر پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ بارش شروع ہوچکی تھی اور اس وقت تیز بارش کی وجہ سے سامنے حد نظر بہت کم رہ گئی تھی اس کے باوجود ارشد نے امیر علی کو رفتار تیز کرنے کو کہا۔

"اس سے زیادہ رفتار میں خطرہ ہے۔ یہاں سڑک بہت خراب ہے اور آگے کچھ نظر نہیں آرہا۔"

ارشد بھی یہ بات جانتا تھا۔ وہ اضطراری طور پر اسے ہدایات دے رہا تھا۔ جیپ پر اضافی طاقت ور لائٹس لگی تھیں لیکن ان کی روشنی بھی بارش کی وجہ سے زیادہ کارآمد نہیں تھی۔ پھر بھی عام ہیڈ لائٹس کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھا رہی تھیں۔ اچانک ارشد کو دائیں طرف سڑک کے ساتھ ایک گاڑی نظر آئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "امیر.... ذرا رکنا۔"

اس کے کہنے سے پہلے امیر علی بریک لگا چکا تھا۔ ارشد تیزی سے باہر نکلا اور سڑک عبور کرکے دوسری طرف آیا۔ یہاں ایک خالی گاڑی کھڑی تھی اور جہاں تک نظر کام کر رہی تھی، آس پاس بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ارشد نے پستول تھام رکھا تھا اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے گاڑی کا معائنہ کیا۔ اسے ڈینٹ نظر آگئے۔ گاڑی پر سامنے کے حصے پر ڈینٹ تھے۔ ارشد کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ گاڑی کسی دوسری گاڑی سے.... سامنے سے ٹکرائی ہے۔ لیکن دوسری گاڑی کہاں گئی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس گاڑی کے مسافر کہاں تھے؟

وہ واپس اپنی جیپ کی طرف آیا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے۔" [illegible] امیر علی نے کہا۔ ارشد [illegible] تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"ممکن ہے وہ کسی دوسری گاڑی میں یہاں سے چلے گئے ہوں۔" ارشد کہتے ہوئے عقب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور اس نے کسی گاڑی کی روشنیوں کو دور سڑک پر آتے دیکھا۔ اس کے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے جیپ میں گھس گیا۔ "چلو.... وہ آگئے ہیں۔"

امیر علی نے پوچھا نہیں کہ کون آگئے ہیں، وہ سمجھ گیا تھا۔ ان کے پیچھے موت کے فرشتے لگے تھے۔ اس نے جیپ آگے بڑھائی۔ ارشد مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ایک بار وہ سیدھا ہونے لگا تو بجلی چمکنے پر اس نے بائیں طرف ٹیلے پر بنے اس مکان کو دیکھ لیا۔ اس نے امیر علی سے کہا۔ "بائیں طرف ایک مکان ہے۔"

بجلی چمکی تو امیر علی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے جیپ اس طرف جانے والے راستے پر روک لی اور ارشد سے کہا۔ "راستہ خطرناک لگ رہا ہے۔"

بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور ماحول تقریباً روشن ہی تھا۔ امیر علی کی بات سن کر ارشد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"فکر مت کرو دوست... ہم یہاں اکیلے نہیں ہیں۔ مکان میں پہلے ہی کوئی ہے۔ ذرا غور سے دیکھو، وہاں ایک گاڑی نظر آ رہی ہے۔"

امیر علی نے دیکھا، واقعی ایک چھوٹی پجارو موجود تھی۔ جب وہ وہاں تک جا سکتی تھی تو ان کی جیپ بھی جا سکتی تھی۔ اس نے جیپ اس پل نما راستے پر موڑ دی اور احتیاط سے ڈرائیو کرنے لگا۔ ارشد خاموش تھا لیکن اس کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ مکان میں کون لوگ ہو سکتے ہیں اور کہیں وہ ان کے سامنے مزاحمت نہ کریں۔ پھر اسے تعاقب کرنے والوں کا خیال آیا۔ جس طرح انہیں یہ مکان نظر آ گیا تھا، اس طرح پیچھے آنے والوں کو بھی نظر آ سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ انہیں گھیر سکتے تھے۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر چیک کیا لیکن اس پر سگنلز نہیں تھے۔ ایک تو یہ علاقہ آبادی سے دور تھا اور دوسرے موسم بھی خراب تھا اس لیے سگنلز نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ابھی جیپ راستے میں تھی کہ امیر علی نے کہا۔

"ایک آدمی اس طرف آ رہا ہے۔"

ارشد نے سامنے دیکھا۔ ایک پیدل شخص ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے شاید جیپ کی روشنیاں دیکھ لی تھیں۔ امیر علی نے اس کے پاس پہنچ کر جیپ روک لی۔ آنے والا عرفان تھا۔ اس نے امیر علی کے پاس آ کر پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو؟"

"مسافر ہیں... ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہم خود مسافر ہیں۔" عرفان بولا۔ "میری گاڑی حادثے کے بعد کھائی میں گر چکی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ ہم نے اس عمارت میں پناہ لے رکھی ہے۔"

"تب ہم بھی پناہ لے سکتے ہیں۔" امیر علی نے کہا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ اس دوران میں ارشد نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ تعاقب میں آنے والے دشمنوں کو اس جگہ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگتا۔ جیسے ہی جیپ احاطے میں داخل ہوئی، اس نے امیر علی سے کہا۔

"سامنے مت روکنا... اسے بائیں طرف لے چلو۔"

امیر علی سمجھ گیا۔ اس جگہ سڑک سے ان کی جیپ نظر نہیں آتی۔ امیر علی کو ہدایت دے کر خود ارشد نیچے اتر آیا اور اس نے واپس آتے عرفان سے پوچھا۔ "یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"ایک آدمی کی ہے، وہ اندر ہے۔"

"اسے فوری طور پر یہاں سے ہٹاؤ۔" ارشد کا لہجہ حکمانہ ہو گیا۔

"کیوں؟" عرفان نے پوچھا۔

"سوال مت کرو۔" ارشد نے اس پر پستول تان لیا۔

"جو کہا ہے وہ کرو... جلدی۔"

عرفان ششدر رہ گیا۔ "تم کون ہو؟"

"ہم کوئی بھی ہیں لیکن ہمارے پیچھے جو لوگ آ رہے ہیں، وہ مسلح اور قاتل ہیں۔ اگر وہ یہاں آ گئے تو کسی کو نہیں چھوڑیں گے اس لیے گاڑی چھپا دو ورنہ یہ سڑک سے نظر آ گئی تو وہ سیدھے ادھر ہی آئیں گے۔"

عرفان کے پاس چابی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ انکار کر دے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس کا انکار بے سود ہے۔ دوسرے اسے ارشد کی بات سے خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ لوگ یقیناً خوف ناک ہوں گے جن سے ایک مسلح شخص ڈر رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ ارشد اس سے پہلے ہی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ عرفان نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے بائیں طرف کھڑی جیپ کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ارشد نے اس کی طرف دیکھا۔

"اندر کتنے لوگ ہیں؟"

"میرے علاوہ پانچ ہیں۔ دو مرد، تین عورتیں اور ایک بچی... لیکن بچی کہیں گم ہو گئی ہے، ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"ہم کون؟"

"میں اور میرا مرد ساتھی فراز۔"

ارشد چونکا ہو گیا۔ "فراز کہاں ہے؟"

"وہ عمارت کے دائیں طرف اور پیچھے دیکھنے گیا تھا۔ ممکن ہے اب تک اندر چلا گیا ہو۔" عرفان نے جواب دیا اور پھر بولا۔ "تم لوگ کون ہو اور ہم پر اسلحہ کیوں اٹھا رہے ہو؟"

"صرف حفاظت کے لیے تاکہ تم ہمارے لیے مسائل پیدا نہ کرو۔" ارشد بولا۔ "ویسے اگر تم نے کوئی مسئلہ نہ کیا تو کسی کو تکلیف نہیں ہوگی۔ اب اندر چلو۔"

ارشد عرفان کے ساتھ اندر آیا۔ ہال نما کمرے اور اس کے ساتھ والی نشست گاہ میں فراز نہیں تھا۔ عرفان نے اسے عورتوں والے کمرے میں جانے سے روکنے کی کوشش کی۔

"بات سنو، یہاں ایک حاملہ عورت ہے... اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔"

ارشد نے اس کی بات سنی اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے روبینہ بے تابی سے آئی۔ مونا کی پریشانی کے باوجود وہ فرح کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مونا مل گئی ہے لیکن ایک مسلح اجنبی کو دیکھ کر وہ جھجک گئی۔ ارشد اندر داخل ہوا۔ فرح بستر پر بے حال لیٹی تھی۔ روبینہ نے برہمی سے کہا۔ "تم کون ہو اور اس طرح اندر کیوں آ رہے ہو؟"

ارشد نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ "یہ بتانے کے

لیے کہ اب اس جگہ ہمارا قبضہ ہے، کوئی غلط حرکت مت کرنا۔"

روبینہ نے عرفان کی طرف دیکھا۔ "یہ کون ہے؟"

عرفان اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ کوئی جرائم پیشہ ہیں اور ان کے پیچھے دشمن لگے ہیں۔"

ارشد نے ان کی بات سن لی تھی لیکن کچھ کہا نہیں۔ اندر سے مطمئن ہو کر اس نے عرفان سے کہا۔ "آؤ... اسے باہر دیکھتے ہیں۔"

"عرفان! مونا ملی؟"

"نہیں، میں نے جہاں تک دیکھا ہے، وہ نہیں ہے۔" عرفان نے افسردگی سے کہا۔ "فراز دوسری طرف دیکھ رہا ہے۔"

فرح مسلح آدمی کو دیکھ کر خوف زدہ تھی۔ وہ شوہر کے ذکر پر تڑپ گئی۔ "فراز کہاں ہیں؟"

"وہ باہر ہے۔" عرفان نے کہا اور ارشد کے ساتھ باہر آ گیا۔

"ہمارے ساتھ ایک زخمی بھی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی طبی مدد دے سکتا ہے؟"

"ہم مسافر ہیں اور اس ویرانے میں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جس سے کسی کو طبی مدد دے سکیں۔ ویسے تمہارے ساتھی کو کیا ہوا ہے؟"

"گولیاں لگی ہیں۔" ارشد نے جواب دیا۔

عرفان نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے؟"

"ایک جگہ دشمن نے گھیر لیا تھا۔"

وہ جیپ تک آئے۔ امیر علی نے عقل مندی کی اور جیپ کی روشنیاں بجھا دیں۔ "سامان لے کر اندر جاؤ اور ہال میں رکنا۔" ارشد نے امیر علی سے کہا۔ "میں اسے لے کر آتا ہوں۔" اس نے ظاہر کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" امیر علی نے کہا اور جیپ سے اتر آیا۔ سامان سے مراد اسلحہ اور رقم کا بیگ تھا۔ ارشد عرفان کو لے کر سامنے کی طرف آیا۔

"وہ کس طرف گیا تھا؟"

"اس طرف۔" عرفان نے دائیں طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے فراز کو آواز دی۔ اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ ارشد اس کے پیچھے خاموشی سے چل رہا تھا۔ عرفان آواز دیتا ہوا عقبی باغ تک آ گیا لیکن فراز کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ اس نے آواز دی تھی۔ ارشد نے کہا۔

"یہ کیا چکر ہے... کیا وہ ہمیں دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہے؟"

"نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا اور تم نے اس کی بیوی کو تو دیکھا ہی ہے کوئی شوہر بیوی کو اس طرح سے چھوڑ کر جا سکتا ہے؟"

"تب وہ کہاں ہے؟" ارشد کے اس سوال کا عرفان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

فراز نے ہاتھ میں آنے والی چیز کو کھینچا تو فوراً ہی دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوا۔ دراصل یہ دروازہ ہی تھا لیکن وقت کی دھول نے اسے اور دیوار کو ایک جیسا کر دیا تھا اس لیے یہ نظر نہیں آیا پھر تاریکی بھی تھی اور بارش جاری تھی۔ فراز نے جس چیز کو کھینچا تھا، شاید وہ اس کا لٹو تھا۔ یہ دُہرے پٹ والا چھوٹا سا دروازہ تھا، مشکل سے دو بائی پانچ فٹ کا اور اس کے نچلے حصے میں کوئی فٹ بھر کی گھاس بھی اگی تھی۔ اندر سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں اور شاید یہ حویلی کا تہ خانہ یا اسٹور روم تھا جہاں سامان رکھا جاتا ہوگا۔ اندر کہیں روشنی تھی جو باہر تک آ رہی تھی۔

فراز اس طرح دروازہ نمودار ہونے پر ڈر سا گیا لیکن پھر ہمت کر کے اس نے اندر جھانکا۔ سیڑھیاں بچی پکی تھیں اور جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ اندر یقینی طور پر کوئی تھا۔ اسی لیے اسے بچی کے چلانے کی آواز آئی تو وہ بے اختیار اندر اتر گیا۔ وہ سیڑھیاں اترتے آیا۔ اس دوران میں ایک دفعہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ وہ نیچے پہنچا تو اس کے سامنے ایک بڑا سا تہ خانہ تھا جس کا فرش کچا تھا اور وہاں کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ سامنے کوئی نہیں تھا البتہ ایک طرف روشنی ہو رہی تھی۔ فراز اسی طرف بڑھا۔ اس بار اسے بچی کی آواز سنائی دی، وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ ایک بڑے سے بکس کے پیچھے فراز کو وہ شخص نظر آ گیا جو بچی کو رسی سے باندھ رہا تھا اور یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا کہ وہ سفلی انداز میں اس کے جسم پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ بچی رو رہی تھی۔ فراز جیک لیور سنبھال کر اس کی طرف بڑھا لیکن اس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ اسٹیل کا خالی گلاس تھا جو پُرشور انداز میں فرش پر لڑھکا اور وہ شخص ہوشیار ہو گیا۔ وہ شخص تڑپ کر پلٹا پھر اٹھ کر فراز کی طرف جھپٹا۔ فراز نے غیر ارادی طور پر جیک لیور گھمایا۔ وہ اس کے سر پر لگا۔ اس شخص کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ سر تھام کر نیچے گر گیا۔ فراز بچی کی طرف لپکا۔ اس نے مونا کو دیکھا نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ یہی مونا ہے۔ اسے آتے دیکھ کر وہ پھر خوف سے چلانے لگی۔

http://pakfunplace.blogspot.com

"آرام سے بیٹا۔" فراز اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔ اس نے جیک لیور زمین پر پھینک دیا تھا۔ زمین پر بے ہوش پڑے شخص نے سیاہ چوغہ نما لباس پہن رکھا تھا اور جیسے اور لمبے بالوں سے وہ کوئی ملنگ یا فقیر لگ رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے منحوس چہرے اور سفید بالوں کی وجہ سے عمر رسیدہ لگتا تھا۔ جیک لیور اچٹتا ہوا لگا تھا ورنہ اس کا سر کھل جاتا۔ اسی وجہ سے اسے جلد ہوش بھی آگیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اپنے فراز کی پشت دکھائی دی۔ وہ بچی کو کھولنے کے ساتھ اسے تسلی بھی دے رہا تھا۔ چوغہ پوش آہستہ سے اٹھا اور اس نے جیک لیور اٹھا لیا۔ اسے چکر آرہے تھے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ فراز کے پاس پہنچ کر اس نے جیک لیور گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس نے ہلکا وار کیا تھا۔ فراز بے ہوش ہو کر نیچے لڑھک گیا۔ مونا خوف سے چلانے لگی۔ چوغہ پوش نے جھپٹ کر اس کا منہ دبوچ لیا اور خوں خوار لہجے میں بولا۔

"چپ کر ورنہ گلا دبا دوں گا۔"

مونا سہم گئی۔ چوغہ پوش نے اس کا منہ چھوڑ دیا اور خود کلامی کی۔ "اوپر اور لوگ بھی آگئے ہیں۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف آیا تو اسے کسی کی آواز آئی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور اس نے پٹ اندر کی طرف کھینچ لیے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا لیکن باہر سے مزید کوئی آواز نہیں آئی تو وہ نیچے آگیا۔ مونا اسے دیکھتے ہی لرزنے لگی۔ اسے اس شخص سے بے انتہا ڈر لگ رہا تھا۔

☆☆☆

فرح کی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہو رہی تھی اور روبینہ اسے آرام دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ معاملہ رفتہ رفتہ خرابی کی طرف جا رہا ہے۔ فراز باہر تھا۔ روبینہ نے شاہین کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے ڈیلیوری ہونے والی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" شاہین نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"تم میری مدد کرو۔ ہمیں چند صاف کپڑوں اور کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"یہاں یہ سب چیزیں کہاں سے ملیں گی؟"

روبینہ چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔ "اچھا تم اس کے پاس بیٹھو، میں دیکھتی ہوں۔"

روبینہ کمرے سے باہر آئی۔ ہال میں مسلح شخص موجود تھا۔ روبینہ ایک لمحے کو ڈر گئی۔ "تم کون ہو؟"

امیر علی نے جواب دیا۔ "ہم بھی مسافر ہیں۔"

"مجھے کچھ صاف کپڑوں کی ضرورت ہے۔"

امیر علی نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہے اور کیا نہیں... تم خود دیکھ لو۔"

روبینہ ایک موم بتی لے کر دوسرے کمروں میں آئی۔ نشست گاہ میں کھڑکی پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا۔ یہ ویلوٹ کے بھاری اور صاف پردے تھے۔ اس نے انہیں کھینچ کر اتار لیا۔ یہ کام دے سکتے تھے۔ وہ انہیں لے کر کمرے میں آئی۔ اب اسے گرم پانی درکار تھا۔ پانی باہر بارش سے لیا جا سکتا تھا لیکن برتن کوئی نہیں تھا۔ وہ موم بتی لے کر برتن کی تلاش میں نکلی اور بالآخر اسے کچن سے دو بڑی پتیلیاں اور ایک ڈونگا مل گیا۔ وہ واپس کمرے میں آئی۔ فراز اور عرفان میں سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ فرح کو اپنے شوہر کی فکر بھی تھی۔

آتش دان میں آگ کم ہو رہی تھی۔ روبینہ نے ایک کرسی کو فرش پر مار کر توڑ دیا اور اس کے ٹکڑے آتش دان میں ڈال دیے۔ شاہین، فرح کے ساتھ بستر کے کنارے بیٹھی تھی لیکن اس نے اسے تسلی دینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ فرح بار بار اس سے شوہر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے کیا پتا... مجھے دوسروں کے شوہروں پر نظر رکھنے کی عادت نہیں ہے۔"

روبینہ نے محسوس کیا کہ یہ بات اس نے اسے کہی ہے۔ وہ مڑ کر بولی۔ "اگر تم کچھ کر نہیں سکتیں تو اپنی زبان بند رکھو۔"

شاہین بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ اس دوران میں آگ تیز ہو گئی تھی۔ اب پانی کی ضرورت تھی۔ وہ باہر آئی اور ہال میں موجود شخص کو بتایا کہ وہ پانی لینے جا رہی ہے۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ روبینہ نے برآمدے کے سامنے گرتے ایک پرنالے سے پانی لیا، واپس آکر اسے گرم ہونے کے لیے آتش دان میں آگ پر رکھ دیا اور شاہین سے کہا۔

"تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

لیکن شاہین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ جانے وہ کس قسم کی عورت تھی جو ایسے حالات میں بھی ہٹ دھرمی پر اتری ہوئی تھی۔ روبینہ نے محسوس کیا کہ اسے جو کرنا ہے، خود ہی کرنا ہے۔

☆☆☆

عرفان اور ارشد واپس عمارت کے دائیں طرف آئے۔

ارشد نے اپنی جیپ کا دروازہ کھولا۔ اس میں فرنٹ سیٹ پر اس کے ایک ساتھی کی لاش ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔ عرفان نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس نے ارشد سے کہا۔ "یہ یہیں پڑا رہے گا؟"

"تو کیا کریں؟" اس نے کہا۔ "فی الحال تو مجھے زندہ آدمی کی فکر ہے۔"

عرفان نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ اس نے طاہر کو دیکھا، وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ ارشد نے اس سے ٹارچ لے لی اور طاہر کو اٹھانے کو کہا۔ عرفان نے اسے باہر کھینچا اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ وہ اسے سہارا دے کر برآمدے تک لایا۔ وہ بھیگ گیا تھا۔ عرفان اور ارشد پہلے ہی پانی میں شرابور ہو رہے تھے۔ وہ طاہر کو اندر لے آئے اور اسے نشست گاہ میں صوفے پر لٹا دیا۔ اندر لاتے لاتے اس کی حالت بُری ہو گئی۔ پانی میں بھیگ کر اور سردی لگنے سے وہ کانپنے لگا تھا۔ ارشد نے امیر علی سے کہا۔

"ادھر کا آتش دان بھی جلاؤ۔"

امیر علی نے چند منٹ میں دو کرسیاں توڑ کر آتش دان میں ڈالیں اور انہیں آگ دکھا دی۔ کچھ دیر بعد لکڑیاں جلنے لگیں۔ کب سے خشک پڑی لکڑی نے لمحوں میں آگ پکڑی تھی۔ فراز کے بارے میں سوچتے ہوئے عرفان آگ تاپنے لگا۔ ارشد ہال کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بارش تسلسل کے ساتھ جاری تھی اور جب بجلی چمکتی تو عمارت کی طرف آنے والا راستہ صاف دکھائی دیتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رحیم شاہ تعاقب میں آگے نکل گیا ہے۔

اندر روبینہ اور شاہین نے باہر آہٹیں محسوس کر لی تھیں۔ عرفان کی آواز آئی تو روبینہ باہر نکل آئی۔ "شکر ہے تم آگئے ورنہ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ مونا کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" عرفان نے آہستہ سے کہا۔ "ہم ایک اور مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ فراز بھی غائب ہے۔"

"وہ کہاں گیا؟" روبینہ پریشان ہو گئی۔

"پتا نہیں لیکن ہم ہر جگہ دیکھ آئے ہیں۔" عرفان نے کہا۔ "مسز فراز کی طبیعت کیسی ہے؟"

روبینہ ہچکچائی۔ "میرا خیال ہے، وقت قریب ہے۔"

عرفان اس کی بات سمجھ گیا۔ "شاہین مدد کر رہی ہے؟"

روبینہ کو غصہ آگیا۔ "وہ بہت عجیب عورت ہے۔ اس نے میری مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

عرفان نے گہری سانس لی۔ "وہ ایسی ہی عورت ہے۔ خدا کا شکر ہے، میری اس سے جان چھوٹ گئی۔"

"کیا مطلب؟" روبینہ چونکی۔

"مطلب یہ کہ ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہم مجبوری میں ساتھ جا رہے تھے۔" عرفان نے کہا اور اسے آغا جی کی موت کے بارے میں بتایا۔ "ہماری علیحدگی کے صدمے نے ان کی جان لے لی لیکن اس عورت کو اپنے باپ کی موت کی پروا بھی نہیں ہے۔"

روبینہ کو نہ جانے کیوں یہ بات اچھی لگی کہ شاہین، عرفان کی بیوی نہیں رہی ہے۔ اسے عرفان سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بچے ہیں؟"

"ہاں، میرے دو بہت پیارے اور شریر بچے ہیں۔ بڑا چھ سال کا ہے اور چھوٹا ابھی چار سال کا ہے۔ وہ میرے پاس ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ دونوں میں پہلے ہی علیحدگی ہو چکی ہے؟"

"ہاں، ایک سال سے یہ الگ رو رہی ہے۔ اب تو اس نے جاب بھی کر لی ہے۔" عرفان نے کہا۔

روبینہ نے دوبارہ آنے والوں کے بارے میں پوچھا۔ "یہ لوگ کون ہیں؟"

عرفان بولا۔ "مجھے نہیں معلوم لیکن لگتا ہے یہ کہیں سے لڑ بھڑ کر آرہے ہیں۔ ان کی جیپ میں ایک لاش اور ایک زخمی ہے۔ زخمی کو ہم اندر لے آئے ہیں۔"

"میرے خدا... ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔" وہ پریشان ہو گئی۔

عرفان بھی فکر مند ہو گیا۔ "یہ مسلح ہیں اور ان کے عزائم ٹھیک نہیں۔"

روبینہ سہم گئی۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ ابھی مونا بھی نہیں ملی تھی۔ اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "لیکن مونا...؟"

"میں سڑک کی طرف جا رہا تھا لیکن یہ مل گئے اور پھر اپنے ساتھ لے آئے۔ پھر جانے نہیں دیا۔" عرفان بولا۔ "آس پاس تو ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ اس عمارت کو بھی پوری طرح دیکھ لیا ہے۔"

ارشد ان کی طرف آیا۔ اس نے عرفان سے کہا۔ "میرے ساتھی کو دیکھو، اسے بخار ہو رہا ہے۔"

"پلیز! میری بچی باہر کہیں ہے، ہمیں اسے تلاش کرنا ہے۔" روبینہ نے التجا کی۔

"ابھی کوئی باہر نہیں جائے گا۔" ارشد نے کہا۔ وہ جوان اور اچھے نقوش کا حامل تھا لیکن کرختگی نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی۔ "باہر خطرہ ہے۔ ہمارے دشمن یہاں تک آگئے تو کسی کو نہیں چھوڑیں گے اس لیے بچی اور فراز کے بجائے تم لوگ اپنی

http://pakistanipoint.blogspot.com

فکر کرو۔"

اندر فرح کو اپنی حالت سے زیادہ شوہر کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس نے آواز دے کر عرفان سے کہا۔ "فراز آپ کے ساتھ گئے تھے، وہ کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں ۔۔۔ میں اسے حویلی میں ہی چھوڑ گیا تھا۔" عرفان نے بتایا۔ "لیکن ابھی دیکھا تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ اس کی گاڑی بھی اپنی جگہ موجود ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ان لوگوں کو دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہے۔" شاہین نے کہا۔ فرح شاہین کی بات پر تڑپ گئی۔

"نہیں، وہ مجھے چھوڑ کر اس طرح چھپ نہیں سکتے۔"

"اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔" شاہین کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔

"شاہین۔" عرفان کو غصہ آ گیا۔ "بی ہیو یور سیلف۔"

"اس پر تم بھی غور کرو۔ آخر اس عورت سے اتنی بات کیوں کر رہے ہو؟" شاہین نے روبینہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کسی سے بھی بات کروں، تمہیں اس سے کیا؟" عرفان نے اسے یاد دلایا۔ "تم اب میری بیوی نہیں رہی ہو۔"

عرفان کے اس انکشاف پر شاہین کا چہرہ سفید ہو گیا اور وہ چپ چاپ پلٹ کر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ ارشد اور امیر علی ان کی گفتگو [illegible]

"کیا [illegible] تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے؟" [illegible] عرفان نے خشک لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم جانتے ہو کہ فراز کہاں ہے؟" ارشد نے شک سے کہا۔ "بہتر ہے تم اسے بتا دو ورنہ۔۔۔"

"یہ غلط ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟" عرفان بولا۔ "میں اسے یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ تم خود سوچو۔۔۔ جس شخص کی بیوی کا یہ حال ہو وہ اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے۔"

"اگر وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا تو پھر کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے ایک بار اسے پھر باہر دیکھتے ہیں۔" عرفان نے کہا تو ارشد اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس نے فراز کو آوازیں دیں اور اسے بتایا کہ اس کی بیوی کی حالت خراب ہے، وہ جلدی آئے لیکن کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ عرفان نے ارشد سے کہا۔ "مجھے یہ جگہ پراسرار لگ رہی ہے۔ یہاں کوئی چکر ہے۔ پہلے بچی مونا غائب ہوئی اور اب فراز غائب ہے۔ دونوں کسی صورت اپنی ماں اور بیوی کو چھوڑ کر کہیں دور نہیں جا سکتے۔"

ارشد بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس لیے فراز کی تلاش پر اصرار نہیں کیا اور اپنی جیپ تک آیا۔ اس سے اندر موجود مزید ہتھیار نکالے۔ ان میں چند عدد گرینیڈ بھی تھے۔ عرفان حیران ہوا۔ "تم لوگوں کے پاس تو خطرناک اسلحہ ہے پھر دشمن تم پر کیسے حاوی ہو گیا؟"

اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "وہ تعداد میں زیادہ تھے اور ہمیں موقع نہیں ملا ورنہ انہیں ختم کر دیتے۔"

اسی لمحے سڑک کی طرف سے روشنی نظر آئی۔ ارشد نے چونک کر دیکھا اور بولا۔ "جلدی اندر چلو۔"

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر آئے۔ ارشد نے داخلی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ایک گاڑی عمارت کی طرف آتی دکھائی دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ رحیم شاہ اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔ اس نے چلا کر امیر علی سے کہا۔ "وہ آ گئے ہیں۔"

امیر علی دوسری کھڑکی کی طرف لپکا۔ اس نے باہر جھانکا اور بولا۔ "وہی ہیں۔ اڑا دو ان کو۔۔۔"

"ایک منٹ۔" ارشد نے اسے روکا۔ "ممکن ہے یہ کوئی اور ہوں اور ہم بے گناہوں کو مار دیں۔"

"اور کون آ سکتا ہے؟" امیر علی نے بے تابی سے کہا۔

"جیسے یہ اور ہم آئے ہیں اسی طرح کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔"

ارشد کی دلیل پر امیر علی بادلِ ناخواستہ خاموش ہو گیا۔ [illegible] یہاں سے [illegible] معلوم نہیں ہو رہا۔"

"احتیاط ہے۔" ارشد بولا۔ عرفان بھی ہال میں موجود تھا۔ یہاں روشنی کے لیے امیر علی نے دو لکڑیاں جلا کر دیواروں میں موجود سوراخوں میں لگا دی تھیں۔ یہاں اب روشنی تھی۔ امیر علی باہر نکل گیا۔ وہ برآمدے میں نہیں رکا تھا بلکہ بھاگ کر احاطے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ آنے والی گاڑی پل نما راستے کے آغاز پر رکی ہوئی تھی اور اس میں سوار لوگ ہچکچا رہے تھے کہ اسے پار کریں یا نہ کریں۔ آخر ان میں سے ایک آدمی اترا اور پیدل پل نما راستے پر آ گیا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں اس کا معائنہ کر رہا تھا کہ اس پر سے گاڑی گزر سکتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ حویلی کی طرف آنے لگا۔ شاید اس نے کھڑکیوں سے جھلکتی روشنی دیکھ لی تھی۔ وہ ذرا آگے آیا تو امیر علی نے اس کے پاس رائفل دیکھ لی۔ اب شبہ نہیں رہا تھا۔ یہ رحیم شاہ کا آدمی تھا۔ امیر علی نے اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور اس پر گولی چلا دی۔ گولی لگتے ہی وہ شخص اچھلا اور زمین پر گرنے کے بعد اٹھ کر واپس بھاگا۔ لیکن امیر علی نے اسے زیادہ دور جانے نہیں دیا اور دوسری گولی نے اسے گرا دیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے

گاڑی کی طرف رائفل کا رخ کر کے پورا برسٹ چلا دیا۔

☆☆☆

رحیم شاہ کا آدمی پل نما راستے کے وسط میں پڑا تھا اور وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس نے پھرتی سے گاڑی کی لائٹس بجھاتے ہوئے اسے ریورس کرنا شروع کر دیا۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا اس لیے اس نے ریورس گیئر لگا رکھا تھا۔ دوسری طرف سے چلایا جانے والا برسٹ آ کر اس کی جیپ کے بونٹ پر لگا لیکن ونڈ شیلڈ اور انجن بچ گیا۔ رحیم شاہ غرایا۔

"لعنت ہو۔"

اس کے دو ساتھیوں نے عقبی کھڑکیوں سے رائفلیں باہر نکال کر جوابی فائرنگ کی لیکن ان کے سامنے کوئی نہیں تھا جسے وہ نشانہ بناتے۔ ان کا ایک ساتھی مارا جا چکا تھا لیکن ابھی اس کے ساتھ تین مسلح آدمی تھے۔ رحیم شاہ کا غصے سے برا حال تھا اور وہ ارشد کو گالیاں دے رہا تھا۔ اس نے پوری پلاننگ کے ساتھ اسے گھیرا تھا لیکن اس کی قسمت کہ وہ اس کا گھیرا توڑ کر نکل گیا تھا اور جاتے جاتے اس کے ساتھیوں کو موت کے حوالے کر گیا تھا۔ کھائی میں گرنے والی گاڑی میں سوار چار میں سے دو مر چکے تھے اور باقی دو بھی شدید زخمی تھے۔ ان کی گاڑی کے چاروں پہیے برسٹ تھے۔ کھائی میں گرنے والی گاڑی کے [illegible] رحیم شاہ کو [illegible] تو وہ اس کے بارے میں زبان کھول سکتے تھے۔ اب ایسا لگتا جیسے گاڑی حادثے کا شکار ہوئی اور اس میں سوار تمام افراد مارے گئے۔ زخمیوں کو بھی اس نے سر پر چوٹ لگا کر ہلاک کیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی خاموش رہے کیونکہ وہ بھیڑیوں کی سی سفاک فطرت رکھتے تھے جو اپنے ہی زخمی ساتھیوں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک زخمیوں سے جان چھڑا لینا بہتر تھا۔

اس وقت بھی انہیں مارے جانے والوں کی پروا نہیں تھی بلکہ رحیم شاہ پُرجوش ہو گیا تھا کہ وہ درست سمت میں آیا ہے۔ ارشد اور اس کے پاس موجود رقم بہت بڑی تھی۔ وہ ہر صورت اس رقم کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ برسٹ ہو جانے والے ٹائروں کو بدلنے میں ان کا بہت وقت ضائع ہوا۔ اوپر سے اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے بھی معاملہ خراب کر دیا لیکن اس نے پھر بھی تیزی دکھائی۔ راستے میں کھڑی گاڑی نے رحیم کو متوجہ کیا۔ وہ وہاں رکے اور پھر انہیں یہ حویلی نظر آ گئی۔ رحیم شاہ نے اسے چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب ثابت ہو گیا تھا کہ ارشد اور اس کے ساتھی اسی حویلی میں ہیں۔ ورنہ کوئی اور ان پر حملہ کیوں کرتا۔ رحیم گاڑی سڑک تک لے آیا اور اب وہ یہاں سے حویلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی کے آثار تھے پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "خون بہانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھی بھی اسی کی طرح تھے، یہ سن کر ان کے چہرے کھل اٹھے۔

☆☆☆

عرفان چلا اٹھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

ارشد نے کھڑکی سے پل کے پار کھڑی گاڑی کی طرف فائر کیا لیکن اس کی آواز امیر علی کے چلائے برسٹ میں دب گئی۔ ارشد نے مڑے بغیر کہا۔ "خاموش رہو اور اندر جاؤ۔ میرے دشمن یہاں آ گئے ہیں۔"

عورتوں والے کمرے سے روبینہ بوکھلا کر نکلی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

عرفان اس کی طرف آیا۔ "باہر ان لوگوں کے دشمن آ گئے ہیں۔ اب خدا خیر کرے۔"

اسی دوران میں امیر علی بھاگ کر اندر آیا۔ ارشد نے داخلی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کمرے کے اندر سے فرح درد سے کراہ رہی تھی۔

[illegible]

عرفان [illegible] اپنی حفاظت میں رہے۔"

روبینہ کا چہرہ اتر گیا۔ عرفان کی بات کا مطلب یہی تھا کہ مونا کی تلاش کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہا۔ "میری بچی نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں خود جا کر اسے تلاش کروں گی۔"

"فی الحال کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" ارشد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے تمہیں صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" عرفان نے اسے سمجھایا۔ "باہر ان کے دشمن ہیں اور جو بھی باہر نکلے گا، وہ اسے شوٹ کر دیں گے۔"

صوفے پر لیٹا جابر کسی قدر ہوش میں آ گیا۔ وہ نیم دراز تھا اور آگے کی طرف جھکا ہوا جھول رہا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں سے تکلیف اور نقاہت جھلک رہی تھی۔ امیر علی اندر آیا اور جابر کو شانوں سے تھام کر لٹا دیا۔ حرکت کرنے سے اس کے زخموں سے دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ اسے لٹا کر امیر علی دوبارہ باہر چلا گیا۔ اس نے ارشد سے کہا۔ "وہ کم سے کم تین ہیں۔ میں نے پیچھے سے دو

http://pakfunplace.blogspot.com

آدمیوں کو فائرنگ کرتے دیکھا ہے۔"

"بندوں کا مسئلہ نہیں ہے۔" ارشد نے تشویش سے کہا۔ "رحیم شاہ کے پاس خطرناک ہتھیار بھی ہیں۔"

امیر علی بھی فکرمند ہو گیا۔ "تمہارا مطلب ہے راکٹ لانچر؟"

"ہاں۔" ارشد نے کہا۔ "ہم اندر کا معائنہ کریں گے۔ امیر... تم یہاں رہو اور عرفان... تم میرے ساتھ آؤ۔ اس حویلی میں آمد و رفت کے اور کتنے راستے ہیں، یہ دیکھنا ضروری ہے۔"

ارشد پوری احتیاط سے کمرے دیکھ رہا تھا۔ ارشد دروازہ کھولتا اور پہلے عرفان سے اندر ٹارچ سے روشنی ڈالنے کو کہتا پھر اس کے پیچھے سے اندر دیکھتا اور جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ کمرا خالی ہے تو وہ اگلے کمرے کی طرف بڑھتا۔ حویلی بہت بڑی تھی اور اس میں کم سے کم بھی آٹھ نو بڑے کمرے تھے۔ البتہ انہوں نے عورتوں والے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا۔ شروع کے کمرے خالی اور گرد و غبار سے اٹے پڑے تھے، بعض میں کچھ کاٹھ کباڑ بھی تھا لیکن یہ بھی برسوں سے ایسے ہی پڑا تھا اور اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ہر کمرے میں کھڑکی تھی اور بعض کے پٹ غائب تھے لیکن سب پر موٹی سلاخیں موجود تھیں۔ وہ عورتوں والے کمرے سے آگے نکلے۔ عرفان نے پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو؟"

"یہ جاننا تمہارے لیے بے کار ہے۔" ارشد نے رکھائی سے کہا۔

"تمہارے پیچھے دشمن کیوں ہیں؟" عرفان نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر کہا۔ "ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہیں تمہارے چکر میں ہم لوگ نہ مارے جائیں۔"

"دشمن یہاں آچکا ہے اور تم اس کے بارے میں جان بھی جاؤ تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" ارشد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

وہ آخری حصے میں ایک کمرے کی طرف آئے تو اس کا دروازہ لاک تھا۔ عرفان نے اسے کھولنے کی ناکام کوشش کی۔

"یہ لاک ہے۔"

"پیچھے ہٹو۔" ارشد بولا اور لاک پر پستول کی نال رکھ کر فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز راہداری میں گونج کر رہ گئی۔ دروازہ کھل گیا۔

ارشد نے کمرے میں روشنی ڈالی۔ کمرا لکڑی کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا اور اس نے جیب سے چاقو نکال کر ایک پیٹی کا ڈھکن ہٹایا تو دنگ رہ گیا۔ اندر اعلیٰ درجے کی غیر ملکی ساختہ مشین گنیں سلیقے سے پیک رکھی تھیں۔ اسلحے کو اس سے زیادہ اور کون شناخت کر سکتا تھا۔ وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ ایک مغربی ملک کی بنی مشین گنیں ہیں اور ایک مشین گن کی قیمت کم سے کم دس لاکھ روپے تھی۔ عرفان بھی دم بخود رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس خستہ حال اور ویران نظر آنے والی عمارت میں اتنا جدید اور بیش قیمت اسلحہ بھی ہو سکتا ہے۔ ارشد نے مضطرب ہو کر دوسری پیٹی کھولی۔ اس میں بھی اسی ملک کی بنی خودکار رائفلیں تھیں۔

عرفان نے مضطرب انداز میں کہا۔ "اتنا خطرناک اسلحہ..."

ارشد پیٹیاں کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ کسی میں پستول رکھے تھے اور کسی میں ایمونیشن... کسی میں ہینڈ گرینیڈ اور کسی میں بارودی سرنگیں تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں اتنا قیمتی اسلحہ تھا اور اس جگہ کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ آسانی سے یہاں دندناتے پھر رہے تھے۔ ارشد اسلحہ دیکھ دیکھ کر پُرجوش ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک پیٹی میں کوئی دس مشین گنیں ہیں۔ یعنی ایک ہی پیٹی کی مالیت ایک کروڑ روپے تھی اور یہاں اسلحے کی کم سے کم سو پیٹیاں تھیں۔ لیکن عرفان کا انداز مختلف تھا۔ اس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "یہ سب بہت خطرناک اسلحہ ہے اور یقیناً دہشت گردی کے لیے یہاں رکھا گیا ہے۔"

ارشد نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ بھی اسی میدان کا کھلاڑی ہے اور اس کے ہاتھ ایک بہت بڑا خزانہ لگ گیا ہے۔ وہ شکر ادا کر رہا تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولی کسی جگہ بارود میں نہیں لگی ورنہ یہ پوری حویلی اڑ جاتی۔ اس نے عرفان سے کہا۔ "یہاں سے نکلو... اسے بعد میں دیکھیں گے۔ فی الحال تو مجھے دشمنوں سے نمٹنا ہے۔"

☆☆☆

وہ پکی عمر کا لیکن کرخت صورت شخص تھا۔ اس کا جسم دبلا اور مضبوط تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹ کے باوجود اس کے دم خم میں کمی نہیں آئی تھی اور اس نے نفرت سے بے ہوش فراز کی طرف دیکھا۔ مونا اسے ڈری ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ مکروہ انداز میں مسکرایا۔ "فکر نہ کر... پہلے باہر والوں کو دیکھ لوں پھر تجھے بھی دیکھتا ہوں چڑیا۔"

اس نے بے ہوش فراز کے ہاتھ پیر باندھ دیے اور پھر مونا کو بھی باندھ کر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ وہ اس کے گال پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر تیزی سے ایک ڈھلان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک لمحے کو ڈھلان کے کنارے رکا اور پھر اس میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

عرفان کو خیال آیا کہ ان میں سے کسی کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے لیکن ان حالات میں کسی کو کھانے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک مشکل میں پڑ رہے تھے۔ گاڑیوں کے تصادم اور اس کی گاڑی کھائی میں گرنے کے بعد پھر فراز اور اس کی حاملہ بیوی آئے۔ مونا غائب ہوئی اور اب فراز بھی غائب تھا۔ عرفان سوچ رہا تھا کہ اس عمارت میں کوئی اور بھی ہے جو سامنے نہیں آ رہا اور ان کو ایک ایک کر کے غائب کر رہا ہے۔ اسلحے کا یہ بہت بڑا ذخیرہ بتا رہا تھا کہ اس جگہ بہت خطرناک لوگوں کا ٹھکانا بھی ہے۔ وہ واپس ہال میں آئے تو کھڑکی سے نگرانی کرتے امیر علی نے طاہر کے بارے میں کہا۔

"اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"ابھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" ارشد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اب ربی کی کراہیں چیخوں میں بدل گئی تھیں۔ روبینہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی چیخیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد روبینہ نے دروازہ کھولا اور عرفان سے کہا۔ "پانی چاہیے۔"

"پانی کہاں سے لے گا؟"

"میں باہر بارش کا پانی لائی تھی لیکن وہ کم پڑ رہا ہے۔"

"تم برتن دو، میں لاتا ہوں۔" عرفان نے کہا۔ روبینہ نے اسے پتیلی تھما دی اور وہ باہر کی طرف بڑھا تھا کہ ارشد نے روک دیا۔

"باہر خطرہ ہے۔"

"پانی چاہیے۔" عرفان نے اصرار کیا۔

"نہیں اور سے لے لو۔ باہر نکلے تو وہ شوٹ کر دیں گے۔"

عرفان نے سوچا پھر برابر والے خالی کمرے میں آیا اور کھڑکی کے ٹوٹے پٹ سے باہر پتیلی نکال کر بارش کے پانی سے بھرنے لگا۔ اس کام میں اسے دس منٹ لگے۔ اس نے پتیلی روبینہ کو دی اور نشست گاہ میں آگیا۔ ارشد اور امیر علی کھڑکیوں سے باہر کی نگرانی کر رہے تھے۔ عرفان نے صوفے پر سے سدھ پڑے اس نوجوان کی طرف دیکھا جس کی عمر شاید بیس بائیس سال تھی اور وہ رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس سردی میں بھی پسینے میں شرابور اور تپتا ہوا لگ رہا تھا۔ عرفان باہر آیا اور ارشد سے کہا۔ "شاید اس کے جسم میں گولیوں کا زہر پھیل رہا ہے۔ گولیاں نکالنا ہوں گی۔"

"یہاں کیسے نکالیں؟" اس نے کہا۔

"کوشش تو کر سکتے ہیں۔" عرفان نے کہا۔ "مجھے فرسٹ ایڈ آتی ہے۔ کیا تم مجھے اپنا چاقو دے سکتے ہو؟"

ارشد نے سوچا اور اپنا چاقو اس کی طرف بڑھا دیا۔

مجبوری

ایک شخص نے عمدہ سا کپڑا خریدا اور سوٹ سلوانے کی غرض سے ایک درزی کے پاس گیا۔ درزی نے کپڑا ناپا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کپڑا کم ہے، اس کا ایک سوٹ نہیں بن سکتا۔"

وہ دوسرے درزی کے پاس چلا گیا۔ اس نے ناپ لینے کے بعد کہا۔ "آپ دس دن بعد سوٹ لے جائیے۔"

وقتِ مقررہ پر وہ درزی کے پاس پہنچ گیا۔ سوٹ تیار تھا۔ ابھی سلائی کے پیسے ادا کر رہا تھا کہ دکان میں درزی کا پانچ سالہ لڑکا داخل ہوا۔ اس شخص نے دیکھا کہ لڑکے نے بالکل اسی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

تھوڑی سی بحث کے بعد درزی نے اقرار کر لیا۔ اب وہ شخص پہلے درزی کے پاس گیا اور جھگڑتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کپڑا کم ہے لیکن تمہارے حریف نے اسی کپڑے سے میرا اور اپنے لڑکے کا بھی سوٹ بنا لیا۔"

درزی صبر و تحمل سے سنتا رہا پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "لڑکے کی عمر کیا ہے؟"

"پانچ سال۔"

درزی چہک کر بولا۔ "میں بھی کہوں وجہ کیا ہے۔ جناب! میرے لڑکے کی عمر اٹھارہ سال ہے۔"

یوسف عزیز... کراچی

http://pakfunplace.blogspot.com

عرفان نے اس سے کہا۔ ”مجھے ایک آدمی کی مدد کی ضرورت ہے۔“

ارشد نے امیر علی سے کہا تو وہ اس کے ساتھ آ گیا۔ عرفان نے عورتوں والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ روبینہ نے دروازہ کھولا۔ عرفان نے کہا۔ ”اگر کوئی اضافی برتن ہے تو دے دو۔“

روبینہ نے اسے دوسری پتیلی دے دی۔ عرفان نے اس میں بھی بارش کا پانی بھرا اور اسے تشت گاہ والے آتش دان میں رکھ کر گرم ہونے کے لیے رکھ دیا اور جب پانی کھول گیا تو اس نے امیر علی سے کہا۔ ”اس کی قمیص اتارنے میں میری مدد کرو۔“

ان دونوں نے مل کر طاہر کی قمیص اتاری۔ اندر اس کا جسم خون سے تر تھا اور یہ خون جم گیا تھا۔ عرفان نے پہلے بھیگے رومال سے اس کا جسم صاف کیا پھر اس کے زخم صاف کیے۔ طاہر کے زخموں پر گرم پانی لگا تو وہ غشی میں بھی تڑپ گیا۔ امیر علی نے اسے پکڑ لیا اور عرفان اس کے زخم صاف کرتا رہا۔ ایک بار پانی گندا ہونے پر اس نے دوبارہ پانی بھر کر اسے گرم ہونے کے لیے رکھا۔ اس دوران میں اس نے چاقو کی نوک کو بھی خوب گرم کر کے جراثیم سے پاک کر لیا تھا۔ اس نے چاقو لیا اور امیر علی سے کہا۔

”اب اسے مضبوطی سے پکڑنا۔“

پہلے عرفان نے شانے والے زخم سے گولی نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چاقو کی نوک سے زخم کریدا تو نوجوان تڑپ کر رہ گیا مگر امیر علی نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ عرفان نے اس کے تڑپنے کی پروا کیے بغیر چاقو کی نوک زخم میں داخل کر دی اور گولی تلاش کرنے لگا۔ گولیاں لڑکے کے جسم میں اترنے سے پہلے گاڑی کے دروازے کی فولادی چادر میں سے گزری تھیں اس لیے ان کا زور کم ہو گیا تھا اور وہ اس کے جسم میں زیادہ گہرائی میں نہیں اتر سکی تھیں۔ عرفان کو یہ گولی فوراً ہی مل گئی اور اس نے چاقو کی نوک کی مدد سے اسے باہر نکال لیا۔ خون پھر بہنے لگا تھا لیکن اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ لڑکے کا خون روکنے کے لیے عرفان نے اسی کی شرٹ استعمال کی۔ جب اس زخم سے خون کسی قدر رک گیا تو اس نے دوسرے زخم کی طرف توجہ دی۔ اس دوران میں لڑکا تکلیف سے بے ہوش ہو گیا تھا مگر عرفان نے امیر علی سے کہا۔

”اسے چھوڑنا مت، پکڑے رکھنا۔“

اس نے چاقو صاف کر کے دوبارہ گرم کیا اور پھر رومال سے پسلی کا زخم صاف کرنے لگا۔ یہاں گولی سامنے تھی اور پسلی کی ہڈی میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے نکالنا آسان کام نہیں تھا اور امکان تھا کہ اسے نکالنے کی کوشش میں پسلی کی ہڈی ٹوٹ جائے گی لیکن گولی نکالنا زیادہ ضروری تھا، ورنہ اس کا زہر پھیلنا شروع ہو جاتا تو لڑکا چند گھنٹوں میں بھی مر سکتا تھا جبکہ گولی نکلنے کے بعد اس کے بچ جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ عرفان نے چاقو کی نوک سے گولی کو ہلایا تو لڑکا بے ہوشی میں بھی اتنے زور سے تڑپا کہ امیر علی کی گرفت سے نکل گیا... عرفان تیز لہجے میں بولا۔

”میں نے کہا ہے نا کہ اسے مضبوطی سے پکڑو۔“

”یہ بہت جاندار ہے۔“ امیر علی نے ندامت سے کہا اور اسے دوبارہ پکڑ لیا۔ اس بار عرفان نے کوشش کر کے گولی ایک جھٹکے سے نکال دی مگر گولی نکالنے کے دوران پسلی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ لڑکا تڑپنے اور کراہنے لگا۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا، بہرحال گولی نکل چکی تھی۔ ارشد ظاہر کی آوازیں سن کر اندر آیا اور جب اسے پتا چلا کہ اس کی گولیاں نکل چکی ہیں تو اس نے عرفان سے کہا۔ ”اب اس کے زخم داغ دو۔“

خود عرفان بھی یہی سوچ رہا تھا۔ یہاں کسی قسم کی اینٹی بایوٹک ملنا ناممکن تھی اور زخموں میں گولی نکالنے کے باوجود زہر پھیلنے کا امکان تھا۔ اس نے چاقو آتش دان پر گرم کرنا شروع کر دیا۔ پھر اسے پوری طرح تپا کر اس نے پہلے لڑکے کے شانے والے زخم کو داغا۔ اس بار ارشد بھی مدد کے لیے آ گیا تھا اور انہوں نے لڑکے کو جھٹنے نہیں دیا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ پسلی والا زخم داغنے پر اس نے چیخ ماری۔ عین اسی لمحے ایک چیخ بند کمرے کے اندر سے بھی سنائی دی۔

☆☆☆

فراز کو لگا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور دائیں کنپٹی سے خون نکل رہا تھا لیکن وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کا جسم جیسے سن ہو رہا تھا۔ آواز برابر آ رہی تھی لیکن یہ عجیب سی آواز تھی۔ پھر وہ چونکا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ بندھا پڑا ہے اور وہ شخص غائب ہے جس پر اس نے وار کیا تھا۔ آواز دوبارہ آئی تو فراز نے سر گھما کر دیکھا۔ ذرا دور مونا بھی بندھی پڑی تھی۔ اس کا منہ بھی بندھا تھا اور وہ ناک سے آوازیں نکال رہی تھی۔ اسے لگا جیسے بچی اس سے کہہ رہی ہو۔ ”انکل! مجھے کھولیں... مجھے درد ہو رہا ہے... مجھے کھولیں۔“

مگر فراز تو خود بندھا ہوا تھا، اسے کہاں سے کھولتا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ کوئی نصف یا پون گھنٹے سے بے ہوش تھا۔ اچانک اسے فائر کی دبی دبی سی آواز سنائی دی اور اسے لگا جیسے

یہ آواز بالکل تہ خانے کی چھت کے اوپر والے کمرے سے آئی ہو۔ اس کا دل رکنے لگا، اوپر فائر کس پر ہوا تھا؟ وہاں اس کی بیوی بھی تھی اور ہونے والا بچہ بھی۔ اس نے..... رسی کھولنے کی کوشش کی لیکن اس ظالم آدمی نے بہت سختی سے باندھا تھا اور رسی کی وجہ سے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ فراز نے کمرے میں کوئی چیز تلاش کی جس سے وہ رسی کو کاٹ سکتا لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ زمین سرد تھی اور اس کا جسم سن ہو گیا تھا لیکن وہ کوشش کر کے اٹھ بیٹھا۔ یہ تہ خانے کا آخری حصہ تھا اور یہاں ایک تیل سے جلنے والا لیمپ روشن تھا لیکن وہ دیوار میں لگا تھا، یعنی اس کی رسائی سے دور تھا۔ یہاں کاٹھ کباڑ تو بہت تھا مگر اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جس سے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی رسی کاٹ سکتا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ آدمی کہاں گیا تھا اور کب واپس آئے گا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ وہ بہت ذلیل آدمی تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اسے اور مونا کو قتل بھی کر سکتا تھا اور اس کے سامنے مونا کو... وہ سوچ کر لرز گیا۔ وہ ابھی باپ نہیں بنا تھا لیکن اسے ابھی سے اپنی ہونے والی اولاد سے بے پناہ محبت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی طرح روبینہ کو بھی اپنی بچی سے بہت محبت ہو گی اور اسے کوئی نقصان پہنچے، اسے برداشت نہیں ہو گا۔ لیکن یہاں وہ اور مونا ایک درندہ صفت آدمی کے قبضے میں تھے۔ اوپر موجود لوگوں کو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اسی حویلی کے ایک حصے میں قید ہیں۔

اس نے ایک نظر مونا کو دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا... وہ اس پھول سی بچی کو اس آدمی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو آزاد کرے، تب ہی وہ بچی کو بچا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اس لیے وہ آسانی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس نے کوشش کی اور پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ البتہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ کھڑے ہو کر اسے آس پاس کی چیزیں بہتر طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ تب اس کی نظر دیوار پر لگے ایک آئینے کے نیچے رکھے شیونگ بکس پر گئی۔ اسے خیال آیا کہ اس میں بلیڈ ضرور ہو گا۔ وہ اچھل اچھل کر دیوار کی طرف بڑھا تو پہلی کوشش میں لڑھک گیا۔ زمین پر گرنے سے اسے چوٹ لگی لیکن وہ ہمت کر کے پھر اٹھ گیا۔ اس بار وہ بغیر گرے دیوار تک پہنچ گیا اور اس نے سر کی مدد سے شیونگ بکس نیچے گرا دیا۔ وہ نیچے گرتے ہی کھل گیا تھا اور یوں فراز کا کام آسان ہو گیا۔ اس میں سے ایک بلیڈ کا پیکٹ باہر گرا۔ وہ نیچے بیٹھا اور اس نے انگلیوں سے پیکٹ اٹھا لیا۔ اب اس میں سے بلیڈ نکالنا تھا اور یہ خاصا مشکل کام تھا۔

بلیڈ باہر آیا تو اسے موزوں انداز میں پکڑنا کہ صرف رسی کٹے، اس کی کلائی نہ کٹ جائے اور بھی مشکل ثابت ہوا۔ کوشش کے باوجود اس کی کلائی کو کئی چرکے برداشت کرنا پڑے لیکن بالآخر ایک رسی کٹ گئی اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ اس نے باقی رسی ایک منٹ میں کاٹ دی اور پھر مونا کے ہاتھ پیروں سے بندھی رسی بھی کاٹ دی۔ مونا کے منہ سے ٹیپ اتارتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

”آواز مت نکالنا۔“

مونا نے سر ہلایا تو فراز نے پہلے تہ خانے کا جائزہ لیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ شخص وہاں نہیں تو وہ واپس مونا کے پاس آیا۔ ”بیٹا... آپ یہاں کیسے آئیں؟“

”یہ گندا آدمی مجھے اٹھا کر لے آیا ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ ”میں دروازے کے پاس کھڑی تھی، اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے اٹھا کر لے آیا۔ پھر اس نے مجھے باندھ دیا۔ انکل! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میری ماما کہاں ہیں؟“

”وہ بھی یہیں ہیں۔“

”مجھے ان کے پاس لے چلیں۔“ اس نے التجا کی۔

فراز خود بھی جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے روبینہ کے فرح کا خیال آ رہا تھا کہ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے وہی راستہ نظر آ گیا۔ اس نے راڈ اٹھا لی اور مونا کا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا لیکن جب وہ سیڑھیوں کے اوپر والے حصے میں پہنچا، اسے باہر سے تیز فائرنگ کی آواز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی آتشیں ہتھیاروں کے دہانے کھل گئے ہوں۔ اس کے منہ سے نکلا۔ ”میرے خدا... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

☆☆☆

روبینہ مسکرا رہی تھی جبکہ سرد ترین موسم کے باوجود پسینے میں شرابور فرح بھی مسکرا رہی تھی۔ اس کا ننھا سا بیٹا صاف کپڑے میں لپٹا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ روبینہ بہت مشکل مرحلے سے گزری تھی۔ اس نے پہلے کبھی یہ کام نہیں کیا تھا۔ ہاں خود اسے ماں بننے کا تجربہ تھا جو آج اس کے کام آیا تھا۔ شاہین شروع میں تو لاتعلق رہی لیکن پھر اس کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ بھی روبینہ کی مدد کرنے لگی اور انہوں نے مل کر یہ مشکل مرحلہ سر کر لیا۔ بچے کے بعد وہ فرح کی طرف متوجہ ہوئیں اور اسے صاف کر کے روبینہ نے اپنا ایک گرم سوٹ پہنایا۔ گندے اور آلودہ کپڑے اس نے کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیے تھے۔ شاہین بچے کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے بچے کو فرح کے حوالے

http://pakfunplace.blogspot.com

کیا تو وہ اسے فیڈ کرانے لگی۔ اسے اپنے بچے سے پیار کرتے دیکھ کر روبینہ کو مونا کا خیال آیا کہ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ وہ تڑپ گئی اور اس نے دل سے دعا کی۔

"یا اللہ... میری بچی کو سلامت رکھنا۔"

وہ کمرے سے باہر آئی اور عرفان سے کہا۔ "بیٹا ہوا ہے اور شکر ہے ماں بیٹا دونوں ٹھیک ہیں۔ فراز کا پتا چلا؟"

"نہیں۔" عرفان نے جواب دیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے خون صاف کر رہا تھا۔ انہوں نے آپریشن مکمل کر کے لڑکے کو اس کی جیکٹ پہنا دی تھی کیونکہ قمیص تو بالکل خراب ہو گئی تھی اور گرمائش کے لیے صوفہ آتش دان کے قریب کر دیا تھا۔ وہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ روبینہ نے کہا۔

"کھانے کو کچھ ہے؟ فرح کو خوراک چاہیے۔"

"یہاں کھانے کو کیا ملے گا۔" عرفان نے کہا۔ "باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"سوٹ کیس میں مونا کی چیزیں ہیں۔ ان میں بسکٹ اور جوس کے ڈبے ہیں لیکن میری بچی...؟" روبینہ کہتے کہتے رو دی۔

عرفان اس کے قریب آ گیا۔ "تم فکر مت کرو، وہ ضرور مل جائے گی۔ خدا نے چاہا تو وہ بالکل محفوظ ہوگی۔"

"میں بھی اسی امید پر خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔" روبینہ نے آنسو صاف کیے۔ "میں فرح کو کچھ دے دوں، اسے توانائی کی ضرورت ہے۔"

عرفان نے ارشد کی طرف دیکھا۔ "تم لوگوں کے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

"گولیاں ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اور یہ میں تم لوگوں کو کھلا نہیں سکتا۔ اس کے لیے میرا دشمن میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔"

"تمہارے ساتھی کو بھی خوراک کی ضرورت ہے۔" عرفان بولا۔

"جب تک ہم یہاں سے نہیں نکل جاتے، کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" ارشد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

امیر علی جو اب ایک کھڑکی سے جھانک رہا تھا، اس نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے، وہ شاید پل کے پار آ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ارشد نے کہا اور جھپٹ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ اسی لمحے باہر سے ایک برسٹ چلا اور گولیاں کھڑکی میں سے گزریں۔ وہ سب ہی بال بال بچے تھے۔ ارشد اور امیر علی کھڑکی کے دائیں بائیں ہو گئے اور عرفان زمین پر گر گیا۔ وہ رینگتا ہوا نشست گاہ میں چلا گیا۔ اس دوران میں گولیوں کی برسات جاری تھی اور باہر سے یقیناً کئی خود کار رائفلیں آگ برسانے میں مصروف تھیں۔

"تم نے صحیح سے دیکھا نہیں۔" ارشد نے امیر علی سے کہا۔ "یہ یہاں تک کیسے آئے؟"

"پل سے نہیں آئے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ نیچے کھائی میں اتر کر اوپر آئے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ احاطے کی دیوار کے پار کچھ حرکت ہو رہی ہے۔"

اب رحیم شاہ اور اس کے ساتھی احاطے کی دیوار کے پیچھے تھے اور یہ حویلی سے بہ مشکل پچاس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ تین چار خود کار ہتھیاروں سے فائرنگ کی جا رہی تھی اور ..... ہال نما کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ گولیاں ان سے گزر رہی تھیں۔ نشست گاہ اور عورتوں کا کمرا ابھی تک محفوظ تھے لیکن اگر باہر موجود دشمن اندر آ جاتا تو کوئی محفوظ نہیں رہتا۔ ارشد اور امیر علی نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کوئی دو منٹ بعد فائرنگ کے تسلسل میں وقفہ آیا۔ پھر ارشد نے امیر علی کو دیکھا اور سر کا اشارہ کیا۔ انہوں نے بیک وقت دونوں کھڑکیوں سے اپنی رائفلیں باہر نکالیں اور احاطے کی طرف رخ کر کے پورے میگزین خالی کر دیے۔ یہ ان کی طرف سے بھرپور جواب تھا۔ وہ رحیم شاہ اور اس کے ساتھیوں کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ نہتے اور کمزور نہیں ہیں۔

اندر روبینہ، شاہین اور فرح اس فائرنگ سے دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ فرح لرزنے لگی۔ اس کا شوہر غائب تھا اور ننھا بچہ ابھی دنیا میں آیا تھا۔ اس نے روبینہ سے کہا۔ "باجی... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یہاں آنے والوں کے دشمن بھی پیچھے سے آئے ہیں۔" روبینہ نے بتایا۔ "انہوں نے حملہ کر دیا ہے۔"

"یہ کمرا محفوظ نہیں ہے۔" شاہین نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے پیچھے جانا چاہیے۔"

روبینہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو عرفان اندر آ گیا۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "یہاں خطرہ ہے۔ تم لوگوں کو پیچھے والے کسی کمرے میں جانا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ اس دوران میں دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ عرفان نے عقبی سمت میں ایک کمرا دیکھا۔ اس میں بھی بیڈ تھا اور وہاں گندگی نہیں تھی۔ عرفان نے بچے کو سنبھال لیا، روبینہ اور شاہین نے فرح کو سہارا دیا۔ وہ انہیں اس کمرے میں لے

آیا لیکن یہاں بلا کی سردی تھی کیونکہ عقب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ غائب تھے اور ہوا بلا روک ٹوک اندر آ رہی تھی۔ سردی سے فرح کی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ لرزنے لگی۔

روبینہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے عرفان سے کہا۔ "یہاں آتش دان نہیں جلا سکتے؟"

"کیوں نہیں جلا سکتے۔" اس نے کہا اور وہاں موجود فرنیچر سے کچھ لکڑی نکال کر آتش دان میں ڈالی اور اسے آگ لگا دی۔ آگ روشن ہوئی تو کمرے میں حرارت پھیلنے لگی۔ کھڑکی کی سلاخوں پر بستر کی چادر باندھ دی گئی، اس سے کمرا ہوا سے کسی قدر محفوظ ہو گیا۔ عرفان باہر آیا تو روبینہ بھی اس کے ساتھ نکل آئی۔ اس کے چہرے پر بہت بڑا سوالیہ نشان تھا کہ اب کیا ہوگا؟ عرفان نے کہا۔

"اگر یہ لوگ انہیں روکنے میں کامیاب رہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر وہ اندر آ گئے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"فراز... مونا..."

"ان کی کوئی خبر نہیں ہے اور ہماری صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ سب سے اچھی خبر یہ ہے کہ کوئی خبر نہیں ہے... اس لیے تم اللہ سے اچھی امید رکھو، وہ بہتر کرے گا۔"

روبینہ نے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ "یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ بھی تو اچھے نہیں لگتے۔"

"ہاں، یہ بھی جرائم پیشہ ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا رویہ کیا ہوگا۔" عرفان نے اسے بتایا۔ "ارشد اور اس کے ساتھی ہنگامی طور پر یہاں آئے۔ ان میں سے ایک مر چکا ہے اور دوسرا زخمی ہے۔ ان کی گاڑی پر گولیوں کے نشانات ہیں۔ یقیناً ان کا کہیں مقابلہ ہوا ہے یا کسی دشمن نے حملہ کیا ہے۔ اس وقت یہ پناہ کی تلاش میں تھے لیکن یہاں ان کو اسلحہ مل گیا۔ جرائم پیشہ افراد کے لیے اسلحے کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔" روبینہ یہ سن کر حیران رہ گئی۔

"یہاں اسلحہ ہے؟"

"بے پناہ اور ہر قسم کا۔" عرفان نے اسے کمرے کے بارے میں بتایا جس میں اسلحہ تھا۔

"ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں؟" روبینہ پریشان ہو کر بولی۔ "کاش کہ میں یہ سفر ہی نہ کرتی۔"

"یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ تقدیر نے یہ سفر لکھ دیا تھا اس لیے کرنا تو تھا۔" عرفان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"مجھے شک ہے کہ یہ بھی آسانی سے ہماری جان چھوڑیں گے۔" روبینہ نے کہا۔ "ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔" وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی اور عرفان سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

حویلی کا سامنے والا حصہ میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ دونوں طرف سے خود کار ہتھیاروں سے بے پناہ فائرنگ کی جا رہی تھی۔ اسلحے اور ایمونیشن کی دونوں کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر پتھر کی دیواروں کے پیچھے ہونے کی وجہ سے دونوں کسی نقصان سے محفوظ تھے۔ رحیم شاہ اور اس کے ساتھی کھائی سے ہو کر یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ شدید بارش نے ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تھی مگر پانچ کروڑ کی کشش ایسی تھی کہ انہیں کھائی تو کیا کوہِ ہمالیہ بھی سر کرنا پڑتا تو وہ اسے بھی سر کر لیتے۔ وہ اپنے ساتھ اسلحے اور ایمونیشن کے بیگ لائے تھے۔ ان کے پاس دستی بم بھی تھے۔ ابتدائی فائرنگ سے رحیم شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ ارشد کے ساتھ کوئی ایک فرد ہی رہ گیا ہے کیونکہ اندر سے صرف دو رائفلیں جواب دے رہی تھیں جبکہ یہاں چار افراد تھے۔ رحیم شاہ مسکرانے لگا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اب ارشد وارث کو سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی مستان سے کہا۔

"گرینیڈ نکالو۔"

گرینیڈ کے نام پر مستان کے دانت نکل آئے تھے۔ اس نے کہا۔ "شاہ جی، تم نے بہت دیر سے کہا۔"

"میں دیکھ رہا تھا ارشد کے ساتھ کتنے آدمی رہ گئے ہیں۔ وہ بس دو ہیں۔ ان کو آزاد دو... پانچ کروڑ کی رقم ہماری ہو جائے گی۔"

مستان دستی بم پھینکنے کا ماہر تھا۔ اس کا نشانہ شاذ ہی خطا جاتا تھا۔ اس نے بیگ سے ایک درمیانے سائز کا دستی بم نکالا اور اس کی پن نکال کر اسے حویلی کے برآمدے کی طرف اچھال دیا۔ فاصلہ زیادہ تھا اس لیے دستی بم دروازے تک نہیں پہنچ سکا اور برآمدے کے وسط میں گر گیا۔ مستان نے وقت کا اتنا حساب رکھا تھا کہ بم گرتے ہی پھٹ گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور برآمدے کی چھت کو شدید نقصان پہنچا۔

☆☆☆

ارشد نے کوئی چیز برآمدے میں گرتی محسوس کی اور اس نے بروقت چلا کر امیر علی کو خبردار کیا۔ دونوں ایک ساتھ جھک گئے۔ اگلے ہی لمحے دھماکا ہوا اور بم کے ٹکڑے اڑ کر کھڑکی اور دروازے سے اندر آئے۔ اگر وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑے ہوتے تو ان ٹکڑوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔ دروازے کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہو گیا تھا۔ ارشد چلایا۔ "لعنت

http://paktunplace.blogspot.com

ہو... یہ گرینیڈ استعمال کر رہے ہیں۔"

"مجھے یقین تھا کہ ان کے پاس گرینیڈ ہوں گے۔" امیر علی بولا۔ "رحیم شاہ کے پاس مستان نامی بندہ ہے۔ وہ گرینیڈ کے استعمال کا ماہر ہے۔"

گرینیڈ ان کے پاس بھی تھے لیکن وہ اندر رہ کر اسے دشمن پر نہیں پھینک سکتے تھے اور وہ پھینکنے کے لیے سامنے جاتے تو دشمن کا کام آسان ہو جاتا۔ وہ مشکل میں پڑ گئے تھے۔ امیر علی نے ارشد کی طرف دیکھا۔ "ہمیں پیچھے ہٹنا ہوگا۔"

"نہیں، اس صورت میں وہ اندر تک آ جائیں گے۔" ارشد غرایا۔ "ان کی تعداد زیادہ ہے۔"

دھماکے کی آواز اندر تک پہنچی تھی۔ عرفان بھاگتا ہوا آیا۔ "یہ کیا تھا؟"

"دستی بم۔" ارشد نے جواب دیا۔ "ہمارے دشمنوں کے پاس بم بھی ہیں۔"

"یعنی ہمارے مارے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے؟" عرفان سرد لہجے میں بولا۔ "کاش کہ تم لوگ یہاں نہ آتے۔"

"اب تو آ ہی گئے ہیں اور تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔" ارشد نے کہا۔ "تمہیں پستول یا رائفل چلانی آتی ہے؟"

"پستول چلانا آتا ہے۔" عرفان نے غلط بیانی سے کام [illegible] لیا کیونکہ اسے رائفل بھی چلانی آتی تھی۔ "سوال یہ ہے گرینیڈ کا مقابلہ پستول سے کیسے کیا جائے گا؟"

"وہ برآمدے تک آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں اندر کے کمروں میں جانا پڑے۔" ارشد نے کہا۔ "اندر آنے کی صورت میں وہ دستی بم استعمال نہیں کر سکیں گے کیونکہ حویلی گرنے سے انہیں بھی خطرہ ہوگا۔"

"ممکن ہے وہ اندر آنے کی کوشش ہی نہ کریں اور باہر سے ہی حویلی کو بموں سے اڑا دیں۔" عرفان نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ ایسا نہیں کریں گے۔" ارشد نے یقین سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ رحیم شاہ اصل میں پانچ کروڑ کی رقم کے پیچھے آیا ہے اور وہ اسے تباہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ حویلی کی تباہی کی صورت میں رقم کے تباہ ہونے کا بھی بہت زیادہ امکان تھا۔ اسی لمحے باہر ایک دھماکا اور ہوا اور اس بار ایک کھڑکی مکمل طور تباہ ہوگئی۔ عرفان نشست گاہ کے فرش پر گر گیا۔ وہ دونوں دیوار کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ لیکن اس طرح وہ کب تک محفوظ رہ سکتے تھے؟ ارشد نے اپنی طرف کی کھڑکی سے ایک برسٹ مارا مگر رحیم شاہ اور اس کے ساتھی احاطے کی دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ امیر علی نے کہا۔

"کھڑکی ٹوٹ گئی ہے، اب ہم بھی ان پر گرینیڈ پھینک سکتے ہیں۔"

ارشد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ساتھ صرف امیر علی باقی رہ گیا تھا اور گرینیڈ پھینکنے میں خطرہ تھا کہ وہ باہر سے نشانے پر آ جاتا۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا لازمی تھا، ورنہ ایک بار دروازہ ٹوٹ جاتا تو ان کے لیے ہال میں رکنا مشکل ہو جاتا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن کوشش کرنا کہ سامنے نہ آؤ۔"

امیر علی نے اپنے پاس اسلحے کے بیگ میں موجود ایک گرینیڈ نکالا۔ اس نے چابی نکالی اور پن دبائے ہوئے کھلی کھڑکی کے پاس ایک طرف کھڑے ہو کر کرکٹ کے فیلڈر کی طرح ہاتھ گھما کر گرینیڈ باہر تھرو کر دیا۔ بچنے کی کوشش میں وہ کھڑکی کے سامنے نہیں آیا تھا اس لیے گرینیڈ احاطے کی دیوار تک پہنچنے کے بجائے اس سے ذرا دور گرا اور دھماکے سے پھٹا لیکن رحیم شاہ اور اس کے آدمی محفوظ رہے۔ گرینیڈ ایک مشکل اور خطرناک ہتھیار ہے۔ اسے چابی نکالنے کے بعد ایک مخصوص وقت میں پھینکنا لازمی ہوتا ہے ورنہ یہ پھٹ جائے تو پھینکنے والے کے پرخچے اڑ جاتے ہیں اور اگر جلدی پھینک دیا جائے تو دشمن کو بچنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ارشد کھڑکی کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔

"دیوار سے وہ [illegible] بچ رہے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔" امیر علی نے دوسرا گرینیڈ نکالا۔ "یہ دیوار تک جائے گا۔"

اس بار امیر علی نے زیادہ قوت لگا کر گرینیڈ پھینکا اور یہ دیوار کے پاس گرا اس لیے جب دھماکا ہوا تو دیوار کا ایک حصہ بھی اڑ گیا۔ ارشد خوش ہو گیا۔ "زبردست نشانہ لیا ہے۔ ایسے ہی دو تین گرینیڈ دیوار کے پاس گرے تو ان کو بچنے کی جگہ نہیں ملے گی۔"

امیر علی تیسرا گرینیڈ پھینکنے کی تیاری کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کی پن نکالتا، دروازے کے باہر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی اور وہ دونوں بیک وقت زمین پر گرے۔ دھماکے نے دروازے کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس کے پٹ کا ایک حصہ ارشد کے سامنے گرا اور اب وہ دشمن کے سامنے کھل کر آ گئے تھے۔ امیر علی زمین پر پڑا خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے گرینیڈ کی چابی نہیں نکالی تھی۔ ورنہ وہ بھی یہیں پھٹ جاتا۔ جیسے ہی دھواں کم ہوا، اس نے اٹھ کر گرینیڈ دروازے سے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ اس دوران میں وہ مارے جوش کے سامنے آ گیا تھا۔ ارشد نے تیز لہجے میں کہا۔

"امیر علی... پیچھے ہٹو۔"

اسی لمحے باہر سے آنے والے ایک برسٹ نے اس کی ٹانگ کو چھلنی کر دیا۔ امیر علی چلایا اور زمین پر گر گیا۔ ارشد تڑپ کر اٹھا اور زخمی امیر علی کو کھینچ کر دیوار کی آڑ میں لے آیا۔ اس کا پھینکا ہوا گرینیڈ دھماکے سے پھٹا تو فائرنگ میں وقفہ آیا اور اسی وجہ سے وہ امیر علی کو آڑ میں لانے میں کامیاب رہا۔ اس کے فوراً بعد فائرنگ شروع ہوگئی۔ ارشد نے امیر علی کی ٹانگ دیکھی۔ اس میں ران اور پنڈلی پر دو گولیاں لگی تھیں۔ پنڈلی والی گولی سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن ران میں گولی اٹک گئی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ ارشد نے رومال نکال کر اس کی ران پر باندھ دیا۔ پھر اپنی شرٹ سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کی پنڈلی کے زخم پر باندھا۔ امیر علی گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم باہر دیکھو... وہ موقع سے... فائدہ اٹھا کر... اندر نہ آ جائیں۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" ارشد نے اسے تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو۔"

باہر سے رحیم شاہ کی آواز آئی۔ "ارشد... میری آواز سن رہے ہو؟"

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پھر پکارا۔ "ارشد... تو سن رہا ہے لیکن جواب نہیں دے رہا۔"

اس بار ارشد نے رائفل سے جواب دیا اور ایک برسٹ مارا۔ اس پر رحیم شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "اس کا مطلب ہے تو سن رہا ہے۔ میں تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ تو رقم میرے حوالے کر دے میں لے کر چلا جاؤں گا۔"

"ذلیل آدمی۔" ارشد نے زیر لب کہا۔ "مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔"

"اگر تم نے اسے... رقم دے دی تو یہ حویلی کو ہمارا مقبرہ بنا دے گا۔" امیر علی نے اسے خبردار کیا۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" ارشد ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"ارشد! میں آخری بار کہہ رہا ہوں... اگر تم نے جواب نہیں دیا تو اگلا گرینیڈ اندر گرے گا اور تم سب کے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"گرینیڈ اندر آ سکتا ہے۔" امیر علی نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ "ہمیں اندر جانا ہوگا۔"

"نہیں... اگر ہم نے ہال چھوڑ دیا تو یہ حویلی تک آ جائیں گے اور اس کے بعد انہیں اندر آنے سے روکنا ممکن نہیں ہوگا۔" ارشد نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن گرینیڈ یہاں گرا تو ہم بالکل محفوظ نہیں ہوں گے۔" امیر علی نے اصرار کیا۔ "ہمیں اندر جانا پڑے گا۔"

ارشد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے دو ساتھی تھے لیکن عملاً لڑنے کے لیے وہ اکیلا ہی رہ گیا تھا اور ایک آدمی چار آدمیوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ زندہ بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ان کو حویلی میں آنے سے روک سکے۔ اس نے امیر علی سے کہا۔ "مجھے چھت پر جانا ہوگا۔"

"وہ کیسے... تم یہاں سے کیسے نکلو گے؟" وہ بولا۔ "سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس دوران میں انہیں اندر آنے سے کیسے روکا جائے گا؟"

"یہ رقم کے لیے آئے ہیں نا۔" ارشد نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "انہیں رقم ہی روکے گی۔"

امیر علی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "رقم ان کو کیسے روکے گی جبکہ یہ رقم لینے ہی تو آئے ہیں۔"

"تم دیکھتے رہو۔" ارشد نے کہا اور فرش پر رینگتا ہوا ہال کے ایک کونے میں رکھے رقم کے بیگ کی طرف بڑھا۔ انہوں نے رقم اور اسلحے کے بیگز ہال میں رکھے تھے تاکہ وہ ان کی نظروں کے سامنے رہیں۔ رقم کے بیگ تک جانے کے لیے ارشد کو ایک چھوٹے سے حصے سے گزرنا تھا جو دروازے کے سامنے تھا اور باہر سے رحیم شاہ اور اس کے ساتھی وقفے وقفے سے برسٹ [illegible] کھڑکیوں سے [illegible] فائرنگ سے محفوظ تھے۔ ارشد اس جگہ سے بھاگ کر گزر گیا اور پھر اسی طرح بیگ لے کر واپس آ گیا۔ اب وہ رینگتا ہوا آ رہا تھا کیونکہ یہ جگہ کھڑکی کے عین سامنے تھی۔ امیر علی اب بیٹھا ہوا کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر اندر نہ گھس آئیں۔

"اس کا کیا کرو گے؟" امیر علی نے رقم کے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

"ان لوگوں کے سامنے رکھ دوں گا۔" ارشد نے سنجیدگی سے کہا۔

امیر علی نے اس کی طرف دیکھا جیسے اسے ارشد کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ "تم یہ انہیں دے دو گے؟"

"سامنے رکھ دوں گا۔" ارشد نے کہا اور بیگ اٹھا کر دروازے کے سامنے پھینک دیا۔ اس طرح کہ بیگ عین چوکھٹ پر جا گرا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" امیر علی تڑپ کر بولا۔

"میں نے کہا نا، دیکھتے رہو۔" ارشد کا لہجہ سرد ہو گیا۔ پھر

http://pakfunplace.blogspot.com

اس نے کھڑکی کے پاس سے چلا کر رحیم شاہ کو آواز دی۔
"رحیم... میری آواز سن رہا ہے؟"
"ہاں، بالآخر تجھے زبان مل گئی۔" رحیم شاہ کا جواب آیا۔ "یہ دروازے کے سامنے کیا ڈالا ہے؟"
"وہ جس کے لیے تو میرے پیچھے آیا اور جس کے لیے اب تک کئی..... آدمی مر چکے ہیں۔"
"اس بیگ میں رقم ہے؟" رحیم شاہ نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں، اس میں رقم ہے۔" ارشد بولا۔ "پورے پانچ کروڑ روپے۔"
"تو نے کیا اسے میرے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟" رحیم شاہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
"نہیں، میں نے رقم تیرے سامنے رکھ دی ہے۔ ہمت ہے تو آ کر لے جا۔"
"میں اسے تیری لاش سے گزر کر لے جاؤں گا۔"
"اگر ہمت ہے تو ایسا کر لے۔" ارشد بولا اور پھر ذرا رک کر کہا۔ "لیکن اب اگر تیری طرف سے کوئی بم آیا تو ہمارے ساتھ اس رقم کے پرزے بھی اڑ جائیں گے۔"
اس بات پر رحیم شاہ کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ بات اس نے سوچی نہیں تھی۔ اب اگر وہ گرینیڈ پھینکتا تو اس سے رقم کو بھی نقصان پہنچتا۔ اپنے چار ساتھی اور ایک گاڑی گنوانے کے بعد وہ اس رقم کو گنوانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس طرح کیا تم بچ جاؤ گے؟"
"نہیں، مجھے ایسی کوئی امید نہیں ہے لیکن اب ہمارے درمیان برابر کا مقابلہ ہوگا۔ یعنی گنوں سے اور گرینیڈ کوئی استعمال نہیں کرے گا۔"
"میں باہر ہوں اور تم اندر ہو۔" رحیم شاہ نے کہا۔ "تم کب تک اس حویلی میں رہ سکتے ہو؟"
"جب تک ہم میں جینے کی آس ہے۔" ارشد نے جواب دیا اور نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے امیر علی سے کہا۔ "میں اب چھت پر جانے کی کوشش کروں گا۔"
"کیسے اور میں اکیلا انہیں کس طرح روکوں گا؟"
"یہ تمہارا ساتھ دے گا۔" ارشد نے نشست گاہ کی طرف دیکھا۔
"طاہر؟" امیر علی بے یقینی سے بولا۔ "اسے اپنا ہوش نہیں ہے۔"
"نہیں، میں عرفان کی بات کر رہا ہوں۔"
"اس کے ہاتھ میں ہتھیار دینا خطرناک ہو سکتا ہے۔"
"تم فکر مت کرو، وہ اکیلا نہیں ہے اس لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے گا۔" ارشد نے اسے تسلی دی اور رینگتا ہوا نشست گاہ تک آیا۔ عرفان ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ ارشد نے اس سے بلا تمہید کہا۔ "اب تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا، میرا ساتھی بھی زخمی ہو گیا ہے۔"
"میں کیا کر سکتا ہوں؟"
"تمہیں دوسری کھڑکی سنبھالنا ہوگی۔" ارشد نے کہا۔
"ایک کھڑکی پر میرا ساتھی ہوگا۔"
"اور تم؟"
"میں پیچھے کے حصے کی نگرانی کروں گا۔" ارشد نے غلط بیانی کی۔
"یہ رقم کا کیا ذکر ہو رہا تھا؟"
"میرے پاس رقم ہے اور میرا دشمن اصل میں اس رقم کے چکر میں ہی آیا ہے۔ جب تک اسے رقم نہیں مل جاتی، وہ انتہائی اقدام نہیں اٹھائے گا لیکن جیسے ہی اسے رقم ملی، وہ جانے سے پہلے سب کو مار دے گا۔"
"کیا یہ کام تم نہیں کرو گے؟" عرفان کی بات پر ارشد چونک گیا۔
"نہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں صرف رقم کے لیے کسی کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں، کوئی میرے لیے خطرہ بنتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا۔ یہ بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دے رہے ہو یا نہیں؟"
عرفان نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "یہ ہماری جان کا معاملہ بھی ہے اس لیے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"
"میرے ساتھ آؤ۔" ارشد بولا اور اسے ہال میں تباہ ہو جانے والی کھڑکی تک لایا اور اسے ایک خود کار رائفل دی۔ پھر اسے چلانے، لوڈ اور اَن لوڈ کرنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ عرفان سمجھنے کی اداکاری کرتا رہا۔ اس نے ارشد کو رائفل لوڈ اَن لوڈ کر کے دکھائی۔ ارشد خوش ہو گیا۔ "تم ذہین آدمی ہو۔ اب ایک برسٹ مارو... اس طرح سے پکڑ کر۔"
عرفان نے کھڑکی کی آڑ سے دیوار کی طرف ایک برسٹ مارا۔ ارشد حیران ہو گیا۔ "تم نے بالکل درست طریقے سے رائفل استعمال کی ہے۔ سچ بتاؤ، پہلے بھی چلائی ہے؟"
"نہیں لیکن پستول چلانا سیکھا ہے۔" عرفان نے کہا۔
"ٹھیک ہے، تم یہاں رکو۔" ارشد نے کہا اور رینگتا ہوا اندر والے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ عرفان نے اسے جاتے دیکھا اور امیر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دوسری کھڑکی کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی رائفل کی نال کھڑکی سے لگی تھی

اور وہ عرفان کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تنبیہہ تھی کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

☆☆☆

فراز دروازے کے پاس بیٹھا تھا اور باہر سے آنے والی خوف ناک آوازیں سن رہا تھا۔ اب فائرنگ کے ساتھ ایسے دھماکے بھی ہو رہے تھے جیسے بم پھٹ رہے ہوں۔ وہ حیران تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ آوازوں سے مونا بھی سہم گئی۔ فراز باہر جانے کے بارے میں سوچتا لیکن ان آوازوں کو سن کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ مونا بار بار پوچھتی۔
"انکل! یہ کیا ہو رہا ہے؟"
فراز کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سب اس شخص کی کارستانی ہے جو اسے بے ہوش کر کے باندھ گیا تھا؟ لیکن وہ کس پر اتنی شدت سے فائرنگ کر رہا تھا؟ اور پھر آوازوں سے تو لگ رہا تھا جیسے حویلی میں دو مسلح گروہ آپس میں پیکار ہوں۔ اسے رہ رہ کر فرح کا خیال آ رہا تھا۔ آخر اس نے ہمت کی اور باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے مونا سے کہا۔ "تم یہیں رکو، میں پہلے باہر جا کر دیکھتا ہوں پھر آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔"
لیکن مونا اس شخص سے اس قدر خوف زدہ تھی کہ یہ سن کر وہ فراز سے لپٹ گئی۔ "نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ انکل! یہاں سے چلیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ گندا آدمی پھر نہ آ جائے۔"
فراز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ باہر فائرنگ ہو رہی ہے اور وہ یہیں رکے لیکن وہ کسی صورت رکنے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ وہ اتنی شدت سے فراز سے چمٹ گئی کہ اسے مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔ فراز نے جیک لیور اٹھایا اور اوپر آ کر دروازہ کھولا۔ یہ دروازہ خفیہ ہونے کے باوجود سادہ سا تھا اور اسے صرف اندر سے بند کیا جا سکتا تھا۔ باہر سے یہ ایک لٹو گھمانے سے کھل جاتا تھا لیکن اس سے لاک نہیں ہوتا تھا۔ فراز نے باہر جھانکا۔ اس کی ٹارچ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ لیکن بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی، اس سے تاریکی کم ہو گئی تھی۔ مختلف جگہوں میں بجلی اس طرح چمکتی کہ اس کی روشنی آس پاس بھی پھیل جاتی اس لیے ایک مسلسل روشنی والی کیفیت تھی۔ البتہ بارش کسی قدر ہلکی ہو گئی تھی۔ فراز نے مونا کو اپنے پیچھے رکھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کونے تک آیا۔ اس نے وہاں سے جھانکا۔ اسی لمحے اسے احاطے کی دیوار پر سے ایک رائفل کی نال شعلے اگلتی نظر آئی اور اس کا رخ مرکزی ہال کی طرف تھا۔ پھر وہاں سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی۔ فراز حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ فوراً مونا کو لے کر پیچھے ہٹا اور حویلی کے پچھلے حصے میں جانے لگا۔ اس طرف دیوار میں حویلی کے اندر ایک دروازہ موجود تھا لیکن وہ اندر سے بند تھا اور وہ اس سے اندر نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

ارشد باہر جانے کے لیے دائیں طرف کھلنے والے دروازے تک آیا۔ یہ دروازہ لاک نہیں تھا، بس اندر سے کنڈی لگی تھی۔ اس نے کوشش کر کے زنگ آلود اور بُری طرح جام کنڈی کھول لی۔ اس دوران میں شور بہت ہوا لیکن اسے یقین تھا کہ بارش اور بادلوں کی گرج کے شور میں کسی نے کنڈی کھلنے کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ بھی چرچرایا۔ وہ باہر آیا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت فراز اور مونا حویلی کے سامنے والے کونے پر تھے لیکن اتفاق سے جب ارشد نے اس طرف دیکھا تو ماحول تاریک تھا اور اسے وہ دونوں نظر نہیں آئے اور جب روشنی چمکی تو ارشد کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔
وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ فراز کو تلاش کرتے ہوئے اس نے وہاں ایک سیڑھی پڑی دیکھی تھی جس کی مدد سے وہ اوپر جا سکتا تھا اسی لیے وہ عقبی طرف آیا تھا۔ سیڑھی بھی خستہ حال تھی لیکن اس کا کام بن جاتا۔ ارشد اسے دیوار سے... لگا کر چھت پر آ گیا۔ مسلسل بھیگنے اور سردی سے اسے اپنا جسم سن محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن سردی کے مقابلے میں جان لیوا دشمن اس کے سامنے تھا اور ارشد کو موت سے بچنے کے لیے اس سے لڑنا تھا۔ ایسے میں بارش اور سردی ایک ثانوی معاملہ بن گیا تھا۔ رحیم شاہ جیسے دشمن سے نجات مل جاتی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ وہ چھت کے کنارے پہنچا۔ یہاں مشکل سے ایک فٹ کی منڈیر تھی۔ اس نے چھت پر لیٹ کر نیچے جھانکا تو اسے فوراً ہی رحیم شاہ اور اس کے تین عدد ساتھی احاطے کی دیوار کے نیچے نظر آ گئے۔ وہ وقفے وقفے سے ہال کی طرف فائرنگ کر رہے تھے لیکن جب سے ارشد نے رقم کا بیگ ان کے سامنے رکھا تھا، انہوں نے گرینیڈ سے حملہ نہیں کیا تھا۔ ارشد کو ان چاروں میں رحیم شاہ کی تلاش تھی لیکن کم روشنی اور پھر ان کی جیکٹوں کے کھڑے کالروں کی وجہ سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے ایک آدمی پر شبہ ہوا۔ وہ بائیں طرف سے دوسرے نمبر پر تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ احاطے کی دیوار کوئی چھ فٹ اونچی تھی اور چھت پر سے بھی یہاں چھپے افراد کو نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ وہ تو خود رحیم شاہ اور اس کے ساتھی بے پروا تھے اور دیوار سے ذرا دور تھے اس لیے چھت سے نظر آ رہے تھے۔ اگر

http://pakistanipalace.blogspot.com

وہ رحیم شاہ کے بجائے کسی اور کو مار دیتا تو باقی ہوشیار ہونے کی وجہ سے بچ سکتے تھے۔ البتہ رحیم شاہ کے مارے جانے کی صورت میں اس کے ساتھی یقیناً بھاگ نکلتے۔ وہ رائفل لیے سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟

☆☆☆

اندر والے کمرے میں تینوں عورتیں خاموش اور فکرمند تھیں۔ فرح کو اپنے ہونے والے بچے کے باپ کی فکر تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رونے لگتی جبکہ روبینہ کو مونا کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس کا بھی رونے کو دل چاہ رہا تھا لیکن وہ خود پر ضبط کررہی تھی۔ شاہین کو صرف یہ فکر تھی کہ وہ یہاں سے زندہ سلامت جاسکے گی یا نہیں۔ وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھی تھی جبکہ روبینہ بستر پر فرح کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے اصرار کرکے فرح کو لٹکٹ اور جوس دیا۔ فرح نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے فراز کے بارے میں پوچھا۔ ”باجی! یہ کہاں جاسکتے ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، مجھے تو خود اپنی بچی کا نہیں پتا۔“ روبینہ ضبط کرکے بولی۔ ”اللہ کرے دونوں مل جائیں۔“

”آپ دیکھیں شاید وہ آگئے ہوں۔“ فرح نے التجا کی۔ روبینہ جانتی تھی کہ باہر جس قسم کی جنگ چھڑی ہے، اس میں نہ تو کوئی باہر جاسکتا تھا اور نہ اندر آسکتا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک امید پر باہر کا رخ کیا کہ شاید کوئی اطلاع ہو۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو اسے سامنے والی راہداری میں کوئی سایہ سا متحرک نظر آیا۔ وہ دبے قدموں اس طرف آئی۔ اس نے دیکھا تو اسے ارشد باہر جانے والے دروازے کے ساتھ نظر آیا۔ روبینہ نے اسے رائفل سے پہچانا۔ پھر اس نے کنڈی کھولی اور باہر نکل کر دروازہ بند کرلیا۔ روبینہ دروازے تک آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ باہر کیوں گیا ہے اور اس کا کیا ارادہ ہے۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی سوچتی رہی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی بند کردی۔ اب ارشد اس دروازے سے اندر نہیں آسکتا تھا۔

☆☆☆

فراز نے محسوس کیا کہ اندر اور باہر موجود مسلح افراد میں فائرنگ کا تبادلہ ہورہا ہے اور اس وقت سامنے کی طرف جانے کی صورت میں انہیں خطرہ ہوسکتا ہے، اس لیے اس نے واپس پیچھے جانے کا سوچا۔ وہ پلٹا اور مونا کو لے کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف جانے لگا۔ راستے میں آنے والے دروازے پر اس کا ہاتھ لگا اور اس نے ایک بار پھر اس پر زور آزمائی کی لیکن ایک لمحے پہلے روبینہ اس کی کنڈی لگا چکی تھی۔ اگر وہ ایک لمحے پہلے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا تو کامیاب رہتا۔ بادلوں اور بارش کے شور میں اسے کنڈی لگنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے دروازہ بجانے کا سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ نہ جانے اندر کون مسلح افراد ہیں اور ان کے عزائم کیا ہیں؟ کہیں وہ اندر جاکر پھنس نہ جائے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ باہر ہی رہے۔ مونا نے موٹے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن بارش سے بھیگنے کے بعد اسے سردی لگ رہی تھی۔

”انکل! مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

”بیٹے اندر اس بُرے آدمی کے ساتھی ہیں۔“ فراز نے اسے سمجھایا۔ ”اگر ہم اندر گئے تو وہ ہمیں پکڑ لیں گے۔“

مونا سہم گئی۔ ”تب ہم اندر نہیں جائیں گے۔“

”پہلے ہم دیکھیں گے کہ آپ کی امی اور آنٹی کہاں ہیں۔“ فراز نے اسے سمجھایا۔ مونا نے سر ہلایا تو وہ دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے کھڑکیوں سے اندر جھانکنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اگر کسی کمرے میں فرح اور دوسرے لوگ ہوئے تو وہاں روشنی ہوگی۔ ویسے وہ عمارت کے بائیں طرف واقع ایک کمرے میں تھے۔ اس طرف جانے کے لیے سامنے سے گزرنا لازمی تھا۔ لیکن اس طرف کی ساری کھڑکیاں تاریک تھیں۔ وہ عقبی طرف آیا تو اس نے سب سے پہلے غسل خانے کا دروازہ چیک کیا۔ وہ بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چوغہ پوش واپس نہیں آیا تھا۔ شاید اسے اطمینان تھا کہ اندر مونا اور فراز بندھے پڑے ہیں اور فرار نہیں ہوسکتے۔ لیکن جب اس نے ذرا آگے دیکھا تو اسے ایک سیڑھی دیوار کے ساتھ لگی نظر آئی۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو یہ سیڑھی یہاں نہیں تھی۔ یک دم اسے خطرے کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی تھا اور اس کی نظروں میں آئے بغیر وہ عقبی طرف آیا تھا۔ اس نے سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی تھی اور اوپر گیا تھا۔ وہ سیڑھی کی طرف آیا تو اس کی نظر ایک روشن کھڑکی پر پڑی۔ اس پر لہراتے پردے کے عقب میں روشنی موجود تھی لیکن یہ کھڑکی زمین سے خاصی بلندی پر تھی۔ اس کا نچلا حصہ بھی آٹھ فٹ اوپر تھا اور فراز کسی صورت اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن ایک ترکیب ہوسکتی تھی۔ اس نے دیوار کے ساتھ لگی سیڑھی اٹھائی اور اسے کھڑکی کے ساتھ آہستہ سے ٹکا دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ ہو۔ اوپر چڑھنے سے پہلے اس نے مونا سے کہا۔

”آپ یہاں خاموش کھڑی رہو... ٹھیک ہے؟“

”جی انکل!“ اس نے سر ہلایا تو فراز اوپر چڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ کھڑکی کے پاس پہنچا، اسے کسی عورت کے دبے دبے انداز میں رونے کی آواز آئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ اسی کمرے میں ہیں۔ اس نے کوشش

کرکے پردہ ہٹایا تو اسے بیڈ کا اونچا سرہانہ دکھائی دیا۔ اسے فرح تو نہیں البتہ ایک طرف کرسی پر بیٹھی ہوئی شاہین نظر آگئی۔ اس نے آہستہ سے ”شش“ کی آواز نکال کر اسے متوجہ کیا۔ شاہین نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور جھپٹ کر آگے آئی۔ اس نے حیرت سے فراز کو دیکھا۔

”تم یہاں کیا کررہے ہو؟“

”کون ہے؟“ فراز نے فرح کی آواز سنی۔

”تمہارا شوہر ہے۔“

یہ سن کر فرح اپنی حالت کے باوجود تڑپ کر اٹھ گئی۔ اس نے بیڈ کے سرہانے کے اوپر سے دیکھا اور فراز کو دیکھ کر چلائی۔ ”آپ یہاں؟“

”شش۔“ فراز نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”آہستہ ورنہ ان لوگوں کو پتا چل جائے گا۔“

”کن لوگوں کو؟“

”یہ بتاؤ اندر کون ہے؟“

”آپ کے جانے کے بعد کچھ بدمعاش آئے تھے، انہوں نے ہمیں بھی پکڑ لیا ہے۔“ فرح نے اسے بتایا۔

اسی لمحے روبینہ اندر آئی۔ اس نے حیرت سے فراز کی طرف دیکھا اور جھپٹ کر کھڑکی کی طرف آئی۔ ”آپ... میری بیٹی کہاں ہے؟“

”یہاں میرے ساتھ ہے۔“ فراز نے کھڑکی کے نیچے اشارہ کیا۔ ”میں نے اندر آنے کی کوشش کی تھی لیکن دروازہ بند ہے۔“

روبینہ اپنی بچی کا سن کر پاگل ہوگئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوکر چلائی۔ ”کہاں ہے مونا؟“

”ماما!“ مونا بھی ماں کی آواز سن کر تڑپ گئی۔

”تم دائیں طرف کا دروازہ کھولو، ہم آرہے ہیں۔“ فراز نے کہا اور سیڑھی سے نیچے اتر گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ مونا کی آواز کسی نے سن نہ لی ہو۔ نیچے اترتے ہی اس نے سیڑھی گرادی اور مونا کو گود میں اٹھا کر حویلی کے داہنی پہلو کی طرف بھاگا اور اسی وجہ سے بال بال بچ گیا۔ چھت کے اوپر سے کسی نے اس پر فائر کیا تھا۔ گولی اس کے پاس سے گزر کر زمین پر لگی تھی اور وہ دہشت زدہ ہوکر دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگا۔ اسے یقین ہوگیا کہ چھت پر وہی چوغہ پوش ہے اور اسے مارنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس نے اچھا کیا کہ سیڑھی ہٹادی، اب وہ آسانی سے نیچے نہیں آسکتا تھا۔ وہ دروازے تک آیا، روبینہ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا، روبینہ نے مونا کو اس سے لے لیا اور پاگلوں کی طرح اسے پیار کرنے لگی۔ وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ گھبرائے ہوئے فراز نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

”اندر چلو، چھت پر دشمن ہے... اس نے ہم پر فائر بھی کیا ہے۔“ فراز نے کہتے ہوئے اندر سے کنڈی لگادی۔

”لیکن باہر تو وہ آدمی گیا ہے جو ہمارے بعد آیا تھا۔“

”وہ کون ہے؟“ فراز چونکا۔ روبینہ نے اسے مختصراً بتایا کہ اس کے غائب ہونے کے بعد یہاں کیا ہوا تھا۔

”میرے خدا... لیکن فرح کیسی ہے؟“ فراز نے بے تابی سے پوچھا۔

روبینہ مسکرانے لگی۔ ”وہ ٹھیک ہے... اور تم ایک پیارے سے بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔“

”سچ؟“ فراز خوشی سے چلا اٹھا۔

”بالکل سچ... اب اندر چلو، فرح تمہارا انتظار کررہی ہے۔ میں نے اسے بہ مشکل بستر سے اترنے سے روکا ہے۔“

روبینہ اسے لے کر کمرے کی طرف آئی۔ مونا اس کی گود میں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی فراز بستر کی طرف لپکا۔ فرح اور اس کے پہلو میں لیٹا بچہ کسی طاقت ور مقناطیس کی طرح اسے کھینچ رہے تھے۔ فراز کو اندر آتے دیکھ کر شاہین بھی باہر آگئی تاکہ میاں بیوی اپنے بچے کی خوشی منا سکیں۔ روبینہ، مونا کے ساتھ باہر ہی تھی اور مونا اسے بتا رہی تھی کہ اس پر کیا گزری ہے۔ روبینہ اسے پیار کرنے لگی۔

”میری بچی... میری بچی۔“

مونا کی بات سن کر روبینہ کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس آدمی کے عزائم کیا تھے اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے فراز کو نیکی کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور اس کی بچی بچ گئی۔ باہر سردی بہت تھی اس لیے کچھ دیر بعد وہ اندر آگئے۔ فراز اپنے بیٹے کو گود میں لیے ہوئے تھا۔ روبینہ نے اس سے کہا۔ ”میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟“

”انکل بہت اچھے ہیں۔“ مونا بولی۔

فراز نے روبینہ سے کہا۔ ”شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”یہ کوئی احسان نہیں ہے۔“ روبینہ بولی۔ ”اور اگر میں نے آپ کے لیے کچھ کیا ہے تو آپ نے میرے لیے اس سے کہیں بڑھ کر کیا ہے۔ میری بچی کو بچا کر لے آئے ہیں۔ میرے لیے اس دنیا میں اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔“

”میں نے جو کیا، اس میں میری نیت کا دخل نہیں تھا لیکن آپ نے جو کیا وہ ارادی ہے۔“ فراز نے اعتراف کیا۔ ”یوں سمجھ لیں مجھ سے خدا نے کام لیا ہے۔“

http://pakfunplace.blogspot.com

"تب مجھ سے بھی خدا نے کام لیا ہے۔" روبینہ ہنسی۔
"یوں سمجھ لیں کہ حساب برابر ہو گیا۔"
مونا کے کپڑے بھیگ گئے تھے اس لیے روبینہ اسے چینج کرانے لگی پھر اس نے اسے کچھ بسکٹ اور جوس کا ایک پیکٹ دیا۔ فراز نے شاہین سے عرفان کے بارے میں پوچھا تو اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "مجھے کیا... اس کے بارے میں دوسروں کو پتا ہوگا۔"
فراز سمجھ گیا۔ اس نے روبینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ "وہ سامنے ہے لیکن مجھے نہیں معلوم وہاں کیا کر رہا ہے۔"
"اوپر موجود آدمی نے مجھ پر فائرنگ کیوں کی؟"
"شاید وہ تمہیں دشمن سمجھا ہوگا۔" روبینہ نے کہا۔
"یا وہ ہمیں بھی دشمن سمجھ رہا ہوگا۔" فراز نے سوچ کر کہا تو روبینہ چونک گئی۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ ہمیں ان سے بچنا ہوگا اور اس کے لیے خود کوشش کرنا ہوگی۔"
"ہم کیا کر سکتے ہیں؟" روبینہ نے بے بسی سے کہا۔ "یہ بھی مسلح ہیں اور باہر ان کے دشمن بھی مسلح ہیں۔"
"صرف ہم نہتے ہیں۔" فراز نے ٹھنڈی سانس لی۔
فراز کی بات پر روبینہ کو خیال آیا۔ "سنو... عرفان بتا رہا تھا کہ یہاں جدید قسم کا بہت سارا اسلحہ موجود ہے۔"
"کہاں؟" فراز نے پوچھا۔
"ایک کمرا ہے اس میں تالا تھا۔" روبینہ نے بتایا۔
"مجھے دکھاؤ... ہمیں بالکل بھی نہتے نہیں ہونا چاہیے۔" فراز بولا۔
"تمہیں اسلحہ چلانا آتا ہے؟"
فراز نے سر ہلایا۔ "میرے پاس پستول ہے۔"
روبینہ اسے اسلحے والے کمرے میں لائی۔ اس نے ایک موم بتی جلالی تھی۔ فراز نے کمرے میں اسلحے کی پیٹیاں دیکھیں تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ارشد نے جو پیٹیاں کھولی تھیں، ان کے ڈھکن دوبارہ نہیں لگائے تھے۔ فراز انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے چیک لیور کی مدد سے دوسری پیٹیاں بھی کھول کر دیکھیں۔ ایک میں اسے پستول کے میگزین مل گئے۔ اس نے دو عدد پستول نکالے اور پھر ان میں میگزین لگائے۔ پھر اس نے دوسری پیٹیاں دیکھیں تو ایک میں اسے ڈائنامیٹ بھی نظر آئے۔
"میرے خدا... اتنا اسلحہ تو پوری ایک فوج کے لیے کافی ہوگا۔" فراز نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ جگہ جرائم پیشہ لوگوں کا اڈا ہے۔"
"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" روبینہ نے کہا۔
"اب سمجھ میں آیا کہ وہ چوغہ پوش کون ہے۔ وہ یقیناً اس اڈے کا نگران ہے۔" فراز فکر مند ہو گیا۔ "وہ یقیناً ان لوگوں کو خبردار کرنے گیا ہے جن کا یہ اڈا ہے۔"
روبینہ کا رنگ اڑ گیا کیونکہ یہ دو مسلح پارٹیاں ہی کم خطرہ نہیں تھیں اور اب تیسری کا وجود بھی سامنے آ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "اب ہم کیا کریں؟"
"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ اس اڈے کے مالک بھی آ جائیں۔"
"ہم کیسے نکل سکتے ہیں؟" روبینہ فکر مند ہو گئی۔
فراز سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اوپر موجود شخص سمجھ رہا ہے کہ میں دشمن ہوں لہٰذا اسے نہیں معلوم کہ میں اندر آ گیا ہوں۔ اس نے مونا کو نہیں دیکھا ہوگا۔"
"تم کیا کہہ رہے ہو؟" روبینہ نے پوچھا۔
"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان لوگوں کو جو اندر موجود ہیں، یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں واپس آ گیا ہوں۔"
"عرفان کو بھی نہیں؟"
"نہیں، وہ تو ہمارا ساتھی ہے لیکن ان لوگوں کو نہیں۔" فراز نے کہا۔ "عرفان کہاں ہے؟"
"وہ شاید ہال میں ہے۔"
"اسے کسی طریقے سے یہاں بلا سکتی ہو؟"
"میں کوشش کرتی ہوں۔" روبینہ بولی اور ہال کی طرف چلی گئی لیکن اس نے براہِ راست ہال میں جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہاں فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس نے راہداری سے عرفان کو آواز دی۔ "سنو... یہاں پیچھے کوئی ہے۔ ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔"
عرفان، امیر علی کے ساتھ مل کر اب تک رحیم شاہ اور اس کے ساتھیوں کو کامیابی سے روکے ہوئے تھا... بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ارشد کی دھمکی کے بعد انہوں نے فی الحال اندر آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیونکہ ان کی حکمتِ عملی کا انحصار گرینیڈ کے استعمال پر تھا اور اب وہ گرینیڈ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اس کے بغیر اندر آنے کی کوشش کرتے تو مارے جاتے۔ امیر علی مضطرب تھا کہ اب تک ارشد نے کچھ کیا کیوں نہیں۔ عرفان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ اوپر گیا ہے۔ اس لیے جب روبینہ نے کہا تو اسے تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔
"پیچھے کی طرف تو اس کا ساتھی ہے۔"
"نہیں، وہ اس طرف نہیں ہے اور کھڑکی کے باہر کوئی

اور شخص ہے۔"
عرفان سے زیادہ امیر علی مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے عرفان سے کہا۔ "تم جا کر دیکھو، کہیں دشمن پیچھے سے گھوم کر نہ آ گیا ہو۔"
عرفان رینگتا ہوا راہداری تک آیا اور جیسے ہی کھڑا ہوا، روبینہ نے سرگوشی میں کہا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس کا ساتھی دائیں طرف کے دروازے سے باہر اور پھر چھت پر گیا ہے۔ فراز اور مونا آ گئے ہیں۔ فراز تمہیں بلا رہا ہے۔"
"سچ۔" عرفان نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ کہاں تھا؟"
"اسی حویلی کے ایک تہ خانے میں۔" روبینہ بولی۔ "باقی وہ خود بتائے گا۔"
عرفان کمرے میں آیا تو فراز اس کے گلے لگ گیا۔ پھر اس نے عرفان کو تفصیل سے بتایا کہ اس پر کیا گزری اور پھر اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ "اس سے پہلے کہ ہم بالکل پھنس جائیں، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
"تم نے ٹھیک کہا لیکن ہم یہاں سے کیسے نکلیں؟ سامنے سے جانا ناممکن ہے۔" عرفان نے کہا۔ "اوپر ان کا سرغنہ ہے۔"
"یہ کون ہیں؟"
"میں بھی نہیں جانتا لیکن دونوں ہی جرائم پیشہ ہیں۔" فراز نے کہا۔ "اس نے مجھ پر بھی فائر کیا تھا لیکن میں بچ گیا۔" فراز نے کہا۔ "میں نے یہاں موجود اسلحے سے دو پستول نکال لیے ہیں۔"
"ہتھیار تو میرے پاس بھی ہے لیکن سوال وہی ہے کہ یہاں سے نکلا کیسے جائے؟"
"ہم کسی طرف سے اتر نہیں سکتے؟" فراز نے کہا۔
"ناممکن... یہاں ڈھلان بہت گہری ہے اور پھر تمہاری بیوی اور بچہ بھی ہیں۔" عرفان نے اسے یاد دلایا۔
"تب کیا کریں؟" فراز مایوس ہو کر بولا۔
عرفان سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "دیکھو، اگر باہر والے اندر آ گئے تو ان سے خیر کی توقع کم ہی ہے جبکہ اندر موجود افراد میں سے دو زخمی ہیں اور ایک اوپر ہے۔ اگر ہم ذرا ہوشیاری سے کام لیں تو ان کی مدد کر کے باہر والوں کو روک سکتے ہیں... اور اگر خطرہ ہوا تو ان سے نمٹنا زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔"
فراز نے سوچا اور بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ "یعنی ہمیں حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہیے؟"
"بالکل... میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔" عرفان نے جواب دیا۔ "اگر سرغنہ اوپر ہے تو وہ یقیناً باہر والوں کے خلاف کچھ نہ کچھ کرے گا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ انہوں نے دستی بم استعمال کرنا شروع کر دیے تھے۔"
"اور وہ لوگ جو اس جگہ کے مالک ہیں؟"
"ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال ان دو سے نمٹ لیں تو یہی بڑی بات ہوگی۔"
"ٹھیک ہے لیکن ہمیں اسلحہ خانے سے مزید اسلحہ حاصل کر لینا چاہیے۔ صرف ان دو پستولوں سے کام نہیں چلے گا۔" فراز نے کہا۔
عرفان نے سوچا اور اس کی تائید کی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں پوری طرح تیار ہونا چاہیے۔"

☆☆☆

ارشد سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے عقبی سمت نیچے سے کسی بچے کی سی آواز آئی۔ وہ چونکا اور پلٹ کر پیچھے کی طرف آیا۔ اس نے نیچے جھانکا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ سیڑھی غائب ہے۔ اسے کوئی عمارت کے کونے کی طرف سے مڑتا دکھائی دیا۔ وہ بھاگا اور اس طرف آیا۔ اس نے نیچے جھانکا تو کوئی اسے دیوار کے ساتھ لگا نظر آیا۔ اس کے کسی ساتھی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی یہ عرفان ہو سکتا تھا۔ اس نے بے ساختہ ایک گولی اس پر چلا دی۔ اس پر وہ بالکل ہی دیوار سے چپک گیا اور ارشد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیوار کے ساتھ کوئی ایک فٹ کا چھجا بھی تھا جس سے دیکھنا آسان کام نہیں تھا۔ جب تک اس نے لیٹ کر دیکھا، وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ارشد پریشان ہو گیا۔ وہ شخص اتنی جلدی کہاں غائب ہو سکتا تھا؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ وہ شخص کسی طرح حویلی کے اندر چلا گیا ہے۔ ارشد کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پچھلے حصے میں آیا۔ وہ نیچے اترنے کا سوچ رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اسے اپنا کام مکمل کر کے نیچے جانا چاہیے۔ وہ پھر سامنے والے حصے میں آیا۔ اس نے دوبارہ احاطے کا جائزہ لیا اور پھر اس شخص کا نشانہ لیا جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہی رحیم شاہ ہے۔ اس نے احتیاطاً دس بارہ گولیوں کا برسٹ مارا تاکہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ اس کی چیخ فضا میں گونجی اور اس کے تین ساتھی دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ ارشد نے ان پر بھی فائرنگ کی لیکن وہ اب محفوظ تھے۔
پھر ان کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ وہ جان گئے تھے کہ انہیں اوپر سے نشانہ بنایا گیا ہے، اندر سے بھی جوابی

http://pakfunplace.blogspot.com

فائرنگ جاری تھی۔ ارشد چونکا۔ اسے محسوس ہوا کہ اندر سے صرف ایک خودکار رائفل سے فائر ہو رہے ہیں۔ دوسرا کہاں تھا؟ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان میں سے کم سے کم ایک کو اور نشانہ بنا لے۔ جسے اس نے شوٹ کیا تھا' اس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں بچا ہوگا مگر وہ بھی محتاط تھے۔ ارشد کو پیچھے اس پُراسرار شخص کی فکر بھی تھی جو کسی طرح پیچھے سے اندر گھس گیا تھا اور اندر اس کے دو زخمی ساتھی تھے اور پانچ کروڑ کی رقم کے ساتھ اسلحے کا بیش قیمت ذخیرہ بھی تھا۔ وہ سوچتا رہا اور آخر اس نے نیچے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پیچھے کی طرف آیا۔ اب یہاں سیڑھی نہیں تھی اور زمین کم سے کم پندرہ فٹ نیچے تھی۔ اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے سے چوٹ آنے کا امکان تھا لیکن اسے نیچے تو جانا تھا۔ اس نے رائفل شانے سے لٹکائی اور پہلے ہاتھوں کے بل نیچے لٹک گیا۔ اب بھی زمین اس کے پیروں سے کوئی آٹھ فٹ نیچے تھی۔ پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اس کا جسم تیزی سے نیچے گیا اور پھر اسے لگا جیسے اس کے پاؤں میں کوئی دہکتی ہوئی سلاخ گھس گئی ہو۔ اس نے بہ مشکل اپنی چیخ ضبط کی۔ وہ زمین پر گرا اور کچھ دیر ساکت پڑا رہا۔

ارشد کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا اور اس نے اپنے پاؤں کا معائنہ کیا تو اسے ایک پتلی سی فولادی سلاخ اپنی پنڈلی میں گھسی نظر آئی۔ وہ نہ جانے کب [illegible] منتظر تھی کہ ارشد اوپر سے گرے [illegible] بہ مشکل اسے کھینچ کر پاؤں سے الگ کیا۔ اس بار اذیت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے گالی دے کر سلاخ کو ایک طرف پھینک دیا۔ سلاخ آر پار ہوئی تھی اور زخم گہرا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ارشد نے اپنی قمیص سے ایک ٹکڑا اور پھاڑا اور اسے کس کر زخم پر باندھ لیا۔ وہ فٹ بھر اونچی گھاس میں پڑا ہوا تھا۔ تکلیف بہت زیادہ تھی مگر اسے اٹھنا تو تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، اسے پیچھے کی طرف سے کسی کی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ یک دم ساکت ہو گیا۔ اس نے غور کیا تو اسے احاطے کی عقبی گری ہوئی دیوار کے ملبے کے پاس کوئی نظر آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس طرف سے کون آسکتا ہے؟ پیچھے گہری ڈھلان تھی۔ پھر وہاں تین چار افراد اور نمودار ہوئے اور وہ اسی طرف آنے لگے۔

☆☆☆

رحیم شاہ کا غصے سے برا حال تھا اور وہ دل ہی دل میں ارشد کو گالیاں دے رہا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ واقعی چالاکی کا ثبوت دے گا۔ وہ کسی طرح چھت تک جا پہنچا تھا اور وہاں سے اس نے مستان کو شوٹ کر دیا تھا۔ اب وہ ان تینوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ رحیم شاہ نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس نے اس پر فائر بھی کیے تھے لیکن وہ اوپر محفوظ تھا... وہ نیچے زیادہ خطرے میں پڑ گئے تھے۔ پھر وہ چونکا۔ اس نے محسوس کیا کہ اندر سے اب ایک ہی رائفل جواب دے رہی ہے۔ یعنی اندر ارشد کا ایک ہی ساتھی باقی رہ گیا تھا۔ کچھ دیر اوپر سے فائرنگ ہوتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ رحیم نے اپنے دو بچ جانے والے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اندر اب ایک ہی آدمی ہے اگر ہم کوشش کریں تو اندر پہنچ سکتے ہیں۔"

"لیکن اندر جانے کے لیے ہمیں بالکل کھلی جگہ سے گزرنا پڑے گا۔" اس کے ساتھی نے اعتراض کیا۔ "اس میں بچنے کا امکان بہت کم ہے۔"

رحیم شاہ کا صبر جواب دے رہا تھا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "کچھ پانے کے لیے خطرہ مول لینا پڑتا ہے اگر ہم نے ارشد سے رقم حاصل کر لی تو اس میں سے ایک ایک کروڑ روپیا تمہارا ہوگا۔"

وہ دولت کی خاطر تو جان ہتھیلی پر رکھ کر گھومتے تھے۔ ایک کروڑ ان کی اوقات سے اوپر کی رقم تھی اس لیے وہ لالچ میں آگئے۔ ایک نے کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی استاد... حکم کرو، کیا کرنا ہے؟"

"ہم تینوں الگ الگ جگہوں سے نکل کر بیک وقت اندر کی طرف بھاگیں گے اور کوشش کریں گے کہ اندر موجود آدمی کو فائرنگ نہ کرنے دیں۔ ایک بار ہم برآمدے تک پہنچ گئے تو پھر کام آسان ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کے آدمیوں نے جواب دیا۔

"ہم میں کم سے کم دس دس گز کا فاصلہ ہو تاکہ وہ ہمیں بیک وقت نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔" رحیم شاہ نے اپنی حکمت عملی سمجھائی۔ "میں درمیان میں رہوں گا اور تم دونوں دائیں بائیں سے حملہ کرو گے۔ دوڑتے ہوئے بیک وقت فائر کرنا ہے تاکہ اندر والے شخص کو جوابی فائرنگ کا موقع نہ ملے۔"

"لیکن اوپر موجود شخص جو ہے؟" رحیم شاہ کے ایک ساتھی نے اسے یاد دلایا۔ "وہ ہم سب کو بیک وقت اڑا سکتا ہے۔"

رحیم شاہ نے چھت کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے اب وہ چھت پر نہیں ہے۔ اسے جو کرنا تھا، وہ کر کے جا چکا ہے۔"

لیکن رحیم شاہ کے آدمی خوف زدہ تھے۔ اس نے یہ

بات محسوس کر لی اور بولا۔ "ہم اندر جانے سے پہلے برآمدے سے ذرا پہلے ایک گرینیڈ پھینک دیں گے۔ اس کے دھوئیں کی آڑ میں اندر والا ہمیں آتا ہوا نہیں دیکھ سکے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اوپر والا..." رحیم شاہ کے آدمی نے کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔

"وہ جائے جہنم میں... ہمیں ہر صورت اندر تک پہنچنا ہے ورنہ اس طرح بیٹھے رہے تو سردی سے مر جائیں گے۔"

بادل ناخواستہ رحیم شاہ کے ساتھی اس کے پلان پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ رحیم شاہ نے ان کو ان جگہوں پر بھیج دیا جہاں سے نکل کر انہوں نے اندر کی طرف بھاگنا تھا۔ اس نے ان سے کہا۔ "جیسے ہی میں گرینیڈ پھینکوں، سب کو بھاگنا ہوگا۔"

جب وہ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے تو رحیم شاہ نے ایک گرینیڈ نکال کر برآمدے سے ذرا پہلے پھینک دیا۔

☆☆☆

عرفان اور فراز اندر مصروف تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عورتیں اور بچے جس کمرے میں ہیں، وہ کھڑکی کی وجہ سے غیر محفوظ ہے اس لیے انہوں نے انہیں درمیان کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا جس میں صرف ایک دروازہ تھا۔ انہوں نے اسلحے کی پیٹیوں سے خودکار رائفلیں اور ان کا ایمونیشن نکال لیا تھا۔ عرفان کو ان کا استعمال آتا تھا۔ ایک زمانے میں اس نے [illegible] کی تربیت لی تھی۔ اندر والے کمرے سے برآمدے کے باہر ہونے سے ان کو اپنا کام کرنے میں آسانی ہوئی کیونکہ اس کے دو ساتھی زخمی اور حرکت کرنے کے قابل نہیں تھے۔

روبینہ نے عرفان سے پستول مانگا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟"

"نہیں لیکن ٹریگر دبانا کون سا مشکل کام ہے۔" وہ بولی۔ "ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔"

روبینہ کی بات عرفان کے دل کو لگی۔ ویسے بھی اس حوصلہ مند عورت نے اسے متاثر کیا تھا جو ان حالات میں اور ایک چھوٹی بچی کی ماں ہوتے ہوئے بھی پوری ہمت سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے فرح کو سنبھالا تھا اور اس کی وجہ سے فرح اور اس کا بچہ بچ گئے تھے۔ عرفان نے روبینہ کو ایک پستول دے دیا۔ اس نے شاہین سے بھی کہا کہ وہ ہتھیار لے لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"نہیں... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"حالانکہ تم جس علاقے کی ہو، وہاں عورتیں ہتھیار چلانا جانتی ہیں۔" عرفان نے اسے یاد دلایا۔

"اب میرا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس پر عرفان نے تلخی سے کہا۔

"ہاں تم ویسے بھی تعلق توڑنے کی ماہر ہو۔"

شاہین نے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ عرفان اور فراز راہداری میں آئے۔ فراز نے ہال میں جھانکا جہاں امیر علی کھڑکی کے ساتھ چوکس بیٹھا تھا۔ اسی لمحے باہر گرینیڈ پھٹا۔ امیر علی غیر ارادی طور پر پیچھے ہو گیا۔ باہر دھواں پھیل گیا تھا لیکن اسی لمحے بجلی چمکی تو عرفان نے دیکھ لیا۔ اسے کھڑکی اور دروازے سے دو افراد بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے چلا کر امیر علی سے کہا۔

"وہ آرہے ہیں۔"

امیر علی تڑپ کر سیدھا ہوا اور اس نے دائیں طرف سے آنے والے کو برسٹ مارا۔ وہ قلابازی کھا کر گرا اور ساکت ہو گیا مگر اسی دوران میں دوسرے نے بھاگتے ہوئے فائر کیے اور امیر علی جھٹکے سے پیچھے جا گرا۔ اسے گولی لگی تھی۔ عرفان نے فراز سے کہا۔

"ان کو اندر آنے نہیں دینا ورنہ ہم مارے جائیں گے۔"

مگر آنے والا اندر آنے کے بجائے اس بیگ کے چکر میں تھا جس میں رقم تھی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور واپسی کے لیے مڑا تھا کہ امیر علی نے اسے بھی گولی مار دی۔ وہ بیگ سمیت منہ کے بل گرا۔ اسی لمحے رحیم شاہ ٹوٹ جانے والی کھڑکی پر نمودار ہوا اور اس نے امیر علی کو گولی مار دی۔ گولی اس کے سینے پر لگی اور اس بار اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ ساکت ہو گیا۔ رحیم شاہ نے اپنے ساتھی کے نیچے دبا ہوا بیگ نکالا اور اس کی لاش کو ایک طرف دھکیل کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ عرفان اور فراز دم بخود سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ دولت کے لیے دیکھتے ہی دیکھتے تین افراد مزید اپنی زندگیاں ہار گئے تھے اور اب ایک بچا تھا۔

عرفان آگے بڑھا۔ اس نے فراز سے وہیں رکنے کو کہا۔ اس نے دروازے کے پاس آ کر باہر جھانکا تو رحیم شاہ اسے بیگ سمیت پل نما راستے پر نظر آیا۔ وہ اکیلا تھا، اس کے تمام ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اچانک ہی حویلی کے باہر سے فائرنگ ہوئی اور عرفان نے رحیم شاہ کو اچھل کر بیگ سمیت کھائی میں گرتے دیکھا۔ عرفان چونکا۔ باہر سے فائرنگ کا مطلب تھا کہ ارشد نیچے آگیا ہے اور اسی نے اپنے دشمن کو گولی ماری ہے۔ اب وہ شاید اندر آنے کی فکر میں تھا۔ عرفان تیزی

http://paktunplace.blogspot.com

سے واپس آیا۔ اس نے فراز سے کہا۔

"وہ اب اندر آئے گا اور ہمیں اسے اندر آنے سے روکنا ہے۔ رقم اس کے ہاتھ سے جا چکی ہے اور اس کا ساتھی بھی مارا جا چکا ہے۔ اب صرف اسلحہ رہ گیا ہے اور وہ اسے راز میں رکھنے کے لیے ہمیں مار سکتا ہے۔"

دونوں نے راہداری میں پوزیشن سنبھال لی۔

☆☆☆

ارشد بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ آنے والے اس سے کچھ دور تھے اور اگر ان کی نظر اس طرف پڑ جاتی تو وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ارشد چاہتا تو ان کو مار گرانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن چار افراد سے بیک وقت نمٹنا آسان نہیں تھا جبکہ وہ زخمی بھی ہو گیا تھا۔ ان کا رخ عقبی حصے کی طرف ہی تھا، البتہ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اس کو شوٹ کر چکے ہوتے۔ اچانک ہی حویلی کے سامنے والے حصے سے دھماکے کی آواز آئی اور پھر شدید قسم کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ارشد چونکا پھر اس نے دانت پیسے۔ گرینڈ یقیناً رحیم شاہ کے ساتھیوں نے استعمال کیا تھا اور اب وہ حویلی میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دھماکے اور فائرنگ کی آواز پر آنے والے رک گئے پھر ارشد نے ان میں سے ایک کو کہتے سنا۔ "فضل، یاسر... تم دونوں سامنے کی طرف جا کر دیکھو اور کوئی نظر آئے تو اسے اڑا دو۔"

ان میں سے دو الگ ہو کر پیچھے گئے پھر بولنے والے نے چوغہ پوش آدمی سے پوچھا۔ "وہ اندر ہی ہے؟"

"ہاں، میں اسے باندھ کر ڈال گیا تھا۔ اس کے ساتھ بچی بھی اندر ہے۔" چوغہ پوش نے اسے بتایا۔ اس نے دیوار پر کہیں ہاتھ مارا تو اس میں ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ارشد حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس حویلی میں نہ صرف ایک تہ خانہ ہو گا بلکہ اس میں کوئی قید بھی ہو گا۔ پھر اسے فراز اور مونا کا خیال آیا جو غائب تھے۔ یہ شخص ان کا ہی ذکر کر رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ اندر چلے گئے۔ دوسری طرف سے فائرنگ کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ امیر علی اور عرفان مزاحمت کر رہے ہیں۔ ارشد ریختا ہوا تہ خانے کے دروازے تک آیا اور اس نے اندر جھانکا۔ وہ دونوں اندر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ پھر ارشد نے گرجنے کی آواز سنی۔ "بکواس بند کر... کہاں ہیں وہ؟" اس کے ساتھ ہی تھپڑ کی آواز آئی۔ تھپڑ چوغہ پوش کو پڑا تھا کیونکہ وہ مسلسل منمنانے کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ "تلاش کر ان کو۔"

ارشد کھڑا ہو گیا۔ اس نے رائفل شانے پر لٹکا لی اور پستول نکال لیا۔ زخم کی تکلیف کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور نیچے جانے لگا۔ ابھی وہ نصف سیڑھیوں پر تھا کہ نیچے سے چوغہ پوش نمودار ہوا۔ ارشد نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ چوغہ پوش ساکت ہو گیا۔ ارشد اس کے پاس پہنچا اور اشارے سے اسے اندر چلنے کو کہا۔ اس بار بھی اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اندر موجود شخص نے جب اسے واپس آتے دیکھا تو غصیلے لہجے میں بولا۔ "واپس کیوں آ رہا ہے؟"

"اسے میں لایا ہوں۔" عقب سے ارشد نے کہا۔

وہ شخص حلیے اور لباس سے مقامی لگ رہا تھا۔ اس نے رائفل کی طرف ہاتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن ارشد نے فائر کر دیا اور گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔ وہ گرا تو چوغہ پوش کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"مجھے مت مارنا... میں صرف یہاں کا چوکیدار ہوں۔"

"یہ اڈا کس کا ہے؟"

"میں نہیں جانتا، میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔" اس نے سبق دہرانے کے انداز میں کہا۔ اس پر ارشد نے اس کے پاؤں میں گولی ماری تو وہ دھڑام سے زمین پر گر کر بلبلانے لگا۔ ارشد نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

"منہ بند رکھ کتے۔"

وہ چپ ہو گیا لیکن اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "تم کون ہو؟"

"لگتا ہے تم دوسرے پاؤں پر بھی گولی کھانا چاہتے ہو۔ میں نے پوچھا ہے یہ جگہ کس کی ہے؟"

"یہ جگہ سلطان مرید کی ہے۔"

"یہ کون ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"وہ سلطان مرید ہے۔" چوغہ پوش نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

ارشد اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "اوپر موجود اسلحہ اسی کا ہے؟"

"ہاں، اس کا سامان آتا ہے اور جاتا ہے۔"

ارشد سمجھ گیا کہ سلطان مرید بھی رحیم شاہ کی طرح اسلحے کا سوداگر ہو گا۔ ابھی اسے رحیم شاہ سے نمٹنا تھا اور یہ تیسری پارٹی میدان میں آ گئی تھی۔ ارشد نے اس سے مزید سوالات کیے۔ پاؤں پر گولی کھانے کے بعد اس کی مزاحمت دم توڑ گئی تھی اور وہ فر فر ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے جو بتایا، اس کے مطابق سلطان کے اس اڈے کی نگرانی اس کے سپرد تھی اور یہاں کا انچارج باسو شاہ وہی تھا جسے ارشد نے گولی

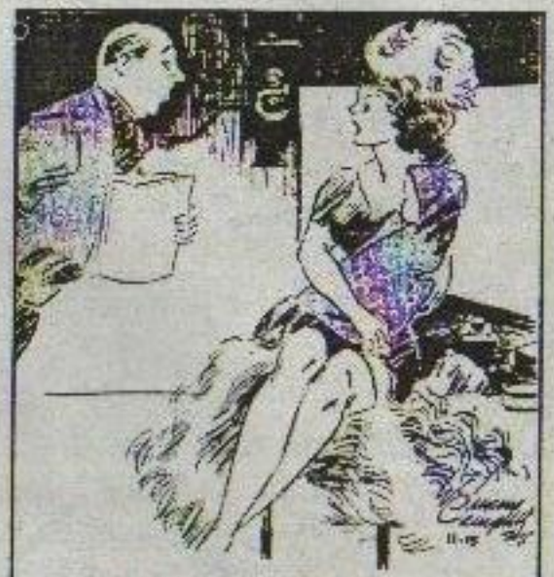

اگر تم اس سین کی شوٹنگ میں رُلانا چاہتے ہو تو بس اشارے سے مجھے وہ معاوضہ یاد دلا دینا جو تم مجھے ادا کرو گے۔

ماردی تھی۔ وہ یہاں نزدیک ہی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے یہیں شادی کر رکھی تھی اور نئی نویلی بیوی کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ حالانکہ اس اڈے کی حفاظت کی اصل ذمے داری اسی کی تھی۔ اس جگہ کو غیر آباد ظاہر کرنے کے لیے چوغہ پوش اس تہ خانے میں رہتا تھا۔ ارشد نے سوال کیا۔

"میں نے اوپر دیکھا ہے، وہاں اتنی مٹی اور گند ہے... جیسے کسی نے برسوں سے وہاں قدم نہیں رکھا۔ پھر اسلحہ کہاں سے آتا جاتا ہے؟"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے چوغہ پوش ہچکچایا لیکن جب ارشد نے اس کے زخم پر پاؤں رکھا تو مجبوراً اس نے بتایا۔

"اسی جگہ سے اوپر جانے کا راستہ ہے۔ اسلحہ یہیں سے لایا اور لے جایا جاتا ہے۔"

"راستہ کہاں ہے؟"

چوغہ پوش نے اسے کاٹھ کباڑ کے پیچھے ایک سیڑھی دکھائی جو اوپر چھت تک جا رہی تھی اور چھت میں ایک تختہ لگا تھا۔ اسے کھول کر اس کمرے میں جاتے تھے۔ اوپر سے پتا نہیں چلتا تھا کہ فرش میں کوئی تختہ لگا ہے۔ ارشد سمجھ گیا۔ اس نے چوغہ پوش سے آخری سوال کیا۔ "کیا سلطان کو علم ہے کہ یہاں کچھ لوگ گھس آئے ہیں؟"

"نہیں، وہ شہر میں ہوتا ہے اور ابھی فون بھی کام نہیں کر رہا ہے۔" اس نے بتایا۔ مطلب واضح تھا کہ سلطان کو ابھی اس سارے چکر کا علم نہیں تھا اور اگر ارشد، رحیم شاہ اور اس کے ساتھیوں پر قابو پا لیتا تو وہ چند گھنٹوں میں اپنے ساتھیوں کو بلوا کر یہ اسلحہ اپنے ٹھکانے پر منتقل کر سکتا تھا۔ بس چند گھنٹے کی بات ہوتی اور اس کے بعد کروڑوں روپے مالیت کا یہ اسلحہ بھی اس کے قبضے میں آ جاتا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر چوغہ پوش سمجھا کہ اس کا موڈ اچھا ہو گیا ہے۔ اس نے گھگیا کر اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

"میں صرف چوکیدار ہوں۔"

"اس لیے تم بھی اپنے مالک کے پاس جاؤ۔" ارشد نے کہا اور اچانک اسے گولی ماردی۔ گولی اس کے سر میں لگی۔ وہ پلٹ کر فرش پر جا گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ ارشد نے پہلے وہاں سامان کی تلاشی لے کر اپنے لیے ایک بڑا اور صاف کپڑا لیا اور اسے اپنے زخم پر اچھی طرح لپیٹ کر کس کر پٹی باندھ لی۔ پھر اس نے لاشیں گھسیٹ کر سامان کے پیچھے ڈال دیں اور ان دونوں کا انتظار کرنے لگا جو عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف گئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہیں واپس آئیں گے۔ یہاں وہ ان کو بس دو گولیوں میں جہنم رسید کر دیتا۔

☆☆☆

سلطان کے دونوں آدمی حویلی کے برابر میں تھے اور یہاں سے فائرنگ کر کے انہوں نے رحیم شاہ کو کھائی میں گرا دیا تھا۔ جس وقت وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے اور اس نے رقم حاصل کر لی ہے، اچانک ہی موت نے آن دبوچا تھا۔ وہ دونوں اپنی کامیابی پر نازاں تھے۔ فضل نے کہا۔ "چل کر دیکھ، ہو سکتا ہے تھیلے سے کچھ رقم ہاتھ لگ جائے۔"

یہ دونوں ہی نچلے درجے کے عام جرائم پیشہ تھے جن کے لیے ہزار روپے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاید لاکھوں کا سوچ لیا تھا اور اس پر ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ یاسر نے فضل کی تجویز سے فوراً اتفاق کیا۔ ان کو شبہ تھا کہ حویلی کے اندر کچھ لوگ ہو سکتے ہیں اس لیے وہ سامنے سے جانے کے بجائے دائیں طرف احاطے کی ٹوٹی دیوار سے کھائی میں اتر گئے۔ ان کو یہاں کے راستوں کا اچھی طرح علم تھا اس لیے وہ بہ آسانی نیچے اتر گئے۔ نیچے پہنچ کر انہوں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں بیگ والا گرا تھا۔ اس کی لاش تو فوراً نظر آ گئی لیکن بیگ غائب تھا۔ یاسر کو اس کی رائفل دکھائی دی تو اس نے لپک کر رائفل اٹھا لی اور فضل رحیم شاہ کی لاش کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے پاس سے برآمد ہونے والا پستول اور دوسری چیزیں مع بٹوے کے، اس نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس دوران میں یاسر بیگ تلاش کر رہا تھا۔ آخر اسے ایک جگہ بیگ نظر آ گیا۔ بجلی کے رہ رہ کر چمکنے سے ماحول اتنا روشن ضرور تھا کہ آس پاس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یاسر کو بیگ ملا تو فضل بھی لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ بیگ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا اور اس سے پانی

http://pakfunplace.blogspot.com

لٹک رہا تھا۔ یاسر نے اس کی زپ کھولی اور پھر دونوں ہی دم بہ خود رہ گئے۔ اندر پورا بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی دیر بعد یاسر بہ مشکل بولا۔ ''اتنی رقم...''

فضل بھی دنگ رہ گیا تھا۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ اس کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھے۔ پھر یاسر نے کام کی بات کی۔ ''اس رقم کا کیا کرنا ہے؟''

فضل نے فوری فیصلہ کیا۔ ''اسے کہیں چھپا دیتے ہیں، بعد میں نکال لیں گے۔''

انہوں نے رقم اپنے استاد کو دینے کے بجائے آپس میں بانٹ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ رقم کہاں چھپائی جا سکتی ہے۔ انہوں نے بیگ ایک ایسی ہی جگہ چھپا دیا۔ اس وقت شاید ان کے دل میں لالچ بھی نہیں آئی تھی کہ ان میں سے کوئی اکیلا ہی اس رقم کو ہضم کر جائے۔ پھر وہ اوپر آئے اور انہوں نے حویلی کے عقبی حصے کا رخ کیا۔

☆☆☆

عرفان اور فراز ہال میں آئے۔ انہوں نے خود کو..... جھکائے رکھا۔ اگرچہ باہر سے فائرنگ بند ہو چکی تھی پھر بھی خطرہ تھا اور انہیں علم نہیں تھا کہ رحیم شاہ اور اس کے آدمی مارے جا چکے ہیں۔ البتہ انہیں امیر علی کی ہلاکت کا فوراً علم ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس ساکت پڑا تھا۔ عرفان نے اس کی نبض دیکھی اور افسوس سے سر ہلایا۔

''یہ مر چکا ہے۔''

''میرے خدا۔'' اسی دوران میں فراز نے باہر دیکھا جہاں دو افراد کی لاشیں پڑی تھیں۔ ''یہ دو اور ہیں... یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''لالچ۔'' عرفان نے کہا۔ ''یہ سب لالچ کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ ان کے پاس خاصی بڑی رقم تھی اور اس کا بیگ...'' وہ بولتے بولتے رک گیا کیونکہ دروازے سے بیگ غائب تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کے پاس آیا۔ ''بیگ یہاں تھا۔''

''اب نہیں ہے... اس کا مطلب ہے کوئی اسے لے گیا ہے۔'' فراز چوکنا ہو کر بولا۔ ''تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔''

عرفان کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ جوش میں بالکل دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ ''خدا کرے بیگ لے کر باہر والے دشمن چلے گئے ہوں۔''

''وہ چلے بھی گئے ہوں تو ان کا ساتھی ابھی باقی ہے۔'' فراز نے اندر والوں کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ایک ہی ہے اور اگر راستہ صاف ہو گیا ہے تو ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن اس کے لیے ہمیں صبح تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس سے پہلے نکلنا درست نہیں ہو گا۔ ایک تو موسم خراب ہے اور اوپر سے یہ بھی نہیں معلوم کہ باہر کوئی ہے یا نہیں۔''

''اور اگر اس دوران میں اس جگہ کے اصل لوگ آ گئے تو...؟'' عرفان نے پوچھا لیکن فراز کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ البتہ اس کی بات میں وزن تھا کہ اس وقت نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر باہر کوئی موجود ہوتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتے۔ اسی طرح اگر حویلی کے لوگ آ جاتے تب بھی وہ مشکل میں پڑتے۔ بہرحال، حویلی کے اندر کوئی ان پر اتنی آسانی سے قابو نہیں پا سکتا تھا۔ ہال کا داخلی دروازہ اور سامنے کی دونوں کھڑکیاں تباہ ہو گئی تھیں اس لیے اب باہر سے اندر بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا اور فائرنگ کی صورت میں وہاں چھپنے کی گنجائش کم تھی اس لیے انہوں نے راہداری میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

ان میں سے کسی نے بہت دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روبینہ کے پاس جو بسکٹ اور جوس تھے، وہ فرح کو دے رہی تھی۔ تھوڑے سے بسکٹ [illegible] تھے۔ فراز اس کے اس ایثار سے اور بھی متاثر ہوا۔ اس نے عرفان سے کہا۔ ''میں اس عورت کا احسان ساری عمر نہیں اتار سکتا جو اس نے اس وقت مجھ پر اور میری بیوی بچے پر کیا ہے۔''

''واقعی بہت بڑے دل کی اور باہمت عورت ہے۔ اس کی بچی غائب تھی اور فکر کے باوجود وہ پوری طرح تمہاری بیوی کی خدمت کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے اکیلے سب کس طرح کر لیا۔''

''تمہاری کزن نے اس کی مدد نہیں کی؟''

عرفان نے نفی میں سر ہلایا اور تلخی سے بولا۔ ''اس کی کیا، وہ اپنی مدد کر لے تو بڑی بات ہے۔''

''تم نے اس سے شادی کیسے کر لی؟''

''بس یار بدقسمتی تھی۔ یہ میرے تایا کی بیٹی ہے اور مجھے شروع سے پسند تھی۔'' عرفان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''دو بچے ہونے کے باوجود اس کے رویے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مجبوراً مجھے طلاق پر آمادہ ہونا پڑا۔''

''اب تم کیا کرو گے؟'' فراز نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے تمہارے دو چھوٹے بچے ہیں؟''

''پتا نہیں، ایک نوکر ہے وہی بچے سنبھالتا ہے۔''

''نوکر کہاں سنبھال سکتے ہیں۔ تم جوان ہو اور مالی لحاظ سے بھی ٹھیک ٹھاک ہو تو دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

عرفان نے سرد آہ بھری۔ ''ابھی تو ایک سے پیچھا چھوٹا ہے پھر اتنی جلدی مناسب عورت کہاں سے ملے گی۔ اب میں اپنے بچوں کے حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے پلے ہیں جیسے بن ماں کے بچے پلتے ہیں۔''

فراز نے آہستہ سے کہا۔ ''روبینہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی بیوہ ہے اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ وہ دوسروں کا کتنا خیال کرتی ہے۔''

عرفان سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''سچی بات ہے کہ وہ مجھے بھی اچھی لگی ہے۔ لیکن ایک تو میں اپنے بچوں کو ایک طرف کر کے صرف اپنی ذات کے حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا... دوسرے اس کا بھی اپنا فیصلہ ہو گا۔ اس کی بچی سات سال کی ہو چکی ہے اور اس کے شوہر کو گزرے چھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ اگر وہ شادی پر رضامند ہوتی تو اب تک اسے کوئی نہ کوئی اچھا آدمی مل گیا ہوتا۔''

''اور ممکن ہے وہ کرنا چاہتی ہو لیکن اسے کوئی اچھا آدمی نہ ملا ہو۔'' فراز نے کہا۔

''میں اس پر غور کروں گا لیکن پہلے اس صورت حال سے تو نکلیں۔''

''مجھے یقین ہے اگر ہم نے ہمت کی تو یہ [illegible] لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' فراز بولا۔ ''[illegible] خدا بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ سوچ کر ہمیں مطمئن نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔''

اسی لمحے وہاں روبینہ آ گئی۔ فراز نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''بڑی لمبی عمر ہے آپ کی... ابھی ہم آپ کا ذکر کر رہے تھے۔''

''اچھا... کیا ذکر کر رہے تھے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہی کہ عرفان اور آپ...''

''او بھائی۔'' عرفان نے بوکھلا کر اس کی بات کاٹی۔ ''یہ کون سا وقت ہے؟''

''میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں بہت بہادر اور باہمت ہیں۔''

روبینہ مسکرائی۔ ''وہ تو تم بھی کم نہیں ہو۔ کوئی اور ہوتا تو میری بچی کے بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔''

''اور آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فرح کو ہرگز اس طرح

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جنوری 2011ء

نئے سال کے

نئے رنگ

سمجھوتا

رشتوں کا بھرم ٹوٹے..... راہ خارزار پر ننگے پاؤں چلنے والوں اور کرچی کرچی ہونے والے اعتبار کی کتھا......

محی الدین نواب کے قلم کی سحر کاریاں

شاہی سے غلامی تک

ڈاکٹر ساجد امجد ابتدائی صفحات پر تاریخ کے جھروکوں سے ایک عبرت انگیز داستان لے کر حاضر ہیں۔ 1857ء کی جنگ اور بہادر شاہ ظفر کا انجام

شریک سفر

محبت کے نشیب و فراز اور رشتوں کی نازک ڈوری کا الجھاؤ..... اور **مرزا امجد بیگ** کا ایک منفرد انداز

حضرت الیاسؑ

حیات انبیا اور پیغام خدا کے سلسلے کی ایک اور عبرت انگیز کڑی

واہی تباہی، اناڑی، گلشن شعر و سخن، آپ کے خط

منظر امام، ضیا تسنیم

بلگرامی، کاشف زبیر، تنویر عباس

نجمہ مسعودی اور تنویر ریاض کی دلچسپ تحاریر

http://pakfunplace.blogspot.com

نہیں سنبھالتا۔"

"چلو حساب برابر ہو گیا۔" روبینہ بولی پھر چونکی۔ "میں تو بھول ہی گئی۔ اتنی فائرنگ سنی ہے کہ یہ چند فائر بالکل معمولی سے لگ رہے ہیں۔"

"فائر کہاں ہوئے ہیں؟" عرفان نے کہا۔

"بہ ظاہر تو باہر سے آواز آئی ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا ہے جیسے فائر زمین کے نیچے ہوئے ہیں۔"

"تہ خانے میں ہوئے ہوں گے۔" فراز نے بے ساختہ کہا۔ "یہ شاید اسلحہ خانے کے بالکل نیچے ہے۔"

عرفان چونکا۔ "یار! ایک بات تو ہم نے سوچی نہیں کہ یہاں اتنی گرد اور گند ہے... تو اسلحہ کہاں سے آتا ہے؟"

فراز نے اس کی طرف دیکھا۔ "گرد اور گند کا اسلحہ لانے سے کیا تعلق ہے؟"

عرفان کی بات روبینہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم نے ٹھیک سوال کیا ہے جبکہ ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں برسوں سے کسی نے قدم نہیں رکھا... تو اسلحہ کہاں سے آیا؟"

"اس کا مطلب ہے کہ اسلحہ کسی خفیہ راستے سے براہِ راست اس کمرے تک آتا ہے۔" عرفان نے کہا۔ "یعنی کوئی اس راستے سے اندر آسکتا ہے۔"

فراز اچھل پڑا۔ "میں سمجھ گیا کہ وہ خفیہ راستہ کہاں سے آتا ہے۔ وہ یقیناً اس تہ خانے سے آتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو اس حویلی میں سامنے سے داخل ہونا نہیں پڑتا۔"

"یوں یہاں آنے والے کو شک بھی نہیں ہوگا کہ حویلی استعمال میں ہے۔" روبینہ بولی تو فراز نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"دیکھا، میں نے ٹھیک کہا تھا کہ تم اور عرفان..."

"آگے کہو؟" روبینہ بولی۔

"یہی کہ تم دونوں بہت ذہین ہو۔" فراز کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔ روبینہ شرما گئی۔ اپنے تاثرات چھپانے کے لیے اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

"ہمیں اس کمرے کو دیکھنا چاہیے۔" عرفان نے کہا۔ "ممکن ہے اوپر موجود شخص نیچے آگیا ہو اور اسے اندر آنے کا موقع نہیں ملا تو وہ تہ خانے میں اتر گیا ہو۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے۔ شاید مونا کو لے جانے والا واپس آیا ہو اور اس شخص نے اسے تہ خانے میں جاتے دیکھ لیا ہو۔"

"اس صورت میں فائرنگ کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔" عرفان نے کہا اور فراز سے بولا۔ "تم اسی جگہ رکو، میں اسلحے والے کمرے میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

عرفان جانے لگا تو روبینہ بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔ ذرا آگے نکل کر اس نے عرفان سے کہا۔ "تم دونوں میرے بارے میں کیا بات کر رہے تھے؟"

عرفان چلتے چلتے رک گیا اور اس نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، کیا ہم تمہارے بارے میں کوئی نازیبا بات کر رہے تھے؟"

"ارے نہیں۔" روبینہ بے ساختہ بولی۔ "ایسا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے فراز کے انداز پر کہا ہے، وہ کچھ شوخ ہو رہا تھا۔"

"اسے شوخ تو ہونا ہے، اس کی اتنی بڑی مشکل آسان ہو گئی۔" عرفان نے ٹالتے ہوئے کہا۔

مگر روبینہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے کسی قدر شک سے کہا۔ "یعنی کوئی خاص بات نہیں ہے؟"

"اب کیا میں قسم کھا کر بتاؤں؟" عرفان نے کہا۔ وہ اسلحے والے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ عرفان نے اس کے لٹو پر ہاتھ رکھا تھا کہ اسے اندر سے ایک واضح کھٹکا سنائی دیا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اس نے روبینہ کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر بتایا کہ اس نے بھی آواز سنی ہے۔ اندر کوئی تھا۔ دروازے کا لاک ٹوٹ گیا تھا اور وہ اندر شخص کو باہر آنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے روبینہ کا بازو پکڑ کر کھینچا اور برابر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے اسلحے والے کمرے کا دروازہ کھلنے لگا۔

☆☆☆

یاسر اور فضل اندر آئے اور فوراً ہی مارے گئے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے محفوظ ٹھکانے پر دشمن کا قبضہ ہوگا اس لیے وہ بے دھڑک تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ رقم کا تصور بھی ان کے ذہنوں پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ خطرے کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا اور جب اچانک ہی ارشد ان کے سامنے آیا تو ان کو اپنے ہتھیار اٹھانے کا موقع نہیں ملا اور ارشد نے یکے بعد دیگرے ان کو شوٹ کر دیا۔ اس پر خون سوار تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں اس نے چار افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کے نامۂ اعمال میں بے شمار قتل تھے لیکن اس نے ایک وقت میں اتنے افراد کو نہیں مارا تھا۔ اس نے ان کی لاشیں بھی کھینچ کر ایک طرف ڈال دیں اور اوپر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے پاؤں کی تکلیف اب قابلِ برداشت تھی۔

اس نے سیڑھیاں چڑھ کر اسلحے والے کمرے میں

جانے کا راستہ کھولا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں اندر داخل ہو گیا۔ ٹارچ اسے تہ خانے میں مل گئی تھی۔ اسلحے والا کمرا خاصا بڑا تھا اور اسے پہلی بار صحیح معنوں میں پتا چلا کہ یہاں کس قدر اسلحہ موجود ہے۔ پیٹیوں کے درمیان میں بہت کم جگہ تھی۔ وہ بڑی دقت سے راستہ بناتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس کی نظر کھلی پیٹیوں پر نہیں گئی جن سے عرفان اور فراز نے اسلحہ نکالا تھا ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے قیدی بھی اب مسلح ہو گئے ہیں۔ ویسے اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ ان لوگوں سے نمٹ سکتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر راہداری میں آیا اور بائیں کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوا، اسے امیر علی کی لاش نظر آگئی۔ عرفان غائب تھا اور پھر رقم والا بیگ غائب دیکھ کر وہ پاگل ہونے لگا۔ امیر علی کا قاتل اور رقم لے جانے والا یقیناً رحیم شاہ تھا لیکن عرفان کہاں تھا؟ اس نے دروازے سے باہر دیکھا تو چمکتی بجلی کی وجہ سے اسے رحیم شاہ کے آدمیوں کی لاشیں نظر آگئیں۔ وہ باہر آیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ احاطے میں رحیم شاہ کے آدمیوں کی لاشیں تھیں لیکن وہ خود نہیں تھا اور اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ رقم لے کر جا چکا ہے۔

رحیم شاہ اور ان لوگوں کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا وہ واپس آیا۔ اس دوران میں اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ قیدیوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا کیونکہ اب اسے یہاں سے اکیلے نکلنا تھا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر یہاں سے اسلحہ لے جا سکتا تھا۔ ان کو چھوڑ کر جانے کا مطلب اسلحے کا راز فاش ہو جانا تھا۔ رقم سے محرومی کے بعد اب وہ کسی قیمت پر اس اسلحے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ رقم اور رحیم شاہ دونوں کھائی میں تھے۔ رقم یاسر اور فضل نے چھپا دی تھی اور اسے استعمال کرنے کے خواب دیکھتے ہوئے خود بھی اچانک ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

ارشد نے اندر آتے ہی رائفل سامنے کر لی اور محتاط قدموں سے اندر کی طرف بڑھا۔ اس کا رخ عقبی کمرے کی طرف تھا جہاں اس کے خیال میں وہ سب موجود تھے۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ اب درمیان کے ایک کمرے میں آچکے ہیں۔ وہ دبے قدموں اس کمرے کے دروازے تک آیا اور اس نے اچانک ہی دھکا دے کر اسے کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھکا اسے بھی لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے اندر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ اس نے کنڈی لگنے کی آواز سنی اور تڑپ کر ہاتھ سے چھوٹ جانے والی رائفل اٹھائی اور دروازے کی طرف برسٹ مارا۔ لیکن کسی زمانے میں بنی اس حویلی میں دروازے بہت موٹی اور ٹھوس لکڑی کے بنے تھے۔ گولیاں ان میں پیوست ہو گئیں لیکن اس کے پار نہیں جا سکیں۔ داخلی دروازہ بھی گرینیڈ سے تباہ ہوا تھا۔ ارشد نے عرفان کی آواز سنی۔ "تم بے کار میں گولیاں ضائع کر رہے ہو، یہ عام دروازہ نہیں ہے۔"

ارشد نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر دروازے کے کنڈی والے حصے کو نشانہ بنانا چاہا تو انکشاف ہوا کہ رائفل خالی ہو چکی ہے اور اس کے پاس کوئی اضافی میگزین بھی نہیں۔ یہی حال پستول کا تھا۔ اس میں صرف دو گولیاں باقی تھیں اور ان سے دروازہ نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، دروازہ کھول دو۔"

"تبھی تم ہمیں مارنے آئے تھے۔" عرفان نے طنز کیا۔

"اب آرام کرو اور یہاں سے ہمارے جانے کا انتظار کرو۔ اگر تم نے اس سے پہلے نکلنے کی کوشش کی تو مجبوراً ہمیں تم کو مارنا پڑے گا۔ اپنے ساتھیوں کا انجام تم دیکھ چکے ہو۔"

ارشد کو احساس ہوا... کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے کیونکہ اس کے پاس گولیاں ختم ہو گئی تھیں اور اس کمرے سے نکلنا بھی ناممکن تھا۔ اس نے عرفان کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ راہداری کا درمیانی دروازہ بھی بند کر کے جا چکے تھے۔ ان کو اعتماد تھا کہ اگر ارشد کمرے سے نکل بھی آیا تو راہداری میں پھنس جائے گا۔

☆☆☆

کمرے میں روبینہ مونا کو گود میں لیے بیٹھی تھی جو نیند میں تھی۔ فراز اپنی بیوی اور بچے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے بیٹے کو گود میں لے لیا تھا۔ آرام اور کھانے پینے سے فرح کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی اور اب وہ سفر کر سکتے تھے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد انہوں نے حالات پر قابو پا لیا تھا لیکن ابھی بھی ان کے دلوں میں خدشات تھے کہ یہاں اسلحہ رکھنے والے نہ آجائیں۔ فراز نے عرفان سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں بارش رکنے کا انتظار کیے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" عرفان نے کہا۔ "تم یہاں رکو اور ہوشیار رہنا۔ میں ذرا باہر دیکھ کر آتا ہوں۔"

عرفان باہر آیا۔ اس نے امیر علی کی لاش کی تلاشی لی تو اسے ان کی جیپ کی چابی مل گئی۔ اگرچہ ضرورت پڑنے پر وہ فراز کی گاڑی میں بھی کسی نہ کسی طرح ٹھنس کر سفر کر سکتے تھے لیکن ایک اضافی گاڑی میسر تھی تو اس کا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو بارش میں خاصی حد تک کمی آگئی تھی لیکن بجلی اب بھی چمک رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس نے عمارت کی... بائیں جانب

http://pakistanipalace.blogspot.com

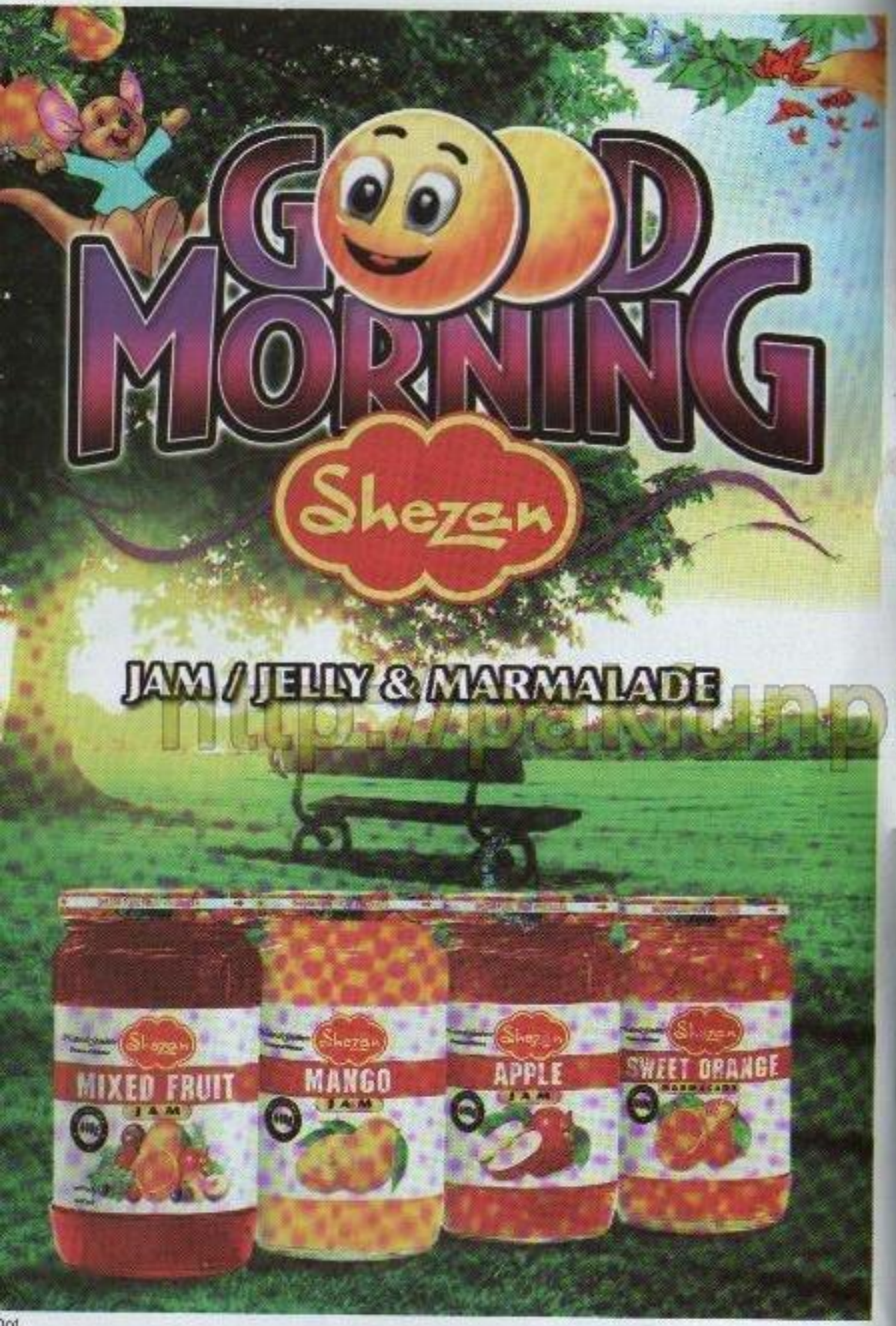

احاطے میں موجود جیپ اور گاڑی کو سامنے لا کر کھڑا کیا۔ وہ اندر آیا اور کہا۔

"تیار ہو جاؤ، ہم نے یہاں سے نکلنا ہے۔"

"فرح کی حالت ابھی سفر کرنے والی نہیں ہے۔" روبینہ نے کہا۔

"نہیں باجی۔" فرح بولی۔ "میں ہمت کرلوں گی لیکن ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

فراز کا بھی یہی خیال تھا۔ سب کو خدشہ تھا کہ کوئی نئی مصیبت نہ نازل ہو جائے اور وہ پھر یہاں پھنس کر رہ جائیں۔ فراز نے فرح کو سہارا دیا۔ بچہ روبینہ نے سنبھال لیا تھا۔ عرفان سامان اور اسلحہ لیے ہوئے تھا۔ جب تک وہ کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے، انہیں اسلحے کی ضرورت تھی۔ وہ باہر آئے۔ فرح اور فراز اپنی گاڑی میں سوار ہوئے جبکہ عرفان اور باقی لوگ ارشد والی جیپ میں آگئے۔ بارش رک گئی تھی لیکن مل نما کچے راستے پر کیچڑ سے اچھا ہو گیا تھا۔ اس سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ پہلے فراز کی گاڑی گئی۔ کئی بار وہ پھسلتی محسوس ہوئی۔ عرفان بہتر ڈرائیونگ کرتا تھا اس لیے وہ آسانی سے پار چلا گیا۔

سڑک کی حالت بہتر نہیں تھی لیکن بہرحال اس پر سفر اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد آسمان سے بادل صاف ہونے لگے۔ عرفان جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ روبینہ، مونا اور شاہین عقبی نشست پر بیٹھی تھیں۔ اچانک روبینہ نے کہا۔ "آج نیو ایئر نائٹ ہے۔"

عرفان چونکا۔ "ہاں، اس چکر میں یاد ہی نہیں رہا۔" اس کی نظر جیپ میں لگی گھڑی پر گئی۔ اس میں بارہ بجنے میں ایک منٹ تھا۔ "لو نیا سال شروع ہونے والا ہے۔"

روبینہ نے مونا کی طرف دیکھا۔ "مجھے میری بچی دوبارہ مل گئی، میرے لیے تو یہی نئی زندگی ہے۔"

"ہم سب کے لیے یہ نئی زندگی ہے۔" عرفان بولا۔

شاہین خاموش تھی لیکن اس بار اس کے انداز میں بے نیازی نہیں تھی بلکہ وہ خود کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ دو گھنٹے کی سست اور محتاط ڈرائیونگ کے بعد وہ اس سڑک سے نکل کر دارالحکومت جانے والی شاہراہ پر آگئے۔ اس شاہراہ پر چند منٹ بعد انہیں ایک ساری رات کھلا رہنے والا ریستوران مل گیا۔ انہوں نے وہاں رک کر کھانے پینے کا سامان لیا۔ عرفان نے گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ اس گاڑی کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ سکتے تھے، اس نے ایک ٹیکسی کر لی۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد جب روبینہ پھر اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی تو کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے عرفان تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بوکے اور دوسرے میں کیک کا ڈبا تھا۔

"تم...." روبینہ نے بے ساختہ کہا اور پھر جھینپ گئی۔ "میرا مطلب ہے آپ؟"

"جی میں۔" عرفان مسکرایا۔ "کیا اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟"

"کیوں نہیں۔" وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ گئی اور مونا کو آواز دی۔ "مونا، دیکھو کون آیا ہے۔"

مونا اندر اپنا چھٹیوں کا ہوم ورک کر رہی تھی۔ ماں کی آواز سن کر آئی اور دوڑ کر عرفان سے لپٹ گئی۔ "انکل آپ۔"

عرفان نے اسے پیار کیا۔ "ہاں بیٹا.... آپ کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

روبینہ اسے اندر لے آئی۔ "میں سوچ رہی تھی کہ آپ جلدی آئیں گے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا لیکن کچھ معاملات نمٹانے میں وقت لگ گیا۔ ایک تو اسلحے کا معاملہ تھا۔ ایک خفیہ ایجنسی نے وہاں چھاپا مارا اور کئی گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ دوسرے وہاں کمرے میں قید آدمی پکڑا گیا۔ اس پر کئی افراد کو قتل کرنے کا الزام ہے اور پھر تمہاری اور میری گاڑیوں کا معاملہ بھی تھا۔"

"میری گاڑی؟" روبینہ چونکی۔ "میں تو اسے بھول ہی گئی تھی۔"

"میں نہیں بھولا تھا۔ باہر کھڑی ہے اور ٹھیک حالت میں ہے۔"

"آپ نے میرے لیے زحمت کی۔"

"نہیں، میں نے اپنے لیے زحمت کی ہے۔" عرفان بولا۔ مونا وہاں سے چلی گئی تھی اس لیے عرفان نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ "روبینہ، میں صاف بات کروں گا۔ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ تم جانتی ہو، شاہین سے میری علیحدگی ہو چکی ہے اور میرے دو بیٹے ہیں۔ پھر بھی میں چاہوں گا کہ تم میرے پروپوزل کے بارے میں سوچو۔"

"میری بھی ایک بیٹی ہے۔" روبینہ نے آہستہ سے کہا۔ "اس طرح سے دیکھا جائے تو ہم دونوں برابر ہیں۔"

عرفان کا چہرہ چمکنے لگا۔ "تو کیا میں اسے اقرار سمجھوں؟"

روبینہ نے منہ سے نہیں کہا لیکن اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور آنکھیں جھک گئیں۔ اقرار کی اس سے زیادہ واضح صورت اور کیا ہو سکتی تھی؟

http://pakiunplace.blogspot.com